كتاب
الأربعين
في فضائل آل البيت الطاهرين
تأليف
عبد الله بن صالح بن محمد العبيد
ترجمة، تخريج، تحقيق، تشريح
قاري ظهور احمد فيضي
مكتبة باب العلم
جامعة علي المرتضى، لاهور

في فضائل آل البيت الطاهرين

تأليف

عبد الله بن صالح بن محمد العبيد

ترجمة، تخريج، تحقيق، تشريح

قاري ظهور احمد فيضي

ريسرچ سکالر: جامعہ اسلامیہ، لاہور

مكتبة باب العلم

جامعة علي المرتضىٰ، لاہور

نام کتاب : شرح كتاب الأربعين في فضائل آل البيت الطاهرين

مُصنّف : قاري ظہور احمد فیضی

پروف ریڈنگ : مفتی خالد محمود باروی (ایم فل،اسلامیات)

کمپوزنگ : محمد سہیل فیضی،محمد طاہر فیضی،اوچ شریف (بہاول پور)

تصحیح وترتیب : محمد احمد فیضی

بک ورک : محمد رضا

تعداد : 1100

الطبعة الثانية : نومبر ۱۴۴۱ھ

ہدیہ : 1400 روپے

پرنٹر :

ناشر : مکتبۃ باب العلم

54 گراؤنڈ فلور ہادیہ حلیمہ سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار،لاہور

maktbababulilm110@gmail.com Tel: 0300 41 500 21,042-37321214

ڈسٹری بیوٹرز

ضیاء القرآن پبلی کیشنز: گنج بخش روڈ لاہور / اردو بازار، کراچی

احمد بک کارپوریشن،اقبال روڈ کمیٹی چوک،راولپنڈی

اسلامک بک کارپوریشن،اقبال روڈ کمیٹی چوک،راولپنڈی

عباسی کتب خانہ جونا مارکیٹ کراچی

مکتبہ خورشیدِ ملت،نزد کینال ریسٹ ہاؤس،اوچ شریف (بہاول پور)

0300 249 5037

انتساب

یہ ناپاک اپنی اِس کاوش کو اُس پاک ہستی کی طرف منسوب کرتا ہے جن پر جس قدر مصائب وابتلاء زیادہ آئے اُسی قدر اُن کے صبر وثبات اور توجہ الی الخالق میں اضافہ ہوا، یہاں تک کہ جب کہا جائے ''سید الساجدین، زین العابدین'' تو اہل اسلام کے ذہن میں اُن کے علاوہ کسی دوسری شخصیت کا تصور ہی نہیں آتا، اُنہیں اُن کے نام ''علی بن حسین'' سے اتنا نہیں جانا جاتا جتنا اِن القاب سے جانا جاتا ہے۔ ضرور اُنہیں زندگی کے بقیہ ایام میں میدانِ کربلاء کا منظر، پھر کربلاء سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک کا سفر اور اُس وقت کی اموی حکومت کی خباثتیں یاد آتی ہوں گی، اور مصیبت جب بھی یاد آجائے تو اپنے ساتھ تلخی کو ضرور لاتی ہے، لہٰذا میں سمجھتا ہوں جتنا اُنہیں یہ مصائب زیادہ یاد آئے اُنہوں نے اتنا ہی سجدوں کی کثرت کی، یہاں تک کہ زین العابدین ہوگئے۔ ع:

جن کے رتبے ہیں سوا، اُن کو سوا مشکل ہے

دعا ہے کہ مجھ ناپاک کی یہ معمولی سی کاوش اُس پاک بارگاہ میں قبول ہوجائے، اور اُن کے طفیل معبودِ برحق ﷻ مجھے اور میری فیملی کو سجدوں کی کثرت ولذت سے بہرہ ور فرمائے، اور قیامت کے دن مجھے، میرے والدین، بہن بھائی، اولاد، اس کتاب کے معاونین اور قارئین سب کو اُن کی شفاعت نصیب فرمائے۔ آمین، ثم آمین!

الإهداء

میں اپنی اِس کاوش کو پہلے اُن جملہ خواتین وحضرات کی بارگاہوں میں ھدیہ کرتا ہوں جنہیں نبی کریم ﷺ کے ماں باپ ہونے کا شرف حاصل ہوا، پھر اُس طیب وطاہر آل کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں جنہیں سید الاولین والآخرین ﷺ کی مبارک اولاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اظہارِ تشکّر

الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ
وَعَلٰى آلِهِ الطَّيِّبِيْنَ وَأَصْحَابِهِ الرَّاشِدِيْنَ.

حمد وصلاۃ کے بعد سب سے پہلے بندہ اربابِ جامعہ اسلامیہ، لاہور کا شاکر وممنون ہے کہ اُنہوں نے "**شرح خصائص علي** رضی اللہ عنہ" کی اشاعتِ اولیٰ کے بعد نہ صرف یہ کہ اُن ابتدائی دُشوار حالات میں مجھ پر علمی اور مالی دستِ شفقت رکھا بلکہ مجھے زندگی کے بقیہ ایام میں بھی اہل بیت کے کام کرنے کا مشورہ دیا اور اِس پر اہل بیت کرام علیہم السلام کی جانب سے ایک وظیفہ بھی مقرر فرما دیا۔

پھر میں اُس حق پسند اور تحقیق پسند عالمِ دین کا ممنون ہوں جنہوں نے میرے ترجمہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا، تصحیح فرمائی اور مفید مشوروں سے نوازا، یعنی علامہ ڈاکٹر عبدالحی ابڑو حفظہ اللہ تعالیٰ۔

بالخصوص یہاں اُس محسن کا شکریہ ادا کرنا لازم سمجھتا ہوں جن کے تعاون کی بدولت کتابِ ھٰذا کا بر وقت منظر عام پر آنا ممکن ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے پاس سرمایہ نہ ہو تو اعلیٰ سے اعلیٰ تحقیق بھی یا تو دھری کی دھری رہ جاتی ہے یا پھر تاخیر کا شکار ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے حضرات کا شکریہ ادا کرنا جن کی اعانت کی بدولت کام بن جائے عند الشریعت بھی لازم ہے۔ اگر کتابِ ھٰذا کی اشاعت میں جناب **الحاج جسٹس سید حامد علی شاہ مدظلہ** بروقت اعانت نہ فرماتے تو خدا جانے کہ اِس کی اشاعت میں کتنی تاخیر ہوتی۔ مزید برآں یہ کہ حضرت شاہ صاحب بطفیل اہل بیت مجھ پر اور میرے بچوں پر بہت شفقت فرماتے ہیں، ہمارے دینی و دنیوی امور میں ترقی کے خواہاں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سعادت اُنہیں اُن کی اصل (آباؤ اجداد علیہم السلام) سے ورثہ میں ملی ہے۔ اَللّٰهُمَّ زِدْ فَزِدْ.

انتہائی ناانصافی ہوگی اگر یہاں جناب قیصر عباسی صاحب زیدت صحتہ وحسناتہ کا شکریہ ادا نہ کیا جائے، یہ دیوانۂ اہل بیت "الزھراء لائبریری" کی تمام ضروریات سے لے کر مجھ فقیر کی صحت کی ضروریات تک کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ انہیں جو عشق ومحبت کی سعادت حاصل ہوئی، یہ جناب سید محمد انور حسین شاہ نفیسؔ رحمہ اللہ تعالیٰ کی صحبتِ بابرکت کا نتیجہ ہے۔ قادرِ مطلق انہیں دارین کی سعادتوں سے مالامال فرمائے اور وہ تمام علماء اور عوام جنہیں شاہ صاحب کی بدولت اہل بیت کرام کا عرفان حاصل ہوا، اُن کی مساعیٔ جمیلہ کو اُن کے لیے اور شاہ صاحب کے لیے صدقۂ جاریہ فرمائے۔

اظہارِ تشکّر کی بات ہو اور اربابِ نثار آرٹ پریس کا تذکرہ نہ ہو تو یہ بجائے خود ناشکری ہوگی۔ سچی بات یہ ہے کہ اِن حضرات کی خصوصی محبت اور لطف وعنایت نہ ہوتی تو میری کتب اس قدر شاندار طرز سے شائع نہ ہوتیں۔ اُس وقت سے میرے دل میں ان کی وقعت مزید بڑھ گئی جب میں نے ایک کتاب بعض دوسرے مقامات سے پرنٹ کرائی۔ مزید برآں یہ کہ میں اکثر تہی دست ہوتا ہوں لیکن اس کے باوجود کتاب کو خوبصورت شکل میں چھپوانے کا جنون رکھتا ہوں۔ بخدا یہ حضرات کھلے دل سے میری کتاب پر کام شروع کر دیتے ہیں اور میں بعد میں بسہولت ادائیگی کرتا رہتا ہوں۔ یقیناً یہ عاجز ان کے احسانات کا بدلہ چکانے سے قاصر ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی انہیں دنیا اور آخرت میں حسین ترین جزا عطا فرمائے۔

یہاں میں اپنے بزرگوار سید امان اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے لیے دعا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ مجھے پدری شفقت عطا فرماتے تھے، پھر میں اُن حضرات کے لیے بھی دعا کرتا ہوں جو حضرت شاہ صاحب کی بدولت بالترتیب میرے نشیب وفراز کے ساتھی اور معاون بنتے گئے، یعنی سید سمیع اللہ شاہ صاحب، چوہدری صلاح الدین صاحب، سید نعیم اللہ شاہ صاحب، اور جناب سید محمد اسماعیل شاہ صاحب عباسی۔

جَزَاھُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ خَیْراً

آخر میں دعا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مذکورہ بالا تمام حضرات کو اہل بیت کرام علیہم السلام کے طفیل کونین کی ہر خیر عطا فرمائے اور ہر ایک کی کوشش کو اُس کے لیے اور اُس کے والدین واقارب کے لیے صدقۂ جاریہ فرمائے۔ آمین!

مؤلف کتابِ ھٰذا کا مختصر تعارف

”کتاب الأربعين في فضائل آل البيت الطاهرين“ کے مؤلف کا نام ٹائٹل پر مرقوم ہے، یہ اصلاً اور ولادۃً سعودی ہیں، ان کی ولادت ۱۳۸۶ھ میں سعودیہ کے شہر ریاض میں ہوئی، ابتدائی تعلیم ”معهد إمام الدعوة“ سے حاصل کی، پھر شریعہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۴۱۰ھ میں سندِ فراغت حاصل کی۔ پھر انہوں نے امریکہ سے ماسٹر کیا اور یمن کے دار الخلافہ ”صنعاء“ سے فقہ اور اصولِ فقہ میں ڈاکٹریٹ کیا۔

ان کے اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے، پانچ سو سے زائد اہلِ علم سے کسبِ فیض کیا۔ ۴۷ سے زائد کتب کے مصنف ہیں اور ماشاء اللہ اس وقت شہر ریاض میں سلسلہ تعلیم و تدریس بھی جاری ہے۔

قادرِ مطلق نے مؤلف کو بہترین ملکۂ استنباط عطا فرمایا ہے، جیسا کہ آپ کو کتابِ ھٰذا کے مطالعہ کے وقت معلوم ہوگا، اور ہم نے اُن کے استنباط ہی کی وجہ سے اس کتاب کے ترجمہ میں دل چسپی لی ہے۔ اَللّٰهُمَّ زِدْ فَزِدْ.

کتابِ ھٰذا میں مؤلف کی سند

مؤلف نے کتابِ ھٰذا میں ہر حدیث سندِ مسلسل سے ذکر کی ہے، ان کی سند میں حجازِ مقدس، ریاض اور یمن کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے مشائخ کے نام بھی آتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور پاکستان سے شیخ ثناء اللہ بن عیسیٰ خان لاہوری۔

مؤلف کے شیوخ میں نجدی علماء کی کثیر تعداد ہے اور متعدد احادیث کی سند میں شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی کا نام بھی آتا ہے۔ علاوہ ازیں سندِ حدیث میں یمن کے کافی مشائخ کا نام ملتا ہے، جن میں سے بعض اہدل اور بعض غماری حضرات بھی ہیں۔ شاید اہل بیت کرام ﷺ کی شان میں ایسی عمدہ کتاب یمن کے ایسے ہی مشائخ کی صحبتِ بابرکت کا نتیجہ ہو۔ واللہ أعلم۔

کتابِ ھٰذا میں میرا کام

اس سلسلے میں چند امور غور طلب ہیں:

۱۔ مؤلف حفظہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قدیم اسلوب کے مطابق ہے، چنانچہ اِس کے متن میں کسی بھی بات پر آج کل کے انداز کے مطابق کوئی حوالہ نظر نہیں آتا۔ اکثر مقامات پر فقط مصنف اور اُس کی کتاب کا نام ذکر کر دیا گیا، مثلاً: **قال الشوکاني: في النیل**'' (شوکانی نے نیل الأوطار میں کہا) جبکہ نیل الأوطار کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ بعض مقامات پر تو فقط اتنا لکھا: ''**قال شیخ الإسلام ابن تیمیة**'' (شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا) حالانکہ علامہ ابن تیمیہ کی سینکڑوں کتابیں ہیں، بہر حال بتوفیقِ الٰہی ہم نے ایسی تمام مشکلات کو عبور کیا ہے اور مؤلف کی ہر ہر بات پر مکمل حوالہ پیش کیا ہے۔

۲۔ مؤلف نے اپنی ذات سے لے کر نبی کریم ﷺ تک **مسلسل** سند ذکر کی ہے، لیکن ہم نے ترجمہ میں طویل سند کو حذف کر کے فقط پہلے راوی کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ مؤلف کی نقل کردہ ہر بات پر متن کے ترجمہ میں پہلے عربی ہندسوں میں نمبر لگایا گیا پھر فٹ نوٹ کے تحت ویسا ہی نمبر لگا کر مکمل حوالہ پیش کیا گیا۔

۴۔ جہاں مؤلف کے کلام میں معمولی سی توضیح کی ضرورت پیش آئی تو پہلے متن میں عربی ہندسہ لگایا پھر فٹ نوٹ کے طور پر نیچے اُسی طرح کا نمبر دے کر حاشیہ میں وضاحت کی۔

۵۔ بعض مقامات پر جہاں ہم نے مؤلف کی رائے سے اتفاق نہیں کیا، یا مؤلف کی کسی عمدہ بات پر اپنے دیار اور گرد و پیش کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلسل کئی صفحات لکھنا پڑے تو وہاں ہم نے اپنی عبارت میں جو کوئی حوالہ دیا ہے، اُس پر انگریزی میں نمبر لگایا ہے اور نیچے اُسی خط میں نمبر لگا کر حوالہ قلم بند کیا ہے۔

۶۔ جہاں ہماری شرح کئی صفحات پر پھیل گئی تو وہاں ہم نے صفحے کی پہلی لائن پر اس طرح.... نقطے لگا دیے اور اُس کے نیچے ایک لکیر کھینچ دی ہے تاکہ قاری کو معلوم ہو سکے کہ یہاں فقط حاشیہ ہی چل رہا ہے۔ پھر وہ حاشیہ اگر اُسی صفحہ پر مکمل نہیں ہوا بلکہ آئندہ صفحہ پر چلا گیا تو صفحہ کی آخری لائن کے آخری لفظ کے آگے یہ علامت = لگائی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ابھی حاشیہ جاری ہے۔

۷۔ مؤلف نے جن کتب کی مدد سے متن تیار کیا ہے اور ہم نے جن کتب سے شرح میں مدد لی ہے، کتاب کے آخر میں اُن تمام کتب کی فہرست ''مآخذ ومراجع'' کے عنوان سے پیش کی گئی ہے۔

سببِ تالیف

۸۔ ہم نے اپنی کتاب ''مناقب الزهراء'' اور ''شرح أسنى المطالب'' میں بعض مقامات پر کتابِ ھٰذا کے حوالے سے کچھ مفید باتیں لکھی تھیں، جس پر بعض علماء کرام کے دل میں اس کتاب کی جستجو پیدا ہوئی تو اُنہوں نے اِسے دبئی، کویت اور مکہ ومدینہ زادھما اللّٰه تعظیماً وتشریفاً میں تلاش کرایا، مگر کتاب نہ ملی، اس لیے اُنہوں نے خواہش ظاہر فرمائی کہ کیوں نہ اس کتاب کا ترجمہ کیا جائے پھر اِس کے عربی متن کو بعینہٖ اس کے آخر میں لگا دیا جائے۔ چونکہ اُن کی بات میں وزن تھا اس لیے اللہ جل جلالہ نے مجھ بے بس کے ہاتھوں اُن کی یہ خواہش پوری فرمادی مگر افسوس کہ جن صاحب کی یہ خواہش تھی وہ کتاب کی اشاعت سے قبل ہی اِس دارِ فانی کو خیر باد کہہ گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. موصوف مجھ پر بہت مہربان تھے، چنانچہ اُن کی عظیم الشان لائبریری میں ایک نایاب قلمی کتاب تھی، جس کے حصول کے لیے کچھ علماء نے کافی کوشش کی مگر اُنہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

جب قادر وقیوم جل جلالہ نے مجھ نکمے کے ہاتھوں ''شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ'' لکھوالی تو بعض علماء کرام نے مجھے فرمایا: آپ کا کام اُنہیں بہت پسند ہے، لہٰذا آپ اُن سے سوال کریں تو وہ آپ کو منع نہیں کریں گے۔ میں نے اُن کی زیارت تک نہیں کی تھی اور نہ ہی اُنہوں نے مجھے دیکھا تھا، فون پر ہی بات چیت ہوتی تھی، بہر کیف چونکہ کتاب میری بھی کمزوری ہے اس لیے میں نے فون پر ہی اُن سے سوال کر ڈالا تو اُنہوں نے فرمایا: اگر آپ خود آئیں گے تو کتاب مل جائے گی۔ میں پہلی فرصت میں اُن کے پاس (گوجرہ کے قریب چک نمبر ۳۰۴ ج، ب کٹھوڑ میں) حاضر ہوا، اُنہوں نے پرخلوص میزبانی فرمائی، علمی تبادلۂ خیال ہوا اور آخر میں کتاب کی کاپی بھی عنایت ہوئی۔ دعا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اُن (علامہ حافظ سید سجاد حیدر رحمۃ اللہ علیہ) کی مغفرت فرمائے، اُن کے درجات بلند فرمائے اور اُن کی خواہش اور احسن ارادے کو اُن کے لیے صدقۂ جاریہ فرمائے۔ آمین۔

اعترافِ تقصیر

میں اپنی سابقہ کتب کی طرح کتابِ ھذا میں بھی پہلے تو اعترافِ عجز وخطا کرتا ہوں اور قلم وطباعت کی چھوٹی موٹی اغلاط کی نشان دہی کی التجا کرتا ہوں، پھر درخواست کرتا ہوں کہ اگر اہل علم حضرات کو میرے کسی موقف سے اختلاف ہو تو با حوالہ دلائل کے ساتھ مجھے آگاہ فرمائیں۔ اگر میرے کسی موقف کا باطل ہونا مجھ پر واضح ہو گیا تو میں بلا تاخیر تحریری رجوع کروں گا۔ إن شَاء اللّٰه تعالیٰ.

خیال رہے کہ میں مناظرہ سے گھبراتا ہوں، کیونکہ میں غوغا اور شور مچانے سے قاصر ہوں، اسی لیے بار بار تحریری آگاہی کی درخواست کرتا رہتا ہوں، لیکن افسوس کہ بعض لوگ اِس سیدھے راستے کے بجائے اُلٹا راستہ چلتے ہیں، حالانکہ وہ اپنے گمان میں لوگوں کو سیدھے راستے پر لگانے میں کوشاں ہیں۔ اُن کی اُلٹی چال کی واضح مثال یہ ہے کہ جہاں کہیں مجھ عاجز کا خطاب رکھا جائے اور بدقسمتی سے اُس کے اشتہار بھی شائع کیے جائیں تو درجن کے قریب مولوی لوگ جلسے کی انتظامیہ کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ گستاخ ہے، اس کی تقریر مت کراؤ۔ یہی صورتِ حال اُس مسجد کی ہے جہاں یہ فقیر جمعہ کی خطابت کرتا ہے، وہاں بھی بعض ایسے مولوی پہنچ گئے جو باقاعدہ درسِ نظامی کے مدرس بھی ہیں، اور کہنے لگے: ''یہ شخص گستاخ ہے، اسے یہاں مت رکھو''۔ چونکہ ''شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ'' کی اشاعتِ اول کے فوراً بعد ایسے ہی باطل ہتھکنڈوں کی وجہ سے مجھے کئی مساجد سے فارغ کروایا گیا تھا۔ اس لیے میں نے کوٹلی پیر عبد الرحمان (لاہور) کی مرکزی مسجد کی انتظامیہ سے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اگر آپ حضرات کے پاس کوئی معترض میری کتاب کے حوالہ سے اعتراض لائے تو اُس کا اعتراض مکمل سننا اور پھر اُسے کہنا کہ چونکہ یہ تحریری معاملہ ہے، لہٰذا آپ اپنا اعتراض تحریری طور پر لائیں، لیکن تا حال تین سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے مگر کسی جلسہ کی انتظامیہ، مسجد کی انتظامیہ یا میرے پاس کوئی شخص بھی تحریری اعتراض نہیں لایا۔

وَاللّٰهُ يَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ.

مُقدِّمَة

امتِ مسلمہ کا عزّ و شرف

اللہ رب العزت ہی تمام تعریف کے لائق ہے جس نے امتِ محمدیہ کو اہلِ بیت اطہار سے مشرف کیا اور اولین و آخرین کے سردار اپنے برگزیدہ پیغمبر ﷺ کو اُنہیں میں سے بھیج کر اِس اُمت کے شرف میں مزید اضافہ کیا۔ ہم اُس کی اُس طرح حمد کرتے ہیں جس طرح اُس کے طاعت گزار بندے کرتے ہیں اور اُس کے سامنے سرنگوں ہونے والوں کی طرح سرنگوں ہوتے ہیں۔

(وہ ایسا اول ہے کہ) اس کے وجود کی ابتدا نہیں اور ایسا کریم ہے کہ اس کی عطا اور جود کی انتہا نہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ درود و سلام نازل فرمائے اُس (رسول ﷺ) پر جو اُس کی مخلوق میں سے منتخب ہیں اور اُن پر جو آپ کے اصحابِ اخیار ہیں اور آپ کی آل (علیہم السلام) پر۔

زندہ و مردہ کے مابین حدِّ فاصل

بعد از حمد و صلاۃ یہ حقیقت ہے کہ اہل بیت کی محبت زندہ و مردہ کے مابین حدِّ فاصل، نیک طینت ہونے کی دلیل اور خلوصِ نیت کی علامت ہے۔

اہل بیت کے بارے میں اسلاف کا طرزِ عمل

اہل اسلام اور سلف صالحین ہمیشہ اُن کی تعظیم کرتے آئے ہیں، اُن کے بارے میں ایک دوسرے کو اور اپنے اہل و عیال کو تلقین کرتے رہے ہیں، اپنے اقوال و افعال میں اُن کے بارے میں ایک دوسرے کو ترغیب دیتے رہے ہیں اور سفر و حضر میں ان کے فضائل پر مذاکرات اور تبادلۂ خیال کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ صحیحین میں بیعت کے متعلق حدیث میں ہے:

''سیدنا علی علیہ السلام نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کا (اس میں) حصہ سمجھتے تھے، اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آنسو چھلک پڑے۔ پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گفتگو کی تو فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، مجھے رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کی صلہ رحمی اپنے قرابت داروں سے زیادہ محبوب ہے''۔(۱)

نیز صحیح بخاری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

''سیدنا محمد ﷺ کا آپ کے اہل بیت کے بارے میں خیال رکھو''۔(۲)

کتبِ سیرت اور دوسری کتابوں میں صحیح سند کے ساتھ مذکور ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو عرض کیا: جس دن آپ اسلام لائے بخدا مجھے آپ کا اسلام لانا (اپنے باپ) خطّاب کے اسلام لانے سے زیادہ محبوب تھا، اگر وہ اسلام لاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کا اسلام لانا رسول اللہ ﷺ کو (میرے باپ) خطّاب کے اسلام لانے سے زیادہ محبوب تھا''۔(۳)

(کتب سیر و تاریخ میں ہے:)

''امیر المؤمنین حضرات عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما جب سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے پاس سے سواری پر گزرتے تو سواری سے اتر پڑتے، یہاں تک کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی نظروں سے

---

(۱) بخاري: كتاب المغازي، باب٣٨ حديث ٤٢٤١؛ مسلم كتاب الجهاد والسير، باب قول النبي ﷺ لا نورث ما تركنا فهو صدقة، حديث ١٧٥٩۔

(۲) بخاري: كتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب قرابة رسول الله ﷺ، ومنقبة فاطمة عليها السلام، حديث ٣٧١٣، وباب مناقب الحسن والحسين رضي الله عنهما حديث ٣٧٥١۔

(۳) الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: ج٤ ص١٦، وط: ج٤ ص ٣٣٠ وط: ج٤ ص٢١؛ استجلاب ارتقاء الغرف ج٢ ص٥٦٤۔

اوجھل ہوکر سوار ہوتے اور وہ یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے چچا کی تعظیم میں کرتے تھے''۔(١)

صحیح بخاری میں ہے:

''عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بنوزہرہ کے کچھ لوگوں کے ساتھ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حاضر ہوئے تو وہ ان حضرات کے ساتھ نہایت ہی لطف ومہربانی سے پیش آئیں، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے رشتے دار تھے''۔(٢)

ابن سعد نے طبقات میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

''سیدہ فاطمہ بنت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو بکثرت اُن کے حق میں دعائے رحمت کی اور ارشاد فرمایا: جب وہ امیر مدینہ تھے تو میں ان کے پاس گئی تھی، انہوں نے تمام خواص اور پہرے داروں کو نکال دیا، یہاں تک کے گھر میں میرے اور ان کے سوا کوئی نہ رہا، پھر انہوں نے کہا: اے بنتِ علی! بخدا روئے زمین پر کسی گھر کے مکین مجھے تم سے زیادہ محبوب نہیں اور تم لوگ تو مجھے میرے اہل وعیال سے بھی زیادہ محبوب ہو۔(٣)

اس سلسلے میں اس قدر واقعات ہیں کہ اُن کا شمار کرنا مشکل اور احاطہ کرنا دشوار ہے۔

حُبِّ اہل بیت فلاح دارین

اہلِ بیت کے بارے میں اللہ عزوجل کی سنتِ جاریہ ہے کہ جو شخص صدقِ دل سے اہل بیت سے محبت کرتا ہے، اللہ عزوجل اس کی مدد فرماتا ہے اور جو شخص خلوص سے اہل بیت کی عزت کرتا ہے اللہ عزوجل اسے رفعت

---

(١) تاريخ دمشق ج٢٦ ص٣٥٤؛ جواهر العقدين للسمهودي ص٣٨٤۔

(٢) بخاري: كتاب المناقب، باب مناقب قريش، حديث٣٥٠٣۔

(٣) الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ج٧ ص٣٢٧، وط: ج٥ ص٢٥٧ وط: ج٥ ص١٦٢؛ الصواعق المحرقة ص٢٣٨، وط: ص٤٩٩، ٦٤٢؛ جواهر العقدين ص٣٨٩۔

عطا فرماتا ہے۔

بُغضِ اہلِ بیت، عذابِ دارین

جو بدنصیب اہل بیت کی اہانت کے درپے ہوتا ہے، اللہ ﷻ اس کو ذلت و پستی میں دھکیل دیتا ہے۔ چنانچہ مختلف سندوں سے ابن ابی الدنیا اور دیگر محدثین سے ہمیں روایت پہنچی ہے:

''ایک شخص نے امیر المؤمنین سیدنا علی علیہ السلام کو برا کہنا شروع کیا تو سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اسے روکا، جب وہ باز نہ آیا تو انہوں نے اُسے بددعا دی، پس وہ ابھی اسی حال میں تھا کہ اچانک ایک بِد کے ہوئے اونٹ نے آکر اس کو کچل دیا اور وہ مر گیا''۔(۱)

مصنفینِ سلف کا طرزِ عمل

ائمہ اسلام اور نیکی میں ان کی اتباع کرنے والوں نے جب بھی عقائد، حدیث یا تاریخ کی کوئی کتاب لکھی تو اس میں اہل بیت کے فضائل ضرور بیان کیے، اور انہوں نے اس بات کو ایسا عقیدہ اور روشن راستہ بنایا جس پر چل کر وہ اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جا ملتے ہیں۔

حُبِّ اہلِ بیت میں صادق کون؟

اہل بیت کی محبت میں سچا وہ ہے جو اُن کی راہ کو اپنائے، جو کتاب مبین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے، سید المرسلین ﷺ اور آپ کے اصحاب کرام کی اتباع کرتے ہوئے اُن کی راہ کو اپنائے، یہی دراصل حقیقی منہاج نبوت ہے۔ اصل محبّ صادق وہ ہے جو عبادت و انابت، کثرت اذکار، نیکوکاری، رحمت، احسان اور

(۱) کتاب مجابی الدعوة[موسوعة ابن أبی الدنیا] ج۲ ص۱۶۳؛ تاریخ دمشق ج۲۰ ص۳۴۶؛ سیر أعلام النبلاء ج۱ ص۱۱۵،۱۱۶؛ محض الخلاص في مناقب سعد بن أبي وقاص، ص۱۵۲، ۱۵۳؛ المعجم الکبیر ج۱ ص۱۴۰ حدیث۳۰۷؛ مجمع الزوائد ج۹ ص۱۵۴ حدیث۱۴۸۵۵، وط: ج۱۹ ص۳۷۵ حدیث۱۴۸۵۲؛ دلائل النبوة للبیهقي ج۶ ص۱۹۰؛ الخصائص الکبری ج۲ ص۲۸۲ ؛ جامع کرامات الأولیاء ج۱ ص۱۱۳؛ حجة الله علی العالمین ص۶۱۶؛ جمال الأولیاء ص۱۴۔

ایثار میں اپنے سلف صالحین کے طریقہ پر ہو۔

غلو سے اجتناب کا حکم

ہر چند کہ اہل بیت کے فضائل حدِ تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود علماء اسلام انہیں لیتے ہوئے اعتدال کو مدنظر رکھنے اور اُن کے بارے میں غلو سے باز رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ اس لیے کہ فضائل کی کثرت جاہل کے لیے غلو اور راہِ اعتدال سے ہٹ جانے کا اور راست رو کے لیے راہِ اعتدال پر قائم رہنے کا مقام ہوا کرتی ہے۔ اہل بیت کے امام اور اُن کے سردار ﷺ نے ہی سب سے پہلے ایسی مبالغہ آرائی سے منع فرمایا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

''میری تعریف میں حد سے تجاوز نہ کرنا، جیسا کہ عیسائیوں نے ابن مریم علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔ میں تو اس کا عبد ہوں، لہٰذا تم (مجھے) اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہا کرو''۔(۱)

ابن سعد نے طبقات میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

''سیدنا حسن بن حسن بن علی رضی اللہ عنہم نے ایک ایسے شخص سے جو اہل بیت کے بارے میں غلو کیا کرتا تھا، کہا: تمہارا بھلا ہو! ہم سے اللہ کے لیے محبت کرو، سو اگر ہم اللہ عزوجل کی اطاعت کریں تو تم ہم سے محبت کرو، اور اگر ہم اس کی نافرمانی کریں تو تم ہم سے راستے جدا کرلو۔ اس شخص نے جواباً کہا: تم رسول اللہ ﷺ کے اقرباء اور گھر والے ہو (ہم تمہیں کیسے چھوڑ سکتے ہیں)؟ انہوں نے فرمایا: تمہارا بھلا ہو اگر اللہ تعالیٰ اپنی طاعت کیے بغیر محض قرابتِ رسول کی بنا پر اپنے عذاب سے بچاتا تو یہ بات اُن کے لیے زیادہ نفع بخش ہو سکتی تھی جو ماں باپ کے لحاظ سے ہم سے زیادہ آپ کے قریبی ہیں۔ بخدا مجھے تو اس بات کا ڈر ہے کہ ہم میں سے جو گنہگار ہیں انہیں دوگنا عذاب دیا جائے اور ہم میں سے جو نیکوکار ہوں انہیں دوگنا اجر دیا جائے، تمہارا بھلا ہو: اللہ سے ڈرو اور ہمارے بارے میں صرف وہی کہو جو حق ہے، اس طرح تم وہ مقام حاصل کر سکتے ہو جس کی تمہیں طلب ہے اور ہمیں

---

(۱) بخاري: كتاب أحايث الأنبياء، باب: وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ، حديث ٣٤٤٥۔

بھی تمہاری بات پسند ہوگی۔ پھر فرمایا: جو تم کہتے ہو اگر اُسے دین کا تقاضا مان لیا جائے تب تو ہمارے آباء نے ہمارے ساتھ برا کیا، انہوں نے ہمیں کیوں نہ بتایا اور ترغیب کیوں نہ دی"۔(۱)

ایسے ہی اُسی میں صحیح سند کے ساتھ مذکور ہے:

"سیدنا علی بن حسین ﷺ نے فرمایا: اے لوگو ہم سے اسلامی محبت کرو، ہم سے تمہاری محبت ایسی رہی کہ بالآخر وہ ہمارے لیے باعث عار بن گئی ہے"۔(۲)

اندراجِ حدیث میں مؤلف کا طریقہ

لیجئے! یہ اربعین بسند مسلسل ہے، اس میں زیادہ تر احادیث قراءت وسماع کے ساتھ ہیں۔ میں نے اس میں وہ احادیث جمع کی ہیں جو (مشائخ سے) سنی ہیں اور میں ان کے اندراج میں مشائخ کی قدر ومنزلت پر انحصار کرتے ہوئے عالی اسناد کا متلاشی نہیں ہوا، اور میں نے صحیحین کی جلالت کے پیشِ نظر اربعین کا بڑا حصہ اُنہیں میں سے منتخب کیا ہے، اگرچہ اربابِ فن اس پابندی کے عادی نہیں ہوتے بلکہ سند عالی کی طلب میں وہ اپنی سند کو چھوڑ دیتے ہیں۔

احادیث سے مصنف کا طرزِ استنباط

پھر میں نے اس کتاب میں استنباط شدہ فوائد اور عمدہ لطائف شامل کیے ہیں، اُن فوائد کو اہل بیت کے ساتھ مخصوص رکھا ہے، اگرچہ ان فوائد میں اُن کے ساتھ دوسری برگزیدہ ہستیاں بھی شریک ہیں۔ شریعت کا خطاب سب کو شامل ہے، اگرچہ سببِ شانِ نزول اہل بیت ہی ہیں، البتہ وہ اس میں شمولیت کا اول مقام رکھتے ہیں، کیونکہ وہ اس کا سببِ نزول ہیں اور اس پر عمل کے لحاظ سے بھی وہی مخلوق میں مقدم ہیں، کیونکہ مرتبہ کے لحاظ سے بھی وہی اعلیٰ ہیں۔

---

(۱) الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ج۷ ص ٣١٤۔

(۲) الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ج۷ ص ٢١٢۔

اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو، اور وہ پچھلوں کو بھی اسی طرح فائدہ عطا فرمائے جیسا کہ اُس نے پہلے لوگوں کو عطا فرمایا۔

اللہ تعالیٰ اس "أربعین" کو لکھنے والے اور پڑھنے والوں کے لیے قربت کا ذریعہ بنائے، روزِ محشر اُن کے زمرہ میں شامل فرما کر انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رضی اللہ عنہم کا ساتھ نصیب فرمائے۔ آمین! آمین!

آیئے اب مقصد کلام کا آغاز کرتے ہیں۔

پہلی حدیث

حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کا انتخاب کیا، کنانہ سے قریش کو چنا، قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھے برگزیدہ فرمایا۔

ہمیں یہ حدیث اسی طرح سماعاً صحیح مسلم میں ملی، جس شخص نے اس کو بخاری کی طرف منسوب کیا اُسے وہم ہوا۔(١)

پہلی حدیث سے مأخوذ مسائل

اس حدیث میں کئی مسائل ہیں:

١۔ اس میں دلیل ہے کہ اولادِ اسماعیل علیہ السلام کو تمام جہانوں پر فضیلت حاصل ہے، اس کی صراحت بہت سی احادیث میں آئی ہے۔

٢۔ ایسے ہی بنو کنانہ کی فضیلت

٣۔ ایسے ہی قریش کی فضیلت

٤۔ ایسے ہی بنو ہاشم کی فضیلت

---

(١) مسلم: كتاب الفضائل، باب فضل نسب النبي ﷺ، حديث ٢٢٧٦۔

۵۔ حضور اکرم ﷺ کی تمام تر مخلوق پر برتری

۶۔ بلاشبہ کسی چیز کا انتخاب رب تبارک وتعالیٰ کے فعل اور اُس کی مشیت سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اُس سبحانہ وتعالیٰ کے افعال پر انگلی اٹھائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَايَشَآءُ وَيَخْتَارُمَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَتَعَالىٰ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ.

''اور آپ کا رب پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے اور منتخب کرتا ہے (جسے چاہتا ہے) نہیں ہے اُنہیں کچھ اختیار، اللہ تعالیٰ پاک و برتر ہے اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں''۔(۱)

۷۔ اس میں دلیل ہے کہ اللہ ﷻ نے اپنے رسول ﷺ کو فضیلت دی ہے، اُن کے اہل بیت کو فضیلت دی ہے، اور اِس فضیلت کو اُس ﷻ نے شریعت اور دین بنایا ہے، شریعت کا پابند شخص اسی کے ساتھ اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے ملاقات کرے گا۔

۸۔ تقاضائے انتخاب منتخب (پسند فرمودہ) کی محبت کو واجب کرتا ہے، اس لیے کہ انتخاب رب ﷻ کا عمل اور اُس کی محبت (کی دلیل) ہے اور یہ بہت ہی عظیم شرف ہے۔

۹۔ اہل سنت و جماعت اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ نسبی اعتبار سے مکمل شرف اس انسان کو حاصل ہے جو قبیلہ بنو ہاشم سے ہو۔ اس بنا پر اُنہیں تمام قریش پر مزید محبت اور مرتبہ حاصل ہے، اور (بنو ہاشم کے بعد) قریش کو وہ مقام حاصل ہے جو عرب کے دوسرے قبائل کو حاصل نہیں۔

۱۰۔ اللہ ﷻ نے اس شریعت کی خاطر جو قریش کی وساطت سے آئی، قریش کے لیے زمانۂ جاہلیت میں عرب کی محبت کو تمہید بنایا، عرب اُن کی تعظیم کرتے تھے اور خیر و نیکی کے کاموں میں، کثرتِ فضائل اور حرم کی دیکھ بھال میں انہیں سبقت رکھنے والا قبیلہ مانتے تھے۔ پھر جب اسلام آیا اور نبی کریم ﷺ نے اُنہیں (قریش کی اس فضیلت) سے آگاہ فرمایا تو کسی نے بھی اس شرف و برتری اور سبقت میں مقابلہ نہ کیا۔

۱۱۔ اس میں سید عالم ﷺ کے نسب شریف کے پاکیزہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ آپ نکاح

---

(۱) القصص:۶۸۔

سے آئے سفاح (نکاح علاوہ کسی دوسرے طریقہ) سے نہیں آئے۔

۱۲۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بنیاد پاکیزہ ہو تو ظاہر و باطن میں اس کی تاثیر ہوتی ہے۔

۱۳۔ اس حدیث میں آپ کے ارشاد "وَاصْطَفَانِي" میں اللہ تعالیٰ کی اپنے رسول ﷺ سے عظیم محبت کی دلیل ہے اور یہ ایسا افتخار ہے جس سے بڑھ کر فخر کا کوئی تصور نہیں۔

۱۴۔ اس میں عرب کی تمام دیگر اقوام پر فضیلت کی دلیل ہے۔

دوسری حدیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میں تمام اولادِ آدم علیہ السلام کا سردار ہوں گا، میں اول وہ شخص ہوں گا جس کی قبر شق ہوگی، میں اول سفارش کرنے والا ہوں اور وہ اول ہی ہوں جس کی سفارش قبول ہوگی۔(۱)

دوسری حدیث سے مأخوذ مسائل

اس حدیث میں متعدد مسائل ہیں:

۱۔ نبی کریم ﷺ کی تمام جہانوں پر فضیلت۔

۲۔ آپ کے ارشاد "أَوّل شَافِع" میں دلیل ہے کہ آپ کے اہل بیت تمام لوگوں سے زیادہ آپ کی شفاعت کے حق دار ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے "طبرانی اوسط" میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

> "میں اولادِ آدم علیہ السلام کا سردار ہوں...... اُن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ میری رشتہ داری نفع نہیں دے گی؟ یہ بے بنیاد خیال ہے، یقیناً میں شفاعت کروں گا اور میری شفاعت قبول ہوگی، یہاں تک کہ میں جن کی شفاعت کروں گا تو وہ بھی شفاعت کریں گے اور اُن کی شفاعت بھی قبول ہوگی، یہاں تک کہ ابلیس بھی شفاعت کی

---

(۱) مسلم: كتاب الفضائل، باب تفضيل نبينا ﷺ على جميع الخلائق، حديث ۲۲۷۸۔

تمنا کرنے لگے گا''۔(۱)

اس کی تائید آگے حدیث نمبر۳۰ ''كُلُّ سَبَبٍ وَّنَسَبٍ'' سے بھی ہوتی ہے۔

۳۔ اس حدیث میں دنیامیں شفاعت (اچھے کام کی سفارش) کے پسندیدہ ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے، پس آخرت میں کسی کے حق میں شفاعت سب سے بڑی بھلائی ہوگی اور جو آخرت میں بھلائی کے اہل ہوں گے وہی دنیامیں بھی اہل ہیں، اور اہل بیت اپنے سردار ﷺ کی اقتدامیں تمام لوگوں سے بڑھ کر اس شفاعت کے حق دار ہیں۔

٤۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ جب حق بات پر فخر کیا جائے اور اس سے عصبیت یا نفرت وعداوت پیدا نہ ہو تو جائز ہے۔ایک اور روایت میں اس کی تصریح آئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وَلَافَخْرَ''. (اور کوئی فخر نہیں)(۲)

٥۔ اس میں کسی شخص کے ''أَنَا'' (میں) کہنے کا بھی جواز ہے۔

٦۔ اس میں ''یوم القیامة'' کا لفظ لانے میں یہ فائدہ ہے کہ یہ سیادت آخرت میں تمام مخلوق کو شامل ہوگی، کیونکہ وہ جمع ہونے کا سب سے بڑا دن ہے اور دوسرے یہ کہ یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ سیادت دنیوی اعتبار سے فقط آپ کے اہل زمانہ پر ہے (بلکہ تمام اگلوں پچھلوں پر ہے)۔

۷۔ اس میں سید عالم ﷺ اور آپ کی دعوت کی عظمت کا ثبوت ہے، اور یہ کہ آپس کے معاملات آپ کے علاوہ کسی اور کی طرف نہ لے جائے جائیں، کیونکہ تمام مخلوق پر سیادت کا یہی تقاضا ہے۔

فضیلتِ حقہ کے بیان سے منع کیوں؟

---

(۱) المعجم الأوسط ج٦ ص٣٨، ٣٩ حديث٥٠٧٨، وط: ج٥ ص٢٠٢، ٢٠٣ حديث ٥٠٨٢؛ مجمع البحرين ج٨ ص١٢٥، ١٢٦ حديث٤٨٢٦؛ مجمع الزوائد ج١٠ ص٣٧٥، ٣٧٦، وط: ج٢٢ ص١٧٣، ١٧٤ حديث ١٨٤٥٠۔

(۲) جامع الترمذي: أبواب تفسير القرآن، باب ومن سورة بني إسرائيل، حديث٣١٤٨، وأبواب المناقب عن رسول الله ﷺ، باب فضل النبي ﷺ، حديث٣٦١٥۔

۸۔ اس سے سیدِ عالم ﷺ کے لیے لفظ "السَّيِّـــد" بولنے کے جائز ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور وہ جو صحیح حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان ہے: "السَّيِّـدُ هُوَ اللّـه" (سید اللہ ہی ہے) وہ ان لوگوں کے لیے تھا جو تازہ تازہ عہد جاہلیت سے نکلے تھے، جب انہوں نے آپ ﷺ کی مدح میں مبالغہ کیا تھا تو آپ ﷺ نے اُنہیں ایسی بات سے منع کیا تھا جس میں کوئی حرج نہیں ہے، تاکہ وہ اُس بات سے محفوظ رہیں جس میں حرج ہے، اور اس لیے بھی منع کیا کہ لوگوں کو تنبیہ اور نصیحت ہو کہ مدح میں مبالغہ کے لائق اُس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے جس کا مرتبہ بلند اور اسماء مقدس ہیں، کیونکہ وہی ذات ایسی سید ہے جس سے بلند کوئی سید نہیں، وہ بلند و بابرکت ہے۔ (۱)

---

(۱) **جو فضیلت کسی کی تنقیص کا سبب بنے اُس سے اجتناب**

مؤلف نے یہ زبردست قاعدہ بیان کیا ہے، یہ قاعدہ اس حدیث کے علاوہ دوسری احادیث سے بھی ماخوذ ہے، جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہے:

لا ينبغي لعبد أن يقول: أنا خير من يونس بن مَتّٰى.

"کسی بندے کے لیے مناسب نہیں کہ وہ (میرے بارے میں) کہے کہ میں یونس بن متّیٰ علیہ السلام سے بہتر ہوں"۔ (1)

یا جیسا کہ دوسرے موقعہ پر ارشاد نبوی ﷺ ہے:

لا تخيروني علىٰ موسىٰ.

"مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو"۔ (2)

حالانکہ قرآن وسنت کے دلائل سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ پوری مخلوق سے افضل ہیں، لیکن مندرجہ بالا احادیث میں سیدنا یونس اور موسیٰ علیہما السلام کا نام لے کر اُن پر اپنی فضیلت سے اس لیے منع فرمایا کہ بعض =

---

(1) بخاري: كتاب أحاديث الأنبياء، باب: وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ مُوسىٰ، حديث ۳۳۹۵؛ مسلم: كتاب الفضائل، باب في ذكر يونس، حديث: ۲۳۷۷۔

(2) بخاري: كتاب الخصومات، باب مايذكر في الإشخاص والملازمة، حديث ۲٤۱۱؛ مسلم: كتاب الفضائل، باب فضائل موسىٰ علیہ السلام حديث ۲۳۷۲۔

....

= لوگوں کے ذہنوں میں حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی وجہ سے اُن کے حق میں تنقیص پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وخص یونس بالذكر لما يخشىٰ علىٰ من سمع قصته أن يقع في تنقيص له، فبالغ في ذكر فضله لسد هذه الذريعة.

''اور خصوصاً حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر اس لیے کیا کہ آپ کو اُن لوگوں کے بارے میں اندیشہ تھا جنہوں نے یونس علیہ السلام کا واقعہ سن رکھا تھا کہ وہ اُن کی تنقیص میں نہ پڑ جائیں، سو آپ نے انسدادِ تنقیص کی خاطر اُن کی فضیلت میں مبالغہ فرمایا ہے''۔(1)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت کی ممانعت کی وجہ تو خود حدیث کے متن میں موجود ہے کہ ایک یہودی اور مسلم کے مابین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت میں تنازع ہوا تو مسلم نے یہودی کو طمانچہ جڑ دیا، اس پر آپ نے مذکورہ ممانعت صادر فرمائی۔

ایسی ہی حکمت کے پیشِ نظر اہل بیت خصوصاً اہل کساء [پنجتن پاک] علیہم السلام میں جس ہستی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد افضلیت حاصل ہے، انہوں نے اپنی افضلیت کے بیان سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

لا أجدُ أحداً فضّلني علىٰ أبي بكر وعمر إلا جلّدته حد المفتري.

''میں جسے پاؤں گا کہ مجھے ابوبکر و عمر سے افضل کہتا ہے اُسے الزام تراش کی حد لگاؤں گا''۔

ہمارے بعض لوگوں نے فرمانِ مرتضوی کے اتنے حصے کو اُچک لیا ہے اور اُنہوں نے کسی بھی پہلو سے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی افضلیت واحبیت کے قائل پر حد لگانے کا فتویٰ دے رکھا ہے، حالانکہ اس فرمانِ مرتضوی کی حکمت فقط یہ تھی کہ کوئی شخص شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی تنقیص وتوہین کا مرتکب نہ ہو۔ سو اگر اس ارشادِ مرتضوی کو اس کی شانِ ورود کے ساتھ پڑھا جائے تو اُس سے یہی حکمت واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ فقیہِ شام، شیخ الاسلام امام ابراہیم بن محمد المعروف بأبی اسحاق فزاری متوفّٰی ۱۸۶ھ لکھتے ہیں:

ثنا شعبة عن سلمة بن كهيل، عن أبي الزعراء، أوعن زيد بن وهب أن =

---

(1) فتح الباري ج۸ ص۲۳۔

= سويد بن غفلة الجعفي،دخل علىٰ علي بن أبي طالب رضي الله عنه في إمارته، فقال:يا أمير المؤمنين! إني مررت بنفر يذكرون أبا بكر وعمر بغير الذي هما له أهل من الإسلام ،لأنک يرون أنک تضمر لهما علىٰ مثل ذلک، وإنهم لم يجترء وا علىٰ ذلک إلاوهم يرون أن ذلک موافق لک، وذكر حديث خطبة علي وكلامه في أبي بكر وعمر رضي الله عنهم وقوله في آخره:"ألاولن يبلغني عن أحد يفضلني عليهما إلا جلدته حد المفتري".

"شعبہ نے ازسلمہ بن کہیل ،از ابوالزعراء،یا از زید بن وہب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ سوید بن غفلہ جعفی نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: یاامیر المؤمنین! میرا گزر کچھ ایسے افراد پر ہوا جو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا ذکر اُن کے اُس حق سے ہٹ کر کررہے تھے جس کے وہ اسلام میں مستحق ہیں، اس لیے کہ وہ گمان کرتے ہیں کہ آپ بھی اُن دونوں کے بارے میں یہی خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ جرأت فقط اس لیے کی ہے کہ اُن کا گمان ہے کہ اُن کی یہ جرأت آپ کے موافق ہے، اور اُس نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خطبہ کا ذکر کیا اور اُنہوں نے حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی جو شان بیان فرمائی اُس کا ذکر کیا اور آخر میں سیدنا علی کا یہ قول ذکر کیا: "خبر دار جس کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے شیخین پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر جھوٹے کی حد لگاؤں گا"۔(1)

غور فرمایئے! یہ ارشادِ مرتضوی کب اور کیوں صادر ہوا، اگر اہلِ علم "وإنهم لم يجترء وا علىٰ ذلک إلا وهم يرون أن ذلک موافق لک" کے الفاظ میں بنظرِ انصاف غور فرمائیں تو انہیں "لا أجدُ أحداً فضَّلني علىٰ أبي بكر وعمر إلا جلدته حد المفتري" کے ارشادِ مرتضوی کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اور وہ بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُن لوگوں کو ایسے قول "جس میں کوئی حرج نہیں تھا" سے فقط اس لیے سختی سے روکا تھا تاکہ وہ اُس بات سے محفوظ رہیں جس میں حرج ہے، اور وہ ہے =

(1) كتاب السير لأبي إسحاق الفزاري ص٣٢٧؛لسان الميزان ج٤ ص٢٤وط: ج٤ ص٥٨٥۔

۹۔ اس حدیث میں اس بات کی ترغیب کا پہلو نکلتا ہے کہ میت کو قبر میں اچھے طریقے اور پختہ انداز سے دفن کیا جائے، اس لیے کہ حضور ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا ہے: ''یَنْشَقُّ''

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ آپ کی روحِ طاہرہ کے خروج یعنی ۱۱ھ سے لے کر قیامت کے دن اٹھنے تک آپ ﷺ ''مَیِّت'' (مردہ) ہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ'' (آپ کی قبر مبارک شق ہوگی)۔(۱)

= شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی تنقیص کا خدشہ۔

(۱) مؤلف کی سنگین لغزش

اس میں کوئی شک نہیں کہ مؤلف کو احادیث سے فوائد کے استنباط میں عمدہ ملکہ حاصل ہے، لیکن ''گرتے ہیں شہسوار میدان میں'' کے مطابق مؤلف کو اس حدیث کے دسویں اور آخری فائدے کے استنباط میں سخت ٹھوکر لگی ہے۔ انہوں نے ''ینشق عنہ القبر'' سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ جو قبر میں ہوتا ہے وہ مردہ ہوتا ہے۔ اگر وہ فقط اتنا کہتے کہ ''ینشق عنه القبر'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ''حضور ﷺ روحِ طاہرہ کے خروج یعنی گیارہ ہجری سے لے کر قیامت کے دن اٹھنے تک قبر میں ہیں اور قبر سے ہی باہر تشریف لائیں گے تو یہ استدلال قدرے درست ہوتا، اور اِس سے اُن کے مخصوص نظریے کا اظہار بھی ہوجاتا، لیکن ''ینشق عنہ القبر'' سے اُن کا مذکورہ بالا استدلال کتاب وسنت کے اشارات کے تو کیا خود تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ یہاں ہم مصنف کے سامنے چند سوالات رکھتے ہیں جن سے نفسِ مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

1۔ مصنف یہ بتلانا پسند کریں گے کہ شہداء کرام بھی قبروں میں ہیں اور اُن کی قبریں شق بھی ہوں گی، تو کیا اُن کے استدلال کے مطابق اُنہیں ''میت'' کہا جاسکتا ہے، اور جو اُنہیں ''میت'' کہے اُس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

2۔ امام ابو یعلیٰ موصلی لکھتے ہیں:

حدثنا أبو الجهم الأرزق بن علي، حدثنا یحییٰ بن أبي بكر، حدثنا المستلم بن سعید، عن الحجاج، عن ثابت البناني، عن أنس بن مالك: قال رسول الله ﷺ: الأنبیاء أحیاء في قبورهم یصلون. =

....

= ''سندِ مذکور سے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں نماز پڑھتے ہیں''۔(1)

اس حدیث میں فقط یہ نہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں ہیں بلکہ یہ بھی ہے ''أَحْيَاءٌ'' (زندہ ہیں) اور یہ بھی ہے ''يُصَلُّوْنَ'' (نماز پڑھتے ہیں)۔ بتلایئے! اس نص کی موجودگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گیارہ ہجری سے لے کر قیامت کے روز قبر اقدس سے باہر جلوہ گر ہونے تک ''میت'' کہنا، کیا لفظِ ''أَحْيَاءٌ'' اور ''يُصَلُّوْنَ'' کے منافی نہیں؟

خیال رہے کہ حدیث ''الأنبياء أحياء ...'' کو امام بزار نے بھی ذکر کیا ہے۔(2)

لیکن اُن کی سند میں ایک راوی حسن بن قتیبہ پر اعتراض ہے۔ ہر چند کہ محققین نے اُس اعتراض کو دفع کیا ہے، لیکن ہمیں اُس کے دفاع کی ضرورت نہیں، کیونکہ جب ہمارے سامنے ''مسند أبي يعلى'' کی ایسی سند موجود ہے جو اکثر محدثین کے نزدیک صحیح ہے اور متشددین بھی اُسے حسن تسلیم کرنے پر مجبور ہیں تو ہم کسی کے اعتراض کو نقل کر کے اُس کی تردید میں وقت کیوں ضائع کریں؟ واضح رہے کہ امام بیہقی، امام سبکی، ابن کثیر، حافظ ابن حجر عسقلانی، امام سیوطی، امام سخاوی، امام سمہودی، امام مناوی، قاضی شوکانی، نواب صدیق حسن خان قنوجی، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا زکریا سہارن پوری، معاصرین میں ''مسند أبي يعلى'' کے محقق شیخ حسین سلیم اسد، مختصر فوائد =

---

(1) مسند أبي يعلىٰ ج٣ ص٢١٦ حديث٣٤١٢، وط: ج٦ ص١٤٧ حديث٣٤٢٥؛ المقصد العلي ج٣ ص١٣١ حديث١٢٣٩؛ السنن والأحكام للضياء المقدسي ج٣ ص١٩٩ حديث ٢٩٧٨؛ المطالب العالية ج٤ ص٢٦٩ حديث٣٤٥٢، وط: ج١٤ ص٢٢٦ حديث٣٤٤٦؛ الفصول في سيرة الرسول لابن كثير ص٢٩١، وط: ص٣٢٦؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٩ ص١٩٤ حديث٨٨٠٢؛ الروض البسام بترتيب وتخريج فوائد التمام ج٤ ص٢٤٦ حديث١٤٣٢؛ مجمع الزوائد ج٨ ص٢١١، وط: ج١٧ ص٥١ حديث١٣٨٣٣۔

(2) مسند البزار ج١٣ ص٦٢ حديث٦٣٩١؛ كشف الأستار ج٣ ص١٠٠ حديث٢٣٣٩؛ مختصر زوائد البزار ج٢ ص٢٧١ حديث١٨٥٢۔

....

= کے مرتب ومحقق شیخ ابوسلیمان جاسم اورناصرالدین البانی وغیرہ نے اس حدیث کوصحیح مانا ہے۔(1)

شیخ البانی کے نزدیک ''الأنبیاء أحیاء ''کی سند

یہاں ہم قارئین کے سامنے مختصراً شیخ ناصرالدین البانی کے رجوع کا ایک واقعہ پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس واقعہ سے جہاں اس حدیث کی صحت واضح ہوگی وہیں علامہ البانی کی دیانتداری بھی عیاں ہوگی۔شیخ البانی پہلے اس حدیث کوایک عرصہ تک ضعیف گمان کرتے رہے، پھراُن کے سامنے ''**مسند أبي یعلی**'' اور''**تاریخ أصبهان**'' کی سند آئی توانہوں نے اس حدیث کوصحیح تسلیم کرلیا۔وہ لکھتے ہیں:

قد کنت برهة من الدهر أریٰ أن هذا الحدیث ضعیف،لظني أنه مما تفرد به ابن قتیبة،کما قال البیهقي، ولم أکن قد وقفت علیه في (مسند أبي یعلیٰ) و (أخبار أصبهان) فلما وقفتُ علیٰ إسناده فیهما تبین لي أنه إسناد قوي،وأن التفرد المذکور غیر صحیح.

''میں ایک زمانہ تک اس حدیث کوضعیف سمجھتا رہا،اپنے اس خیال سے کہ اس کی روایت میں حسن بن قتیبہ متفرد(تنہا) ہے،جیسا کہ بیہقی نے کہا ہے،اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ حدیث''**مسند أبي یعلی**'' اور''**أخبار أصبهان**''میں بھی موجود ہے، پھر جب میں ان دونوں کتابوں میں اس حدیث کی سند سے واقف ہوا تو مجھ پر روشن ہوا کہ اس کی سند قوی ہے =

(1) حیات الأنبیاء للبیهقي ص۳؛شفاء السقام ص۳۹۲؛الجامع الصغیر ص۲۳۰ حدیث۳۰۸۹؛ شرح الصدور ص۱۸۷؛إنباء الأذکیاء في حیاةالأنبیاء للسیوطي،في:الحاوي للفتاوي ص٥٥٤؛ تحفة الذاکرین للشوکاني ص٥٢،٥٨؛نیل الأوطار ج٦ ص۳۱۲،وط: ج۹ ص٤٠٨،٤٠٩؛فیض الباري ج۲ ص۲۰۳،حدیث۱٤٧١؛القول البدیع ص۳۳٦؛وفاء الوفا ج٤ ص٤٦٦؛فیض القدیر ج٥ ص۲٥٥٦ حدیث۳۰۸۹؛فضائل درود ص٦٧؛سلسلة الأحادیث الضعیفة ج۱ ص۳٦٦ حدیث۲۰۲؛ سلسلة الأحادیث الصحیحة للألباني ج۲ ص۱۸۷ حدیث٦۲۱۔

....

= اور ابن قتیبہ کے تفرد کی بات صحیح نہیں ہے''۔

اس سے آگے شیخ البانی نے لکھا ہے:

''لٰہذا میں نے دوڑ کر اس روایت پر صحت کا حکم لگایا، تا کہ علمی امانت ادا ہو اور رب تعالیٰ کی رضا عطا ہو۔ میرے اس طریقہ سے بعض لوگوں کو طعن و تشنیع کا سامان تو ہاتھ آئے گا، لیکن مجھے رضائے الٰہی کے مقابلہ میں دوسری کسی بات کی پروانہیں''۔(1)

واضح رہے کہ شیخ البانی نے اپنی کتاب ''سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة'' میں بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الجامع الصغير'' میں اس حدیث پر ''ح'' یعنی حسن کی رمز استعمال فرمائی تھی، لیکن شیخ البانی نے ''صحيح الجامع الصغير'' میں اس کو صحیح کہا ہے۔(2)

شیخ البانی کا یہ جذبۂ حق قابل تحسین ہے۔ جزاه الله تعالىٰ أحسن الجزاء.

موت کا معنیٰ

حیات الانبیاء یا مطلقاً حیات فی القبور پر بکثرت احادیث موجود ہیں، لیکن ہم دوسری احادیث پیش کرنے کی بجائے مجھ ایسے غیر عالم قارئین کے لیے موت کا معنیٰ عرض کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اگر موت کا یہ معنیٰ سمجھ لیا گیا تو حیات کا معنیٰ ازخود سمجھ آجائے گا، پھر اُس معنیٰ کی روشنی میں دوسری وہ تمام احادیث بھی سمجھ آجائیں گی جن میں اہل قبور سے سلام وکلام اور تلقین وغیرہ کا ذکر ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ جو چیز جس مقصد کے لیے تخلیق کی گئی جب تک وہ اُس مقصد پر پورا اترتی رہے تو اُس کی اُس حالت کو حیات کہتے ہیں اور اُس کے برعکس حالت کو موت کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن وحدیث میں زمین کے اُن مقامات کو جن میں کچھ اُگانے کی صلاحیت دم توڑ جاتی ہے، مردہ کہا گیا ہے، اور جب بارش وغیرہ کی بدولت وہ صلاحیت لوٹ آتی ہے تو اُس حالت کو حیات کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں جابجا بارش کے ذکر کے =

---

(1) سلسلة الأحاديث الصحيحة ج۲ ص ۱۹۰ حديث ۶۲۱۔

(2) صحيح الجامع الصغير ص ۵۳۹ حديث ۲۷۹۰۔

= ساتھ ﴿فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (پھر زندہ کر دیا ہم نے زمین کو اُس کے مردہ ہونے کے بعد) جیسے الفاظ میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

سونے سے قبل اور بیدار ہونے کے بعد جو دعائیں پڑھی جاتی ہیں اُن میں حالتِ نیند کو موت اور حالتِ بیداری کو حیات کیوں کہا گیا؟ فقط اس لیے کہ نیند میں حس وحرکت کالعدم ہو جاتی ہے، اس لیے اس حالت کو موت کہا گیا اور چونکہ بعد از بیداری وہ حس وحرکت لوٹ آتی ہے، اس لیے اس حالت کو حیات کہا گیا۔ یہ حیاتِ حیوانی کی بات ہے، حیاتِ روحانی کا معاملہ بھی اسی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ کے الفاظ میں جو مقصدِ تخلیق بیان فرمایا ہے، اس پر جو لوگ پورے اترتے ہیں اُن کے بارے میں فرمایا: ﴿فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ (ہم انہیں اچھی زندگی عطا فرماتے ہیں) [النحل: ۹۷] اور جو لوگ مقصدِ تخلیق سے روگردانی کرتے ہیں اُن کے بارے میں فرمایا:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ.

''ان کے دل تو ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں اُن سے، اُن کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں اُن سے، اُن کے کان تو ہیں لیکن وہ سنتے نہیں اُن سے، وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں''۔ (الأعراف: ۱۷۹)

یہاں تک کہ ایک مقام پر فرمایا:

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى.

''آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے''۔ (النمل: ۸۰)

حیاتِ ابدی

آخر کفار جیتے جی مردہ کیوں قرار پائے؟ اس لیے کہ انہوں نے توحیدِ الٰہی کا انکار کیا، انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا، آیاتِ الٰہیہ سے روگردانی کی، جبکہ یہی مقصدِ تخلیق ہے اور اسی کی تعمیل وتکمیل میں ابدی زندگی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: =

= وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا.

''اور اسی طرح وحی فرمائی ہم نے آپ کی طرف روح کی اپنے حکم سے، نہیں جانتے تھے آپ (قیاس وتخمین سے) کیا ہے کتاب اور نہ ایمان، لیکن بنایا ہے ہم نے اِس قرآن کو نور، ہدایت دیتے ہیں ہم اس کے ذریعہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں''۔(الشوریٰ:۵۲)

قرآن کو روح اور نور کیوں فرمایا گیا؟ اس کی حکمت علامہ ابن قیم الجوزیہ حنبلی کے درجِ ذیل کلام میں بہت عمدہ طریقہ سے بیان کی گئی ہے۔ وہ اسی آیت اور روح ونور کے ذکر پر مشتمل دوسری متعدد آیات کو جمع کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فجعله روحًا لما يحصل به من حياة القلوب والأرواح، ونورًا لما يحصل به من الهدى والرشاد.

''پس اللہ تعالیٰ نے قرآن کو روح بنایا، کیونکہ اسی سے دلوں اور روحوں کو زندگی حاصل ہوتی ہے، اور نور بنایا کیونکہ اسی سے رشد وہدایت حاصل ہوتی ہے''۔(1)

علامہ ابن قیم ﴿أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ﴾[الأنعام:۱۲۲] (کیا وہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا) کے تحت لکھتے ہیں:

من كان ميت القلب، بعدم روح العلم والهدى والإيمان، فأحياه الرب تعالىٰ بروح أخرىٰ، غير الروح التي أحيا بها بدنه، وهي روح معرفته وتوحيده، ومحبته وعبادته وحده لاشريك له، إذ لا حياة للروح إلا بذلك، وإلا فهي في جملة الأموات.

''وہ شخص جو روحِ علم، ہدایت اور ایمان کے بغیر مردہ دل تھا، رب تعالیٰ نے اُسے ایک ایسی روح سے زندہ کیا جو اُس روح کے علاوہ ہے جس سے اُس نے اُس کے بدن کو زندہ کیا تھا، یہ روح اُس

(1) مدارج السالکین لابن القیم ج۳ ص۱۵۵۔

....

= وحدہ لاشریک لہ کی معرفت، اُس کی توحید، اُس کی محبت اور اُس کی عبادت کی روح ہے، یہ ہے تو روح زندہ ہے ورنہ مردہ ہے"۔(1)

مزید لکھتے ہیں:

سمّي وحیه روحاً،لما یحصل به من حیاة القُلوب والأرواح.

"وحی کو روح اس لیے کہا گیا کہ اسی کی بدولت دلوں اور روحوں کو حیات حاصل ہوتی ہے"۔(2)

مزید لکھتے ہیں:

فالوحي حیاة الروح،کما أن الروح حیاة البدن،ولهذا فمن فَقَدَ هذه الروح فَقَدْ فَقَدَ الحیاة النافعة فی الدنیا والآخرة.

"وحی اسی طرح روح کی حیات ہے جس طرح روح بدن کی حیات ہے، لہٰذا جس نے یہ روح کھودی تو یقیناً اُس نے دنیا اور آخرت کی حیاتِ نافعہ کھودی"۔(3)

ایک اور مقام پر انہوں نے فرمایا ہے کہ زندگیاں دو ہیں اور اُن دونوں کے لیے روحیں بھی الگ الگ دو ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

فمن أراد هدایته جعل له نورًا وجودیًا، یحیي به قلبه وروحه کما یحیي بدنه بالروح التي ینفخها فیه، فهما حیاتان حیاة البدن بالروح و حیاةالروح والقلب بالنور، ولهذا سمي سبحانه الوحي روحًا لتوقف الحیاة الحقیقیة علیه.

"اللہ ﷻ نے جس انسان کی ہدایت کا ارادہ کیا اس کے لیے نورِ وجودی پیدا کر دیا، اسی سے اس نے اس کے قلب اور رُوح کو زندہ کیا، جیسا کہ اُس نے اُس کے بدن کو اس روح سے زندہ کیا جو اُس میں پھونکی گئی۔پس زندگیاں دو ہیں: بدن کی زندگی روح سے ہے اور روح اور دل =

---

(1) مدارج السالکین ج۳ص۲۴۲۔

(2) مدارج السالکین ج۳ص۲۴۳۔

(3) مدارج السالکین ج۳ص۲۴۳۔

کی زندگی نور سے ہے۔اسی لیے اللہ ﷻ نے وحی کو روح فرمایا، کیونکہ حقیقی حیات اسی پر موقوف ہے"۔(1)

ذرا آگے لکھتے ہیں:

فمن لم یحیه بهذا الروح فهو میت.

"اللہ تعالیٰ نے جس کو اس روح سے زندہ نہیں کیا تو وہ مردہ ہے"۔(2)

اس حقیقت کو علامہ انور شاہ کشمیری نے جس خوب صورت انداز میں بیان فرمایا ہے وہ اُنہیں کا حصہ ہے، ہم اُن کی طویل عبارت کو نقل کرنے سے قاصر ہیں۔اہل علم حضرات کو چاہیئے کہ وہ اُن کی کتاب "فیض الباري ج ۲ ص ۲۰٤، کتاب الصلاۃ، باب رفع الصوت فی المسجد" کا مطالعہ فرمائیں۔

حیاتِ ابدی کا حصول کیسے؟

جب یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ قلب وروح کی دائمی زندگی کا دارومدار وحی، قرآنی روح اور نور پر ہے تو پھر یہ بھی جان لیجئے کہ یہ زندگی کیسے حاصل ہوتی ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ.

"اے ایمان والو حاضر ہوجاؤ اللہ اور رسول کے بلانے پر جب رسول تمہیں اس چیز کے لیے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے گی"۔(الأنفال: ۲٤)

ہر چند کہ آیت میں یہ بات واضح ہے کہ یہ زندگی فقط اطاعتِ مصطفیٰ ﷺ سے ملتی ہے، لیکن اختصار سے اس کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیے۔علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

"یہ آیت کئی فوائد پر مشتمل ہے: اوّل یہ کہ حیاتِ نافعہ فقط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے پر ملتی ہے، جو شخص یہ دعوت قبول نہ کرے اس کو یہ حیاتِ نافعہ حاصل نہیں ہوتی، اگرچہ وہ اُس حیات کا حامل ہوتا ہے جس میں ناکارہ ترین جانور بھی اُس کے برابر ہیں۔ =

(1) إعلام الموقعین ج۱ ص۱۵۵ وط: ج۲ ص۲۸۰۔

(2) إعلام الموقعین ج۱ ص۱۵۵ وط: ج۲ ص۲۸۰۔

....

= یقیناً حقیقی اور پاکیزہ زندگی اس انسان کی ہے جس نے دل وجان سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی دعوت کو قبول کیا۔ پس یہی لوگ ہی زندہ ہیں اگرچہ وفات پا گئے ہوں اور ان کے ماسوا لوگ مردہ ہیں اگرچہ ان کے بدن زندہ ہوں۔

پھر سب سے بڑھ کر کامل حیات اُس شخص کی ہے جس نے حضور ﷺ کی دعوت کو کامل طور پر قبول کیا۔ جان لیجئے! ہر وہ بات جس کی حضور اکرم ﷺ نے دعوت دی، اس میں حیات ہے، لہٰذا جس شخص نے اُس کا کچھ حصّہ ضائع کر دیا اس کی حیات میں اتنی کمی رہ گئی۔ الغرض ہر شخص کو اتنی زندگی ملے گی جتنا وہ حضور ﷺ کی دعوت کو قبول کرے گا۔

چند سطور بعد لکھتے ہیں:

إن الإنسان لا حياة له حتى ينفخ فيه الملک الذي هو رسول الله من روحه فيصيره حياً بذلک النفخ، وكان قبل ذلک من جملة الأموات، وكذلک لاحياة لروحه وقلبه حتى ينفخ فيه الرسول ﷺ من الروح الذي ألقي إليه.

''انسان کو اُس وقت تک حیات حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ اُس میں وہ فرشتہ روح نہ پھونکے جو اللہ کا بھیجا ہوا ہوتا ہے، جب وہ روح پھونکتا ہے تو وہ اُس کی بدولت زندہ ہو جاتا ہے اور اس سے قبل وہ مردہ ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی روح اور اس کے قلب میں اُس وقت تک کوئی زندگی نہیں ہوتی جب تک کہ رسول اللہ ﷺ اُس میں وہ روح نہ پھونک دیں جو آپ کی طرف القا کی گئی۔

اس سے آگے وہ روح اور وحی کے الفاظ پر مشتمل چند آیات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فأخبر أن وحيه روح ونور، فالحياة والاستنارة موقوفة على نفخ الرسول الملكي، فمن أصابه نفخ الرسول الملكي ونفخ الرسول البشري حصلت له الحياتان، ومن حصل له نفخ الملک دون نفخ الرسول، حصلت =

= له إحدى الحياتين وفاتته الأخرىٰ.

''پس اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمادیا کہ اُس کی وحی روح اور نور ہے، لہٰذا حیات اور نورانیت کاحصول نفخۂ رسول پر موقوف ہے۔ سو جس شخص کو مَلکی رسول (فرشتے) اور بشری رسول ﷺ دونوں کا نفخۂ روح پہنچا تو اُسے دونوں زندگیاں حاصل ہو گئیں، اور جس شخص کو فرشتہ کا نفخہ پہنچا اور رسول اللہ ﷺ کا نفخہ نہ پہنچا تو اُس کو صرف ایک حیات حاصل ہوئی اور دوسری رہ گئی''۔(1)

اصلِ حیات کیا ہے؟

آپ نے غور فرمایا کہ اخلاص کے ساتھ کتاب وسنت پر عمل کی صورت میں اور روحِ نبوی ﷺ کے فیضان سے انسانی روح میں دوسری روح پھونکی جاتی ہے تو وہ ابدی حیات کا حامل ہو جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حیات ہے کیا؟ جواباً عرض ہے کہ اس حیات کو یقین کہتے ہیں اور یقین کی کوئی حد نہیں ہے۔ سو جس طرح یقین میں تمام انسان برابر نہیں ہوتے اسی طرح حیات میں بھی تمام انسان برابر نہیں ہوتے، جس شخص کو جتنا زیادہ یقین حاصل ہو جائے حیات بھی اُس کو اتنا ہی زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

شہید قبل از قتل زندہ ہوتا ہے یا بعد از قتل؟

عنداللہ شہید وہ ہے جو کسی تذبذب کے بغیر سراپا یقین ہو کر میدانِ جہاد میں اُترے، اُس کے دل میں اپنا حق پر ہونا اور دشمن کا باطل پر ہونا محقق ہو چکا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کتاب وسنت پر ایمان اور حشر ونشر اور جنت ودوزخ پر اُسے کامل یقین حاصل ہو چکا ہو تو وہ شہید ہے ورنہ نہیں۔ چنانچہ علامہ ابن قیم الجوزیہ نفس مطمئنہ پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پھر وہ شخص جوں جوں صفات الٰہی پر مشتمل کوئی آیت سنتا ہے تو مسلسل قوی ہوتا رہتا ہے اور =

(1) الفوائد لابن القيم (ملخّصًا) ص ۱۲۱، ۱۲۲ وط: ۱۲۸، ۱۳۰؛ بدائع التفسير لابن القيم ج ۱ ص ۴۴۰، ۴۴۲۔

= قوت کی کوئی حد نہیں ہے، یہی اطمینان اصولِ ایمان کی ایسی اصل ہے جس پر ایمان کی بنیاد قائم ہے، پھر یہ نفس اُن امور پر مطمئن ہوتا ہے جن کا تعلق مرنے کے بعد عالَمِ برزخ سے ہے، پھر اس کے بعد اُسے احوال قیامت پر ایسا یقین حاصل ہوجاتا ہے گویا کہ وہ ان کا عیاناً مشاہدہ کررہا ہوتا ہے، یہی یقین کی وہ حقیقت ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے یوں توصیف فرمائی ہے: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ (اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں)۔

اور آخرت پر یقین حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ دل ہر شک وشبہ سے بلند ہوکر اُن امور پر مطمئن نہ ہو جن کی اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے، جو شخص یقین کے اس درجہ کو پہنچ جائے وہی یوم آخرت کو ماننے والا مومنِ حق ہے، جیسا کہ حضرت حارثہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے صبح اس حال میں کی کہ میں مومن ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں فرمایا:

إن لكل حق حقيقة، فما حقيقة إيمانك؟ قال: عزفت نفسي عن الدنيا وأهلها، وكأني أنظر إلىٰ عرش ربي بارزاً، وإلىٰ أهل الجنة يتزاورون فيها وأهل النار يعذبون فيها، فقال: عبد نوّر الله قلبه.

''ہر حق کی حقیقت ہوتی ہے، تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے عرض کیا: میرا دل دنیا اور اہل دنیا سے بھر گیا ہے، اور گویا میں اپنے رب کے عرش کو واضح دیکھ رہا ہوں اور اہل جنت کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ اُس میں ایک دوسرے کی زیارت کررہے ہیں اور اہل جہنم کو دیکھ رہا ہوں کہ انہیں اُس میں عذاب دیا جارہا ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ ایسا بندہ ہے جس کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے روشن فرمادیا ہے''۔(1)

بتلایئے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کا دل دنیا اور اہل دنیا سے کیوں اچاٹ ہوگیا تھا؟ فقط اس لیے کہ اُن پر معاملاتِ اخروی منکشف ہوگئے تھے۔ یقین کی اس منزل پر وہ کیسے فائز ہوئے؟ علامہ ابن قیم کی عبارت میں واضح ہے کہ آیات الٰہی کی وجہ سے۔ یہ آیات انہیں کہاں سے حاصل ہوئی تھیں؟ محتاجِ بیان نہیں، لہٰذا خود سوچئے کہ اگر ایک =

(1) كتاب الروح لابن القيم ص٢٧٦، وط: ص٤٧٠۔

....

= امتی آیات اوراُن پر عمل کرنے کی وجہ سے یقین کے اس مقام پر فائز ہوگیا تو اُس ہستی کے یقین کی عظمت کا عالم کیا ہوگا قرآن خود جن کے قلب اقدس پر نازل ہوا؟ آیئے ذرا درجِ ذیل واقعہ میں غور فرمائیں کہ اس سینۂ اقدس سے کس قدر سرعت کے ساتھ صحابہ کرام ﷺ کے سینوں میں یقین داخل ہوتا تھا۔امام مسلم اور امام ابن سعد رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

''غزوۂ بدر میں حضور اقدس ﷺ ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے، آپ ﷺ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا: اٹھو اور بڑھو، ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان وزمین سے کہیں زیادہ ہے اور متقیوں کے واسطے بنائی گئی ہے۔حضرت عمیر بن الحمام رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں وہ بھی سن رہے تھے کہنے لگے واہ واہ! حضور ﷺ نے پوچھا: کس بات پر واہ واہ کہہ رہے ہو؟ عرض کی یارسول اللہ! میری یہ تمنا ہے کہ میں بھی ان میں سے ہوتا، آپ ﷺ نے فرمایا: تم بھی ان میں سے ہو، اس کے بعد وہ جھولی میں سے چند کھجوریں نکال کر کھانے لگے، پھر فرمانے لگے: ان کھجوروں کے ختم ہونے کا انتظار جو ہاتھ میں ہیں بڑی لمبی زندگی ہے، کب تک انتظار کروں گا، یہ کہہ کر ان کو پھینک دیا اور تلوار لے کر مجمع میں گھس گئے اور شہید ہونے تک لڑتے رہے''۔(1)

غور فرمایئے! صحابی نے کیوں دنیوی زندگی پر اُخروی زندگی کو ترجیح دی، دنیا میں مزید چند سیکنڈ رہنا بھی کیوں نہ پسند کیا اور کٹ مرنا اُن پر کیونکر آسان ہوا؟ فقط کمالِ یقین کی وجہ سے۔مولانا زکریا سہارنپوری کا اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت خوب ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ہم لوگوں کو بھی اگر یقین نصیب ہوجائے تو ساری باتیں سہل ہوجائیں''۔(2)

یہی وحی ہے، یہی ایمان ہے، یہی یقین ہے، یہی روحِ قرآن ہے اور یہی ابدی حیات ہے۔راہِ خدا میں کٹ مرنا اُسی پر آسان ہوتا ہے جس کو حسبِ استطاعت سرعتاً یا تدریجاً یہ دولت حاصل ہوچکی ہو۔ایسا شخص ہی مکمل عزم کے ساتھ میدان میں اترتا ہے اور وہی عنداللہ شہید ہوتا ہے۔اگر کوئی شخص بے یقینی اور تذبذب =

---

(1) مسلم: كتاب الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، حديث ۱۹۰۱؛ ابن سعد ج۳ ص ۵۲٤۔

(2) حکایاتِ صحابہ [فضائل أعمال] ص۹۲۔

....

= کی کیفیت میں میدان کارزار میں اترے اور مارا جائے تو وہ شہید نہیں ہوتا۔اسی لیے تو نبی کریم ﷺ نے واضح طور پر فرما دیا تھا:

إن أكثر شهداء أمتي أصحاب الفرش، ورُبَّ قتيل بين صفين، الله أعلم بنيته.

''میری امت کے اکثر شہداء اپنے بستروں پر مرنے والے ہیں، جبکہ بہت لوگ میدان جہاد کی صفوں میں مقتول ہوتے ہیں، اللہ ہی اُن کی نیتوں سے خوب واقف ہے''۔(1)

غور فرمایئے! میدانِ جہاد کی صفوں میں دشمن کے وار سے قتل تو دونوں ہوئے، لیکن ایک شہید ہے اور دوسرا نہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ شہادت اور دائمی حیات کا سبب کٹ مرنا نہیں بلکہ سبب کوئی اور ہے۔وہ کیا ہے؟ بلاشبہ وہ کمالِ یقین ہے اور اسی کا دوسرا نام قلب وروح کی حیات ہے۔سوایسا پیکرِ یقین کٹ مرنے سے قبل سراپا حیات ہو چکا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اُس کے قتل کے بعد اُسے نئی زندگی دینے کا ذکر نہیں آیا بلکہ اُسے مردہ کہنے اور مردہ گمان کرنے کی ممانعت آئی ہے۔فَافْهَمْ!

حیاتِ انبیاء کا حیاتِ شہداء سے قوی ہونا

کچھ لوگ شہداء کرام کو تو حیات مانتے ہیں مگر انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہداء کی حیات میں تو قرآن کی نص ہے، انبیاء کی حیات میں کونسی نص آئی ہے؟ مذکور الصدر تفصیل کی روشنی میں ایسے لوگوں کو اگر احمق سمجھا جائے تو غیر مناسب نہیں۔یاد رکھیے! قرآن اپنے ماننے والوں کو ہر بات میں محض نص ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے اندر غور وفکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔ہر عقل مند جانتا ہے کہ جو کمال ناظرہ خواں کو حاصل ہوتا ہے وہ حافظ قرآن کو بدرجۂ اتم حاصل ہوتا ہے، میٹرک والے میں جتنا قابلیت ہوتی ہے درجہ بدرجہ ایف اے، بی اے، اور ایم اے والے میں اُس سے زیادہ ہوتی ہے۔اسی لیے علماء نے انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات کو شہداء کی حیات سے افضل، اعلیٰ اور اقویٰ کہا ہے۔چنانچہ امام ابوالعباس قرطبی، علامہ ابن قیم الجوزیہ حنبلی، امام ابوعبد اللہ قرطبی، امام سیوطی، امام صالحی شامی، امام زرقانی، محمد بن جعفر الکتانی اور امام نبہانی رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں: =

(1) مسند أحمد [شاكر] ج٣ ص ٢٥، ٢٦ حديث ٣٧٧٢؛ نوادر الأصول ج٢ ص ٤٣٩؛ جامع الأحاديث الكبير ج٢ حديث ٤٩٦٨؛ الجامع الصغير ص ١٦٦ حديث ٢٢١٨۔

....

= الشهداء بعد قتلهم وموتهم أحياء عند ربهم يرزقون فرحين مستبشرين، فهٰذه صفات الأحياء فى الدنيا وإذا كان هٰذا فى الشهداء كان الأنبياء بذلك أحق وأولىٰ.

''شہداء کرام اپنے قتل اور اپنی موت کے بعد اپنے رب کے نزدیک زندہ ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے وہ مسرور ہیں اور بشارتوں سے شادکام ہوتے ہیں، اور یہ تمام باتیں دنیوی زندگی کی صفات ہیں۔ جب شہداء کو یہ مقام حاصل ہے تو انبیاء کرام علیہم السلام بدرجۂ اولیٰ اس کے حق دار ہیں''۔(1)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

الأنبياء أحياء عند الله، وإن كانوا في صورة الأموات بالنسبة إلىٰ أهل الدنيا، وقد ثبت ذلك للشهداء، ولاشك أن الأنبياء أرفع رتبة من الشهداء.

''انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں، اگر چہ وہ اہل دنیا کی بنسبت صورتاً مردہ ہیں، اور یہ حیات شہداء کے لیے ثابت ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا رتبہ شہداء سے بلند ہے''۔(2)

علامہ خفاجی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أن الأنبياء والشهداء أحياء، وحياة الأنبياء أقوىٰ. =

---

(1) المفهم ج٦ص٢٣٣، ٢٣٤؛ كتاب الروح لابن القيم ص٩٢، وط: ص٤٩؛ التذكرة للقرطبي ص١٩١؛ الحاوي للفتاوي ج٢ص١٤٩ وص٢٦٣، وط: ص٥٥٦، ٦٦٧، ٦٦٨؛ المواهب اللدنية ج٢ص٦٩٥؛ سبل الهدىٰ ج١٢ص ٣٥٥؛ مرقاة ج١٠ص٣٩٥ حديث ٥٧١٧؛ زرقاني على المواهب ج٧ص٣٦٩؛ نظم المتناثر لأبي جعفر الكتاني ص١١٧؛ جواهر البحار ج٢ص٤٠٣؛ سعادت الدارين ص٣٩٨؛ أنوار الباري للبجنوري ج١١ص٣٠۔

(2) فتح الباري ج٨ص١١۔

....

= ''انبیاء کرام علیہم السلام اور شہداء زندہ ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی حیات (اُن سے) زیادہ قوی ہے''۔(1)

اہل حدیث عالم شمس الحق عظیم آبادی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔(2)

قاضی شوکانی کی لکھتے ہیں:

وورد النص في كتاب الله في حق الشهداء أنهم أحياء يرزقون، وأن الحياة فيهم متعلقة بالجسد،فكيف بالأنبياء والمرسلين؟

''اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں شہداء کے بارے میں نص وارد ہوئی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ان کو رزق ملتا ہے اور ان کی حیات کا تعلق جسم سے ہے، پھر انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کی حیات کا کیا عالم ہوگا؟''۔(3)

علامہ انور شاہ کشمیری حقیقی حیات پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الحياة فيها مراتب لا يعدها عاد ولا يحصيها مُحِص، فحياةُ الأنبياء أعلىٰ وأتم.

''حیات کے اس قدر مراتب ہیں کہ گنتی میں نہیں آتے اور شمار کنندہ انہیں شمار نہیں کرسکتا، اور انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات سب سے اعلیٰ اور اکمل ہے''۔(4)

مفتی عزیز الرحمان عثمانی لکھتے ہیں:

''انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی حیات شہداء کی حیات سے بھی اقویٰ واتم ہے''۔(5) =

---

(1) نسيم الرياض ج٥ ص٧٩۔

(2) عون المعبود ج٦ ص٢١۔

(3) نيل الأوطار ج٣ ص٣١٣ حديث١٢٠٦، وط: ج٦ ص٣١١، ٣١٢۔

(4) فيض الباري ج٢ ص٢٠٤۔

(5) فتاوى دار العلوم ديوبند ج٥ ص٣٤٢۔

= مفتی صاحب ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

''انبیاء علیہم السلام کی حیات خصوصاً آنحضرت ﷺ کی حیات، شہداء کی حیات سے افضل ہے اور اعلیٰ ہے''۔(1)

مفتی کفایت اللہ صاحب لکھتے ہیں:

''انبیاء علیہم السلام کو حضرت حق تعالیٰ نے ایک مخصوص حیات اور ممتاز حیات عطا فرمائی ہے جو شہداء کی حیات سے ممتاز ہے''۔(2)

مفتی صاحب نے اس سے قبل ایک مقام پر لکھا ہے:

''انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین اپنی قبور میں زندہ ہیں مگر اُن کی زندگی دنیاوی زندگی نہیں ہے بلکہ برزخی ہے اور تمام دوسرے لوگوں کی زندگی سے ممتاز ہے، اسی طرح شہداء کی زندگی بھی برزخی ہے اور انبیاء کی زندگی سے نیچے درجے کی ہے''۔(3)

مولانا عبدالحق (اکوڑہ خٹک) حیاتِ انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ایک جامع جواب میں آیت مبارکہ ﴿وَلَاتَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ﴾ کے بعد لکھتے ہیں:

''جب شہید کے لیے وقوعِ قتل کے باوجود یہ حیات طیبہ حاصل ہے تو انبیاء علیہم السلام کے لیے اس سے بھی ارفع و اعلیٰ حیات بطریقۂ اولیٰ ثابت ہوگی''۔(4)

حیاتِ انبیاء حیاتِ شہداء سے قوی کیسے؟

جو قارئین کرام موت کا معنیٰ اور ابدی حیات کا نسخہ وغیرہ عنوان کے تحت ہماری گزارشات اور علماء کرام کی عبارات کی روشنی میں ابدی حیات کا سبب جان چکے ہیں، انہیں قطعاً یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی کہ انبیاء =

(1) فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۵ ص ۴۰۶۔

(2) کفایت المفتي ج ۱ ص ۸۸۔

(3) کفایت المفتي ج ۱ ص ۸۰۔

(4) فتاوی حقانیه ج ۱ ص ۱۵۸۔

....

= کرام علیہم السلام کی حیات شہداء کی حیات سے افضل کیسے۔ وہ جان چکے ہیں کہ نبی حیات بخش ہوتا ہے، جیسا کہ ﴿ لِمَا یُحْیِیْکُمْ ﴾ سے ظاہر ہے۔ پھر اُس ہستی کی حیات کا کوئی کیسے اندازہ کرسکتا ہے جس کے فقط سہارا لگانے سے خشک تنے کو حیات مل گئی! اسی لیے علماء کرام نے دوٹوک انداز میں لکھا ہے کہ قبر میں انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات دنیا کی سی حیات ہے، حتیٰ کہ کہا ہے کہ وہ اب بھی یونہی زندہ موجود ہیں جیسے فرشتے زندہ موجود ہیں مگر ہمیں نظر نہیں آتے۔ چنانچہ امام ابوالعباس قرطبی، علامہ ابن قیم الجوزیہ حنبلی اور دوسرے علماء اہل سنت لکھتے ہیں:

إن الموت لیس بعدم، وإنما هو انتقال من حال إلٰی حال...... ویدل علی ذلک أن الشهداء بعد قتلهم وموتهم أحیاء عند ربهم یرزقون فرحین مستبشرین، فهٰذه صفات الأحیاء فی الدنیا وإذا کان هٰذا فی الشهداء کان الأنبیاء بذلک أحق وأولیٰ، مع أنه قد صح عن النبی ﷺ ''إن الأرض لا تأکل أجساد الأنبیاء'' وأن النبي ﷺ قد اجتمع بالأنبیاء لیلة الإسراء في بیت المقدس وفی السماء، وخصوصًا بموسٰی علیہ السلام، وقد أخبرنا النبی ﷺ بما یقتضي إن اللّٰه تعالیٰ یرد علیه روحه حتی یرد السلام علی کل من یُسَلِّمُ علیه إلی غیر ذلک مما ورد في هذا المعنی وهو کثیر بحیث یحصل من جملته القطع بأن موت الأنبیاء إنما هو راجع إلی أنهم غیبوا عنا بحیث لا ندرکهم، وإن کانوا موجودین أحیاء، وذلک کالحال فی الملائکة فإنهم موجودون أحیاء ولا یراهم أحد من نوعنا إلا من خصه اللّٰه بکرامة من أولیائه.

''موت عدم محض (نیست ونابود ہونے کا نام) نہیں ہے، یہ صرف ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شہداء کرام اپنے قتل اور اپنی موت کے بعد اپنے رب کے نزدیک زندہ ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے وہ مسرور ہوتے ہیں اور بشارتوں سے نوازے جاتے ہیں، اور یہ تمام باتیں دنیوی زندگی کی صفات ہیں۔ جب شہداء کو یہ مقام حاصل ہے تو انبیاء کرام علیہم السلام بدرجۂ اولیٰ اس کے حق دار ہیں، کیونکہ سید عالم ﷺ سے =

= صحیح حدیث منقول ہے کہ زمین انبیاء کرام علیہم السلام کے بدنوں کو نہیں کھاتی، اور نبی کریم ﷺ نے شبِ معراج بیت المقدس میں انبیاء کرام علیہم السلام سے ملاقات فرمائی اور آسمانوں میں بھی اور خصوصاً موسیٰ علیہ السلام سے۔ نیز نبی کریم ﷺ نے ہمیں ایسی خبر دی جو حیات کا تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو لوٹا دیا ہے، یہاں تک کہ آپ ہر اُس شخص کو سلام کا جواب دیتے ہیں جو آپ کی بارگاہ میں سلام عرض کرتا ہے۔ یہ اور اس سلسلے میں وارد ہونے والی دوسری تمام احادیث سے قطعاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی وفات کا معنی یہ ہے کہ وہ ہماری نگاہوں سے اس طرح سے پوشیدہ کر دیے گئے کہ ہم ان کا ادراک نہیں کر سکتے، اگرچہ وہ زندہ موجود ہیں، جیسا کہ فرشتے زندہ موجود ہیں اور ہماری نوعیت کا کوئی انسان اُنہیں دیکھ نہیں سکتا، ماسوا اللہ تعالیٰ کے اُن دوستوں کے جنہیں اُس نے کرامت سے مخصوص فرمایا ہے"۔(1)

اہل حدیث عالم قاضی شوکانی نے بعد از وفات نبی کریم ﷺ کی حیات کو پہلے محققین کا مذہب قرار دیا ہے، پھر لکھا ہے:

وورد النص في كتاب الله في حق الشهداء أنهم أحياء يرزقون، وأن الحيوة فيهم متعلقة بالجسد، فكيف بالأنبياء والمرسلين؟ وقد ثبت في الحديث "إن الأنبياء أحياء في قبورهم" رواه المنذري وصححه البيهقي، وفي صحيح مسلم عن النبي ﷺ قال: مررت بموسىٰ ليلة أسري بي عند الكثيب الأحمر، وهو قائم يصلي في قبره.=

(1) المفهم للقرطبي ج٦ ص٢٣٣، ٢٣٤؛ كتاب الروح لابن القيم ص ٩٢، وط: ص٤٩؛ التذكرة للقرطبي ص١٩١، وط: ص٤٥٩، ٤٦٠؛ الحاوي للفتاوي ج٢ ص١٤٩ وص٢٦٣ وط: ص ٥٥٦، ٦٦٧، ٦٦٨؛ سبل الهدىٰ ج١٢ ص٣٥٥؛ زرقاني على المواهب ج٧ ص٣٦٩؛ نظم المتناثر لأبي جعفر الكتاني ص١١٧؛ جواهر البحار ج٢ ص٤٠٣؛ سعادت الدارين ص٣٩٨۔

....

= ''اللہ تعالیٰ کی کتاب میں شہداء کے بارے میں نص وارد ہوئی ہے کہ وہ زندہ ہیں اوران کو رزق ملتا ہے اوران کی حیات کا تعلق جسم سے ہے، پھر انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کی حیات کا عالم کیا ہوگا؟ اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔امام منذری نے اس کو روایت کیا ہے اور امام بیہقی نے اس کی تصحیح کی ہے، اور صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں نے معراج کی رات سرخ رنگ کے ٹیلے کے پاس موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں کھڑے نماز پڑھتے دیکھا ہے''۔ (1)

یہ اوراس سے متعلقہ قاضی شوکانی کی مکمل عبارت شمس الحق عظیم آبادی نے بھی نقل کی ہے۔(2)

علامہ شوکانی نے ایک مقام پر قبر میں حیات کے اثبات کو متواتر قرار دیا ہے۔چنانچہ وہ ایک حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

وفيه دليل علىٰ ثبوت حياة القبر، وقد وردت بذلک أحاديث كثيرة بلغت حد التواتر.

''اس حدیث میں قبر کی حیات کے ثبوت پر دلیل ہے، اوراس مسئلہ میں اس قدر احادیث کثیرہ وارد ہوئیں کہ تواتر کی حد تک پہنچ گئیں''۔(3)

علامہ شوکانی روضۂ نبویہ ﷺ پر حاضری کی بحث میں لکھتے ہیں:

إنه ﷺ حيٌ في قبرهٖ بعد موتهٖ، كما في حديث: الأنبياء أحياء في قبورهم، وقد صححه البيهقي وألّف في ذلک جزء، قال الأستاذ أبو منصور البغدادي: قال المتكلمون المحققون من أصحابنا: أن نبينا ﷺ حيٌ بعد وفاتهٖ انتهى. ويؤيد ذلک ماثبت: إن الشهداء أحياءٌ يرزقون في قبورهم والنبي ﷺ منهم. =

---

(1) نیل الأوطار ج۳ ص۳۱۳ حدیث ۱۲۰۶، وط: ج۶ ص ۳۱۱، ۳۱۲۔

(2) عون المعبود ج۳ ص ۲۶۱۔

(3) نیل الأوطار ج۷ ص ۴۴۷، وط ۴ ص ۵۳۸ حدیث ۱۴۸۴۔

= ''سید عالم ﷺ وفات کے بعد اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ امام بیہقی نے اس کی تصحیح کی ہے اور انہوں نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔ استاذ ابو منصور بغدادی فرماتے ہیں: ہمارے اصحاب میں محققین متکلمین کا قول ہے کہ سید عالم ﷺ وفات کے بعد زندہ ہیں۔ ان کا بیان ختم ہوا، اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور قبروں میں ان کو رزق دیا جاتا ہے، اور نبی کریم ﷺ بھی شہداء میں سے ہیں''۔(1)

اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خان قنوجی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔(2)

قاضی شوکانی ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

أقول: حدیث "الأنبیاء أحیاء في قبورهم" صححه البیهقي، وألف فیه جزءًا، ویؤید ذلک ما ثبت أن الشهداء أحیاء یرزقون في قبورهم، وهو ﷺ رأس الشهداء.

''میں کہتا ہوں: حدیث ''انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں'' کو امام بیہقی نے صحیح کہا ہے، اور اُنہوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے، اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ شہداء کرام کے لیے ثابت ہے کہ وہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں، اُنہیں رزق دیا جاتا ہے اور حضور ﷺ تو شہداء کے سردار ہیں''۔(3)

علامہ محمد قاسم نانوتوی نے رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی حیات میں وجہ فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی موت میں بھی مثل حیات فرق ہے۔ ہاں فرقِ ذاتیت وعرضیت متصوّر نہیں، وجہ اس فرق کی وہی تفاوتِ حیات ہے، یعنی حیاتِ نبوی بوجہ ذاتیت قابلِ زوال =

(1) نیل الأوطار ج۹ ص۴۰۸، ۴۰۹، وط: ج۵ ص۱۲٦ حدیث۲۰۷۳۔

(2) السراج الوهاج من کشف مطالب صحیح مسلم بن الحجاج، ج٤ ص۱۰۰۔

(3) الفتح الرباني للشوکاني ص٦٦۳۔

....

= نہیں اور حیات مؤمنین بوجہ عرضیت قابلِ زوال ہے، اس لیے وقتِ موت، حیاتِ نبوی ﷺ زائل نہ ہوگی، ہاں مستور ہو جائے گی اور حیاتِ مؤمنین ساری یا آدھی زائل ہو جائے گی"۔ (1)

دوسرے مقامات پر علامہ نانوتوی صاحب نے جو کلام کیا ہے اُس سے ان کا مذکورہ بالا مشکل کلام بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ پہلے لکھتے ہیں:

"بالجملہ موتِ انبیاء علیہم السلام اور موتِ عوام میں زمین وآسمان کا فرق ہے"۔

پھر چند سطور آگے انہوں نے اس فرق کو نبی کی نیند اور امتی کی نیند کے فرق سے سمجھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بالجملہ حیاتِ نبوی ﷺ اور حیاتِ مؤمنینِ امت میں فرق ہے۔ چنانچہ اس کے اثبات کے لیے تقریر وافی اور تحریر شافی کافی اوراقِ گزشتہ میں گذر چکی ہے، ایسے موتِ نبوی ﷺ اور موتِ مؤمنین میں فرق ہے، اور بوجہ فرق بین الموتین وہی فرق بین الحیاتین ہے، اور اسی بنا پر لازم ہے کہ نومِ نبوی ﷺ اور نومِ مؤمنین میں فرق ہو، اس لیے کہ "النوم أخوا الموت" (نیند موت کی بہن ہے) چنانچہ خداوند کریم نے بھی اپنے کلام پاک میں موت اور نوم دونوں کو ایک سلک میں کھینچا ہے اور ایک ہی ذیل میں داخل کیا ہے"۔ (2)

مولانا کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح نبی اور غیر نبی کی نیند میں فرق ہے، اسی طرح نبی اور غیر نبی کی وفات میں بھی فرق ہے۔ حالتِ نیند میں نبی کا قلب بیدار رہتا ہے جبکہ غیر نبی کا قلب سو جاتا ہے، نبی کا وضو باقی رہتا ہے جبکہ غیر نبی کا وضو ٹوٹ جاتا ہے، اور ایسی ہی وجوہ کے پیشِ نظر نبی اور غیر نبی کی موت وحیات میں زمین وآسمان کا فرق ہے، لہٰذا جب امت کے کسی شہید کو میت کہنا اور مردہ گمان کرنا ممنوع ہے تو نبی کو اُس کی قبر میں مردہ کہنا اور لکھنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ خلاصہ یہ ہے کہ کتابِ ھٰذا کے مؤلف کا نبی کریم ﷺ کو آپ کی قبر میں ۱۱ھ سے لے کر قیامت تک "مَیّت" لکھنا قرآن وحدیث اور علماء اہل سنت کی تصریحات کے خلاف ہے۔

قابل توجہ نکتہ =

---

(1) آبِ حیات للنانوتوي ص ۱۸۸، ۱۸۹۔

(2) آبِ حیات ص ۱۹۸، ۱۹۹۔

تیسری حدیث

''ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک صبح کو رسول اللہ ﷺ باہر نکلے تو اُس وقت آپ کے جسم اقدس پر کالے بالوں سے بُنی ہوئی اونٹ کے کجاوے کی مانند منقش چادر تھی، پس سیدنا حسن آئے تو آپ نے انہیں اُس میں لے لیا، پھر حسین آئے تو وہ بھی اُس میں داخل ہو گئے، پھر فاطمہ آئیں تو انہیں بھی داخل فرمالیا، پھر علی آئے تو انہیں بھی داخل فرمالیا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾.

= خیال رہے کہ مرنے کے بعد روحانی طور پر تو کفار بھی زندہ ہوتے ہیں، اسی بنا پر اُنہیں احساسِ عذاب ہوتا ہے، لیکن اہل ایمان کی زندگی حسبِ اعمال اُن کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے، چنانچہ بعض اعمال ایسے ہیں کہ اگر اُنہیں اخلاص سے کیا جائے تو جسم زندہ بھی رہتا ہے اور کیڑے مکوڑوں سے محفوظ بھی۔ مثلاً مؤذن کے لیے حدیث میں آیا ہے:

المؤذن المحتسب كالشهيد المتشحط في دمه، إذا مات لم يدوّد في قبره.

''ثواب کی خاطر اذان کہنے والا خون میں لت پت شہید کی مانند ہے، جب وہ وفات پاتا ہے تو قبر میں اُسے کیڑے نہیں کھاتے''۔(1)

شہید کی زندگی اِس سے بہت ارفع ہوتی ہے، کیونکہ اخلاص کے ساتھ اذان کہنے والے کا جسم فقط محفوظ ہے، جبکہ شہید کا جسم فاعل (عمل کرنے والا اور متحرک) بھی ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم کی نص ہے: ﴿بَلْ أَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (بلکہ وہ زندہ ہیں اُنہیں رزق دیا جاتا ہے) سو جب وہ رزق کھاتے ہیں تو اُن کی زندگی محض جسم کے محفوظ ہونے تک محدود نہیں بلکہ اس سے ایک درجہ بلند ہے، کیونکہ اُن کا جسم عمل بھی کرتا ہے، اور چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات اُن سے افضل ہے، اس لیے صحیح احادیث میں آیا ہے کہ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات کے بہت درجات ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں سب لوگ حیات میں برابر نہیں ہیں اسی طرح برزخ میں بھی برابر نہیں۔

---

(1) الترغيب والترهيب ج۱ ص۱۱۲۔

اس کوامام مسلم نے روایت کیا ہے،ہم نے اِس کو اِس سند اور دوسری صحیح سندوں سے ازاول تا آخر سماعاً روایت کیا ہے۔(۱)

''مِرْط مُرَحَّلٌ'' کا معنیٰ ہے وہ چادر جس پر اونٹ کے کجاوے کی تصویر بنی ہوئی ہو اور ''الرحل'' اُسے کہتے ہیں جو سوار ہونے کے لیے زین کی طرح اونٹ کی پشت پر رکھا جاتا ہے۔

تیسری حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس حدیث میں اہل کساء علیہم السلام کی بہت بڑی منقبت ہے، کیونکہ اللہ ﷻ نے اُنہیں منتخب فرمایا اور تطہیر خاص سے نوازا۔

اہل بیت کے تین مفہوم

۲۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عرفِ شرع میں اہل بیت کے تین مفہوم ہیں:

اولاً: **أهل الكساء** (چادر والے) جس پر یہی اور اس جیسی دوسری احادیث دلالت کرتی ہیں۔

ثانیاً: آپ ﷺ کی **ازواج مطہرات امہات المومنین**، جیسا کہ اس پر قرآن مجید نے صراحت فرمائی ہے۔ پہلے اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کا تذکرہ کیا، پھر فرمایا: ﴿**اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا**﴾ پھر ارشاد فرمایا: ﴿**وَاذْكُرْنَ مَايُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ**﴾ اور حدیث نے امہات المومنین کے ساتھ اصحاب کساء کی شمولیت کو واضح

---

(۱) مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل أهل بيت النبي ﷺ، حديث: ٢٤٢٤، وط: حديث ٦٢٦١؛ مسند إسحاق بن راهويه ج٣ ص٦٧٨، حديث ١٢٧١؛ المصنف لابن أبي شيبة: كتاب الفضائل، باب فضائل علي بن أبي طالب ؓ ج١٧ ص١١٧، حديث ٣٢٧٦٥؛ الجمع بين الصحيحين: ج ٤ ص ٢٢٥ حديث ٣٤٣٥؛ المستدرك: كتاب معرفة الصحابة، باب ومن مناقب أهل بيت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم، ج٣ ص١٤٦ وط: ج٤ ص ١٢٧، حديث ٤٧٦١؛ جامع المسانيد لابن الجوزي ج٨ ص١٣٧ حديث ٧٢٠٠۔

فرمایا، جیسا کہ اِسی حدیث میں ہے۔

ثالثاً: وہ حضرات جن پر صدقہ حرام ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل حدیث نمبر ۵ میں آرہی ہے کہ سید عالم ﷺ نے اُنہیں اہل بیت کا نام دیا ہے۔

۳۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ یُرِیْدُ اللّٰہُ ﴾ اس سے ارادۂ شرعی مراد ہے، گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: اے اہل بیت وہ تمہیں اپنی شریعتِ مطہرہ کا حکم کرتا ہے تا کہ وہ تمہیں عیوب اور پلیدیوں سے خوب، مکمل اور خالص طور پر پاک فرما دے۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ نیک وصالح شخص اپنے گھر والوں اور اولاد کے حق میں اللہ کے فضل اور انعام کا ذریعہ ہوتا ہے، لہٰذا تمہیں نیک وصالح بننا چاہیے۔

٥۔ اس میں دلیل ہے کہ بندہ جب عاجزی، انابت وعبادت اور خشوع وخضوع میں بڑھتا ہے اور گناہوں کی آلودگیوں سے بچتا ہے تو اُس کا نفس پاکیزہ اور کامل ہوتا چلا جاتا ہے، اور اسی طرح برے عمل کا نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

٦۔ اس میں بدن، کپڑوں اور جگہ وغیرہ کو اچھی طرح پاک کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

٧۔ اس میں اُس شخص کی تردید ہے جس کا خیال ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل بیت عظام علیہم السلام کے فضائل کو چھپاتے تھے، حالانکہ یہ اور تمام وہ احادیث جو ہم اس ''الأربعین'' میں ذکر کریں گے، سب کی سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نقل فرمودہ ہیں، اور یہ اُن کے روایت کردہ کثیر فضائل میں سے کچھ حصہ ہے۔

٨۔ اس میں سیاہ لباس پہننے کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔

٩۔ اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کتاب وسنت سے اقتباس کرنا جائز ہے، جبکہ استدلال موقع ومحل سے مناسبت رکھتا ہو۔

چوتھی حدیث

حضرت عامر بن سعد بن ابی وقاص اپنے والد (سعد) رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ﴿ نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآءَ کُمْ ﴾ (ہم بلالیں اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو) [آل عمران:

٦١] نازل فرمائی تو نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا، پھر عرض کیا: اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔

یہ صحیح سند ہے، اس کو امام ترمذی نے روایت کیا اور اس کو صحیح کہا ہے، اور اس کو امام مسلم نے قتیبہ سے زیادہ طویل انداز سے روایت کیا ہے۔ ہم نے اس کو اس سند اور دیگر اسناد سے از اول تا آخر جامع ترمذی سے سندِ عالی کے ساتھ باتصالِ سند روایت کیا ہے۔ (١)

چوتھی حدیث سے ماخوذ مسائل

١۔ اس میں اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل کی تاکید وتقویت ہے۔

اہل کساء کا مخصوص ہونا

٢۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اہل کساء [چادر والے علیہم السلام] اہل بیت میں سے خاص مقام کے حامل ہیں۔ (٢)

٣۔ اس میں نبی کریم ﷺ کی اہل کساء علیہم السلام سے عظیم محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ مباہلہ کرنے کے لیے فقط اُنہیں کو لے گئے۔

٤۔ اس میں اشارہ ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام کی یہ ذمہ داری ہے کہ جو دین نبی کریم ﷺ لائے

---

(١) سنن الترمذي: أبواب تفسير القرآن، باب ومن سورة آل عمران، حديث ٢٩٩٩، وأبواب المناقب، باب مناقب علي بن أبي طالب رضي الله عنه، حديث ٣٧٢٤؛ مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه، حديث ٦٢٢٠؛ الجمع بين الصحيحين ج١ ص١٩٧ حديث ٢٠٨؛ مسند أحمد ج١ ص١٨٥ حديث ١٦٠٨ وط: ج٣ ص ١٦٠ حديث ١٦٠٨؛ مسند سعد بن أبي وقاص للدورقي حديث ١٩؛ المستدرك: كتاب معرفة الصحابة، باب ومن مناقب أهل رسول الله ﷺ ج٣ ص ١٦٣ حديث ٤٧١٩۔

(٢) فاضل مؤلف اس سے قبل تیسری حدیث کے پہلے فائدے میں بھی یہی مفہوم بیان کر چکے ہیں۔

اس پر فخر کریں، اس کی طرف لوگوں کو بلائیں اور اس سلسلہ میں جو اذیت پہنچے اُس پر صبر کریں۔

مباہلہ میں مخصوص ہستیوں کا ہونا

۵۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام پر حضور ﷺ کی شریعت کی تحقیق، آپ کے دین کی تنقیح اور آپ کی سنت میں غلو کرنے والوں کی تحریف سے، بطّال قسم کے لوگوں کی دسیسہ کاریوں اور جہلاء کی تاویلات سے حفاظت کرنا جتنا واجب ہے اتنا دوسروں پر نہیں۔ یہی راز ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے مخصوص ترین اہل بیت کے ذریعے مباہلہ کیا، واللہ اعلم۔

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ اسلام میں دعوت دینے کا اصل طریقہ حکمت اور احسن انداز سے دعوت دینا ہے، لیکن جب مباہلہ تک نوبت پہنچ جائے تو یہ استثنائی صورت ہوگی، جو جھوٹوں، معاندین اور ظالموں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

۷۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام کو بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی ذات، اُس کے دین اور اُس کی شریعت کی مدد کے لیے جوش دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ اُن کی اصل پہچان اور شناخت حلم، بردباری، طبیعت کا ٹھہراؤ اور وقار ہے۔

۸۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام پر واجب ہے کہ وہ حق کی تلاش میں خالص اور صحیح ترین ذرائع اختیار کرنے کی بھرپور کوشش کریں، تا کہ اُن کے نزدیک یہ بات یقینی ہو جائے کہ اُنہیں جو شریعت مطہرہ پہنچی ہے وہ صحت کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے، اور یہ بات مباہلہ کے لازمی نتائج میں سے ہے، ورنہ نبی کریم ﷺ نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ نہ کرتے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ جن کے خلاف مباہلہ ہوا تھا، حق اُن کے ساتھ تھا اور اہل بیت کے ساتھ نہیں تھا تو یہ بات اندوہناک ہوتی۔ بہرکیف اللہ تعالیٰ نے اولین کو باطل پر ہونے سے محفوظ رکھا، آخرین کو بھی اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

۹۔ اس میں دلیل ہے کہ جب مباہلہ ناگزیر ہو جائے تو پہلے تو مناسب ہے کہ صلحاء اہل بیت ہی مباہلہ کریں، ورنہ دوسرے اکابر اہلِ علم میں سے جو صلحاء ہوں وہ کریں۔

۱۰۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ بنیادی طور پر مباہلہ بڑے معاملات میں ہی ہونا چاہیے۔

پانچویں حدیث

حضرت یزید بن حیان بیان کرتے ہیں کہ میں، حصین بن سبرہ اور عمر بن مسلم حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے ہاں حاضر ہوئے اور اُن کی مجلس میں بیٹھے، پھر ان سے حصین نے سوال کیا: اے زید! آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی، آپ کی اقتدا میں نماز پڑھی، آپ سے حدیث سنی اور آپ کے ساتھ جہاد کیا، اے زید! یقیناً آپ نے بہت خیر و بھلائی پالی ہے۔ ہمیں کوئی ایسی حدیث سنائیں جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں موجود ہوتے ہوئے براہ راست سنی ہو۔ فرمایا: بھتیجے کیوں نہیں، میں کافی عمر گزار چکا ہوں، بوڑھا ہو چکا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو احادیث میں نے یاد کی تھیں اُن میں سے کچھ بھلا بھی چکا ہوں، لہٰذا جو میں تمہیں بیان کروں اُسے قبول کر لینا اور جو نہ بیان کر سکوں اس کے بارے میں مجبور نہ کرنا۔

فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، پانی کے اُس تالاب پر جسے "خم" کہا جاتا ہے، پہلے حمد و ثناءِ الٰہی بیان فرمائی، وعظ و نصیحت فرمائی، پھر فرمایا: اما بعد، اے لوگو! میں ایک بشر ہوں، قریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا قاصد آئے تو میں اُسے لبیک کہوں، اور میں تمہارے درمیان دو عظیم الشان چیزیں چھوڑ رہا ہوں، پہلی اُن میں کتابِ الٰہی ہے، اُس میں ہدایت اور نور ہے، جو اُسے تھامے گا اور اُس سے روشنی حاصل کرے گا تو وہ ہدایت پر رہے گا اور جو اسے چھوڑ دے گا اور اُس سے روگردانی کرے گا تو وہ گمراہی پر ہوگا، اور (دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ تعالیٰ یاد دِلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ تعالیٰ یاد دِلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ تعالیٰ یاد دِلاتا ہوں۔

حضرت حصین نے پوچھا: اے زید! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کون ہیں؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج آپ کے اہل بیت سے نہیں؟ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ آپ کی ازواج آپ کے اہل بیت سے ہیں، لیکن آپ کے اہل بیت وہ ہیں جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام ہے۔ سائل نے عرض کیا: کون ہیں وہ؟ فرمایا: سیدنا علی، عقیل، جعفر طیار اور عباس رضی اللہ عنہم کی اولاد۔ سائل نے کہا: کیا ان سب پر صدقہ حرام ہے؟ فرمایا: ہاں۔

یہ صحیح سند ہے اور ہمیں اسی طرح یہ حدیث صحیح ابن خزیمہ سے عالی سند سے حاصل ہوئی، اور اس کو

امام مسلم نے جریر اور محمد بن فضیل سے اسی طرح روایت کیا ہے، اور ہم نے اس کو اِسی سند سے اور دوسری سندوں سے صحیح ابن خزیمہ سے از اول تا آخر سماعاً روایت کیا ہے۔(۱)

پانچویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات امہات المومنین آپ کے اہل بیت میں شامل ہیں، لیکن ضمنی طور پر (زوجہ ہونے) کی بنا پر نہ کہ اصالۃً، کیونکہ ہر شخص کی آل اُس کی اصل اور باپ دادا کا خاندان ہوتا ہے، یہی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے قول "بلیٰ......ولکن" (کیوں نہیں......لیکن) کا مطلب ہے، اسی لیے آل اور اُن کے غلاموں (دونوں) پر صدقات (واجبہ) حرام ہیں اور حضور ﷺ کی ازواج مطہرات پر تو صدقات حرام ہیں لیکن اُن کے غلاموں پر نہیں، جیسا کہ اس پر سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی باندی بریرہ کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو بخاری و مسلم میں ہے: "**هو لها صدقة ولنا هدية**" (وہ اُس کے لیے صدقہ اور ہمارے لیے ھدیہ ہے)۔(۲)

اہل بیت کا ذکر قرآن کے ساتھ کرنے میں حکمت

۲۔ نبی کریم ﷺ نے اہل بیت کے بارے میں وصیت کو کتابِ الٰہی کی وصیت کے ساتھ ملایا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حضرات اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

۳۔ اہل بیت کرام علیہم السلام کے بارے میں وصیت کے الفاظ کو تین مرتبہ ارشاد فرمانے میں اس بات پر دلالت ہے کہ اُن سے سچی محبت رکھی جائے، اُن سے مودت کا مظاہرہ کیا جائے، اور یہ کہ کسی کے لیے اس معاملہ میں کوتاہی کرنے پر کوئی عذر باقی نہ رہے۔

---

(۱) مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه، حديث ٢٤٠٨؛ صحيح ابن خزيمة: كتاب الزكاة، باب ذكر الدليل على أن بني عبد المطلب هم من آل النبي ﷺ ج٢ ص١١٣٢، ١١٣٣، حديث ٢٣٥٧؛ المعجم الكبير ج٣ ص٢٩٩، ٣٠٠، حديث ٤٨٨٨۔

(۲) بخاري: كتاب الزكاة، باب مايذكر في الصدقة للنبي ﷺ ص٢٠٢، حديث ١٤٩٣۔

٤۔ نبی کریم ﷺ کے اس بات کے تین مرتبہ تکرار میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اہل بیت کے بارے میں صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیۓ اور اگر اُن کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے تو برداشت کرنا چاہیۓ۔

٥۔ اس میں اہلِ سنت کے لیے بشارت ہے، اس لحاظ سے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کی وصیت کو سینے سے لگایا، کتاب اللہ کو عمل کے ساتھ تھاما، اہلِ بیت کی تعظیم وتکریم کی اور ان کے علم، فہم اور سیرت کی اتباع کی، بخلاف اُن لوگوں کے جنہوں نے کتاب اللہ پر عمل کا دعویٰ کیا مگر مسلمانوں کی تکفیر کی اور انہیں قتل کیا، یا اُنہوں نے اہلِ بیت سے محبت کا دعویٰ کیا مگر اُن پر افترا باندھا، ان کے دین میں ردوبدل کر دیا اور اُن کے اعتقاد، عمل اور سیرت میں تحریف کر کے اُن سے دشمنی کی۔

٦۔ اس میں نبوی پیش گوئیوں میں سے ایک پیش گوئی ہے، وہ یہ کہ رسول کریم ﷺ نے ثقلین (دو بھاری چیزوں) کو تھامنے کی ترغیب دی، [١] کتاب اللہ اور سنت اس کے تابع ہے [٢] اور اہلِ بیت، اور جس نے ان دونوں کو چھوڑ دیا گمراہ ہوا، پس آپ کے ارشاد کے مطابق ہی ہوا۔

٧۔ اہل بیت کرام علیہم السلام کے فضائل کو ظاہر کرنا اور اُن کو پھیلانا مستحب ہے، خاص طور پر خطبہ اور اُس طرح کے دیگر مقامات ومواقع پر۔

٨۔ اس میں اہل بیت کے بارے میں غلو کرنے سے خبردار کیا گیا ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد "إنما أنا بشر" (میں ایک بشر ہی ہوں) میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور جب اصل کے بارے میں یہ بات ہے تو فرع پر بدرجۂ اولیٰ یہ بات صادق ہوگی۔

٩۔ اس میں تصریح ہے کہ تمام بنو ہاشم آل کے مفہوم میں شامل ہیں، اور سیدنا زید رضی اللہ عنہ کا قول مرفوع کے حکم میں ہے، اس کی تائید متعدد احادیث سے ہوتی ہے، جیسا کہ آگے پندرھویں حدیث میں ہے: "کیا تمھیں پتا نہیں کہ ہم اہل بیت صدقہ نہیں کھاتے"۔

١٠۔ اس میں بنو ہاشم پر صدقہ حرام ہونے کی تصریح ہے، اور سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے جو بات کہی، ایسی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جاتی، اور اس مسئلہ میں احادیث معلوم ومعروف ہیں، اُن میں سے بعض عنقریب آگے آئیں گی۔

١١۔ اس میں سفر کے دوران وعظ و نصیحت کے مستحب ہونے کی دلیل ہے، اگر ضرورت پیش آئے، ورنہ سفر میں بنیادی طور پر ایسی ساری باتوں میں تخفیف ہوتی ہے۔

چھٹی حدیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص پسند کرتا ہے کہ جب ہم اہل بیت پر درود بھیجے تو اپنا (اجر و ثواب کا) پیمانہ پورا بھر کرلے تو وہ یہ الفاظ کہے:

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ وَأَزْوَاجِهِ أُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِينَ وَذُرِّيَّتِهِ وَأَهْلِ بَيْتِهِ كَمَا صَلَّيْتَ عَلىٰ آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ.

یہ حدیث حسن ہے، اس کو امام ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کے متعدد شواہد ہیں۔(١)

ان میں سے ایک شاہد وہ ہے جسے امام عبدالرزاق اور امام احمد نے ایک صحابی سے روایت کیا ہے اور اُس میں یہ الفاظ زائد ہیں:

وَبَارِكْ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَعَلىٰ أَهْلِ بَيْتِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ...(٢)

نیز امام احمد نے حضرت ابوطلحہ القاص سے بھی اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل ابوحمید الساعدی سے صحیحین میں موجود ہے۔(٣)

چھٹی حدیث سے ماخوذ مسائل

١۔ یہ حدیث اہل بیتِ نبوت کے ذکر میں جامع ترین حدیث ہے۔

---

(١) سنن أبي داود: کتاب الصلاة، باب الصلاة علی النبي ﷺ بعد التشهد، حدیث ٩٨٢۔

(٢) المصنَّف ج٢ ص ٢١١ حدیث ٣١٠٣، وط: ج٢ ص ١٣٨ حدیث ٣١٠٨؛ مسند أحمد ج٥ ص ٣٧٤، وط: ج٣٨ ص ٢٣٧، ٢٣٨، حدیث ٢٣١٧٣، وط: ج٧ ص ٦٧٤، حدیث ٢٣٥٦٠۔

(٣) بخاري: کتاب أحادیث الأنبیاء، باب: ١٠، ١١ ص ٤٥٨ حدیث ٣٣٦٩؛ مسلم: کتاب الصلاة، باب الصلاة علی النبي ﷺ بعد التشهد، حدیث ٤٠٧۔

اہل بیت درود کے لیے مخصوص

۲۔ علامہ ابن القیم نے ''جلاء الأفهام'' میں کہا ہے:(۱)

''نبی کریم ﷺ نے ازواج، ذریت اور اہل کو جمع فرمادیا ہے، اور آپ نے اُن کے تعین میں تصریح فرمادی ہے تاکہ واضح ہوجائے کہ وہ سب نہ صرف آل میں شامل ہونے کے حق دار ہیں، اور آل سے خارج نہیں بلکہ وہ ہر اُس انسان سے زیادہ حق دار ہیں جو آل میں شامل ہے، اور یہ نظیر ہے خاص کے عام پر عطف اور اُس کے برعکس کی، انواع کے مابین معطوف علیہ کا بالخصوص ذکر اُس کے شرف پر متوجہ کرنے کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنی نوع کے دوسرے افراد سے زیادہ حق دار ہوتا ہے۔(۲)

۳۔ اس میں تمام امت کے مقابلہ میں اہلِ بیت کی خصوصیت کی دلیل ہے، اس حیثیت سے کہ نمازوں میں درود کے لیے انہیں سب لوگوں میں سے خاص کیا گیا ہے اور علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق درود فرض ہے، جیسا کہ امام شافعی، امام احمد اور دوسرے فقہاء کی رائے ہے۔

---

(۱) جلاء الأفهام ص ۲۵۱، ۲۵۲۔

(۲) اس عبارت میں معطوف علیہ لفظ ''محمد'' ہے اور یہی صلاۃ کے لیے خاص ہے اور ازواج، ذریت اور اہل بیت اُس کے معطوفات ہیں اور یہ اُس کے عام ہیں۔ علامہ ابن قیم مذکورہ بالا عبارت کے بعد لکھتے ہیں:

أن ذكر الخاص قبل العام أو بعده قرينة تدل علىٰ أن المراد بالعام ماعداه.

''خاص کا ذکر عام سے قبل یا بعد ایک قرینہ ہے جو دلالت کرتا ہے کہ عام سے مراد اُس کے ماسوا ہیں''۔(1)

مطلب یہ ہے کہ صلاۃ کے لیے حضور ﷺ مخصوص کیے گئے ہیں اور حدیث میں جن دوسرے لوگوں کا ذکر ہوا وہ بطورِ معطوفات حضور ﷺ کے ماسوا ہیں، اور چونکہ اُن کا ذکر صراحتاً کیا گیا ہے اس لیے وہ حضور ﷺ کے بعد دوسروں کی بنسبت صلاۃ کے زیادہ حق دار ہیں۔

---

(1) جلاء الأفهام ص ۲۵۲۔

٤۔ اس میں آپ ﷺ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اور ذریت کی بے پایاں حرمت وعظمت کی دلیل ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اُن کے لیے کامل اور اکمل درود مقرر فرمایا ہے اور یہ درود بھیجنے کا حکم پوری امت کے لیے قیامت تک کے لیے ہے۔

٥۔ اہل بیت کو خوش کرنا اور ان کی خوشی پر خوش ہونا مستحب ہے۔

٦۔ علامہ شوکانی نے ''النیل'' میں کہا ہے کہ درود شریف کے ان الفاظ کا دوسرے الفاظ کی بنسبت اجرِ عظیم اور ثواب زیادہ ہے۔(١)

کون سا درود افضل ہے؟

٧۔ الفاظ نبوی ﷺ ''المکیال الأوفی'' میں اُن لوگوں کا رد ہے جو اہل بیت پر درود کے الفاظ اپنی طرف سے گھڑتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ افضل درود ہے، اس لیے کہ یہ اللہ جل جلالہ اور اُس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی قبیل سے ہے۔(٢)

---

(١) نیل الأوطار ج٤ ص٣٧٩۔

(٢) رسول اللہ ﷺ سے ''آگے بڑھنا'' انتہائی سخت لفظ ہے، لیکن اگر واقعی کوئی شخص عربی یا غیر عربی الفاظ میں اپنے یا کسی کے مرتب کردہ درود کو الفاظِ نبوی ﷺ میں منقول کسی بھی درود سے بہتر سمجھتا ہو تو یقیناً وہ تقدم علی الرسول کا مرتکب ہوگا، اور یہ ایمان کے منافی ہے۔اس سے وہ لوگ عبرت حاصل کریں جو قولاً اور عملاً الفاظ نبوی ﷺ میں منقول درودوں پر لوگوں کے بنائے ہوئے درودوں کو ترجیح دیتے ہیں۔احمقوں کو تو خدا ہی سمجھے، تاہم عقل مندوں کے لیے درجِ ذیل اقتباس کافی ہوگا۔امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ سے تحریراً دریافت کیا گیا:

''بعد سلام علیک حضور کی خدمت میں میری عرض یہ ہے کہ مجھے درود شریف جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اُس کی یا کسی دوسرے درود شریف کی جو سب درودوں سے افضل ہو، اجازت فرمائیں''۔

الجواب: سب درودوں سے افضل درود وہ ہے جو سب اعمال سے افضل یعنی نماز میں مقرر کیا گیا ہے''۔(1)

---

(1) فتاوی رضویه ج٦ ص١٨٣۔

۸۔ الفاظ نبوی ﷺ ''الأوفی'' میں دلیل ہے کہ حضور ﷺ اور آپ کی آل پر صلاۃ کے صیغے ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں۔

۹۔ اس میں اہلِ بیت کرام رضی اللہ عنہم کے کسی ایک فرد پر درود بھیجنے کا جواز ہے، لیکن کیا یہ بطور شعار اُن کے لیے درست ہے؟ اس میں اختلاف ہے، راجح قول اس کا شعار نہ ہونا ہے، اس لیے کہ ابتدائی دور اور فضیلت والے زمانوں میں ایسا نہیں تھا، یہاں تک کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''سلف میں یہ کسی کا عمل نہیں رہا''۔

۱۰۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر اہل بیت ہمارے ساتھ بھلائی کریں، خاص طور پر جب وہ دینی بھلائی ہو تو بہت بڑھ کر اُن کا احسان چکانا چاہیئے۔

۱۱۔ اگر پوچھا جائے کہ حضور ﷺ نے آل محمد کا ذکر تفصیل سے کیوں فرمایا، چنانچہ اپنا، اپنی ازواج، اپنی ذریت اور اپنے باقی اہل بیت کا ذکر فرمایا؟

جواباً کہیے کہ اس کی وجہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر (سیدنا) محمد ﷺ کو اور آلِ ابراہیم علیہ السلام پر آل محمد ﷺ کو زیادہ شرف حاصل ہونا ہے۔

اگر پھر کہا جائے کہ یہ تشبیہ محلِ نظر ہے، کیونکہ آل محمد کو آل ابراہیم سے تشبیہ دی گئی ہے، اور مشبّہ بہ (جس سے تشبیہ دی جائے) وہ مشبّہ (جس کو تشبیہ دی جائے) سے قوی ہوتا ہے۔

تو جواباً کہیے کہ بالفرض اگر اس اطلاق کو درست تسلیم کیا جائے تو کہا جائے گا سیدنا محمد ﷺ بھی آل ابراہیم میں شامل ہیں، جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ مشبہ بہ کے عموم میں داخل ہیں پھر خصوصاً بطور مشبّہ منفرد بھی ہیں، پس اس لحاظ سے آپ صلاۃ کے زیادہ حق دار ہیں اور آپ کے اہل بیت بھی اس میں شامل ہیں۔

پھر اگر کہا جائے کہ آل ابراہیم سے کیوں تشبیہ دی گئی؟

تو جواباً کہیے: عالمین میں اُن کی فضیلت اور شہرت کی وجہ سے۔

۱۲۔ اہل بیت کی تفسیر میں آپ کے ''أزواجه أمهات المؤمنين وذريته وأهل بيته'' فرمانے میں

لفظ آل کو مطلق لینے پر تنبیہ ہے۔ پس اس میں ان لوگوں کی تردید ہے جو کہتے ہیں اہل بیت کی فضیلت میں جو تصریحات آئی ہیں اُن سے مراد آپ کی ملت کے جملہ پیروکار ہیں، اور یہ لوگ مشہور حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ جب سید عالم ﷺ سے دریافت کیا گیا: آل محمد کون ہیں؟ تو فرمایا: ''**کل مؤمن تقي**'' (ہر متقی مومن) سو جہاں تک اس حدیث کا معاملہ ہے تو اسے عُقیلی نے روایت کیا ہے۔(۱) اور یہ مُنکَر بلکہ کذب ہے، اس کی کوئی اصل نہیں، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے کہا ہے (۲) اور اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے الفاظ ''**أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي**'' (میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ یاد کراتا ہوں) (۳) کی کوئی حقیقت ہی نہیں اور نہ ہی آپ کا سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو ''**أما شعرت أنا أهل بيت لا نأكل الصدقة**'' (کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم اہل بیت ہیں، ہم صدقہ نہیں کھاتے)(٤) فرمانے کا کوئی مقصد رہے گا، اور اسی طرح آپ کا دو مینڈھے ذبح فرمانا ''ایک امتِ محمد کی طرف سے اور دوسرا محمد اور آل محمد کی جانب سے'' (٥) بھی بے معنی سمجھا جائے گا۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ ''**الشعب**''(٦) میں لکھتے ہیں: ''اس حدیث میں دلیل ہے کہ لفظ آل خاص قرابت داروں کے لیے ہے، عامۃ المومنین کے لیے نہیں''۔(٧)

---

(۱) كتاب الضعفاء للعقيلي ج ٤ ص ١٤١٣، السنن الكبرىٰ للبيهقي ج٢ ص ١٥٢، وط: ج٢ ص ٢١٨ حديث ٢٨٧٣۔

(٢) مجموعة الفتاوىٰ ج٢٢ ص ٤٦٩؛ جلاء الافهام ص ٢٤٩۔

(٣) یہ حدیث، حدیث نمبر پانچ کا ایک جملہ ہے۔

(٤) یہ حدیث آگے پندرھویں نمبر پر آ رہی ہے۔

(٥) شعب الإيمان ج٢ ص ٢٢٥ حديث ١٥٩١۔

(٦) شعب الإيمان ج٢ ص ٢٢٥۔

(٧) **کیا ہر متقی مومن آل ہے؟**

اوپر حاشیہ نمبر ایک پر جس روایت کی طرف نشان دہی کی گئی ہے، اس سے بڑے بڑے لوگوں کو دھوکہ لگا =

. . . .

= ہے اور اُنہوں نے تمام اہل تقوی کو آلِ محمد میں شامل کر دیا ہے، حالانکہ یہ روایۃً اور درایۃً دونوں طرح مردود ہے۔ اس کے روایۃً مردود ہونے پر کافی محدثین نے تصریح فرمائی ہے۔ چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

هذا لايحل الاحتجاج بمثله، نافع السلمي أبو هرمز بصري، كذبه يحيىٰ بن معين وضعفه أحمد بن حنبل وغيره من الحفاظ.

''ایسی روایت سے استدلال درست نہیں، اس میں ابوہرمز نافع سُلمی کو محدث یحییٰ بن معین نے جھوٹا اور امام احمد بن حنبل اور دوسرے حفاظ نے ضعیف قرار دیا ہے''۔(1)

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

كل مؤمن تقي، وهذا الحديث موضوع لاأصل له.

''كل مؤمن تقي، یہ حدیث موضوع ہے، اس کی کوئی اصل نہیں''۔(2)

علامہ ابن قیم نے اس حدیث کو امام طبرانی اور امام بیہقی سے نقل کیا ہے، طبرانی کی سند میں ایک شخص نوح ہے اور بیہقی کی سند میں ابو ہرمز ہے، وہ ان دونوں کے متعلق لکھتے ہیں:

ونوح هذا، ونافع أبو هرمز لا يحتج بهما أحد من أهل العلم ،و قد رميا بالكذب.

''اِس نوح اور نافع ابو ہرمز سے اہل علم میں سے کسی نے دلیل نہیں لی، اور ان کو جھوٹا کہا گیا ہے''۔(3)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

سنده واه جداً.

''اس کی سند انتہائی کمزور ہے''۔(4)

اور اس کا درایۃً مردود ہونا بالکل ظاہر ہے، کیونکہ آل کا دامن تھامنے کا حکم ہے، سو اگر پوری امت ہی آل =

---

(1) السنن الكبرىٰ للبيهقي ج٢ ص١٥٢ ،وط: ج٣ ص٦٨٥ حديث٢٩١٢۔

(2) مجموع الفتاوى ج٢٢ ص٤٦٢۔

(3) جلاء الأفهام ص٢٤٩۔

(4) فتح الباري ج١٤ ص٣٨١ حديث٦٣٥٨۔

اور رہا مطلقاً لفظ آل تو اُس کا اطلاق کبھی صحابہ اور امت پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت واثلہ کی حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''یہ میرے اہل ہیں'' تو وہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اور میں بھی آپ کے اہل سے ہوں؟ فرمایا: ''تم بھی میرے اہل سے ہو''۔ حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ سب سے بڑی تمنا ہے جو میں نے کی۔ اسی طرح اس کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔ (۱)

اور ابوالشیخ نے ''طبقات المحدثین'' میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: محمد ﷺ کی آل آپ کی امت ہے۔ پس مطلق آل میں اور مطلق لفظ آل میں فرق ہے اور ایسی مثالیں کتاب وسنت کی نصوص میں بہت ہیں۔ (۲)

۱۳۔ ارشادِ نبوی ﷺ ''وبارک علیٰ محمد وأهل بيته'' میں بشارت ہے کہ عنقریب اہل بیت کثیر ہو جائیں گے، اس لیے کہ ''بركة'' کا معنیٰ ہے بڑھنا اور زیادہ ہونا، جیسا کہ خلیل بن احمد فراہیدی نے فرمایا ہے۔ (۳)

= ہوتو پھر وہ کون ہوگا جو دامن تھامے گا اور وہ کون ہوگا جس کا دامن تھامنے کا حکم ہے؟ قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

فإنه لو كان الآل جميع الأمة لكان المأمور بالتمسک والأمر المتمسک به شيئاً واحداً وهو باطل.

''پس اگر جمیع امت ہی آل ہو تو جس کو پیروی کرنے کا حکم ہے اور جس کی پیروی کرنے کا حکم ہے دونوں ایک ہی چیز قرار پائیں گے، اور یہ باطل ہے''۔ (1)

(۱) السنن الكبرىٰ ج۲ ص۱۵۲، وط: ج۲ ص۲۱۸ حديث ۲۸۷۰، الدر المنثور ج۱۲ ص۴۱۔

(۲) اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ جب مطلقاً آل کہا جائے تو اس سے مراد ذریتِ مصطفیٰ ﷺ ہوتی ہے، کیونکہ یہی وہ دوسرا ثقل ہے جو قرآن کریم کے ساتھ چھوڑا گیا، تاہم لفظ آل کی لغوی وسعت کو مدنظر رکھا جائے تو اس کے معنوی احاطہ میں بہت کچھ آ سکتا ہے۔

(۳) كتاب العين ص۶۹، وط: ج۵ ص۳۶۸۔

---

(1) نيل الأوطار ج۴ ص۳۷۷۔

سب سے بڑھ کر بابرکت خاندان

۱٤۔ ارشادِ نبوی ﷺ "وبارک..." میں یہ بشارت بھی ہے کہ اہلِ بیت میں ایسی برکت، بھلائی اور فضائل ہیں جو کائنات کے اعلیٰ خاندانوں میں سے کسی بھی خاندان میں نہیں۔ چنانچہ اُن کی بدولت دنیا و آخرت کی برکات ظاہر ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کے دین اور اُس کے کلمۂ حق کو جو بلندی اُن کے گھرانے سے حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے گھر سے حاصل نہیں ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ کی اولین وآخرین کے سردار ﷺ پر اور اُن کے طیب وطاہر اہل بیت پر صلاۃ ہو اور قیامت تک مسلسل بڑھنے والا خوب سلام ہو۔(۱)

---

(۱) اہل بیت کے ساتھ "علیہ السلام" کہنے کا حکم؟

چونکہ کائنات میں اہل بیت سب سے بڑھ کر بابرکت خاندان ہے، اسی لیے اِس خاندان پر صلاۃ وسلام بھیجنے کا حکم ہے، تاکہ اس کی بدولت بھیجنے والے کو بھی خیر و برکت حاصل ہو۔ شاید اسی لیے نماز میں بھی درود مقرر کیا گیا، جو کہ امام شافعی، امام احمد اور دوسرے فقہاء کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک فرض ہے، جیسا کہ مؤلف نے اِسی حدیث کے تیسرے فائدے میں ذکر کیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا انفراداً اہل بیت کے کسی فرد پر سلام بھیجنا جائز ہے؟ مؤلف نے اِس حدیث کے نویں فائدے میں اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ پہلے تو اُنہوں نے لکھا کہ "اس حدیث میں اہلِ بیت کے کسی ایک فرد پر درود بھیجنے کا جواز ہے" پھر اگلے ہی جملہ میں اس کی تردید کر دی اور دلیل یہ دی کہ یہ اسلاف کا شعار نہیں رہا۔

چونکہ مؤلف نے یہ مسئلہ چھیڑ دیا ہے، لہٰذا ہم اس پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔

کتاب وسنت کی تصریحات کے پیشِ نظر تو ہر مسلمان پر صلاۃ اور سلام دونوں جائز ہیں، لیکن علماء کرام نے کچھ ضوابط مقرر فرمائے ہیں اور جواز وعدم جواز کی ساری بحث اُنہیں ضوابط پر چلتی ہے۔ جس صاحب کو اردو زبان میں یہ بحث قدرے تفصیل سے مطلوب ہو تو وہ علامہ رسول سعیدی حفظہ اللہ کی تصانیف "تبیان القرآن ج ٥ ص ٢٤٨، وج ٩ ص ٥٤٧؛ نعمة الباري ج ٣ ص ٧٣٧؛ شرح صحيح مسلم ج ٢ ص ١٠١٨" وغیرہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ صاحب کا موقف یہ ہے کہ انفراداً صلاۃ بھیجنا تو غیر نبی پر جائز نہیں، البتہ سلام بھیجنا جائز ہے۔ آگے چل کر ہم علامہ سعیدی حفظہ اللہ تعالیٰ کے خلاصہ کے الفاظ نقل کریں گے۔=

....

= اس مسئلہ میں بعض معاصرین کی زیادتی

اگر کوئی شخص اس مسئلہ کی مکمل تحقیق کے درپے ہوا تو لازماً وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ اختلافی مسئلہ ہے، اور جو لوگ اس کے عدم جواز پر زور دیتے ہیں اُن کے پاس تشبہ بالروافض کے علاوہ دوسری کوئی دلیل نہیں ہے۔ آگے چل کر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی عبارت میں یہ وضاحت آئے گی کہ کسی قوم ومذہب کے ساتھ تشبہ کن باتوں میں ممنوع ہوتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس مسئلہ میں بعض معاصرین نے شدت اختیار کی ہے، اور اُنہوں نے اس مسئلہ کو اپنی اُس کتاب میں درج کر دیا ہے، جس کا نام ہے **"کفریہ کلمات کے بارے میں سُوال جواب"** لیجئے! سوال وجواب اُنہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

سُوال: غیر نبی کے ساتھ "**علیہ السلام**" لکھنا اور بولنا کیسا ہے؟

جواب: منع ہے۔ چنانچہ حضرت صدر الشریعہ، بدر الطریقہ علامہ مولٰینا مفتی محمد امجد علی اعظمی علیہ رحمۃ اللہ القوی کی خدمت میں سوال ہوا: یا حسین علیہ السلام کہنا جائز ہے یا نہیں اور ایسا لکھنا بھی کیسا ہے اور پکارنا کیسا ہے؟ الجواب: یہ سلام جو نام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے یہ (یعنی علیہ السلام کہنا لکھنا) سلام تحیت (ملاقات کا سلام) نہیں جو باہم ملاقات کے وقت کہا جاتا ہے یا کسی ذریعہ سے کہلایا جاتا ہے بلکہ اس (یعنی علیہ السلام) سے مقصود صاحب اسم (یعنی جس کا نام ہے اُس) کی تعظیم ہے۔ عرف اہل اسلام نے اس سلام (یعنی علیہ السلام لکھنے بولنے) کو انبیاء وملائکہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت میکائیل علیہ السلام، لہٰذا غیر نبی ومَلَک (نبی اور فرشتے کے علاوہ) کے نام کے ساتھ علیہ السلام نہیں کہنا چاہیے۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعۡلَمُ "۔[فتاویٰ امجدیہ ج٤ ص٢٤٣، ٢٤٥] (1)=

---

(1) کفریّہ کلمات کے بارے میں سُوال جواب، لأبی البلال عطار قادري، ص٢٤٣، ٢٤٤، مکتبة المدینة کراچي۔

....

= فتاوی امجدیہ کے اس اقتباس میں توضیحی قوسین معاصر موصوف کی طرف سے ہیں۔موصوف سے اس مسئلہ میں دو طرح سے شدت ہوگئی ہے:

١۔ اولاً تو یہ کہ فتاوی امجدیہ کے الفاظ نرم ہیں، جیسا کہ آخری الفاظ ''نہیں کہنا چاہیے'' میں لفظ ''چاہیے'' سے عیاں ہے، لیکن معاصر موصوف نے صاف لکھ دیا ''منع'' ہے، جبکہ اہل بیت پر سلام ممنوع نہیں، مأمور بہ ہے۔

٢۔ دوسری شدت اُن سے یہ ہوئی کہ انہوں نے اِس مسئلہ کو اُس کتاب میں درج کر دیا جو **''کفریہ کلمات کے بارے میں سوال جواب''** پر مشتمل ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے اس مسئلہ کو کفر نہیں بلکہ ممنوع لکھا ہے، لیکن ایسے ٹائٹل والی کتاب میں اس مسئلہ کو شامل کرنا پرلے درجے کی بے احتیاطی ہے۔

قارئین کرام! موصوف کا جس مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اس مکتبِ فکر کے لوگوں کی عادت ہے کہ اگر اُن کے کسی عمل و معمول پر کوئی اعتراض کرے تو وہ فوراً مطالبہ کرتے ہیں کہ: **''دکھاؤ اس کی ممانعت کہاں لکھی ہے؟''** لیکن نہ معلوم ایسے لوگوں کو یہ قاعدہ اس مسئلہ میں کیوں نہ یاد رہا اور انہوں نے کیوں صاف لکھ دیا کہ یہ ''منع'' ہے، حالانکہ کتاب و سنت میں اس کی کہیں بھی ممانعت کی تصریح نہیں آئی۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ کسی مسئلہ میں علماء و فقہاء کا باہم اختلاف ہونا اور بات ہے اور نصوصِ شریعت سے اُس کی ممانعت کا ثابت اور منصوص ہونا اور بات ہے۔ اگر کسی عمل کی ممانعت نص سے ثابت ہو جائے تو پھر اُس میں اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔ ممانعت کی تصریح کی تین صورتیں ہیں: کتاب و سنت اور کامل اجماع امت، چونکہ اہل بیت کرام کے اسماء مبارکہ کے ساتھ لفظ ''علیہ السلام'' کی ممانعت پر کتاب و سنت اور اجماع امت کی صورت میں کوئی تصریح نہیں ہے، اسی لیے یہ اختلافی مسئلہ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ صاحب فتاوی امجدیہ کے الفاظ میں لچک ہے۔ انہوں نے دوٹوک انداز میں نہیں فرمایا ''منع ہے'' بلکہ لکھا ''نہیں کہنا چاہیے''۔ اُن کی اِس تحریر کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُن کا یہ انداز عالمانہ شان اور آدابِ اختلاف کے مطابق ہے، لہٰذا **''کفریہ کلمات کے بارے میں سوال جواب''** کے مؤلف کو بھی چاہیے تھا کہ وہ پہلے اس مسئلہ کی نزاکت کو سمجھتے پھر اس کو اپنی کتاب میں شامل کرتے۔

اُنہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اِس مسئلہ نے آج کل نہیں سر اُٹھایا بلکہ یہ قرونِ اُولیٰ سے ہی چلا آرہا ہے، =

....

= چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اس مسئلہ کے بارے میں کہنا کہ یہ اسلاف کا معمول نہیں تھا، بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ اُن کے دَور میں یہ الفاظ زبان وقلم پر جاری تھے اور وہ تابعین کا دور تھا۔ پھر تب سے اب تک اکابرینِ امت کا بلا تعطل ہر دور میں اس پر عمل رہا ہے اور بشمول کتبِ احادیث تمام کتبِ اسلامیہ میں اہل بیت کرام کے اسماء مبارکہ کے ساتھ "علیہ السلام" کا لفظ لکھا جاتا رہا ہے اور اب تک کتبِ صحاح سمیت تمام کتبِ احادیث جو حجاز مقدس، ریاض، مصر اور بیروت وغیرہ سے شائع ہو رہی ہیں، اُن میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

یہاں اِس حقیقت پر بھی توجہ رہے کہ مسائلِ دینیہ کا دارومدار برصغیر کے چند علماء کی کتب پر نہیں بلکہ اس کے لیے دنیا بھر کے تمام معتبر علماء اہل سنت کی کتب ماٰخذ ومراجع کا درجہ رکھتی ہیں۔ سو صاحب فتاوی امجدیہ کا "نہیں کہنا چاہیے" لکھنا اپنی جگہ مگر اس مسئلہ پر دوسرے علماء نے بھی لکھا ہے اور اُن کی تصانیف کے اردو زبان میں تراجم بھی ہو چکے ہیں، بلکہ ماضی قریب کے ایک جید عالم دین (محدث اعظم غزالیٔ زماں رازیٔ دوراں سیدنا احمد سعید شاہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ) کا اس مسئلہ کے اثبات پر قومی زبان میں مستقل ایک رسالہ موجود ہے۔ نیز اس مسئلہ کے اثبات میں تردیدِ روافض میں مشہور مصنف شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک فتویٰ موجود ہے، اور اُس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ کاش ہمارے معاصر نے اس مسئلہ کو اپنی کتاب میں درج کرنے سے قبل ایسی تحریروں کو مدنظر رکھا ہوتا! "فتاوی عزیزی" کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

سوال: تحفہ اثنا عشریہ میں صلوٰۃ وسلام یعنی درود وسلام بالاستقلال بارہ امام کے حق میں لکھا ہے، حالانکہ یہ امر اہل سنت والجماعت کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس واسطے کہ اس میں اہل بدعت کی مشابہت لازم آتی ہے اور اہل سنت نے ایسی مشابہت سے پرہیز کرنا اپنے لیے لازم جانا ہے تو اس امر کے جواز کے لیے سند اہل سنت کی کتب معتبرہ سے بیان کرنا چاہیئے۔

جواب: تحفہ اثنا عشریہ میں کسی جگہ صلوٰۃ بالاستقلال غیر انبیاء کے حق میں نہیں لکھا گیا، البتہ لفظ علیہ السلام کا حضرت امیر المومنین وحضرت سیدۃ النساء وجناب حسنین ودیگر ائمہ کے حق میں مذکور ہے اور اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ صلوٰۃ بالاستقلال غیر انبیاء کے حق میں درست نہیں اور لفظ سلام کا غیر انبیاء کی شان میں کہہ سکتے ہیں۔ اس کی سند یہ ہے کہ اہل سنت کی =

....

= کتب قدیمہ حدیث میں علی الخصوص ابو داؤد وصحیح بخاری میں حضرت علی وحضرات حسنین و حضرت فاطمہ، حضرت خدیجہ وحضرت عباس کے ذکر مبارک کے ساتھ لفظ علیه السلام کا مذکور ہے۔ البتہ بعض علماء ماوراء النہر نے شیعہ کی مشابہت کے لحاظ سے اس کو منع لکھا ہے، لیکن فی الواقع مشابہت بدوں امر خیر میں منع ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ پہلی کتاب اصول حنفیہ کی شاشی ہے۔ اس میں نفس خطبہ میں بعد حمد وصلوۃ کے لکھا ہے "والسلام علیٰ أبي حنيفة و أحبابه" (یعنی سلام نازل ہو حضرت ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ پر اور آپ کے احباب پر)، اور ظاہر ہے کہ مرتبہ حضرات موصوفین کا جن کا نام نامی اوپر مذکور ہوا ہے حضرت امام اعظم کے مرتبہ سے کم نہیں، تو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کے نزدیک بھی لفظ سلام کا اطلاق ان بزرگوں کی شان میں بہتر ہے اور حدیث شریف سے بھی ثابت ہے کہ لفظ "علیه السلام" کا غیر انبیاء کی شان میں کہنا چاہیے۔ چنانچہ یہ حدیث ہے: علیه السلام تحية الموتیٰ.

"یعنی اموات کی شان میں علیه السلام کہنا اُن کے لیے تحفہ ہے"۔

یعنی بلا تخصیص ہر میت مسلمان کے لیے لفظ علیہ السلام کا تحفہ ہے تو اہل اسلام میں غیر انبیاء کی شان میں بھی علیه السلام کہنا شرعاً ثابت ہے، فقط"۔(1)

اس عبارت میں حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بخاری اور سنن ابی داود میں اہل بیت کرام علیہم السلام کے اسماء مقدسہ کے ساتھ "علیــه الســلام" کے الفاظ مرقوم ہیں۔ میں کہتا ہوں: بلکہ صحیح مسلم، سنن ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں بھی مرقوم ہیں اور امام نسائی کی کتاب "خـصـائص علي رضي الله عنه" میں بھی مرقوم ہیں، جیسا کہ ہم "خـصـائص علي رضي الله عنه" کی شرح میں تفصیلاً لکھ چکے ہیں۔ اُس وقت "شـرح خـصـائص علي رضي الله عنه" میں سنن ابی داود کا حوالہ نہیں دیا جا سکا تھا، لہٰذا اُسے اب یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ سنن ابی داود بتحقیق البانی صفحہ ۹۱۵ رقم الحدیث ۵۰۶۴ میں ہے: عـن عـلـي علیه السلام۔ اسی طرح عزت عبید الدعّاس وغیرہ کی تحقیق کے ساتھ سنن ابی داود ج ۵ ص ۱۹۴ میں اسی رقم الحدیث میں علیہ السلام کے الفاظ مرقوم ہیں۔ سنن ابی داود علامہ وحید الزمان =

(1) فتاوی عزیزي مترجم اردو ص ۲۶۰، ۲۶۱۔

....

= کے ترجمہ کے ساتھ ج ۳ ص ۴۳۹ میں بھی اسی طرح ہے، جبکہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ بعض مطابع سے یہ الفاظ اڑا دیے گئے۔

پھر اسی طرح سنن ابی داود کی حدیث نمبر ۳۵۸۲ میں بھی "عن علي عليه السلام" لکھا ہوا ہے۔(1)

"شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ" صفحہ ۱۲ تا ۱۷ میں اِس مسئلہ کے عملی ثبوت میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارقطنی، امام حاکم، امام ابن سعد، امام غزالی، امام ابن جوزی، امام محبّ الدین الطبری، علامہ ابن قیم، حافظ ہیثمی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہم کے اسماء آئے تھے، اب ہم اس سلسلے میں چند مزید حوالہ جات پیش کر رہے ہیں۔

الامام المحدث، محسنِ احناف امام ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ الطحاوی متوفی ۳۲۱ھ کی عادت ہے کہ وہ اہل بیت کے اسماء مبارکہ کے ساتھ اکثر "عليه السلام" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے احبیت کے موضوع سے متعلقہ احادیث کے لیے اُن کی مشہور تصنیف "شرح مشكل الآثار" کی ۱۳ ویں جلد کھولی تو فقط مطلوبہ احادیث کی تخریج و تطبیق میں انہوں نے سیدنا علی اور عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما کے اسماء کے ساتھ دو مقام پر "عليهما السلام" لکھا ہے، سیدہ فاطمہ کے مبارک نام کے ساتھ "عليها السلام" لکھا ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بابرکت نام کے ساتھ "عليه السلام" لکھا ہے۔ باقی جلدوں کا اندازہ خود لگا لیجئے۔(2)

امام ابوسلیمان حمد بن محمد الخطابی متوفی ۳۸۸ھ نے سیدہ کائنات رضی اللہ عنہا کے مبارک نام کے ساتھ "عليها السلام" لکھا ہے۔(3)

خطیب بغدادی نے اپنی سند کے ساتھ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک مرتبہ میں ابوجعفر امیر المومنین کے ہاں گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا: اے ابوحنیفہ! آپ نے کن محدثین سے =

---

(1) سنن أبي داود بتحقيق عزت عبيد ج ٤ ص ١١ حديث ٣٥٨٢، وبتحقيق الألباني ص ٦٤٢ حديث ٣٥٨٢۔

(2) شرح مشكل الآثار ج ١٣ ص ٣٢٣ تا ٣٢٩۔

(3) معالم السنن ج ٤ ص ١٤٤۔

....

= حدیث حاصل کی؟ وہ فرماتے ہیں: میں نے کہا:

عن حماد عن إبراهيم عن عمر بن الخطاب، وعلي بن أبي طالب، وعبد الله بن مسعود، وعبد الله بن عباس، قال: فقال أبو جعفر: بخ بخ، استوثقت يا أبا حنيفة الطيبين المباركين صلوات الله عليهم.

''از حماد، از ابراہیم کی سند سے حضرات عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس سے۔ امام صاحب فرماتے ہیں: اس پر ابو جعفر نے کہا: واہ، بہت خوب! اے ابوحنیفہ آپ نے پاکیزہ اور مبارک ہستیوں **صلوات اللہ علیھم** سے پختہ علم حاصل کیا ہے''۔(1)

یہ سلام کے بھی نہیں بلکہ صلوۃ کے الفاظ ہیں، ایسے ہی صلوۃ کے الفاظ امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے امام عالی مقام سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے لیے بھی استعمال فرمائے ہیں، جیسا کہ ہم اُن کی کتاب صفۃ الصفوۃ سے ''**شرح خصائص علي** رضی اللہ عنہ'' میں نقل کر چکے ہیں۔

امام ابواسحاق احمد المعروف ثعلبی متوفی ۴۲۷ھ نے اپنی تفسیر ''**الکشف و البیان**'' میں اس قدر کثرت سے اہل بیت کرام کے ناموں کے ساتھ سلام کے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ احاطہ کرنا مشکل ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ آل عمران کی آیت ۴۲ کے تحت تقریباً ہر جگہ سیدہ مریم کے نام کے ساتھ ''**علیھا السلام**'' لکھا ہے، اور ایک مقام پر سیدہ مریم، سیدہ آسیہ سیدتنا خدیجہ اور سیدۃ نساء العالمین فاطمۃ الزہراء کے ناموں پر جمع کے ساتھ ''**علیھن السلام**'' لکھا ہے۔

پھر اسی سورت کی آیت ۶۱ کے تحت سیدین امامین حسنین کریمین کے نام ساتھ کئی مرتبہ ''**علیھما السلام**'' لکھا ہے۔

سورۃ المائدہ کی آیت ۵۵ کے تحت متعدد مرتبہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ ''**علیہ السلام**'' لکھا ہے۔ اسی طرح سورۃ المجادلہ کی آیت ۱۲، ۱۳ کے تحت بھی ایک سے زائد مرتبہ **علی علیہ السلام** =

---

(1) تاريخ بغداد ج ١٣ ص ٣٣٤، ٣٣٥۔

= السلام لکھا ہے۔

اہل حدیث عالم علامہ اسماعیل بن محمد الامیر صنعانی اہل بیت کے اسماء کے ساتھ بکثرت "علیہ السلام" لکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے "بلوغ المرام" کی شرح میں حدیث نمبر ۲۵۶،۲۵۵ کے تحت دومرتبہ لکھا ہے "حديث علي عليه السلام". (سبل السلام ج٢ ص ١٧٢، ١٧٣) باقی سات جلدوں کے متعلق خود اندازہ فرمالیجئے۔

اہل حدیث مصنف قاضی شوکانی کثرت سے اہل بیت کے اسماء کے ساتھ یہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ میرے مطالعہ کی میز پر اُن کی مشہور کتاب "نیل الأوطار" کی تیسری جلد ایک دو روز پہلے سے ہی رکھی ہوئی تھی، سامنے موجود ہونے کی وجہ سے میں نے اسے اٹھا کر کھنگالنا شروع کیا تو اُس کے صفحات ۲۰، ۵۳، ۵۵، ۵۵، ۲۹۵، ۳۷۹ وغیرھا پر سیدنا علی اور سیدہ فاطمہ کے نام ساتھ "علیہ السلام، علیھا السلام" کے الفاظ مرقوم تھے۔

اہل حدیث عالم نواب محمد صدیق حسن خان قنوجی نے غزوۂ خیبر والی حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

فيه فضائل ظاهرة لعلي عليه السلام.

''اس میں سیدنا علی علیہ السلام کے واضح فضائل ہیں''۔(1)

الغرض کتبِ حدیث میں یہ الفاظ اہل بیت کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے اس قدر کثرت سے استعمال ہوئے ہیں کہ مشہور محدث علامہ غلام رسول سعیدی حفظہ اللہ کو فقط بخاری شریف کے متعلق ایک مقام پر یوں لکھنا پڑا:

> ''میں کہتا ہوں کہ صحیح بخاری کی متعدد احادیث میں مذکور ہے: فاطمہ علیھا السلام اور علی علیہ السلام اور حسین علیہ السلام اور عرف میں لفظ صلوۃ تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے اور سلام کا معنیٰ مخصوص نہیں ہے، جب کوئی شخص کہے: فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے: وعلیکم السلام، وعلیہ السلام''۔(2) =

(1) السراج الوهاج، ج٩ ص ٣٢٩۔

(2) نعمة الباري ج٧ ص ٥٣٧۔

. . . .

= علامہ غلام رسول سعیدی انفراداً غیر انبیاء پر سلام کے جواز کے قائل ہیں۔ چنانچہ وہ مبسوط بحث کے بعد لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے غیر پر تبعاً صلوٰۃ وسلام بھیجنا جائز ہے اور انفراداً اور استقلالاً بھیجنا مکروہ تنزیہی ہے اور صرف سلام بھیجنا جائز ہے۔ یہی جمہور کا مسلک ہے اور یہی ہمارا موقف ہے''۔ (1)

ایک اور مقام پر علامہ سعیدی صاحب کو اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں لکھنا پڑا۔ ہم اُن کے الفاظ درجِ ذیل عنوان کے تحت نقل کر رہے ہیں۔

شیخ سلیم اللہ خان کا اضطراب

کراچی کے ایک عالم شیخ سلیم اللہ خان نے بخاری شریف کی اردو میں شرح کی تو اُن کے سامنے دکتور مصطفیٰ دیب البغا کی تحقیق والانسخہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بیروت ومصر والے لوگ قطع وبرید وغیرہ گھناؤنے اعمال سے تقریباً مبراء ہیں، وہ کسی مصنف کی تحریر کو جوں کا توں چھاپتے ہیں اور اغلاط وغیرہ کی نشاندہی مع اصلاح فٹ لائن کے تحت کرتے ہیں۔ سو اُنہوں نے بخاری شریف کو جوں کا توں شائع کیا اور چونکہ صحاح ستہ کے مصنفین میں سے امام بخاری سب سے زیادہ اہل بیت کے اسماء مبارکہ کے ساتھ ''علیہ السلام'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو شیخ سلیم اللہ خان اس کثرت سے بے چین ہو گئے اور انہیں لکھنا پڑا:

''جمہور علماء کا یہی مسلک ہے کہ غیر نبی کے لیے ''علیہ السلام'' کہنا درست نہیں ہے''۔(2)

اس پر علامہ سعیدی صاحب نے لکھا ہے:

''حضرات اہل بیت کے لیے علیہ السلام کا لفظ استعمال کرنا ہرگز ممنوع نہیں ہے اور یہ امام بخاری کی اہل بیت کے ساتھ محبت ہے کہ وہ ان کے ناموں کے ساتھ علیہ السلام =

---

(1) تبیان القرآن ج٥ ص٢٥١، نعمة الباري ج٣ ص٧٤٠۔

(2) کشف الباري، کتاب التفسیر ص٤٢٣۔

= لکھتے ہیں''۔(1)

شیخ سلیم اللہ خان کے کلام کونقل کرنے سے قبل علامہ سعیدی صاحب نے یوں بھی لکھا ہے:

''تنبیہ: امام بخاری نے حضرت علی کے نام کے ساتھ علیه السلام لکھا ہے، اسی طرح وہ حضرت فاطمہ کے نام ساتھ علیها السلام لکھتے ہیں اور حضرت حسن اور حسین کے نام کے ساتھ علیه السلام لکھتے ہیں اور یہ اُن کی اہل بیت کے ساتھ محبت کی وجہ سے ہے اور باقی صحابہ کے نام کے ساتھ رضي الله عنه لکھتے ہیں''۔(2)

ایک اور مقام پر شیخ سلیم اللہ خاں اس حد تک مضطرب ہوئے کہ انہوں نے درج ذیل تبصرہ کر ڈالا:

''بیروت اور مصر وغیرہ میں جو کتابیں چھپتی ہیں ان میں حضرت علی اور حضرت فاطمہ کے ناموں کے ساتھ ترضی (رضی اللہ عنہ) کی بجائے علیہ السلام ہوتا ہے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ طباعت کے اداروں پر شیعوں کا تسلط ہے اور وہ منصوبہ بندی کے تحت یہ کام کرتے ہیں''۔(3)

سلیم اللہ خان صاحب، ڈاکٹر مصطفیٰ دیب البغا کی تحقیق سے دار ابن کثیر دمشق سے شائع شدہ نسخہ (جس کا الطبعة الخامسة ۱۴۱۴ھ، میرے سامنے موجود ہے) کو دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ میں پوچھتا ہوں: جس مکتبہ کا نام ''دار ابن کثیر'' ہے، کیا اُس پر شیعہ کا تسلط ہے؟ علاوہ ازیں میرے سامنے بخاری شریف کے درجِ ذیل مطابع کے نسخے موجود ہیں:

١۔ دار السلام، الرياض، الطبعة الثانية ١٤١٩هـ.

٢۔ مكتبة الرشد، الرياض، بتحقيق عمر علوش، الطبعة الثانية ١٤٢٧هـ.

٣۔ دار الفكر، بيروت، بتحقيق صدقي جميل العطار.

٤۔ بيت الأفكار الدولية، الرياض، بتحقيق أبو صهيب الكرمي، ١٤١٩هـ. =

(1) نعم الباري ج٨ ص٦٤٩۔

(2) نعم الباري ج٨ ص٦٤٨، ٦٤٩۔

(3) كشف الباري، كتاب التفسير ص٦٢٣۔

= ٥ـ دار ابن كثير،دمشق،الطبعة الأولىٰ١٤٢٣ھ،

نیز بخاری کی شروح میں سے میرے سامنے:

١ـ فتح البارى ،دار طيبة، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٦ھ،

٢ـ فتح الباري، دار الفكر، بيروت، مطبوعة ١٤١٦ھ ،

٣ـ عمدة القاري، مطبوعة ادارة الطباعة المنيريه، قديم،

٤ـ عمدة القاري،دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢١ھ،

٥ـ إرشاد الساري، طبعة قديمة، مصر ١٣٠٥ھ،

٦ـ إرشاد الساري، دار الكتب العلمية، بيروت ، الطبعة الأولىٰ ١٤١٦ھ ،

٧ـ كرمانى شرح بخاري مطبوعة ١٣٥٦ھ ،

٨ـ الفجر الساطع على صحيح الجامع ،للمحمد الفضيل الزرهوني، مكتبة الرشد، الرياض.

٩ـ التوضيح لشرح الجامع الصحيح لابن الملقن،وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، قطر،الطبعة الأولىٰ١٤٢٩ھ.

١٠ـ مصابيح الجامع للقاضي بدر الدين الدماميني،دار النوادر، دمشق، الطبعة الأولىٰ ١٤٣٠ھ.

١١ـ منحة الباري بشرح صحيح البخاري،شيخ الإسلام أبويحييٰ ذكريا الأنصاري، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولىٰ١٤٢٦ھ.

١٢ـ عطاء الباري مكمل اردوشرح صحيح بخاري،عطاء المنعم، تلميذ مولانا محمد ولي حسن ٹونكي،إداره تاليفات اشرفية،ملتان.

وغیرھا نسخے موجود ہیں اوران سب میں عین اُسی مقام پرسورۃ الذریات کی تفسیر میں **"قال علي عليه السلام"** کے الفاظ مرقوم ہیں، جہاں خان صاحب کی سنیت کو دھچکا لگا ہے۔ یہ اکثر نسخے اسی صدی کے اور بعض اِس صدی سے بھی پہلے سے شائع شدہ ہیں، جبکہ ہم پیچھے لکھ چکے ہیں کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی متوفیٰ ۱۲۲۹ھ کے سامنے بخاری اور سنن ابی داود کے جو نسخے تھے، اُن میں بھی اہل بیت کے ناموں کے ساتھ **"علیه السلام"**=

....

= لکھا ہوا تھا۔اس پورے عرصہ کو سامنے رکھتے ہوئے بتلایئے کہ جولوگ اہلِ اسلام میں فقط دس فیصد ہیں، کیا ہر دور میں تمام مطابع پراُن ہی کا تسلط رہتا ہے؟ اگراُن کا اتنا ہی تسلط ہے تو کیا وہ فقط ترضی (رضي الله عنه) کی جگہ **"علیہ السلام/ علیھا السلام"** تک ہی محدود رہتے ہیں، کوئی اور ترمیم کیوں نہیں کرتے؟

بفرض محال مصر، بیروت، دمشق اور ریاض کے مطابع پر شیعہ کا تسلط ہے، لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب تحفہ اثناعشر فارسی، مطبوعہ مٹیا محل دہلی، اُن کی دوسری تصنیف فتاویٰ عزیزی فارسی ومترجم، اُن کی تیسری تصنیف سرالشہادتین مطبوعہ احباب پبلشرز، لکھنؤ، میں جابجا اہل بیت کے ناموں کے ساتھ **"علیہ السلام"** مرقوم ہے، کیا اِن مقامات میں بھی مطابع پر شیعہ کا تسلط رہا ہے؟

اسی طرح علامہ عبدالمنعم کی "عطاء الباري شرح بخاری" میں بھی عین اُسی مقام پر **"قال علي علیہ السلام"** لکھا ہوا ہے، جبکہ وہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان سے شائع ہوئی۔

خان صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اُن کے مکتبِ فکر کے بہت سے علماء نے اہل بیت کے اسماء کے ساتھ یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثلاً:

مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب کے مکتوبات "مکتوبات قاسم العلوم" میں سیدنا علی اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے ناموں کے ساتھ **علیہ السلام** مرقوم ہے۔(1)

شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب "منصب امامت" میں مرقوم ہے: امام مہدی علیہ السلام"۔(2)

مولانا خرم علی نے امام حسین کے مبارک نام کے ساتھ "علیہ السلام" کے الفاظ لکھے ہیں۔(3)

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے یہ الفاظ امام مہدی کے مبارک نام کے ساتھ لکھے ہیں۔(4)

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنے فتاوی میں ایک سوال کے جواب میں سیدنا علی اور سیدنا امام =

---

(1) مکتوبات قاسم العلوم ص ٢١٦، ٢٢٤، مطبعه خیابان پریس، اردو بازار، لاهور۔

(2) منصب امامت ص ١١٩، طیب پبلشرز۔

(3) مشارق الأنوار ص ٥٢٥، نور محمد کارخانه، کراچی۔

(4) تذکرة الرشید ج ٢ ص ٢٥١، اداره اسلامیات، انار کلي، لاهور۔

....

= جعفر صادق کے ناموں کے ساتھ چار مقام پر "علیـه السلام" کا لفظ لکھا ہے اور ایک مرتبہ لفظ "اہل بیت" کے ساتھ "علیهم السلام" کا لفظ لکھا ہے۔(1)

اسی طرح ان کی ایک اور کتاب میں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" مرقوم ہے۔(2)

ان کے مشہور ملفوظات "الإفاضات اليومية" ج۲ ص۲۰۲، مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان اور "امداد المشتاق" ص۱۴۰، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور میں بھی یہ الفاظ مرقوم ہیں۔

فرمایئے! کیا دار العلوم کراچی کے مطبعہ پر بھی شیعہ کا تسلط ہے؟

اب ہم پھر اپنی گذارشات کا رُخ "کفریہ کلمات کے بارے میں سوال جواب" کے مؤلف کی طرف کرتے ہیں اور اُنہیں عرض کرتے ہیں کہ اگر وہ رضوی ہیں تو اچھی بات ہے، لیکن انہیں اتنا سخت رضوی نہیں ہونا چاہیئے، کچھ دوسروں کا خیال بھی رکھنا چاہیئے، کیونکہ دوسرے رضوی اور غیر رضوی مگر سنی حضرات نے اہل بیت کے اسماء مبارکہ کے ساتھ "علیه السلام" کے الفاظ لکھے ہیں۔ چنانچہ مولانا غلام رسول رضوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر لکھا ہے:

"حضرت علی علیه السلام نے فرمایا"۔(3)

اسی جلد میں آگے ایک مقام پر لکھا ہے:

"سیدہ فاطمہ علیها السلام"۔(4)

ایک اور مقام میں لکھا ہے: "مھدی علیه السلام"۔(5)

محدث اعظم پاکستان مولانا سردار احمد رضوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک استفتاء آیا، اُس میں سائل نے سیدنا امام جعفر صادق کے مبارک نام کے ساتھ "علیه السلام" لکھا ہوا تھا مگر محدث اعظمؒ نے اُنہیں جواب میں =

(1) امدادالفتاوی ج٦ ص٣٧، ٣٨ مطبوعة مكتبة دار العلوم، کراچی۔

(2) کرامات صحابہ، مرتبہ مولانا أحمد حسن سنبهلي ص٤٠، مکتبہ ادب اسلامی، لاهور۔

(3) تفسیر رضوي طبع اول ج١ ص١٥۔ (افسوس کہ طبع ثانی سے یہ الفاظ اُڑا دیے گئے)

(4) تفسیر رضوي طبع اول ج١ ص٤٢٠۔

(5) تفسیر رضوي طبع اول ج١ ص٤١٨۔

....

= ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ ملاحظہ ہو:(فتاوی محدث اعظم ص ۵۳)

اگر اُن کے نزدیک یہ مسئلہ اتنا حساس ہوتا جتنا بعض امراءِ اہل سنت کے نزدیک ہے کہ اُنہوں نے اس کو **"کفریہ کلمات کے بارے میں سوال جواب"** میں لکھ مارا، تو وہ ضرور اس پر سائل کو متنبہ فرماتے، کیونکہ اگرچہ وہ غریب اہل سنت تھے، تاہم رضویت میں کسی امیرِ اہلِ سنت سے کم نہیں تھے۔

اور تو اور خود امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل بیت تو کیا اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے لیے بھی یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"جب قبور مومنین بلکہ اولیاء **علیهم السلام** اجمعین"۔(1)

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ الفاظ اُس عظیم محدث نے بھی لکھنا پسند فرمائے ہیں، جن کے نام کے بغیر ہندو پاک کے کسی بھی مکتبِ فکر کی سندِ حدیث کو وجود نہیں مل سکتا، یعنی شیخ محقق الشاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ اُنہوں نے اپنی تصانیف میں یہ الفاظ اکثر استعمال کیے ہیں، چنانچہ وہ "**جذب القلوب**" میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

روزے حضرت رسالت پناہ ﷺ دست در دست علي مرتضى سلام الله عليه در بعضى بساتين مدينه ميگذشت ناگاه ازميانِ نخله آواز بر آمد كه **هذا محمد سيد الأنبياء وهذا علي سيد الأولياء.**

ایک دن رسول اللہ ﷺ سیدنا علی مرتضی سلام اللہ علیہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر مدینہ منورہ کے کسی باغ سے گزرے تو اچانک کھجور کے ایک درخت سے آواز آئی: یہ محمد سید الأنبیاء ﷺ ہیں اور یہ علی سید الاولیاء رضی اللہ عنہ ہیں"۔(2)

اسی طرح دو صفحے آگے بسر بن ابی ارطاۃ کے حالات میں ایک بیعتِ ضلالت کے ذکر میں دو مرتبہ سیدنا =

---

(1) فتاوی رضویہ ج۹ ص ۴۳۱، رضا فاؤنڈیشن، لاہور۔

(2) جذب القلوب فارسي ص۲۸۔

....

= علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مبارک نام کے ساتھ "سلام الله عليه" کے الفاظ لکھے ہیں۔(1)

اس سے اگلے صفحے پر لکھا ہے:

فصل از اشنع شنایع واقبح قبایح که درزمان یزید پلید بن معاویه بعداز قتل امام حسین بن علي سلام الله علیهما وقوع یافته واقعۂ حره است۔

"فصل: سیدنا امام حسین بن علی سلام اللہ علیہما کی شہادت کے بعد یزید پلید بن معاویہ کے دور میں جو بدترین اور قبیح ترین واقعہ پیش آیا وہ واقعۂ حرہ ہے"۔(2)

آگے ایک مقام پر سید الساجدین امام زین العابدین کے بابرکت نام کے ساتھ یوں لکھا ہے:

علی بن حسین سلام اللّٰہ علیہما.(3)

ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

واز امام جعفر صادق بسندے که از آبائے کرام خود دارد سلام الله علیهم آمده است۔

"امام جعفر صادق سند کے ساتھ اپنے آبائے کرام سلام اللہ علیہم سے روایت کرتے ہیں"۔(4)

یہی انداز شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری کتب میں بھی ہے، لہٰذا اگر **"کفریہ کلمات کے بارے میں سوال جواب"** کے مؤلف سند یافتہ ہوں تو وہ اپنی سندِ حدیث میں غور فرمائیں کہ کہیں اُن کی سند میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام تو نہیں؟

علاوہ ازیں قطب گولڑہ سیدنا پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاوی میں صفحہ ۲۹ پر یہی الفاظ مرقوم ہیں۔ =

---

(1) جذب القلوب فارسي ص ٣١۔

(2) جذب القلوب فارسي ص ٣٢۔

(3) جذب القلوب فارسي ص ٣٧۔

(4) جذب القلوب فارسي ص ١٣٣۔

....

= نیز مولانا محمد عمر اچھروی (المقیاس الوھابیہ ص ۵۳) مفتی محمد مظہر اللہ دہلوی (فتاوی مظہری ص ۳۰۱، ۳۰۶) اور دوسرے کئی حضرات نے اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں کے ساتھ "علیہ السلام" کے الفاظ لکھے ہیں۔ ہر چند کہ یہ سب حضرات اپنے اپنے وقت میں امیر اہل سنت نہیں بلکہ غریب اہل سنت تھے، مگر با قاعدہ عالم دین ضرور تھے، لہٰذا اُن کا اہل بیت کرام کے ناموں کے ساتھ "علیہ السلام" کے الفاظ لکھنا، کیونکر کفریہ کلمات کی سلک میں شامل کیا جا سکتا ہے؟ محض اس لیے کہ وہ غریبِ اہل سنت تھے!

اہل بیت پر درود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود ہے

اس سلسلے میں امام سہیلی کا استدلال بہت خوب ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إن فاطمة مضغة مني، فصلى الله عليه وعلىٰ فاطمة، فهذا حديث يدل علىٰ أن من سبّها فقد كفر، وأن من صلّىٰ عليها فقد صلّىٰ علىٰ أبيها ﷺ.

"فاطمہ میرے جسم کا حصہ ہے، اللہ تعالیٰ کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور سیدہ فاطمہ پر درود ہو، سو یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جس نے سیدہ کو برا کہا اُس نے کفر کیا اور جس نے سیدہ پر درود بھیجا اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجا"۔(1)

یہ شان تمام اہل کساء رضی اللہ عنہم کی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِن سب کو جمع کر کے عرض کیا:

اَللّٰهُمَّ إِنَّهُمْ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْهُمْ فَاجْعَلْ صَلَاتَکَ وَرَحْمَتَکَ وَرِضْوَانَکَ عَلَيَّ وَعَلَيْهِمْ.

"اے اللہ! یہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں، لہٰذا تو اپنی صلوات، اپنی رحمت اور اپنی رضا مجھ پر اور اِن پر بھیج"۔(2) =

---

(1) الروض الأنف ج۳ ص ٤٤٠۔

(2) استجلاب للسخاوي ج۲ ص ٤٤٨؛ مسند فاطمة ص ٥٤ حديث ٨٤؛ جواهر العقدين ص ١٩٧؛ القول البديع ص ١٢٣، ١٢٤؛ الصواعق المحرقة ص ٢٣٣؛ كنز العمال ج١٣ ص ٦٠٣۔

ساتویں حدیث

امام محمد بن شہاب الزہری روایت کرتے ہیں کہ اُنہیں سیدنا علی بن حسین (زین العابدین) رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب وہ مقتل حسین بن علی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یزید بن معاویہ کے دربار سے مدینہ منورہ کو لوٹے تو اُن سے حضرت مِسْوَر بن مَخرمہ رضی اللہ عنہ نے ملاقات کی اور عرض کیا: اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے حکم فرمایئے۔ میں نے کہا: کوئی نہیں۔ انہوں نے کہا: کیا آپ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار نہیں سونپ دیتے، کیونکہ میں خدشہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ لوگ آپ سے وہ چھین کر لے جائیں گے، بخدا اگر وہ تلوار آپ نے مجھے سونپ دی تو یہ لوگ کبھی اس تک نہیں پہنچ پائیں گے، یہاں تک کہ میری جان چلی جائے۔

= خلاصہ یہ ہے کہ فقط امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام طحاوی، خطیب بغدادی، امام خطابی، امام دارقطنی، امام حاکم، امام ابن سعد، امام سہیلی، امام غزالی، امام ابن جوزی، امام محبّ الدین الطبری، علامہ ابن قیم، حافظ ہیثمی، حافظ عسقلانی، امام سخاوی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، علامہ سید پیر مہر علی شاہ گولڑوی، امام احمد رضا حنفی، امیر صنعانی، قاضی شوکانی، نواب صدیق حسن قنوجی، مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ کاظمی محدث ملتانی، محدث اعظم مولانا سردار احمد رضوی، مفتی مظہر اللہ دہلوی، مولانا محمد عمر اچھروی، مولانا غلام رسول رضوی اور علامہ غلام رسول سعیدی وغیرہ کے نزدیک ہی اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء مبارکہ کے ساتھ "علیہ السلام" کے الفاظ لکھنا جائز نہیں بلکہ بعض احادیث سے بھی یہ حقیقت ثابت ہے۔

اگر یہ سب حضرات اسلاف کرام تھے اور یہ اپنی کتابوں میں اہل بیت کے اسماء مبارکہ کے ساتھ "علیہ السلام" لکھتے تھے تو پھر تشبہ بالروافض کی رٹ لگانا چہ معنیٰ دارد؟ نیز جب بعض احادیث میں اہل بیت کرام کو "**إِنَّهُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْهُمْ**" کا مقام دیتے ہوئے صلاۃ ورحمت میں شامل رکھا ہے، تو پھر "**کتاب الأربعین في فضائل آل البیت الطاهرین**" کے مصنف اور دوسرے علماء کا اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء کے ساتھ "**علیه السلام**" لکھنے اور کہنے کو اسلاف کے شعار کے خلاف سمجھنا یا اس کو شعار اہل بدعت وروافض کے کھاتے میں ڈال کر ممنوع قرار دینا، کہاں کی دانش مندی ہے؟

آخر میں مجھ غریبِ اہلِ سنت کا بعض اُمراءِ اہلِ سنت کو مشورہ ہے کہ اگر وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلایا کریں تو اُن کے حق میں بہتر ہوگا۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ علیھا السلام پر سوکن کی صورت میں ابوجہل کی بیٹی کو نکاح کا پیغام بھیجا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا، آپ نے اس سلسلے میں اِسی منبر پر لوگوں کو خطبہ دیا اور میں اُس وقت بالغ ہونے کے قریب تھا، آپ نے فرمایا:

فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے، اور میں خدشہ محسوس کرتا ہوں کہ کہیں وہ اپنے دین کے بارے میں آزمائش سے دوچار نہ ہو جائے، پھر آپ نے بنو عبد شمس کے ایک شخص (ابوالعاص) کے ساتھ اپنی مصاہرت (سسرالی رشتہ داری) کا تذکرہ کیا تو اُس کی تعریف کی، اور فرمایا: اُس (ابوالعاص بن ربیع) نے مجھ سے بات کی تو سچ کہا اور مجھ سے وعدہ کیا تو پورا کیا، اور میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال تو نہیں کرتا، لیکن اللہ کی قسم اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح یہ حدیث ہمیں صحیح بخاری میں ملی ہے۔(۱)

اور ہم نے اِسی سند اور دوسری انتہائی بلند سندوں سے از اول تا آخر مسلسل سماعاً روایت کیا ہے، اور اس کو امام مسلم نے روایت کیا تو کہا: مجھے احمد بن حنبل نے روایت کیا کہ یعقوب نے اُنہیں اسی کی مثل بیان کیا اور اُن کے بعض الفاظ میں یوں بھی ہے:

''فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے جو چیز اُسے اذیت پہنچائے وہ مجھے اذیت پہنچائے گی''۔(۲)

ساتویں حدیث سے ماخوذ فوائد

---

(۱) بخاري: كتاب فرض الخُمُس، باب: ماذُكِرَ مِن درع النبي ﷺ وعصاه وسيفه وقدحه وخاتمه، وماستعمل الخلفاء بعده من ذلك ممالم يذكر قسمته، ومن شعره ونعله وآنيته، ممايتبرك أصحابه وغيرهم بعد وفاته، حديث ٣١١٠۔

(۲) مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل فاطمة بنت النبي، عليها الصلاة والسلام، حديث ٢٤٤٩؛ مسند أحمد ج ٤ ص ٣٢٦، وط: ج ٦ ص ٤٢٠ حديث ١٩١٢٠؛ فضائل الصحابة ج ٢ ص ٩٥١ حديث ١٣٣٥؛ سنن أبي داود: كتاب النكاح، باب مايكره أن يُجمع بينهن من النساء حديث ٢٠٦٩؛ سنن ابن ماجه: كتاب النكاح، باب الغيرة، حديث: ١٩٩٩۔

۱۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں مرتبۂ نبوی ﷺ کے عظیم القدر ہونے کا ذکر ہے۔

۲۔ اس میں سیدہ طاہرہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ہے، اس حیثیت سے کہ آپ ﷺ نے خبر دی کہ وہ ''بَضْعَةٌ'' یعنی آپ ﷺ کے جسم اقدس کا ٹکڑا ہیں۔

۳۔ ارشادِ نبوی ﷺ ''فَاطِمَةُ مِنِّي'' (فاطمہ مجھ سے ہے) میں دلیل ہے کہ جس نے انہیں سبّ کیا یا اُن کی تنقیص کی تو اُس نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائی۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کو چاہیے کہ وہ کسی ایسے خاندان کے ساتھ رشتہ داری نہ کریں جس کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوں، تاکہ اس مقدس خانوادے کے بارے میں لوگوں کو نازیبا باتیں کہنے کا موقعہ نہ ملے اور اُن کے پاک گھر میں اُس چیز کو راہ نہ ملے جو اُن کے شایانِ شان نہیں۔

٥۔ اس میں اشارہ ہے کہ جس شخص نے اہل بیت کو اُن کے شرف وعظمت پر انگلی اٹھا کر اذیت پہنچائی تو اُس نے گویا رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائی، اسی لیے آگے حدیث نمبر ۳۸ میں آیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اُسے جہنم میں ڈالے گا''۔

٦۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی لختِ جگر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے، کیونکہ آپ نے اُن کی تعریف فرمائی ہے۔

۷۔ اس میں اُس شخص کی قدر ومنزلت کا ذکر ہے جس نے اہل بیت کے ساتھ رشتہ داری کی تو اُن سے حسنِ سلوک کیا اور عہد کو نبھایا۔

۸۔ اگر کہا جائے کہ (سیدہ پر سوکن ڈالنے کا) یہ واقعہ اہل بیت کا خاص گھریلو معاملہ ہے تو پھر آپ ﷺ نے اسے منبر پر کیوں بیان کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شیخین کی روایت میں ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کو عرض کیا: ''آپ کی قوم کہتی ہے کہ آپ اپنی بیٹیوں کے بارے میں غضب ناک نہیں ہوتے'' تو آپ ﷺ نے اس غلط فہمی کو زائل کرنے کی خاطر منبر پر جلوہ افروز ہو کر اظہارِ غصہ فرمایا۔

۹۔ ارشادِ نبوی ﷺ ''فَاطِمَةُ مِنِّي'' (فاطمہ مجھ سے ہے) میں دلیل ہے کہ والد کی گواہی اولاد کے حق

میں جائز نہیں، کیونکہ اولاد اسی کا حصہ ہے، جیسا کہ امام شافعی ﷜ کا قول ہے۔

١٠۔ حضرت مسور بن مخرمہ کے قول "حَتّٰى تَبْلُغَ نَفْسِيْ" (یہاں تک کہ میری جان چلی جائے) سے یہ بات نکلتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ترکہ اور آپ کے آثار کے بارے میں صحابہ کرام ﷢ کے کس حد تک تعظیم کے جذبات تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر باب قائم کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"باب: نبی کریم ﷺ کی زرہ، عصا، تلوار، پیالہ اور انگوٹھی کے بارے میں جو ذکر کیا گیا ہے، اور خلفاء کرام ﷢ نے ان میں سے جو استعمال کیا اور جس کا تقسیم ہونا مذکور نہیں، اور آپ کے موئے مبارک، نعلین شریفین اور آپ کے برتن مبارکہ جن سے صحابہ کرام اور دوسرے حضرات ﷢ آپ کے وصال کے بعد برکتیں حاصل کرتے رہے"۔(١)

١١۔ ارشادِ نبوی ﷺ "أَنَا أَتَخَوَّفُ" میں دلیل ہے کہ دینی معاملہ میں جس قدر احتیاط اور حفاظت اہل بیت سے مطلوب ہے اس قدر غیر اہل بیت سے مطلوب نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَـٰنِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ (اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو)۔[الأحزاب: ٣٢]

١٢۔ امام ابن قیم "الهَدْي" میں فرماتے ہیں:

"سیدہ فاطمہ اور بنت ابی جہل کو جمع کرنے میں سیدنا علی ﷜ کو جو ممانعت فرمائی گئی اُس میں ایک عجیب حکمت ہے، اور وہ یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کے تابع ہونے کے لحاظ سے اُسی کے ساتھ اُس کے درجہ میں ہوگی، پھر اگر وہ ذاتی طور پر درجۂ عالیہ کی مالکہ ہو اور اُس کا شوہر بھی اسی طرح ہو تو وہ ذاتی حیثیت سے بھی اور شوہر کی وجہ سے بھی اُس کے ساتھ ہوگی، اور یہی سیدہ فاطمہ اور سیدنا علی ﷜ کی شان ہے، اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا کہ ایک ہی درجہ میں بنت ابی جہل کو اُس کی ذاتی حیثیت سے یا شوہر کی تابعیت میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جمع کر دے، ان دونوں کے مابین ایک فرق ہے جو ہے۔ پس سیدۃ نساء العالمین پر اُس کو سوکن ڈالنا شرعی لحاظ سے بھی اور مرتبہ کے لحاظ سے بھی بہتر نہیں تھا۔ نبی کریم ﷺ

---

(١) بخاري: كتاب فرض الخمس، ص ٤٢٠۔

نے اپنے اس ارشاد ’’واللّٰهِ لا تجتمعُ بنتُ رسولِ اللّٰه وبنتُ عدوِّ اللّٰه فِي مَكَانٍ وَاحِدٍ أَبَدًا‘‘ (اللہ کی قسم! رسول اللہ کی بیٹی اور عدو اللہ کی بیٹی کبھی ایک مکان میں جمع نہیں ہوسکتیں) میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے‘‘۔(۱)

آٹھویں حدیث

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ہم تمام ازواجِ رسول ﷺ آپ کے پاس جمع تھیں کہ سیدہ فاطمہ علیہا السلام تشریف لائیں، اللہ کی قسم اُن کی چال ہو بہو اُن کے بابا کی چال کی طرح تھی۔ پس جب حضور اکرم ﷺ نے انہیں دیکھا تو فرمایا: میری بیٹی کو خوش آمدید! پھر آپ نے ان کو اپنی دائیں یا بائیں جانب بٹھایا، پھر ان سے رازدارانہ طرز پر کوئی بات فرمائی تو وہ رونے لگیں۔ پھر جب آپ نے اُن کا غم دیکھا تو ان سے دوسری مرتبہ رازدارانہ طرز پر کچھ فرمایا تو وہ ہنس پڑیں۔ اس پر میں نے انہیں کہا: میں حضور ﷺ کی ایک بیوی ہوں، رسول اللہ ﷺ نے تمہیں ہم تمام ازواج کی موجودگی میں سرگوشی کے لیے مخصوص فرمایا پھر بھی تم روتی ہو!

پھر جب رسول اللہ ﷺ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تو میں نے اُن سے سرگوشی کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کا راز فاش نہیں کرسکتی، پھر جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو میں نے ان سے کہا: آپ پر جو میرا حق ہے میں اُس حق کے واسطے سے پوچھتی ہوں کہ آپ مجھے اُس راز کے بارے میں ضرور بتلائیں۔ انہوں نے کہا: ہاں اب بتاتی ہوں: پہلی مرتبہ حضور ﷺ نے مجھ سے سرگوشی میں فرمایا تھا کہ جبریل علیہ السلام میرے ساتھ ہر سال قرآن کریم کا ایک مرتبہ دَور کرتے تھے اور اس سال انہوں نے دو مرتبہ دَور کیا، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات میرے وصال کے قرب پر دلالت کرتی ہے، لہٰذا تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا اور صبر کرنا، بیشک میں پہلے جا کر تمہارا بہترین مددگار رہوں گا تو میں رو پڑی تھی، جیسا کہ آپ نے دیکھا تھا۔ پھر جب آپ نے میری گھبراہٹ دیکھی تو دوسری مرتبہ سرگوشی کی اور فرمایا: اے فاطمہ! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم تمام مومنین کی خواتین کی یا اس امت کی خواتین کی سیدہ ہو؟

---

(۱) زاد المعاد في هدي خير العباد ج۵ ص۱۰۸۔

اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے، اور امام مسلم نے اس کو ابوعوانہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔(۱)

آٹھویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں بضعۂ نبویہ رضی اللہ عنہا کی عالمین کی خواتین پر فضیلت کی دلیل ہے۔

۲۔ اس میں سیدہ کے صبرِ عظیم کا ذکر ہے، کیونکہ جس مصیبت سے وہ دوچار ہوئیں وہ سب سے بڑی مصیبت ہے، اور وہ ہے اُن کی موجودگی میں سید عالم ﷺ کا وصال۔

۳۔ اس میں اُن کے عظیم اجر کا ثبوت ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کی ساری اولاد آپ کی حیات میں انتقال کرگئی تو وہ آپ کے نامۂ عمل میں شامل ہوئی اور خود حضور ﷺ سیدہ کی حیات میں وصال فرما گئے تو آپ سیدہ کے نامۂ عمل میں شامل ہو گئے، اس حدیث میں جو منقبت مذکور ہے وہ اسی صبر کا صلہ ہے، واللہ اعلم۔ اور اسی مفہوم میں امام ابن جریر طبری کی روایت میں تصریح بھی آئی ہے، لیکن وہ حدیث ضعیف ہے۔(۲)

---

(۱) بخاري: کتاب الاستئذان، باب من ناجى بين يدي الناس، ومن لم يخبر بسر صاحبه، فإذا مات أخبر به، حديث ٦٢٨٥؛ مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل فاطمة بنت النبي، عليها الصلاة والسلام، حديث ٢٤٥٠؛ الجمع بين الصحيحين ج٤ ص١٤٥ حديث ٣٣٥٧۔

(۲) ضعیف حدیث قیاس پر مقدم

خیال رہے کہ ائمہ حدیث اور فقہاء متبوعین کے نزدیک ضعیف حدیث کو ذاتی رائے پر مقدم مانا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ پہلے بطور استدلال سیدہ کی فضیلت ثابت کرتے تھے پھر انہیں امام ابن جریر طبری کی یہی حدیث مل گئی تو انہیں مزید اطمینان نصیب ہوا، جس پر اُنہوں نے لکھا:

قال: وكنت أقول ذلك استنباطاً إلى أن وجدت الإمام ابن جرير الطبري نص عليه: فأخرج عن طريق فاطمة بنت الحسين بن علي عن جدتها فاطمة، قالت: دخل رسول الله ﷺ يوماً وأنا عند عائشة، فناجاني فبكيت، ثم ناجاني فضحكت، فسألتني عائشة عن ذلك، فقلت: لا أخبرك بسره، فلما تُوفي سألتني=

....

فذكرت الحديث في معارضة جبريل له با لقرآن مرتين ، وأنه قال: أحسب أني ميت في عامي هذا،وأنه لم ترزأ امرأة من نساء العالمين مثلها،فلا تكوني دون امرأة منهن صبراً، فبكيت، فقال: أنت سيدة نساء أهل الجنة فضحكتُ.

''پہلے میں یہ بات بطور استنباط بیان کرتا تھا، پھر میں نے امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کی اس پر تصریح پائی۔ انہوں نے از فاطمہ بنت حسین بن علی سے، انہوں نے اپنی دادی سیدۂ کائنات فاطمہ علیہم السلام سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی ہیں: ایک روز رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور میں اُس وقت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس موجود تھی، حضور ﷺ نے میرے ساتھ سرگوشی فرمائی تو میں رو پڑی، پھر سرگوشی فرمائی تو میں ہنس پڑی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے اس کا سبب پوچھا تو میں نے کہا: میں حضور ﷺ کا راز فاش نہیں کرتی۔ پھر جب حضور ﷺ کا وصال ہو گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا، میں نے انہیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ جبریل علیہ السلام کے دَورِ قرآن کی حدیث بیان کی اور یہ کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ آپ اِسی سال وصال فرمانے والے ہیں، اور یہ کہ تم نے جو حاصل کیا ہے اُس کی مانند عالمین کی خواتین نے حاصل نہیں کیا، لہٰذا تم صبر کرنے میں اُن سے کم نہ رہنا تو میں اس پر رو پڑی تھی، پھر فرمایا تھا: تم جنتی خواتین کی سردار ہو تو میں ہنس پڑی تھی''۔(1)

یہ حدیث امام ابن جریر طبری، امام طبرانی، ابن ابی عاصم، امام بیہقی، امام دولابی، امام طحاوی، امام ابن عساکر، امام محبّ الدین طبری اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی ذکر کی ہے۔(2)

---

(1) فتح الباري ج٧ص ٤٧٧ وط: ج٨ص ٤٧٤ حديث ٣٧٦٧۔

(2) جامع البيان ج٥ص ٣٩٥ ،وط: ج٣ص ٣٥٨، ٣٥٩ ؛المعجم الكبير ج٢٢ ص ٤١٧، ٤١٨ حديث ١٠٣٠ ؛الأحاد والمثاني ج٥ص ٣٦٩ حديث ٢٩٧٠ ،دلائل النبوة ج٧ص ١٦٥، ١٦٦ ؛ الذرية الطاهرة ص ١٠٥ حديث ١٩٤ ؛شرح مشكل الآثار ج١ ص ١٣٩، ١٤٠ حديث ١٤٦ ؛تاريخ دمشق ج٤٧ ص ٤٨٢ ؛ذخائر العقبیٰ ص ٥٣ ؛مسند فاطمة الزهراء ص ٧٥، ٧٦ حديث ١٩٣۔

٤۔ اس میں اکابر اہل بیت کا آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا ذکر ہے۔

٥۔ ارشادِ نبوی ﷺ ''سَيِّدَةُ نِسَاءِ هٰذِهِ الأُمَّةِ'' میں اُن لوگوں کی دلیل ہے جنہوں نے سیدہ فاطمہ کو اُن کی دونوں ماؤں سیدتنا خدیجہ اور سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہن پر فضیلت دی ہے۔(١)

---

(١) سیدہ فاطمہ اور اُمہات میں مفاضلہ

بعض شارحینِ حدیث نے سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پر تمام امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی تفصیل کا قول کیا ہے۔ چنانچہ وہ سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان میں کچھ احادیث اور اُن کی افضلیت میں چند علماء کا کلام نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ سیدہ فاطمہ کے افضل النساء ہونے میں کوئی شک نہیں مگر وہ ازواج مطہرات کے بعد سب سے افضل ہیں، ازواج مطہرات کے افضل النساء ہونے پر صریح قرآن ناطق ہے:

يَانِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ.

اے نبی کی ازواج! تم عورتوں میں سے کسی کی مثل نہیں ہو اگر تم (اللہ سے) ڈرتی رہو۔

(الأحزاب: ٣٢)

اور حضرت سیدہ فاطمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما سے کیسے افضل ہو سکتی ہیں، حالانکہ (وہ) آپ کی ماں ہیں، اور ماں بیٹی سے افضل ہوتی ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ سیدہ فاطمہ ازواج مطہرات کے علاوہ باقی تمام عورتوں سے افضل ہیں''۔(1)

ان دونوں فقروں میں سے دوسرے فقرے پر تو بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ یہ بداہۃً باطل ہے۔ بلاشبہ ماں باپ اپنی اولاد کے حق میں لائق تعظیم ہوتے ہیں، لیکن ہر ماں باپ اپنی اولاد سے افضل ہو، یہ بات کتاب وسنت سے نابلد شخص تو کرسکتا ہے مگر کسی عالم سے اس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والدین اُن سے افضل ہیں؟ اور کیا ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اُن کی والدہ افضل ہیں؟ =

---

(1) نعمة الباري للعلامة السعيدي ج٦ ص٨٩٦۔

....

= دوسرے فقرے کا آخری جملہ یوں ہے:

''تحقیق یہ ہے کہ سیدہ فاطمہ ازواج مطہرات کے علاوہ باقی تمام عورتوں سے افضل ہیں''۔(1)

کیا ہی نرالی تحقیق ہے! کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ بعض شارحین کے نزدیک سیدتنا فاطمہ سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ازواج سے بھی افضل ہیں؟

فضلِ جزائی اور اختصاصی

بعض شارحین نے سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۲ پیش فرمائی، اگر اس آیت کو مع سیاق وسباق دیکھا جائے تو اس سے ازواج مطہرات اور اہل کساء دونوں پر فضلِ الٰہی تو نظر آتا ہے، لیکن یہ فضل دونوں پر یکساں نہیں، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات پر جو فضل ہے وہ جزائی ہے اور اہل کساء پر جو فضل ہے وہ اختصاصی ہے۔ چنانچہ امہات کے لیے پہلے ارشاد ہے:

يَانِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفُ لَهَاالْعَذَابُ ضِعْفَينِ.

''اے نبی کی بیویو! تم میں سے جس نے بھی (بالفرض) کھلی ہوئی معصیت کا کام کیا، اس کو دہرا عذاب دیا جائے گا''۔(الأحزاب: ۳۰)

پھر ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ.

''اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت شعار رہے اور نیک عمل کرتی رہے، ہم اسے اس کا دگنا اجر عطا فرمائیں گے''۔(الأحزاب: ۳۱)

امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو امت کی دوسری خواتین سے دوگنا اجر عطا ہونا یہ فضلِ جزائی ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ نے اہل کساء (سیدنا علی، سیدتنا فاطمہ اور سیدین حسنین کریم علیہم السلام) کو اِس قسم سے جدا کرلیا، کیونکہ وہ عند اللہ فضلِ اختصاصی والے تھے۔ فضلِ اختصاصی یہ ہے کہ کسی عمل کے بغیر اللہ تعالیٰ کسی کو دوسرے =

---

(1) نعمة الباري ج٦ ص٨٩٦۔

= کے مقابلہ میں منتخب فرمالے، جیسا کہ سیدنا آدم علیہ السلام کو اُن کے کسی سابقہ حسن عمل کے بغیر فرشتوں کے مقابلہ میں منتخب فرمالیا اور اُنہیں مسجودِ ملائکہ بنادیا، حالانکہ ملائکہ تسبیح وتقدیس اور دوسری عبادات کے خوگر تھے۔امہات المؤمنین اوراہل کساء رضی اللہ عنہم پر بھی جو فضل ہے اُس کی بھی یہی دو قسمیں ہیں۔اہل بیت میں ازواج مطہرات شامل ہیں مگراُن پر جو فضل ہوا وہ فضلِ جزائی ہے اور سیدنا علی، سیدتنا فاطمہ اور سیدین حسنین کریمین علیہم السلام بھی اہل بیت ہیں مگراُن پر جو فضل ہوا وہ فضلِ اختصاصی ہے۔ چنانچہ جب ان چاروں کو چادر میں لیا گیا تو امہات المؤمنین میں سے جو بعض اُس موقعہ پر موجود تھیں اُن کا جی چاہا کہ وہ بھی ان میں شامل ہوں، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں شامل نہ کیا اور فرمایا:

إنک إلیٰ خیر.

''تم خیر کی طرف ہو''۔(1)

کہیں فرمایا:

إنک علیٰ خیر.

''تم خیر پر ہو''۔(2)

اگرچہ وہ زوجۂ نبی ہونے کے باعث پہلے سے بھی خیر پر تھیں لیکن وہ بھانپ گئی تھیں کہ جنہیں چادر میں لیا گیا اُن کی مخصوص شان ہے۔چنانچہ اس عظمت کے حصول کی انہوں نے اس حد تک کوشش فرمائی کہ اپنے ہاتھوں سے چادر کا ایک کونہ اٹھا کر چادر میں اپنا سر داخل فرمانے لگیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کے ہاتھوں سے چادر کھینچنا پڑ گئی۔وہ فرماتی ہیں:

فرفعت الکساء لأدخل معھم، فجذبه من یدي، وقال:إنک علیٰ خیر.

''میں نے چادر اٹھائی تا کہ اُن کے ساتھ داخل ہو جاؤں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے ہاتھ =

---

(1) نعمة الباري ج٦ ص ٨١٧۔

(2) الجامع الکبیر وهو سنن الترمذي: أبواب المناقب، باب ماجاء في فضل فاطمة رضي الله عنها، ج٦ ص ١٧٥ حدیث ٣٨٧١۔

= سے چادر کھینچ لی اور فرمایا: تم بھلائی پر ہو''۔(1)

بعض احادیث میں ہے کہ اس موقعہ پر نبی کریم ﷺ کو اپنی زبان پر حرف ''لا'' لانا پڑا۔ چنانچہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا خود فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا:

وأنا منهم، قال: لا، وأنت علىٰ خير.

''اور میں بھی ان میں سے ہوں، فرمایا: نہیں، مگر تم خیر پر ہی ہو''۔(2)

یہ ''لا'' فرمانا اور چادر کھینچنا وغیرہ اس لیے نہیں تھا کہ امہات المومنین اہل بیت میں شامل نہیں، جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں بلکہ وہ تو قرآن کی نص سے اہل بیت ہیں اور نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا کہ امہات اہل بیت سے ہیں۔ چنانچہ ام المؤمنین ام سلمہ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا:

یا رسول الله، أدخِلني معهم، قال: إنكِ من أهلي.

''یارسول اللہ! مجھے بھی اُن کے ساتھ داخل فرمایئے، فرمایا: تم میرے اہل سے ہو''۔(3)

غور فرمایئے کہ جب امہات المومنین رضی اللہ عنہن اہل بیت سے ہیں تو سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو چادر میں کیوں نہیں داخل ہونے دیا گیا؟ صرف اس لیے کہ اُن کا شمار فضلِ جزائی والوں میں ہے اور اہل کساء فضلِ اختصاصی والے ہیں۔ اگر کسی کو اب بھی فضل اختصاصی سمجھ نہ آرہا ہو تو وہ غور کرے کہ جب حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو نوجوانانِ اہل جنت کا سردار فرمایا گیا تھا تو اُس وقت اُن کی عمریں کتنی تھیں اور انہوں نے کونسا جہاد اور ریاضت وعبادت وغیرہ کر رکھی تھی؟ صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے کوئی بھی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا، وہ تو ابھی غیر مکلّف =

(1) مسند أحمد ج٦ ص٣٢٣ وط: ج٨ ص٦٤٩ حديث ٢٧٢٨٢؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٧٤٥ حديث ١٠٢٩؛ مسند أبي يعلىٰ ج٦ ص٨٦ حديث ٦٨٧٦، وص١٢٣ حديث ٦٩٩١، وط: ج١٢ ص٢٦٠٧ وص٣٤٤ حديث ٦٩١٢؛ المعجم الكبير ج١٠ ص٨٨ حديث ١٩٢٣١؛ الذرية الطاهرة للدولابي ص١٠٨ حديث ٢٠٢؛ تبيان القرآن ج٩ ص٤٤٢۔

(2) مسند أبي يعلى الموصلي ج٦ ص٧٣ حديث ٨٦٥٢ وط: ج١٢ ص٣١٣ حديث ٦٨٨٨۔

(3) المعجم الكبير ج١٠ ص٧٣ حديث ١٩١٧٤۔

= تھے اور اس قدر چھوٹے تھے کہ حالتِ نماز میں اپنے بابا کریم ﷺ کی پشت مبارک پر سوار ہو جاتے تھے۔
لیکن مخصوص فضلِ الٰہی دیکھئے کہ باقاعدہ ایک فرشتہ نے بارگاہِ الٰہی سے اجازت لی اور حاضر ہو کر بشارت دی:

أن الحسن و الحسين سيدا شباب أهل الجنة، وأن فاطمة بنت محمد ﷺ سيدة نساء أهل الجنة.

''حسن اور حسین جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں اور فاطمہ بنت محمد (ﷺ) جنت کی عورتوں کی سردار ہیں''۔ (1)

بتلائیے! فضلِ اختصاصی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل و مثال ہو سکتی ہے؟

بلاشبہ ہر مسلم کو تسلیم ہے کہ کوئی خاتون جب کسی نبی کے عقد میں آجائے تو وہ عام عورتوں کی طرح نہیں رہتی لیکن تعجب ہے کہ بعض شارحین کو ﴿یَا نِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ میں نبی کریم ﷺ کی بیویوں کی عظمت تو نظر آ گئی لیکن انہوں نے بنات النبی ﷺ کو ﴿كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ (عام عورتوں کے کھاتے میں ڈال دیا) حالانکہ یہی لفظ ''نساء'' آیت مباہلہ میں بھی آیا ہے لیکن وہاں جس خاتون کو عظمت حاصل ہوئی وہ تنہا =

(1) تبيان القرآن ج٧ص٩١٢؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص٣٦٧ حديث ٨٢٤٠ وص٣٩١ حديث ٨٣٠٧ وط: ج٥ ص٩٥ حديث ٨٣٦٥؛ سنن الترمذي ص٨٥٨ حديث ٣٧٨١؛ مسند أحمد ج٥ص٣٩٢ وط: ج٧ص٧١٥ حديث ٢٣٧١٨، ٢٣٧١٩؛ صحيح ابن حبان ج٩ص٥٥ حديث ٦٩٢١، وط: ج١٥ص٤١٣ حديث ٦٩٦٠؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ص٣٨١ حديث ٣٢١٦٨، وط: ج١٧ص٢١٣ حديث ٣٢٩٣٧؛ المعجم الكبير ج٢ ص٧٣ حديث ٢٥٤١، ٢٥٤٢، ٢٥٤٣ وج٩ ص ٣٦٤ حديث ١٨٤٣٨؛ جامع الأصول ج٦ص٣٦٢ حديث ٦٥٩٥ وص ٤١٠ حديث ٦٦٧٣؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١٨٤ وط: ج٩ ص٢٩٣ حديث ١٥٠٨٦، ١٥٠٨٧؛ الزهر الباسم للمغلطائي ج١ ص٥٤٩؛ مسند فاطمة الزهراء للسيوطي ص٥٧ حديث ١١٢ وص٥٩ حديث ١٢٨؛ جمع الجوامع ج١٤ص٢٨٨ حديث ١٠٦١٤، ١٠٦١٥؛ در السحابة للشوكاني ص٢٧٦؛ نزل الأبرار ص ١٠٩؛ السلسلة الصحيحة للألباني ج٢ ص٤٢٣ حديث ٧٩٦۔

....

= سیدة نساء العالمین علیہا السلام تھیں۔

بعض شارحین سے ہمارا سوال ہے کہ کیا سورۃ الأحزاب کی یہ آیت نبی کریم ﷺ کے سامنے نہیں تھی؟ اور کیا حضور ﷺ اس کے عموم سے بے خبر تھے؟ اگر یہ آیت حضور ﷺ کے سامنے تھی اور آپ اس کے عموم سے بھی آگاہ تھے تو پھر آپ ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سیادت سے اپنی ازواج مطہرات کو مستثنٰی کیوں نہ فرمایا؟ بعض شارحین نے متعدد حوالہ جات کے ساتھ خود بھی یہ حدیث لکھی ہے:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جس مرض میں نبی کریم ﷺ کی وفات ہوگئی اس میں آپ نے فرمایا: اے فاطمہ! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہو، اور اس امت کی عورتوں کی سردار ہو اور مومنین کی عورتوں کی سردار ہو۔ (المستدرک رقم الحدیث: ۴۷۹۴، صحیح البخاري رقم الحدیث: ۳۶۲۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۴۵۰، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۳۸۷۱، سنن ابوداود رقم الحدیث: ۲۵۱۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۶۲۰)''۔(1)

کیا حضور ﷺ کو قرآن کریم کی نص معلوم نہیں تھی کہ آپ نے جہانوں کی، اِس امت کی اور تمام مومنین کی عورتوں پر سیدہ فاطمہ کی سرداری کا اعلان فرما دیا اور کسی کو مستثنٰی نہیں فرمایا؟

بعض شارحین کا متکلفانہ استثناء

ذرا آگے چل کر بعض شارحین نے کچھ نکتہ آفرینی کرتے ہوئے ازخود اس قسم کے استثناء کو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے وصال کی خبر دی تو میں روئی، پھر آپ نے خبر دی کہ حضرت مریم کے سوا میں اہل جنت کی تمام عورتوں کی سردار ہوں گی تو میں ہنسی۔ (سنن ترمذی: ۳۸۷۴)''۔

بہ ظاہر اس حدیث سے یہ لازم آتا ہے کہ سیدہ فاطمہ جنت میں ازواج مطہرات سے =

---

(1) تبیان القرآن ج۷ ص۹۱۴۔

= بھی افضل ہوں گی جیسا کہ بعض مالکی علماء کا مختار ہے لیکن اس حدیث میں حضرت مریم کا استثناء ہے کیونکہ وہ جنت میں رسول اللہ ﷺ کی زوجہ ہوں گی، سو آپ کی باقی ازواج مطہرات بھی اسی حکم میں ہیں، نیز حضرت فاطمہ جنت میں حضرت علی کے ساتھ اور آپ کے درجہ میں ہوں گی، نیز ہم (الاحزاب:۳۲) کے حوالے سے بتا چکے ہیں کہ کوئی عورت ازواج مطہرات کی مثل نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں ازواج مطہرات کے بعد سیدہ فاطمہ سب عورتوں سے افضل ہیں اور ان کی سرادر ہیں"۔(1)

اس استثناء کا احادیث کے خلاف ہونا

اس متکلفانہ استثنا پر کئی سوال وارد ہوتے ہیں:

۱۔ اس عبارت میں شارح موصوف نے سیدہ مریم علیہا السلام کے استثناء کی وجہ جنت میں اُن کا حضور ﷺ کی زوجہ ہونا بیان کیا ہے، لیکن نہ معلوم وہ اپنے قلم سے لکھی ہوئی مندرجہ بالا حدیث کی کیا توجیہ کریں گے جس میں بالخصوص یہ بھی مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سیادت کا یہ ارشاد اُس بیماری میں کیا تھا جس میں آپ کا وصال ہوا تھا، جبکہ شارح موصوف یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل اسلام خصوصاً عندالاحناف اُن احادیث کو ترجیح دی جاتی ہے جو نبی کریم ﷺ کے قول وعمل میں آخری ہوں۔

۲۔ شارح موصوف نے سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کے استثناء کی وجہ جنت میں اُن کا حضور ﷺ کی زوجہ ہونا بیان کیا ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ مریم کے استثنا کی جو وجہ بیان فرمائی ہے اُس کا تعلق مستقبل کی فضیلت سے نہیں بلکہ ماضی سے ہے۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الحسن والحسين سيدا شباب أهل الجنة، وفاطمة سيدة نساء أهل الجنة، إلا ما كان من مريم بنت عمران.

"حسن اور حسین رضی اللہ عنہما جنتی جوانوں کے سردار ہیں اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا جنتی عورتوں کی =

---

(1) نعمة الباري ج٦ ص٨٩٨۔

= سردارہ ہے، ماسوا اس کے جو مریم بنت عمران سے تھا‘‘۔(1)

’’إلا ما کان من مریم‘‘ سے کیا مراد ہے؟ ظاہر یہ ہے کہ سیدہ مریم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور وہ نبی ہیں جبکہ سیدہ کی اولاد نبی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اس استثنا کو تسلیم نہ کرے تو پھر وہ بتلائے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط سیدہ مریم کے استثنا کی بات کی تو اپنی دوسری ازواج کے استثنا کی بات کیوں نہ فرمائی؟ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ’’إلا مریم بنت عمران‘‘ (ماسوا مریم بنت عمران کے) فرما سکتے تھے اور ہمارے معاصر شارح کے استدلال کے مطابق ﴿یَانِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مخالفتِ قرآن سے بچنے کی خاطر ’’إلا أزواجي‘‘ (ماسوا میری ازواج کے) نہیں فرما سکتے تھے؟

۳۔ اسی طرح شارح موصوف کا اُن احادیث کی طرف بھی دھیان نہیں گیا جن میں سے بعض میں دلالۃً اور بعض میں صراحتاً سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی اُن کی ماؤں پر تفضیل بیان فرمائی گئی ہے۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مریم خیر نساء عالَمِها وفاطمة خیر نساءِ عالَمِها.

’’حضرت مریم رضی اللہ عنہا اپنے زمانے کی خواتین سے بہتر تھیں اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے زمانے کی خواتین سے بہتر ہیں‘‘۔(2) =

(1) مسند أحمد ج۳ ص ٦٤، ۸۰ وط: ج٤ ص ١٦٣، ٢٠١ حديث ١١٦٤١، ١١٧٧٨؛ فضائل الصحابة ج٢ ص ١٣٣١ وص ٩٦٧ حديث ١٣٦٠؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص ٤٥٥ حديث ٨٤٦١، وط: ج٥ ص ١٤٥ حديث ٨٥١٤؛ خصائص علي بتحقيق البلوشي ص ١٤٢ حديث ١٢٩؛ مسند أبي يعلىٰ ج٢ ص ٣٩٥ حديث ١١٦٩؛ بغية الباحث ص ٩٠٩ حديث ٩٨٩، الثغور الباسمة للسيوطي ص ٥٤؛ مجمع الزوائد ج٩ ص ٢٠١، وط: ج٩ ص ٣٢٤ حديث ١٥١٨٩۔

(2) بغية الباحث ص ٩٠٩ حديث ٩٩٠؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص ٢٣٢ حديث ٦٧٣٧، وط: ج٩ ص ٣١٠ حديث ٩٠٣٧؛ الخصائص الكبرىٰ ج٢ ص ٣٤٨، وط: ج٣ ص ١٧٨؛ قوت المغتذي للسيوطي ج٣ ص ١٢٩٢؛ سبل الهدى ج١١ ص ١٦٢؛ إتحاف السائل للمناوي ص ٥٦۔

= حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں: ''یہ حدیث مرسل اور صحیح السند ہے''۔(1)

دوسرے مقام پر ایک مفصل حدیث آئی ہے، اُس میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ایک ایسا استفسار ہے جس نے مسئلہ کو واضح کر دیا ہے۔ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کی تیمارداری کے لیے تشریف لے گئے تو اُنہیں ارشاد فرمایا:

یا بنیة ! أما ترضین إنک سیدة نساء العالمین؟ قال: تقول: یالیتها، فأین مریم ابنة عمران؟ فقال ﷺ: تلک سیدة عالَمِها و أنتِ سیدة نساء عالَمِها.

''پیاری بیٹی! کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہو کہ آپ عالمین کی خواتین کی سیدہ ہو۔ حضرت عمران کہتے ہیں: سیدہ نے عرض کیا: پھر مریم بنت عمران کے بارے میں کیا حکم ہے؟ فرمایا: وہ اپنے زمانہ کی خواتین کی سیدہ تھیں اور تم اپنے زمانے کی خواتین کی سیدہ ہو''۔(2)

یہ حدیث بعض شارحین نے خود بھی ذکر فرمائی ہے۔(3)

جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے زمانے کی خواتین سے افضل ہیں تو پھر کسی عالم اور شیخ الحدیث پر تو یہ حقیقت مخفی نہیں ہونی چاہیئے کہ سیدہ فاطمہ کا زمانہ سیدہ مریم رضی اللہ عنہما کے زمانے سے افضل ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ تمام زمانوں سے افضل ہے۔ =

---

(1) المطالب العالیة ج٤ ص٦٨ حدیث ٣٩٨٢، وط: ج١٦ ص١٦٧ حدیث ٣٩٥٣۔

(2) فضائل فاطمة الزهراء للحاكم عن عمران بن حصين ص ١٣٠، ١٣١ حديث ١٨٤، ١٨٦؛ مشكل الآثار ج١ ص١٤١ حديث ١٤٩ ؛تحفة الأخيار ج٩ ص١٠٢ حديث ٦٤٠٦؛ حلية الأولياء ج٢ ص٥٢ حديث ١٤٥٠؛ سنن الأصفهاني ج٢ ص٦٤٣ حديث ٣٧٠٦؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص١٣٤ ؛مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٤١، ٣٤٢؛ ذخائر العقبىٰ ص٥٦؛ سير أعلام النبلاء ج٣ ص٤٢٩ ؛إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص٢٣٤ حديث ٦٧٤٣؛ الجوهرة في نسب الإمام العلي وآله، للتلمساني ص١٧ ؛الثغور الباسمة ص٢٩ حديث ٣٩، وط: ص٥٤۔

(3) نعمة الباري ج٦ ص٨٩٦۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی اِس حدیث کے متعلق امام شہاب الدین احمد بن ابوبکر بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''اسے امام احمد بن منیع نے سندِ ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے، چونکہ اس کے راویوں میں ایک شخص کثیر بن نواء ہے اور وہ ضعیف ہے، لیکن اس کی تقویت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی اُس حدیث سے ہو جاتی ہے جس کو امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے''۔(1)

امام شہاب الدین بوصیری نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہے:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا فاطمة! ألا ترضين أن تكوني سيدة نساء العالمين وسيدة نساء هذه الأمة وسيدة نساء المومنين؟.

''اے فاطمہ! کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہو کہ آپ عالمین کی خواتین کی سیدہ ہو، اِس اُمت کی خواتین کی سیدہ ہو اور تمام مومنین کی خواتین کی سیدہ ہو؟''۔(2)

یہ وہ حدیث ہے جس کو ہم (تبیان القرآن ج۷ ص ۹۱۴ سے) نقل کر چکے ہیں۔ اگر حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث ضعیف ہی ہوتی اور اس کا شاہد بھی کوئی نہ ہوتا تب بھی ائمہ اربعہ اور محدثین کے نزدیک کسی عالم کے قیاس پر ضعیف حدیث کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ ابن عساکر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أربع نسوة سادات عالمهن: مريم بنت عمران، وآسية بنت مزاحم إمرأة فرعون، وخديجة بنت خويلد، وفاطمة بنت محمد، وأفضلهن عالَماً فاطمة =

(1) إتحاف الخيرة المهرة ج۷ ص ۲۳٤ حديث ٦۷٤۳، وط: ج۹ ص ۳۱۳ حديث ۹۰٤۳۔

(2) المستدرك للحاكم ج۳ ص ۱٥٥ وط: ج٤ ص ۱٤۱ حديث ٤۷۹٤۔

....

= ''جہاں کی سردار چار عورتیں ہیں: مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم، خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد ﷺ اور ان میں سب سے افضل فاطمہ ہیں''۔(1)

جون ۱۹۹۹ء سے قبل یہ حدیث بعض شارحین نے بھی اپنی بعض کتب میں ذکر فرمائی تھی، ہم نے یہ ترجمہ اُنہیں کی کتاب سے نقل کیا ہے۔(2)

لیکن نہ معلوم 2012ء میں اُن کے موقف میں کیوں تبدیلی آ گئی اور انہوں نے ''نعمة الباري'' میں لکھ دیا کہ حضور ﷺ کی ازواج سیدہ فاطمہ سے افضل ہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں اپنی دو بیویوں سیدہ خدیجہ اور سیدہ مریم پر صراحتاً اپنی بیٹی سیدہ فاطمہ کی افضلیت ذکر فرمائی ہے، اور ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ احناف کے نزدیک تو ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح دی جاتی ہے۔ پھر خدا جانے ہمارے معاصر مدظلہ متصلب حنفی ہونے کے باوجود اپنے قیاس کو حدیث پر کیوں ترجیح دے رہے ہیں؟

۵۔ نبی کریم ﷺ کی بنات کا آپ کی ازواج سے افضل ہونا درجِ ذیل حدیث سے بھی ثابت کیا گیا ہے۔ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو پیش کش فرمائی کہ وہ اُن کی بیٹی سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو اپنے نکاح میں لیں۔ اس پر سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس سرد مہری پر بارگاہِ رسالت میں شکایت کی، اس پر سید عالم ﷺ نے فرمایا:

تُزَوَّج حفصة خيراً من عثمان ،ويُزَوِّج عثمان خيراً من حفصة، فزوجه النبي ﷺ ابنته.

''حفصہ عثمان سے بہتر کے ساتھ شادی کرے گی اور عثمان حفصہ سے بہتر کے ساتھ شادی =

---

(1) تاريخ دمشق ج۷۰ ص۱۰۷، ۱۰۸؛ مختصر تاريخ دمشق ج۲۶ ص۸۵؛ الدر المنثور ج۲ ص۱۹٤؛ جمع الجوامع ج۱ ص۳۷۸ حديث ۲۷۹۱؛ مسند فاطمة الزهراء للسيوطي ص٦۲ حديث ۱٤٥؛ ذخائر العقبیٰ ص٥۷، وط: ج۱ ص۱۹۲، كنز العمال ج۱۲ ص۱٤٥ حديث ۳٤٤۱۱، روح المعاني ج۳ جز۳ ص۳٤۸، وط: ج٤ ص۱۸۲۔

(2) تبيان القرآن ج۲ ص۱٥٥۔

....

= کرے گا، پھر نبی کریم ﷺ نے اپنی بیٹی عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دی‘‘۔(1)
اس استدلال کا ذکر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے، اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مقرر رکھا ہے۔(2)

سیدہ فاطمہ پر امہات کی افضلیت کی عجیب دلیل

بعض شارحین نے لکھا ہے:

’’اس حدیث میں حضرت مریم کا استثناء ہے کیونکہ وہ جنت میں رسول اللہ ﷺ کی زوجہ ہوں گی، سو آپ کی باقی ازواج مطہرات بھی اسی حکم میں ہیں، نیز حضرت فاطمہ جنت میں حضرت علی کے ساتھ اور آپ کے درجہ میں ہوں گی‘‘۔(3)

حیرت ہے کہ بعض شارحین قدآور محدث ہونے کے باوجود ابن حزم ظاہری کی تاویلات کی پیروی کیوں کرنے لگے، حالانکہ علماء اہل سنت ایسی تاویلات کو فساد اور غباوت تک قرار دے چکے ہیں۔

علامہ آلوسی اور دوسرے علماء کرام نے لکھا ہے کہ یہ تاویل فساد اور غباوت پر مبنی اس لیے ہے کہ اگر ازواج مطہرات کو جنت میں حضور ﷺ کے درجہ میں ہونے کی وجہ سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے افضل مانا جائے تو پھر دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کی ازواج بھی سیدہ فاطمہ سے افضل ٹھہریں گی، کیونکہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ ہوں گی اور اُن کے شوہر انبیاء کرام علیہم السلام ہیں، جبکہ سیدہ فاطمہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوں گی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نبی نہیں۔ پھر صرف یہاں تک نہیں بلکہ اس استدلال کے مطابق تو امہات المومنین دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی افضل قرار پاتی ہیں، کیونکہ وہ حضور ﷺ کے درجہ میں ہوں گی اور حضور ﷺ کا درجہ دوسرے انبیاء =

---

(1) مسند أبي يعلىٰ ج١ ص١٨ حديث٦۔

(2) المطالب العالية ج٤ ص١٢٧ حديث ٤١٣١، وط: ج١٦ ص٥٤٥ حديث ٤٠٩٤؛ الخصائص الكبرىٰ ج٢ ص٣٨٤، وط: ج٣ ص١٧٨۔

(3) نعمة الباري ج٦ ص٨٩٨۔

....

= کرام علیہم السلام کے درجہ سے یقیناً افضل ہوگا۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:

وسئل السبكي هل قال أحدٌ إن أحداً من نساء النبي ﷺ غير خديجة وعائشة أفضل من فاطمة؟ فقال: قال به من لا يعتد بقوله: وهو من فضل نساء النبي ﷺ على جميع الصحابة لأنهن في درجته في الجنة. قال: وهو قول ساقط مردود، انتهىٰ. وقائله هو أبو محمد بن حزم وفساده ظاهر.

''امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا کسی شخص نے ام المومنین سیدہ خدیجہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مقدسہ میں سے کسی کو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے افضل کہا ہے؟ فرمایا: یہ ایسے شخص نے کہا ہے جس کی بات کا اعتبار نہیں، اُس نے ازواجِ مطہرات کو تمام صحابہ کرام ؓ پر فضیلت دی ہے، اس لیے کہ وہ جنت میں حضور اکرم ﷺ کے درجہ میں ہوں گی، اور یہ قول ساقط الاعتبار اور مردود ہے۔ امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام ختم ہوا، (امام عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں) اس قول کا قائل ابو محمد بن حزم ہے اور اس قول کا فاسد ہونا ظاہر ہے''۔(1)

امام سیوطی، امام صالحی، امام زرقانی اور شیخ قنوجی نے لکھا ہے:

''یہ قول ضعیف، ساقط اور مردود ہے، اس کی کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی''۔(2)

امام ابن الملقن رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قال ابن دحية في كتاب مرج البحرين: ذكر بعض الجهلة أن عائشة أفضل =

---

(1) فتح الباري ج٧ ص٥١٩۔

(2) الكوكب الساطع شرح جمع الجوامع للسيوطي ج٢ ص٥٧٥؛ سبل الهدىٰ ج١١ ص١٦١؛ شرح الزرقاني على المواهب ج٤ ص٣٧٣؛ عون الباري ج٤ ص٣٤٩، وط: ج٥ ص١٠٧۔

....

من فاطمة.

''امام ابن دحیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''مرج البحرین'' میں کہا ہے کہ بعض جہلاء نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہ سیدہ فاطمہ سے افضل ہیں''۔(1)

کیا ''افضلیتِ فاطمہ'' بعض کا قول ہے؟

بعض شارحین نے لکھا ہے:

''بہ ظاہر اس حدیث سے یہ لازم آتا ہے کہ سیدہ فاطمہ جنت میں ازواج مطہرات سے بھی افضل ہوں گی جیسا کہ بعض مالکی علماء کا مختار ہے''۔(2)

معاصر موصوف ''بعض مالکی علماء کا مختار ہے'' سے یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ افضلیت فاطمہ کا قول مرجوح ہے۔ ذرا سوچئے کہ کوئی اتنا عظیم محدث ہو اور پھر اُسے تمام جدید وقدیم شروحِ حدیث بلکہ دورِ حاضر کی تمام علمی سہولتیں بھی میسر ہوں اور اس کے باوجود وہ لکھے کہ افضلیتِ سیدہ فاطمہ کا قول فقط بعض مالکیہ سے منقول ہے تو تعجب نہیں! یہ نیاز مند عرض کرتا ہے کہ یہ بعض مالکی علماء کا مختار نہیں بلکہ یہ مذاہبِ اربعہ کا قول ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قال السبكي: الذي نختاره وندين الله به، أن فاطمة أفضل ثم خديجة ثم عائشة، والخلاف شهير، ولكن الحق أحق أن يتبع.

''امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جس کو ہم اختیار کرتے ہیں اور جس کا ہم اعتقاد رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ سیدہ فاطمہ افضل ہیں، پھر اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰ پھر اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضي الله عنهن افضل ہیں، اور اس مسئلہ میں اختلاف مشہور ہے لیکن حق اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اُس کی اتباع کی جائے''۔(3) =

---

(1) غاية السول في خصائص الرسول لابن الملقن ص ٢٣١۔

(2) نعمة الباري ج٦ ص ٨٩٨۔

(3) فتح الباري ج٧ ص ٤٨١، وص ٥١٩ وط: ج٨ ص ٤٨٠ وص ٥٢٩۔

= چونکہ یہ مختار وراجح قول محض محبت کی بنیاد پر نہیں بلکہ دلائل پر مبنی ہے، اسی لیے اس کو دوسرے محققین نے بھی پسند کیا ہے۔ چنانچہ امام مناوی شافعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قال الشيخ شهاب الدين بن حجر الهيتمي: ولوضوح ما قاله السبكي تبعه عليه المحققون، وممن تبعه عليه الحافظ أبو الفضل بن حجر.

''شیخ شہاب الدین ابن حجر مکی شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ کے استدلال کے روشن ہونے کی بدولت محققین نے اُن کی پیروی کی ہے، اور اسی کی حافظ ابوالفضل ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اتباع کی ہے''۔(1)

امام تقی الدین سبکی المعروف سبکی کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے اِس تحقیقی قول کو امام سیوطی شافعی، امام قسطلانی شافعی، امام صالحی شافعی، امام ابن حجر مکی شافعی، امام زرقانی مالکی، علامہ سید محمود آلوسی حنفی، نواب صدیق حسن خان قنوجی، علامہ زرھونی مالکی، شیخ حمزہ محمد قاسم، علامہ وحید الزماں اور مفتی محمد تقی عثمانی نے بھی نقل کیا ہے۔(2)

خود موصوف بھی امام سبکی شافعی کا یہ قول اپنی اِسی کتاب کی اِسی جلد میں صفحہ ۸۹۶ پر سات علماء کے حوالہ سے لکھ چکے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ ایک صفحہ کے بعد لکھ دیا کہ یہ قول فقط بعض مالکی علماء کا مختار ہے۔ فیاللعجب!

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قلتُ: الصواب القطع بتفضيل فاطمة رضي الله عنها.

''میں کہتا ہوں: درست یہ ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تفضیل قطعی ہے''۔(3) =

---

(1) إتحاف السائل للمناوي ص ٦٠؛ فيض القدير ج٨ ص ٤١٧٦، حديث ٥٨٣٥۔

(2) شرح الكوكب الساطع للسيوطي ج٢ ص ٥٧٥؛ المواهب اللدنية ج٢ ص ٧٨؛ سبل الهدىٰ ج١١ ص ١٦١؛ المنح المكية ص ٦١٨؛ زرقاني على المواهب ج٤ ص ٣٧٣؛ روح المعاني ج٤ ص ١٨٥؛ عون الباري ج٤ ص ٣٤٩، وط: ج ٥ ص ١٠٧؛ الفجر الساطع ج٩ ص ٩٤، ٩٥، ٩٦؛ منار **القاري** ج٤ ص ٢٧٣؛ تيسير الباري ج٥ ص ٩٦؛ تكملة فتح الملهم ج٥ ص ١١٠۔

(3) شرح الكوكب الساطع للسيوطي ج٢ ص ٥٧٥؛ سبل الهدى ج١١ ص ١٦١۔

....

= قاضی عیاض لکھتے ہیں:

قوله في فاطمة: "سيدة نساء أهل الجنة" أعم وأظهر في التفضيل.

"سیدہ فاطمہ کے بارے میں ارشادِ نبوی کہ "وہ اہل جنت کی خواتین کی سیدہ ہیں" اُن کی فضیلت کے حوالے سے واضح اور ظاہر قول ہے"۔(1)

ملا علی قاری حنفی "سیدۃ نساء أهل الجنة، أو نساء المؤمنين" کے تحت لکھتے ہیں:

والحديث بظاهره يدل علىٰ أنها أفضل النساء مطلقاً حتى من خديجة وعائشة ومريم وآسية.

"یہ حدیث اپنے ظاہر سے دلالت کر رہی ہے کہ سیدہ فاطمہ مطلقاً تمام خواتین سے افضل ہیں، حتیٰ کہ سیدہ خدیجہ، عائشہ، مریم اور آسیہ رضی اللہ عنہن سے بھی"۔(2)

نواب محمد صدیق حسن خان قنوجی لکھتے ہیں:

وفيه أن فاطمة رضي الله عنها، أعطاها الله سبحانه، علىٰ لسان نبيه: سيادة نساء هذه الأمة بأسرها، أي امرأة كانت، وفي رواية عند البخاري مرفوعاً: فاطمة سيدة نساء أهل الجنة، وهذه منقبة لا تساويها منقبة، وفضيلة لا توازنها فضيلة، والله يختص برحمته من يشاء.

"اس حدیث میں دلیل ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اللہ ﷻ نے اپنے نبی ﷺ کی زبان سے اس امت کی تمام کی تمام خواتین پر سیادت عطا فرمائی، خواہ وہ کوئی عورت ہو، اور بخاری شریف کی ایک اور روایت میں ہے کہ فاطمہ اہل جنت کی خواتین کی سیدہ ہے۔ یہ ایسی منقبت ہے جس کے برابر کوئی منقبت نہیں اور ایسی فضیلت ہے جس کے ہم وزن کوئی =

---

(1) إكمال المعلم ج۷ ص۴۴۱۔

(2) مرقاۃ ج۱۰ ص۵۱۲۔

فضیلت نہیں، اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مختص فرماتا ہے''۔(1)

علامہ ابو العباس قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے اپنا میلان ظاہر کیا ہے کہ سیدہ مریم رضی اللہ عنہا نبیہ ہیں، پھر لکھا ہے کہ اگر وہ نبی ہوں تو اُن سے کائنات کی کوئی خاتون افضل نہیں ہوسکتی، کیونکہ نبی غیر نبی سے بہر حال افضل ہوتا ہے، اور اگر وہ نبی نہ ہوں تو پھر ساری کائنات سے سیدہ فاطمہ افضل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

وعلیٰ هذا فهي أفضل مطلقاً ثم بعدها في الفضيلة فاطمة، ثم خديجة، ثم آسية.

''اور اس قول کی بنا پر تو وہ (سیدہ مریم) مطلقاً افضل ہیں، پھر اُن کے بعد فضیلت میں فاطمہ پھر خدیجہ اور پھر آسیہ ہیں''۔(2)

اس سے معلوم ہوا کہ امام ابو العباس قرطبی کے نزدیک سیدہ فاطمہ اپنی تمام ماؤں سے افضل ہیں، اور اگر جنت میں سیدہ مریم بھی حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں تو اُن سے بھی، الا یہ کہ اُن کی نبوت کا قول درست مانا جائے، اور یہ مردود قول ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

وَمَاأَرْسَلنَا مِنْ قَبْلِکَ إِلَّا رِجَالًا.

''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے (رسول بنا کر) مگر مردوں کو''۔(3)

یہاں تک ہم سیدہ فاطمہ علیہا السلام کی افضلیت میں جن علماء کے اقوال نقل کر چکے ہیں اُن میں حنفی، مالکی، شافعی اور اہل حدیث سب آ گئے ہیں ماسوا حنابلہ کے، لہٰذا حنبلی حوالہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ ابن قیم حنبلی لکھتے ہیں:

''اگر فضیلت سے کثرتِ ثواب مراد لی جائے تو یہ ایسا امر ہے جس پر کوئی مطلع نہیں، بلاشبہ قلب کے اعمال اعضاء کے اعمال سے افضل ہیں، اور اگر اس سے کثرت علم مراد لی جائے تو سیدہ عائشہ افضل ہیں، اور اگر فضیلت سے ذاتی شرف اور نسب کی عظمت مراد لی جائے تو پھر فاطمہ =

(1) السراج الوهاج، ج۹ ص ۳۷۱۔

(2) المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم ج٦ ص ٣١٥۔

(3) النحل: ٤٣، الأنبياء: ٧۔

لامحالہ افضل ہیں، یہ اُن کی ایسی فضیلت ہے جس میں اُن کا اُن کی بہنوں کے سوا کوئی شریک نہیں ہے، اور اگر اس سے سیادت مراد لی جائے تو بیشک نص کے ساتھ ثابت ہے کہ اس شرف میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا یکتا ہیں"۔(1)

خلاصہ یہ ہے کہ بعض شارحین کا لکھنا کہ افضلیتِ فاطمہ کا قول فقط بعض مالکی علماء کا مختار ہے، درست نہیں، بلکہ یہ مذاہب اربعہ کا مختار قول ہے۔ باقی رہا علامہ ابن قیم سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی علمی تفضیل کا قول تو اس کی تردید میں علامہ آلوسی نے سورۃ آل عمران کی آیت ۴۲ کے تحت خوب لکھا ہے۔ تفصیل کے لیے ہماری کتاب "شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ" الطبعة الرابعة ص ٦٧٩، ٦٨٠، زیرِ تشریح حدیث: ۱۳۴، اور "مناقب الزهراء" ص ٣٦٧، ٣٦٨، ملاحظہ فرمائیں۔

ترجمۂ حدیث میں بھی من پسند ترمیم

سیدہ فاطمہ اور امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے تفاضل کی بحث کے ضمن میں بعض شارحین ایک حدیث لائے تو اُس کے خاص مقام پر ایک لفظ کے ترجمہ میں تھوڑی سی ترمیم کر دی تا کہ وہ جس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں ترجمہ میں وہ ترمیم اُن کے مطلوب میں معاون ثابت ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> "حضرت ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت علی اور سیدہ فاطمہ کو چادر اوڑھائی، پھر فرمایا: اے اللہ! یہ میرے اہل بیت اور میرے خاص ہیں، ان سے ناپاکی دور کر دے اور ان کو خوب پاک کر دے، حضرت ام سلمہ نے پوچھا: میں بھی ان کے ساتھ ہوں، آپ نے فرمایا: تم زیادہ اچھائی پر ہو۔ (سنن ترمذی: ۳۸۷۱، مسند احمد ج ٦ ص ۲۹۸)"۔(2)

خط کشیدہ الفاظ "إِنَّكِ عَلٰى خَيْرٍ" کا ترجمہ ہے، اور اِن الفاظ کا یہ ترجمہ درست نہیں۔ ہر چند کے لفظ

(1) بدائع الفوائد ج ٢ ص ٦٨٢۔

(2) نعمة الباري ج ٦ ص ٨٩٧۔

....

= "خَيْرٌ" کبھی "أكثر خيرًا" کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، لیکن یہاں یہ معنیٰ قطعاً درست نہیں، اس لیے کہ اِس حدیث میں اوپر یہ الفاظ بھی آئے ہیں "اللّٰهم هؤلاء أهل بيتي وحامّتي" اور ان الفاظ کا ترجمہ خود موصوف نے یوں فرمایا ہے: (اے اللہ! یہ میرے اہل بیت اور میرے خاص ہیں) اور یہی صحیح ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ام المومنین سیدتنا ام سلمہ رضی اللہ عنہا ان خواص میں شامل ہونا چاہتی تھیں تو اُنہیں فرمایا گیا: "إِنَّكِ عَلٰى خَيْرٍ" اور اِن الفاظ کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو معاصر موصوف نے اِس مقام سے قبل اُس مقام پر کیا جہاں اُن کے مدنظر مفاضلہ وموازنہ نہیں تھا، وہاں انہوں نے لکھا:

"تم خیر کی طرف ہو"۔(1)

"تم خیر پر ہو" یا "تم خیر کی طرف ہو" ہو تو صحیح ترجمہ ہے، لیکن "تم زیادہ اچھائی پر ہو" یا "زیادہ اچھائی کی طرف ہو" صحیح نہیں، کیونکہ اس ترجمہ سے یہ خرابی لازم آتی ہے کہ گویا حضور ﷺ نے چار نفوس کو چادر میں اس لیے لیا کہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ جو چادر کے اندر ہیں وہ کم اچھائی پر ہیں اور جو چادر سے باہر ہیں وہ زیادہ اچھائی پر ہیں، حالانکہ حضور ﷺ نے چادر میں لینے کے بعد "حامّتي" (میرے خاص) کے الفاظ بھی ارشاد فرمائے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں: باقی ساری باتیں اپنی جگہ فقط اتنا ہی خیال کر لیا ہوتا کہ اس چادر میں نبی کریم ﷺ خود بھی تھے۔ **فَاعْتَبِرُوْا يَاأُولِى الْأَبْصَار!**

حضور ﷺ کو زیادہ محبوب کون؟

ہمارے معاصر مدظلہ چونکہ زیر بحث مقام پر امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی افضلیت کے اثبات کے درپے ہیں، اس لیے یہاں انہوں نے ہر اُس حدیث پر کوئی نہ کوئی تبصرہ ضرور کیا ہے جس سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تمام امہات یا بعض امہات پر افضلیت ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"جمیع بن عمیر تیمی بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی پھوپھی کے ساتھ حضرت عائشہ کے پاس گیا اور میں نے ان سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو لوگوں میں سب سے زیادہ کس سے محبت تھی؟

---

(1) نعمة الباري ج٦ ص ٨١٧۔

....

= انہوں نے کہا: سیدہ فاطمہ سے، میں نے پوچھا: اور مردوں میں تو انہوں نے کہا: ان کے خاوند سے، وہ بہت زیادہ روزے رکھنے والے اور بہت زیادہ نماز میں قیام کرنے والے تھے۔ (سنن نسائی: ۳۸۷۴)

یہ حضرت عائشہ کا بلند اخلاق اور ان کی تواضع اور انکسار ہے کیونکہ ان کو علم تھا کہ سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو ان سے اور مردوں میں ان کے والد سے محبت ہے جیسا کہ ہم صحیح البخاری: ۳۶۶۲ کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں''۔ (1)

معاصر موصوف نے اِس اقتباس میں جو فرمایا:

''جیسا کہ ہم صحیح البخاری: ۳۶۶۲ کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں''۔

اس سے اُن کی مراد ''نعمة الباري'' کا درجِ ذیل مقام ہے:

''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو عورتوں میں سب سے زیادہ محبت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تھی اور مردوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے۔ (سنن ترمذي ۳۸٦۸' اس حدیث کی روایت میں امام ترمذی منفرد ہیں، علاوہ ازیں صحیح البخاری ۳۶۶۲' میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ کو سب سے زیادہ محبت حضرت عائشہ سے ہے اور مردوں میں سب سے زیادہ محبت اُن کے والد سے ہے، اور امام بخاری کی روایت امام ترمذی کی روایت پر راجح ہے''۔ (2)

نوٹ

اس سے قبل کہ اِس عبارت پر کچھ عرض کیا جائے دو وضاحتیں ضروری ہیں:

ا۔ اولاً یہ کہ پہلے اقتباس میں علامہ صاحب نے سیدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پر جو سنن النسائی =

---

(1) نعمة الباري ج٦ ص٨٩٨۔

(2) نعمة الباري ج٦ ص٨٩٧۔

....

= ۳۸۷۴ کا حوالہ دیا ہے، وہ درست نہیں ہے، کیونکہ یہ حدیث سنن النسائی میں نہیں بلکہ سنن الترمذی میں ہے۔ موصوف اس سے قبل نعمۃ الباري کی اِسی جِلد میں ۸۱۷ پر اس حدیث کو اسی ترقیم کے ساتھ سنن ترمذی سے نقل کر چکے ہیں، تاہم یہ کوئی بڑی بات نہیں، ایسا سہوِ قلم ہر ایک سے ہو ہی جاتا ہے۔ خیال رہے کہ یہ حدیث امام نسائی کی "السنن الکبریٰ" میں ہے، لیکن اُس کا حوالہ دینے کے لیے "الکبریٰ" کے الفاظ لکھے جاتے ہیں۔

۲۔ ثانیاً یہ کہ سیدہ عائشہ اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہما کی یہ دونوں حدیثیں علامہ صاحب اِسی جلد کے صفحہ ۸۱۷ پر لکھ چکے ہیں، لیکن وہاں انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ فتأمل!

بخاری کی احادیث ہر جگہ کیوں راجح نہیں؟

علامہ صاحب نے پہلے اقتباس میں ام المومنین سے سیدہ فاطمہ کے زیادہ محبوب ہونے کی حدیث پر تبصرہ کیا ہے کہ یہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی تواضع اور انکسار ہے۔ ہم کہتے ہیں: یہ تواضع نہیں بلکہ حقیقت ہے، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔ پھر علامہ صاحب نے پہلے اور دوسرے دونوں اقتباسات میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے بخاری کی حدیث نقل کی اور دوسرے اقتباس میں کہا کہ امام بخاری کی روایت امام ترمذی کی روایت پر راجح ہے۔

کوئی پوچھے کہ روایتِ بخاری کا اس مقام پر ہی راجح ہونا کیوں یاد آگیا؟ رفع الیدین، قراءت خلف الامام، وضع الیدین فوق الصدر، آمین بالجہر وغیرہ مقامات پر ترجیح احناف اور دوسرے امور کی وجہ سے سینکڑوں نہیں ہزاروں بخاری کی احادیث کا راجح ہونا کیوں یاد نہیں رہتا، اور وہاں بخاری پر ترمذی، نسائی، ابوداود، المصنف لابن أبي شیبہ اور شرح معاني الآثار وغیرہ کی احادیث کو روایاتِ بخاری پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟ دوسروں کی تصانیف نہیں ذرا وہ اپنی ہی نعمۃ الباری اور شرح صحیح مسلم کے وہ مقامات دیکھ لیں جہاں جہاں اُنہوں نے روایاتِ بخاری کی خوب خبر لی ہے یا پھر انہیں مرجوح قرار دیا ہے۔ قارئین کرام کی سہولت کے لیے گزارش ہے کہ وہ فقط نعمۃ الباری کی جلد اول میں صفحہ ۹۴ تا ۹۹ میں "تسامحاتِ بخاری" کے عنوان کے تحت تفصیل ملاحظہ فرمائیں، اُن پر واضح ہو جائے گا کہ کہاں روایاتِ بخاری راجح ہیں اور کہاں مرجوح۔

موصوف کا طریقہ ہے (اور یہی احناف کی خصوصیت بھی ہے) کہ وہ مختلف احادیث کے مابین مطابقت بیان کیا کرتے ہیں، یوں نہیں کہا کرتے کہ چونکہ یہ روایت بخاری کی ہے، لہٰذا اس کو غیر بخاری کی روایت پر =

....

= ترجیح ہے، لیکن نہ معلوم یہاں تطبیق کے بجائے بخاری اور غیر بخاری کے راجح و مرجوح کی بات کیسے لسانِ قلم پر آ گئی؟

آیئے ہم آپ کے سامنے بعض ایسی احادیث پیش کرتے ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ام المومنین کے روبرو یہ اعتراف کیا کہ آپ ﷺ کو سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ زیادہ محبوب تھے اور دوسری حدیث میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کو زیادہ محبوب تھیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا العيزار بن حريث قال: قال النعمان بن بشير: استأذن أبوبكر علىٰ رسول الله ﷺ، فسمع صوت عائشة عالياً وهي تقول: والله لقد عرفتُ أن عليًّا أحَبُّ إليک مِن أبي ومِنّي مرتين أو ثلاثاً، فاستاذن أبو بكر، فدخل، فأهوى إليها، فقال: يابنت فلانة، ألا أسمعک ترفعين صوتَکِ علىٰ رسول الله ﷺ.

''نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اندر آنے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا وہ بلند آواز سے یہ کہہ رہی تھیں: ''اللہ کی قسم! میں جانتی ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو میرے والد سے اور مجھ سے زیادہ محبوب ہیں، یہ انہوں نے دو یا تین مرتبہ کہا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اجازت مانگ کر اندر داخل ہوئے تو وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف بڑھے اور فرمایا: او فلانی کی بیٹی! کیا میں نہیں سن رہا کہ تو رسول اللہ ﷺ کے سامنے آواز بلند کر رہی ہے؟''۔(1) =

(1) مسند أحمد ج٤ ص٢٧٥ وط: ج٦ ص٢٩٠ حديث ١٨٦١١، وط: الأرنؤوط، ج٣٠ ص٣٧٢ حديث ١٨٤٢١؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص٤٤٨ حديث ٨٤٤١ وج٨ ص٢٥٦ حديث ٩١١٠؛ تحفة الأخيار ج٩ ص٨٩ حديث ٦٣٩٦؛ شرح مشكل الآثار ج١٣ ص٣٣٣ حديث ٥٣٠٩؛ معجم الصحابة لابن قانع ج٢ ص٢٨١ حديث ١٧٧٥۔

....

امام بزار نے بھی بعینہ اسی سند کے ساتھ یہ حدیث روایت فرمائی ہے، ماسوااس کے کہ اُن کی سند کے شروع میں ایک شخص محمد بن معمر کے نام کا اضافہ ہے۔(1)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کوامام بزار نے روایت کیاہےاوران کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں''۔(2)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے۔(3)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور مقام پر بھی اس حدیث کوصحیح کہاہے۔(4)

قاضی شوکانی نے بھی امام احمد کی سند کے تمام راویوں کوصحیح قرار دیا ہے۔(5)

امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی امام احمد کی سند کے تمام راویوں کو رجالِ صحیح کہاہے۔(6)

شیخ شعیب الارنؤوط نے مسند احمداور شرح مشکل الآثار کی تحقیق میں کہاہے:''یونس بن ابی اسحاق کی وجہ سےاس کی سند حسن ہےاوراس کے باقی راوی ثقہ اورصحیح حدیث کے رجال ہیں''۔(7)

شیخ احمد شاکر نے کہاہے:اس کی سند صحیح ہے۔(8)

مجمع الزوائد کے محققین حسین سلیم اسد الدارانی اور مرہف حسین اسد نے کہاہے:اس کی سند حسن ہے =

---

(1) مسندالبزار ج٨ص ٢٢٣ حديث٢٣٧٥؛ كشف الأستار ج٣ص ١٩٤، ١٩٥ حديث٢٥٤٩۔

(2) مجمع الزوائدج٩ص ١٢٧ حديث ١٤٧٣٠ وص ٢٠٢ حديث ١٥١٩٤۔

(3) مختصر زوائدالبزار للعسقلاني ج٢ ص٣١٦، ٣١٧ حديث١٩٢٧۔

(4) فتح الباري ج٧ص ٣٧٧۔

(5) درالسحابة للشوكاني ص٢٧٨۔

(6) إتحاف السائل بما لفاطمة من المناقب والفضائل ص ٢١۔

(7) مسند أحمد ج٣٠ص ٣٧٢ حديث ١٨٤٢١؛ شرح مشكل الآثار ج١٣ ص٣٣٣ حديث ٥٣٠٩۔

(8) مسند أحمد ج١٤ ص١٦٩ حديث١٨٣٣٣۔

....

= اور شواہد کی رو سے یہ صحیح حدیث ہے۔(1)

نوٹ

حافظ ہیثمی اور امام مناوی رحمۃ اللہ علیہما نے اس حدیث میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے احتجاجی الفاظ میں سیدنا علی کے ساتھ سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بھی ذکر کیا ہے۔اُن کے الفاظ یوں ہیں:

واللہ لقدعرفتُ أن علیاً وفاطمة أحب إلیک مني ومِن أبي.

''واللہ! میں جانتی ہوں کہ آپ کو علی اور فاطمہ مجھ سے اور میرے بابا سے زیادہ محبوب ہیں ﷺ''۔(2)

لیکن مجھے مسند احمد کی حدیث میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر نہیں ملا، شاید حافظ ہیثمی کے سامنے جو نسخہ تھا، اُس میں یہ الفاظ ہوں۔ اگر نہ بھی ہوں تو دوسری احادیث کے مطابق یہ حقیقت ثابت ہے، اور دوسری احادیث میں صراحت ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ محبوب تھیں۔ چنانچہ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ صحیح سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

وعن ابن عباس، قال: دخل رسول اللہ ﷺ علی عَلِيّ وفاطمة وهما یضحکان، فلما رأیا النبي ﷺ سکتا، فقال لهما النبي ﷺ: ما لکما کنتما تضحکان، فلما رأیتماني سَکَتُّما؟ فبادرت فاطمة، فقالت: بأبي أنت یارسول اللہ، قال هذا: أنا أحبُّ إلی رسول اللہِ ﷺ مِنکِ! فقلت: بل أنَا أحَبُّ إلیٰ رسول اللہ ﷺ مِنکَ، فتبسم رسول اللہ ﷺ وقال: یابُنَیَّةُ! لکِ رِقَّةُ الولد، وعلي أعزُّ عليَّ منکِ.

''سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سیدنا علی مرتضیٰ اور سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہما کے ہاں تشریف لائے۔ اس وقت وہ دونوں ہنس =

---

(1) مجمع الزوائد ج۱۸ ص ۲۸۹، ۲۹۰ حدیث ۱۴۷۳۱، وص ۵۸۲ حدیث ۱۵۱۸۸۔

(2) مجمع الزوائد ج۹ ص ۲۰۲ وط: ج۹ ص ۳۲۵ حدیث ۱۵۱۹۴۔

= رہے تھے، جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا تو خاموش ہو گئے ، نبی کریم ﷺ نے اُنہیں فرمایا: کیا ہوا کہ تم ہنس رہے تھے لیکن مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے ؟ اس پر سیدہ فوراً گویا ہوئیں: یارسول اللہ! یہ کہتے ہیں کہ میں تم سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو محبوب ہوں اور میں کہتی ہوں کہ میں آپ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو محبوب ہوں ۔اس پر نبی کریم ﷺ نے تبسم فرماتے ہوئے ارشادفرمایا: پیاری بیٹی! تمہارے لیے اولاد کی رِقت (نرمی، دل کا پسیجنا) ہے اور میرے نزدیک علی تم سے زیادہ معزز ہیں''۔(1)

حضرت نعمان بن بشیر کی حدیث میں نبی کریم ﷺ کے سکوت سے معلوم ہوا کہ آپ کو سیدنا علی علیہ السلام سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما سے زیادہ محبوب تھے،اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ سیدہ فاطمہ علیہا السلام آپ کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ محبوبہ تھیں۔

نبی اور خلافِ حق بات پر خاموشی؟

بعض جلیل القدر محدثین نے مذکورہ بالا مقام پر جہاں اس حدیث کی صحت کا قول کیا ہے وہیں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سیدنا ابوبکر اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما سے زیادہ محبت والی حدیث قولی ہے اور سیدنا علی وسیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما سے زیادہ محبت والی حدیث تقریری ہے، اور تقریری حدیث پر قولی حدیث کو ترجیح ہے۔اس پر راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ تقریری حدیث (سنت) کو بھی علماء اصول حدیث نے قولی اور فعلی میں شامل رکھا ہے۔ چنانچہ امام تقی الدین سبکی، امام زین الدین العراقی اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں:

ويدخل فى الأفعال التقرير، لأنه كفٌّ عن الإنكار، والكف فِعْل على =

---

(1) المعجم الكبير ج١١ ص٦٦ حديث ١١٠٦٣، وط: ج٥ص ٢٦٤ حديث ١٠٩٠٠؛ الآحاد والمثاني ج٥ص ٣٦٠ حديث ٢٩٥١؛مجمع الزوائد ج٩ ص٢٠٢ حديث ١٥١٩٥، وط: ج١٨ص٥٨٣ حديث ١٥١٨٩،وص٤٨١ حديث ١٥٠١٢؛سبل الهدى ج١١ ص٤٤؛ در السحابة للشوكاني ص ٢٧٨؛مناقب علي والحسنين للقلعجي ص٢٤٤۔

....

المختار.

''افعال میں تقریری حدیث بھی داخل ہے، اس لیے کہ وہ انکار سے رکنا ہے، اور رُکنا مذہبِ مختار کے مطابق فعل ہے''۔(1)

جب کسی بات کو مقرر رکھنا اور انکار نہ کرنا فعل ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے قول وفعل اور ظاہر وباطن میں تضاد تھا؟ معاذ اللہ۔ یاد رکھئے جو بات کسی نبی کے باطن کے خلاف ہو وہ اُس پر قطعاً خاموش نہیں رہ سکتا، پھر کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ ایک خلافِ حقیقت بات پر خاموش رہ گئے؟ قاضی ابن عقیل حنبلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وإقرار النبي ﷺ على القول والفعل يدلّ علىٰ جوازهما، لأنه بُعث مُبَيِّناً ومُؤَدِّياً ومُعَرِّفاً وجوهَ المصالح والمفاسد، فلا يجوز عليه الإقرار علىٰ ماهو قبيح في الشرع.

''نبی ﷺ کا کسی قول وفعل کو مقرر رکھنا اُس قول وفعل کے جواز کی دلیل ہے، اس لیے کہ حضور ﷺ کھول کھول کر بیان کرنے والے، درست کی تائید کرنے والے اور بھلائیوں اور برائیوں کی وجوہ کی پہچان کرانے والے بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں، لہٰذا آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ اُس بات کو برقرار رکھیں جو شریعت میں ناجائز ہو''۔(2)

یقیناً سیدتنا خدیجہ کے بعد امہات المومنین میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کو تمام ازواج سے زیادہ محبوبہ تھیں، لیکن اُن کی احبیت کو ثابت کرنے والے لوگ اتنا بھی آگے نہ بڑھیں کہ خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی فقاہت وذہانت پر حرف آجائے۔ ذرا اُن کی ذہانت وفقاہت میں غور تو فرمایئے کہ جب اُن کے احتجاج پر نبی کریم ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی تو وہ سمجھ گئیں کہ واقعی اُن سے اور اُن کے والد =

---

(1) الإبهاج في شرح المنهاج للسبكي ج٥ ص١٧٤٩؛ الغيث الهامع ص٣٨٤؛ شرح الكوكب الساطع نظم جمع الجوامع للسيوطى ج٢ ص٧۔

(2) كتاب الجدل لابن عقيل حنبلي ص٥۔

....

= گرامی رضی اللہ عنہما سے وہی جوڑا حضور ﷺ کو زیادہ محبوب ہے جس جوڑے کو وہ زیادہ محبوب خیال کرتی تھیں۔ وہ مقام نبوت سے آشنا تھیں کہ اللہ کا نبی کسی ناحق بات پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ ﷲ اکبر کتاب وسنت کے بحر الزخار میں غوطہ زن ہوکر جو مسائل وقواعد ہمارے فقہاء کرام رضی اللہ عنہم نے بعد میں مستنبط فرمائے، رمز شناس ام المومنین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پروہ ازخود عیاں تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ کو سب سے زیادہ سیدنا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما محبوب تھے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق بھی نبی کریم ﷺ کو سب سے زیادہ سیدنا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما محبوب تھے اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی رو سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بآوازِ بلند احتجاج اور نبی کریم ﷺ کے سکوت سے بھی یہی حقیقت ثابت ہورہی ہے۔ نیز وہ حدیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے، جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب سفر پر جاتے تو سب سے آخر میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ملتے اور جب واپس آتے تو سب سے پہلے سیدہ علیہا السلام کے پاس آتے۔ (1)

اس کے باوجود بھی اگر بعض محدثین حدیث بخاری اور حدیث ترمذی کے راجح ومرجوح کا یا تقریری اور قولی الفاظ کا سہارا لیں تو خدا ہی حافظ ہے۔

شیعہ کی ضد میں کہاں تک؟

انتہائی کرب واضطراب کے ساتھ مجھے یہ بات لکھنا پڑ رہی ہے کہ ہمارے اہل سنت خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، بسا اوقات شیعہ کی ضد میں شعوری یا لاشعوری طور پر اہل بیت کی تنقیص کے مرتکب ہوجاتے ہیں، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ کے بارے میں امام سبکی، حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ ابو غدہ اور شیخ ناصر الدین البانی وغیرہ نے =

---

(1) مسند أحمد ج٥ ص٢٧٥ وط: ج٧ ص٤٤٩ حدیث ٢٢٧٢١؛ المستدرك ج١ ص٤٨٩، وج٣ ص١٥٥، ١٥٦؛ السنن الکبریٰ للبیهقي ج١ ص٢٦، وط: ج١ ص٤١ حدیث ٩٧؛ سنن أبي داود ج٤ ص١١٥ حدیث ٤٢١٣؛ ذخائر العقبیٰ ص٤٩؛ سبل الهدیٰ ج١١ ص٤٥؛ الصواعق المحرقة ٥٠٥، وط: ص٥٣٢۔

....

= لکھا ہے کہ وہ تردیدِ روافض میں تنقیصِ اہلِ بیت کے مرتکب ہوگئے تھے۔اسی صورتِ حال سے علامہ باقلانی دوچار ہوئے، یہی چیز حافظ ابن کثیر سے سرزد ہوتی رہی، جیسا کہ ایک مثال آگے حدیث نمبر۲۲ میں آرہی ہے، یہی شکوہ بعض علماء اہل سنت کو امام ذہبی سے ہے، یہی تنقیص مفتی احمد یار خاں نعیمی سے صادر ہوتی رہی اور اسی کا شکار علامہ سعیدی حفظہ اللہ کا قلم بھی کئی بار ہوا ہے۔ چنانچہ بعض مثالیں تو اِسی بحث میں بھی آچکی ہیں کہ انہوں نے ''إنک علیٰ خیر'' کے معنیٰ میں تھوڑی سے تبدیلی سے اہل کساء رضی اللہ عنہم کی عظمت کو گھٹا کر اُس مفہوم کو تقویت دینا چاہی جس کو وہ ثابت کرنے کے درپے تھے، پھر بخاری و ترمذی کی احادیث کے راجح و مرجوح کے چکر میں پڑے اور یہ سب کچھ اُن کے قلم سے وہاں صادر ہوا جہاں وہ اہل کساء اور دوسری ہستیوں کے مابین مفاضلہ وموازنہ کر رہے تھے۔اب ہم اُن کے قلم سے ایسی واضح مثال پیش کر رہے ہیں جس کو مجھ ایسا عام آدمی بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

انہوں نے کئی مقامات پر سیدتنا فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی شان میں احادیث درج فرمائی ہیں، لیکن اُن مقامات میں سے ایک مقام پر اُن کا قلم سخت ہوگیا، وہ کیسا مقام ہے؟ اِسے جاننے کے لیے پہلے دو مقام کا مطالعہ کیجئے، پھر اُس خاص مقام کو ملاحظہ فرمائیے گا۔اُنہوں نے فروری 2003ء سے قبل تبیان القرآن میں سیدہ کائنات کی شان میں بایں عنوان چند احادیث ذکر فرمائیں:

''حضرت سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فضائل ومناقب کی احادیث''۔

اس عنوان کے تحت جو انہوں نے آخری حدیث نقل فرمائی ہے اُس کی سند پر بعض محدثین کا اعتراض ہے، علامہ نے اُس اعتراض کی تردید فرمائی ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت علی علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک منادی پردے کی اوٹ سے ندا کرے گا: اے اہل محشر اپنی نظریں جھکالو حتیٰ کہ فاطمہ بنت محمد گزر جائیں، یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔

(المستدرک ج۵ رقم الحدیث:۴۷۸۱، المعجم الکبیر ج۱ رقم الحدیث:۱۸۰، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۲۴۰۷، الکامل لابن عدی ج۵ ص۵، مسند فاطمہ ص۱۳۰، المستدرک ج۳ ص۱۶۱ طبع قدیم، کنز العمال ج۱۲ رقم الحدیث:۳۴۲۲۹) =

=حافظ ہیثمی نے اس حدیث کوضعیف کہا ہے،مجمع الزوائدج ۹ص ۲۱۲، یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ سے بھی مروی ہے،حافظ جلال الدین نے کہااس کی یہ سند صحیح ہے۔(الجامع الصغیررقم الحدیث: ۸۲۲،جمع الجوامع رقم الحدیث: ۱۷۵۸،الصواعق المحرقہ ص ۱۹۰،معرفۃ الصحابۃ رقم الحدیث: ۳۵۵، کتاب الضعفاء للعقیلی ج ۲ص ۲۷۵،۲۷۴)علامہ عبدالرؤف مناوی متوفی ۱۰۰۳ھ اس حدیث کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس حدیث کوحاکم نے مسلم کی شرط کے مطابق صحیح کہاہے اور ذہبی نے کہانہیں،خدا کی قسم یہ حدیث موضوع ہے،اس کی سند میں عباس ہے،امام دارقطنی نے کہاوہ کذاب ہے،ابن الجوزی نے بھی اس کوموضوع کہاہے،السیوطی نے ابن جوزی کا تعاقب کیااوراس کے شواہد بیان کئے اور کہایہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔

(فیض القدیرشرح الجامع الصغیرج ۲ص ۸۴۰،مطبوعہ مکتبہ نزارمصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ،۱۴۱۸ھ)

حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث کوامام طبرانی نے الاوسط میں روایت کیاہےاور کہایہ صرف حضرت علی سے مروی ہےاور اس کی روایت میں عبدالحمیداور العباس بن بکارالضبی منفرد ہیں،اور مجھے حضرت ابوھریرہ ،حضرت ابوایوب،حضرت عائشہ اور حضرت ابوسعید کی حدیث سے اس کے شواہد ملے،امام ابوبکرالشافعی نے الغیلانیات میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیاہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایاجب قیامت کا دن ہوگاتو عرش کے باطن سے ایک منادی ندا کرے گااے لوگو!اپنی نظریں جھکالوحتیٰ کہ فاطمہ جنت کی طرف چلی جائیں،اورانہوں نے ہی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایاجب قیامت کادن ہوگاتو عرش کے باطن سے ایک منادی ندا کرے گااے اہل محشر! اپنی نظروں کو جھکالوحتیٰ کہ فاطمہ بنت محمد پل صراط سے گزر جائیں پھر حضرت فاطمہ ستر جوان حوروں کے ساتھ بجلی کی طرح پل سے گزر جائیں گی۔(علامہ سیوطی نے حضرت ابو ہریرہ تک سند کوالجامع الصغیر:۸۲۲ میں صحیح کہا ہے)اور حضرت ابو ایوب کی سند کے متعلق لکھا ہے اس میں محمد بن یونس الکدیمی اوراس کےاوپر کے تین راوی متروک ہیں،اورامام ابوالحسن بن بشران نے اپنے فوائد=

= میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک منادی ندا کرے گا: اے معشر الخلائق اپنے سروں کو جھکا لوحتیٰ کہ فاطمہ گزر جائیں، اس حدیث کو اس سند کے ساتھ خطیب بغدادی نے بھی روایت کیا ہے اور عبداللہ خراسانی کی سند سے بھی روایت کیا ہے، اس سند میں حسین بن معاذ راوی ہے، حافظ عسقلانی نے اس کے متعلق میزان میں کہا: اس کی سند میں اضطراب ہے اور خطیب نے حسین کا ذکر بغیر جرح اور تعدیل کے کیا ہے، اور خطیب بغدادی نے الحسن بن ابی بکر کی سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایک منادی ندا کرے گا اپنی نظروں کو جھکا لوحتیٰ کہ فاطمہ بنت النبی ﷺ گزر جائیں، اور امام ابوالفتح الازدی نے کتاب الضعفاء میں حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن حجاب کی اوٹ سے ایک منادی ندا کرے گا اپنی نظریں نیچی کرلو اور اپنے سروں کو جھکا لو کیونکہ فاطمہ بنت محمد پل صراط سے گزر رہی ہیں، اس سند میں العزری اور عمیر متروک ہیں اور امام الازدی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی ندا کرے گا اے لوگو! اپنی نظریں نیچی کرلوحتیٰ کہ فاطمہ پل صراط سے گزر جائیں، اس سند میں ایک راوی داؤد مجہول ہے۔

(اللآلی المصنوعۃ ج ا ص ۳۶۹، ۳۶۸، مطبوعۃ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث کی جس سند کو ذہبی اور ابن جوزی نے موضوع کہا ہے وہ حضرت علی کی روایت ہے، اور حافظ سیوطی نے تصریح کی ہے کہ الغیلانیات میں حضرت ابوہریرہ کی روایت صحیح ہے اور خطیب نے الحسن بن ابی بکر کی سند سے جو حضرت عائشہ سے حدیث روایت کی ہے اس کا کوئی سقم بیان نہیں کیا، اور باقی روایات میں متروک، مضطرب یا مجہول راوی ہیں جو زیادہ سے زیادہ ضعیف روایات ہیں۔ اللہ تعالیٰ حافظ سیوطی کے درجات بلند فرمائے انہوں نے اس حدیث کی سندوں کو بے غبار کر دیا۔ میں نے اس حدیث کی سند کی تصحیح میں بہت محنت کی ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے''۔(1)

پھر مارچ 2012ء سے قبل ایک مقام پر لکھا: =

---

(1) تبيان القرآن للسعيدي ج٧ ص ٩١٢، ٩١٤۔

....

= ''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خصوصیات کے متعلق درج ذیل احادیث ہیں''۔

پھر سب سے پہلے یہی حدیث لکھ کر فرمایا:

''یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔(المستدرک ۴۷۸۱۔ج ۵،المعجم الکبیر۱۸۰،ج۱،المعجم الاوسط:۲۴۰۷)(1)

پھر اسی تصنیف میں آگے چل کر اُنہوں نے یہی حدیث لکھ کر فرمایا:

''علامہ ذہبی نے کہا:اس حدیث کی سند میں ایک راوی عباس ہے۔دارقطنی نے کہا:وہ کذاب ہے،ذہبی نے قسم کھا کر کہا:یہ حدیث موضوع ہے۔المستدرک ج ۳ص ۱۶۱،قدیم''۔(2)

ذرا سوچیے! کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جس حدیث کو امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کی روشنی میں صحیح ثابت کر کے اُن کے حق میں دعا خیر فرما چکے ہیں اور اپنی محنت کی قبولیت کی دعا کر چکے ہیں، پھر دوسرے مقام پر اسی حدیث کو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خصوصیات میں درج کر چکے ہیں، تیسرے مقام پر اُسے اُڑا کیوں رہے ہیں اور اُس کے موضوع ہونے کی تصدیق کیوں فرما رہے ہیں؟

قارئین کرام !اگر آپ نے باری باری اِن تینوں مقامات کو کھول کر بغور مطالعہ کیا تو یقیناً آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ تضاد اُس تقابل کا نتیجہ ہے جس میں مبتلا ہو کر بڑے بڑے قدآور مصنفین تنقیصِ اہلِ بیت کے مرتکب ہوگئے، جیسا کہ ہم امام سبکی اور حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرھما کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔اللہ کریم ہم پر اور ان سب پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔

خیال رہے کہ اگر علامہ سعیدی حفظہ اللہ تعالیٰ کی تصانیف کی اِس قدر شہرت نہ ہوتی تو یہ عاجز یہ سطور نہ لکھتا۔ عام خطباء،مقررین اور قارئین پر ایسی تحریروں کا اثر ہوتا ہے،اس لیے میرے نزدیک یہ وضاحت ناگزیر تھی، آگے قبول ومسترد کا اختیار قارئین کے پاس ہے۔

---

(1) نعمة الباري في شرح صحيح البخاري ج٦ص ٨١۔

(2) نعمة الباري في شرح صحيح البخاري ج٦ص٨٩٨۔

۶۔ اس میں یہ بات اہل بیت کرام کے ادب سے ہے کہ اُنہیں سلام کرنے میں پہل کی جائے، چونکہ حدیث میں ہے: "فلما رأها رحّب" (حضور ﷺ نے سیدہ کو دیکھتے ہی مرحبا کہا)۔

۷۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کا استقبال و تعظیم پرتپاک طریقہ سے کیا جائے۔

۸۔ الفاظِ حدیث "ثُمَّ أَجْلَسَهَا عَنْ يَمِينِهِ (پھر حضور ﷺ اُنہیں اپنی دائیں جانب بٹھاتے) میں دلیل ہے کہ اہل بیت کو محافل میں نمایاں مقام دینا چاہیئے۔

۹۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام کو چاہیئے کہ وہ رمضان المبارک کو قرآن کے دو ختموں سے خالی نہ چھوڑا کریں۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ راز بتلانے والے کے راز کو اُس کے انتقال کے بعد ظاہر کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اُس سے کوئی خرابی لازم نہ آئے۔

۱۱۔ حافظ سیوطی "الشمائل" میں فرماتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ اکثر اپنی بیٹی فاطمۃ الزہراء کی پیشانی چومتے تھے"۔(1)

اور آپ اکثر اُن کے منہ کے اندر بھی چومتے تھے۔امام ابوداود نے ضعیف سند سے یہ اضافہ کیا ہے کہ آپ سیدہ کی زبان چوستے تھے۔(2)

"فیض القدیر" میں امام مناوی نے بھی حافظ سیوطی کی پیروی کی ہے اور یہ اُن دونوں حضرات کا وہم ہے، رحمۃ اللہ علیہما۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی لختِ جگر کا منہ چوما اور نہ ہی کبھی اُن کی زبان چوسی۔ یہ ہرگز ثابت نہیں، اس کی کوئی اصل نہیں، البتہ یہ عمل سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں منقول ہے۔

اس بحث میں امام ترمذی نے ایک حدیث ذکر فرمائی ہے اور اُسے حسن قرار دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیٹی کو بوسہ دیا(3)

---

(1) الجامع الصغير للسيوطي حديث ٦٨٤٧۔

(2) فيض القدير ج ٥ ص ١٧٤ حديث ٦٨٤٧۔

(3) الجامع الكبير وهو سنن الترمذي ج ٦ ص ١٧٥، ١٧٦، حديث ٣٨٧٢۔

لیکن عرب کی عادت کے مطابق اُن کی آنکھوں کے درمیان۔ اور یہاں حدیث کے اِن الفاظ "**فلما... ثم أجلسها...**" (یعنی جب انہیں دیکھتے تو مرحبا فرماتے، پھر انہیں اپنی دائیں یا بائیں جانب بٹھاتے" میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اُس (مذکورہ بالا قول) کے بطلان کی طرف اشارہ ہے، اور خصوصاً یہ عمل نبی کریم ﷺ کے وصال کے قریب کا ہے۔(۱)

۱۲۔ ارشادِ نبوی ﷺ "**ألا ترضین**" (کیا تم راضی نہیں ہو) میں صراحت ہے کہ سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی طاھرہ بیٹی عالمین کی خواتین کی سیدہ ہو، پھر اس سے بڑھ کر فخر کی کونسی بات ہوسکتی ہے، اس میں سیدہ کے لیے محبتِ الٰہی اور اُس کی رضا کی علامات ہیں، لہٰذا سیدہ کے فضائل کے سلسلہ میں جھوٹی روایات کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسی روایات اللہ جل جلالہ اور اُس کے رسول ﷺ پر بہتان ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: ﴿تو اُس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو بہتان باندھے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا، تاکہ گمراہ کرے لوگوں کو اپنی جہالت سے، بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اُس قوم کو جو ظالم ہے﴾[الأنعام: ۱٤٤]

---

(۱) مؤلف اِس گیارھویں فائدے میں دو مرتبہ وہم کا شکار ہوئے ہیں:

اولاً یہ کہ اُنہوں نے سیدہ کائنات علیہا السلام کے منہ میں چومنے اور اُن کی زبان چوسنے کی مکمل عبارت کو امام سیوطی اور امام مناوی دونوں کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ امام سیوطی نے فقط یہ الفاظ نقل کیے ہیں "**کان کثیرًا ما یقبّل عرف فاطمة**" (حضور اکرم ﷺ اکثر سیدہ فاطمہ کا ماتھا چومتے تھے) باقی الفاظ امام مناوی کے ہیں اور اُنہوں نے اس روایت کا ضعف بیان کر دیا ہے۔

ثانیاً یہ کہ مؤلف نے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی جس حدیث کو لفظاً کی بجائے معناً "**قبّل ابنته**" کے الفاظ سے ذکر کیا ہے اور پھر کہا ہے کہ یہ حضور اکرم ﷺ کے وصال سے قبل کی بات ہے، اس میں اُنہیں یہ وہم ہوا کہ اُنہوں نے حضور ﷺ کے سیدہ کو چومنے کا ذکر کیا، حالانکہ قبل از وصال سنن ترمذی کی اس حدیث میں یہ ذکر نہیں ہے، البتہ یہ ذکر ہے کہ سیدہ نے اپنے بابا کریم ﷺ کو چوما، اور اس سے قبل ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ منقول ہے کہ جب بھی سیدۂ کائنات رضی اللہ عنہا آتیں تو حضور اکرم ﷺ اُنہیں بوسہ دیتے اور اُنہیں اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ لہٰذا مؤلف کو چاہیئے تھا کہ وہ سابقہ معمول نقل کرتے اور "**قبّل ابنته**" (حضور ﷺ نے اپنی بیٹی کو چوما) کے الفاظ کی بجائے "**کان یقبِّل ابنته**" (حضور ﷺ اپنی بیٹی کو چومتے تھے) کے الفاظ لکھتے۔

۱۳۔ ارشادِ نبوی ﷺ "سَیِّدَةُ نِسَاءِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ" میں اُس قول کی طرف باریک اشارہ ہے جو امام طحاوی نے نبی کریم ﷺ سے آپ کی بیٹی سیدہ زینب کے بارے میں فرمایا: "هي أفضل" (وہ افضل ہے)۔

۱٤۔ ارشادِ نبوی ﷺ "سَیِّدَةُ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِینَ" یہاں اسی طرح آیا ہے اور دوسرے مقامات پر ہے: "إلا مریم بنت عمران" (ماسوا مریم بنت عمران کے) اس استثنا سے تفضیل لازم نہیں آتی، قواعد عربیہ اس کا تقاضا نہیں کرتے، ایسا استثناء کبھی برابری کے لیے آتا ہے اور کبھی مستثنیٰ منہ پر مستثنیٰ کی تفصیل کے لیے آتا ہے، اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، لیکن متصل یا منفصل قرینہ کا ہونا ضروری ہے۔

---

(۱) "هي أفضل بناتي" سے اشکال اور اُس کا حل

مؤلف نے اس شبہ کے ازالہ میں اس قدر اختصار سے کام لیا ہے کہ مجھ ایسا کم فہم انسان سمجھنے سے قاصر رہے گا، لہٰذا مناسب ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہی اس اشکال کا حل پیش کر دیا جائے۔ امام طحاوی کے نزدیک سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے حق میں مذکورہ ارشادِ نبوی ﷺ کافی پہلے کی بات ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ثم صار ما فضل اللّٰه تعالىٰ فاطمة مما ذكرنا يوجب فضلها على زينب وعلى من سواها ممّن فضّلَهَا رسُول اللّٰه ﷺ فی الآثار التي رويناها في هٰذا الباب.

"پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اُس فضیلت سے نوازا جو ہم نے ذکر کی، جس کے باعث اُن کی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اور دوسری تمام خواتین پر فضیلت متحقق ہوگئی"۔(1)

حافظ ابن حجر عسقلانی، ابن الملقن، حافظ خیضری، امام قسطلانی اور امام مناوی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔(2)

مزید تفصیل کے لیے ہماری کتابیں "شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ ص ٦٤٥؛ مناقب الزهراء ص ۳۸۳ ملاحظہ فرمائیں۔

---

(1) تحفة الأخيار بترتيب شرح مشكل الآثار ج۹ ص۱۰۳۔

(2) فتح الباري ج۷ ص٤٧٧، ٤٨١؛ غاية السول لابن الملقن ص ٢٣٤؛ اللفظ المكرم للخيضري ص ٢٧٥؛ إرشاد الساري ج۷ ص ٢٤٥، ٢٤٦؛ إتحاف السائل ص ٦٣۔

باقی رہا ارشادِ الٰہی ﴿وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ﴾

''اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بیشک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تجھے اور خوب پاک کر دیا ہے تجھے اور پسند کیا ہے تجھے سارے جہان کی عورتوں سے''۔[آل عمران: ٤٢] تو احادیث نے واضح کر دیا ہے کہ ''العالمین'' میں ''ال'' عہد کے لیے ہے جنس کے لیے نہیں، اور اس سے مراد سیدہ مریم کے زمانہ کی خواتین ہیں، جیسا کہ صحیحین میں ہے:(١)

''مریم اپنے زمانہ کی عورتوں سے بہتر ہے اور خدیجہ اپنے زمانہ کی عورتوں سے بہتر ہے''۔(٢)

اور وہ جو ابن عساکر نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ: ''اہل جنت کی خواتین کی

---

(١) بخاري: كتاب مناقب الأنصار، باب تزويج النبي ﷺ خديجة وفضلها رضي الله عنها، حديث ٣٨١٥؛ مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة أم المؤمنين رضي الله عنها، حديث ٢٤٣٠۔

(٢) ایک اور حدیث میں لفظ عالَم صریحاً آیا ہے۔ چنانچہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مريم خير نساء عالَمِها وفاطمة خير نساءِ عالَمها.

''حضرت مریم اپنے زمانے کی خواتین سے بہتر تھیں اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما اپنے زمانے کی خواتین سے بہتر ہیں''۔(1)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

''یہ حدیث مرسل اور صحیح السند ہے اور یہ مرسل اُس متصل کی تفسیر کر رہی ہے''۔(2)

---

(1) بغية الباحث ص ٩٠٩ حديث ٩٩٠؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص ٢٣٢ حديث ٦٧٣٧، وط: ج٩ ص ٣١٠ حديث ٩٠٧٣؛ الخصائص الكبرىٰ ج٢ ص ٣٤٨؛ سبل الهدىٰ ج١١ ص ١٦٢۔

(2) المطالب العالية ج٤ ص ٦٨ حديث ٣٩٨٢ وط: ج١٦ ص ١٦٧ حديث ٣٩٥٣۔

سردار مریم بنت عمران پھر سیدہ فاطمہ ہیں'' تو اس کی سند انتہائی کمزور ہے اور یہ آفت محمد بن حسن بن زبالہ سے ہے اور اُسے جھوٹا کہا گیا ہے۔(١)

١٥۔ سیدہ کے لیے حضور ﷺ کے ارشاد ''فاتقي الله واصبري'' (پس تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا اور صبر کرنا) میں دلیل ہے کہ کبھی اہل بیت کرام کے کسی فرد کو اللہ کی خاطر نصیحت کرنے کی ضرورت ہو سکتی ہے، اور اس سے اُس کے وقار میں کوئی کمی نہیں آتی۔

١٦۔ ارشادِ نبوی ﷺ ''تكوني سيدة'' میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے لفظ ''سیدہ'' کے اطلاق کا جواز ہے۔

نویں حدیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل کی: آپ ڈرایا کریں اپنے قریبی رشتے داروں کو (الشعرآء: ٢١٤) تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے قریش کی جماعت! یا اس جیسے کوئی اور الفاظ فرمائے: تم اپنی جانوں کو عذاب سے بچالو، اللہ کے عذاب سے میں تمہیں نہیں بچاسکوں گا، اے بنو عبد مناف! اللہ کے عذاب سے میں تمہیں نہیں بچاسکوں گا، اے عباس بن عبد المطلب! اللہ کے عذاب سے میں تمہیں نہیں بچاسکوں گا، اے صفیہ! رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی، اللہ کے عذاب سے میں تمہیں نہیں بچاسکوں گا، اے فاطمہ بنت محمد! تم میرے مال سے جو چاہو سوال کرو، اللہ کے عذاب سے میں تمہیں نہیں بچاسکوں گا۔

اس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے، اور امام مسلم نے اس کو از امام زُہری از حضرت انس رضی اللہ عنہ اسی طرح روایت کیا ہے، اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بعض روایات میں ہے کہ ابولہب نے کہا: تیرے لیے ہلاکت ہو، کیا تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا؟ اس پر مکمل سورۃ اللہب نازل ہوئی۔(٢)

---

(١) اس پر مزید تحقیق اور بحث ونظر کے لیے ہماری کتاب ''مناقب الزهراء'' کا مطالعہ فرمائیں صفحہ ٣٧٥۔

(٢) بخاري: كتاب الوصايا، باب هل يدخل النساء والولد فى الأقارب، حديث ٢٧٥٣؛ مسلم: كتاب الإيمان، باب قوله تعالىٰ ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ حديث ٢٠٤۔

نویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ہے، اس لحاظ سے کہ تاریخ اسلام میں دعوتِ دین کے پہلے موقعہ پر نام لے کر اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ اس میں حضور ﷺ کی پھوپھی سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کی بھی فضیلت ہے۔

۳۔ اس میں حضور ﷺ کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی بھی فضیلت ہے۔

٤۔ اس میں بنو عبد مناف کی بھی فضیلت ہے۔

٥۔ اس میں قریش کی بھی فضیلت ہے۔

٦۔ اس میں اہل بیت کو تنبیہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ محض اپنی نسبی نسبت پر ہی نہ بھروسہ کرلیں، پس جب حضور ﷺ نے سیدہ فاطمہ، سیدنا عباس اور سیدہ صفیہ ایسے کبار اہل بیت رضی اللہ عنہم کو تنبیہ فرمائی ہے تو دوسرے حضرات تو بدرجۂ اولیٰ تنبیہ کے لائق ہیں۔

۷۔ اس میں اہل بیت کو دین کے معاملہ میں سرگرم رہنے پر ابھارا گیا ہے، خصوصا دین کی بنیاد توحید پر، کیونکہ حکمِ انذار یعنی ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ پر عمل اسی سے ہی پورا ہوتا ہے۔ پس ساداتِ اہلِ بیت مثلاً سیدہ فاطمہ، سیدنا عباس اور سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہم کو اُس چیز (توحید) کی (معاذ اللہ) خلاف ورزی کرنے کی صورت میں صراحتاً فرمادیا کہ حضور ﷺ اُنہیں اللہ کے عذاب سے بچا نہیں سکیں گے، اور اُن کا انجام ابولہب کے انجام کی طرح ہوگا۔ (۱)

---

(۱) توحید اور سلسلۃ الذہب

بلاشبہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم نے جس قدر توحید کو مقدم رکھا یہ انہیں کا حصہ ہے، آخر ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ خالقِ کائنات جل جلالہ نے میدانِ مباہلہ کے لیے اہل بیت کو ہی منتخب فرمایا تھا، اور آگے اُن کی اولاد میں یہی چیز مقدم رہی۔ چنانچہ علماء کرام نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امام سیدنا علی بن موسیٰ الرضا رضی اللہ عنہ نیشاپور تشریف لائے تو اُن سے محدث ابوزرعہ رازی، محمد بن اسلم الطّوسی اور ہزاروں لوگوں نے گزارش کی کہ وہ انہیں اہل بیت کی سند سے کوئی حدیث بیان فرمائیں۔ اس پر انہوں نے مع سند یہ حدیث پیش فرمائی:

....

حَدَّثَنِي أَبِي مُوسَىٰ الْكَاظِمُ ، عَنْ أَبِيهِ جَعْفَرِ الصَّادِقِ ،عَنْ أَبِيهِ مُحَمَّدٍ الْبَاقِرِ،عَنْ أَبِيهِ زَيْنِ الْعَابِدِيْنَ،عَنْ أَبِيهِ الْحُسَيْنِ،عَنْ أَبِيهِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ ﷺ، قَالَ:حَدَّثَنِي حَبِيْبِي وَقُرَّةُ عَيْنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: حَدَّثَنِي جِبْرِيْلُ، قَالَ: سَمِعْتُ رَبَّ الْعِزَّةِ ﷻ يَقُوْلُ: كَلِمَةُ لَاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ حِصْنِي، فَمَنْ قَالَهَا دَخَلَ حِصْنِي، وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِي أَمِنَ عَذَابِي.

''حدیث بیان کی مجھے میرے بابا موسیٰ الکاظم نے اپنے بابا جعفر الصادق سے، انہوں نے اپنے بابا محمد الباقر سے، انہوں نے اپنے بابا زین العابدین سے، انہوں نے اپنے بابا حسین سے، انہوں نے اپنے بابا علی بن ابی طالب ﷺ سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: مجھے میرے محبوب اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا، فرمایا: مجھے جبریل علیہ السلام نے بتایا: میں نے رب العزت ﷻ کو فرماتے ہوئے سنا: کلمہ ''لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' میرا قلعہ ہے، پس جس شخص نے اسے پڑھا وہ میرے قلعہ میں داخل ہوگیا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہوگیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہوگیا''۔(1)

امام ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''طاہرین کی یہ حدیث اُن کے طیبین آباء کرام علیہم السلام کی اس سند کے ساتھ ثابت ومشہور ہے، اور ہمارے بعض اسلاف کرام جب یہ سند روایت کرتے تو فرماتے: اگر یہ سند مجنون پر پڑھی جائے تو اُسے افاقہ ہوجائے''۔(2)

---

(1) الفصول المهمة لابن الصباغ المالكي ص ۲۵۱۔

(2) حلية الأولياء ج۳ ص ۲۲۳، ۲۲٤، وط: ج۳ ص ۱۹۲؛ تاريخ دمشق ج۷ ص ۱۱۵؛ مختصر تاريخ دمشق ج٤ ص ۱۱۲؛ الدر المنثور ج ۱۰ ص ۱۷۵؛ الجامع الصغير ص ۲۷۷ حديث ۲۹۹٤؛ جواهر العقدين ص ۳۹۵؛ كنز العمال ج۱ ص ۵۲ حديث ۱۵۸؛ نور الأبصار ص ۱۷۰؛ الصواعق المحرقة ص ۲۰۵، وط: ص ۵۵۷، ۵۵۸؛ تحفة اثنا عشر فارسي ص ۳۵٦، ومترجم اردو ص ۷۳۷، ۷۳۸۔

۸۔ نبی کریم ﷺ کی اپنے اہل بیت کے بڑوں کو نام لے کر مخاطب کرنے میں یہ حکمت ہے کہ بڑے کو تنبیہ سے چھوٹے کو تنبیہ ہو جائے، اگر چہ وہ سب ہی بلند و بالا اور بڑے ہیں۔اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ کہیں یہ نہ ہو کہ امت کے باقی لوگ تو دین ساتھ لے آئیں اور آپ کی آل اپنے سروں پر دنیا کو لاد کر لائے، تو یہ قبیح ترین بات ہوگی۔

۹۔ اس میں اہل بیت اور امت کے حق میں نبی کریم ﷺ کی کمال شفقت اور خیر خواہی کا پہلو ہے کہ انہیں شرک پر متنبہ فرمایا۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ شرک کے ساتھ شفاعت نفع نہیں دے گی، اگر چہ شفیع سید المرسلین ﷺ اور جس کی شفاعت کی جائے وہ سیدۃ نساء العالمین علیہا السلام ہی کیوں نہ ہوں، اسی لیے پہلے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنے آپ کو بچالو، اور آخر میں سیدہ فاطمہ جو جسم نبوی ﷺ کا حصہ ہیں، کو فرمایا: (معاذ اللہ، شرک کی صورت میں) مَیں تم سے عذاب کو دور نہیں کر سکتا۔

۱۱۔ اگر کہا جائے کہ پھر اِس حدیث اور ارشادِ نبوی ﷺ "**كل سبب و نسب منقطع يوم القيامة غير سببي و نسبي**" (قیامت کے دن تمام سبب [نکاح کے رشتے] اور نسب میرے سبب اور نسب کے ماسوا منقطع ہو جائیں گے) کے درمیان کیا مطابقت ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب حدیث نمبر ۳۰ میں آئے گا۔

۱۲۔ ارشادِ نبوی ﷺ "**اِشْتَرُوْا أَنْفُسَكُمْ، الخ**" میں دلیل ہے کہ اہل بیت کا اصل مقصد آخرت کی طلب ہونی چاہیے، دنیا کی نہیں۔

۱۳۔ ارشادِ نبوی ﷺ "**لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا**" میں دلیل ہے کہ سید الاولین والآخرین ﷺ کے قلب اقدس میں توحید کی بڑی عظمت تھی، کیونکہ آپ نے اپنے جگر کے ٹکڑے کا رب ﷻ سے تعلق استوار کیا، لہٰذا آل میں سے جو سیدۃ نساء العالمین رضی اللہ عنہا سے کم رتبہ ہے وہ بدرجۂ اولیٰ اس حکم میں شامل ہے، اور جو سیدہ سے اور دوسرے اہل بیت سے بہت کم ہے وہ اور زیادہ اس امر کا محتاج ہے۔

۱٤۔ ارشادِ نبوی ﷺ "**لَا أُغْنِي...**" میں تصریح ہے کہ مکمل اختیار جس کے ہاتھ میں ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے، پس جب آپ ﷺ نے اپنے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز میں شریک ہونے کی نفی

فرمادی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے باقی اولیاء بدرجۂ اولیٰ اس نفی میں آتے ہیں۔ کتاب وسنت میں اس خیال کے ازالہ کے لیے نصوصِ کثیرہ موجود ہیں، ان میں سے ایک صحیحین کی وہ حدیث ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے کسی کو اُس کا عمل نجات نہیں دے گا، لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو بھی؟ فرمایا: ہاں مجھے بھی، اِلا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لے گا''۔(١)

دسویں حدیث

حضرت مصعب بن سعد اپنے والد سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک کی طرف روانہ ہوئے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے چھوڑا تو انہوں نے عرض کیا: آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تمہارا مرتبہ میرے نزدیک ایسا ہے جیسا موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک ہارون علیہ السلام کا، بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔(٢)

دسویں حدیث سے مأخوذ مسائل

١۔ اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے رتبہ کی عظمت کا ذکر ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حضرت ھارون علیہ السلام سے تشبیہ دی ہے، ماسوائے نبوت کے۔

٢۔ اس میں دلیل ہے کہ بعض اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم برگزیدہ انبیاء کرام علیہم السلام کے درجات کے قریب ہیں، ماسوائے نبوت کے۔

٣۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت اکتسابی چیز نہیں، بلکہ یہ مشیت اور اختیار الٰہی پر موقوف ہے، لہٰذا کسی مدعی

---

(١) بخاري: كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، حديث ٦٤٦٣؛ مسلم: كتاب صفات المنافقين، باب لن يدخل الجنة أحد بعمله، حديث ٢٨١٦۔

(٢) بخاري: كتاب المغازي، باب غزوة تبوك، وهي غزوة العسرة، حديث ٤٤١٦، مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه حديث ٢٤٠٤۔

کو نبوت کا دعویٰ اور کسی خواہش کرنے والے کو نبوت کی خواہش نہیں کرنی چاہیئے۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام کو چاہیئے کہ وہ عملِ صالح سے باز نہ رہیں، اگرچہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

٥۔ اس میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی سیرت، نمونۂ عمل اور طریقہ کی پیروی کے پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشبیہ دینے کا تقاضا یہی ہے، اور اسی کی متعدد احادیث تاکید کرتی ہیں۔ چنانچہ ایک صحیح حدیث (۱) میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آیا ہے:

''تم پر میری اور خلفاء راشدین کی سنت کا اتباع لازم ہے''۔(۲)

---

(۱) سنن الترمذي، أبواب العلم، باب ماجاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع، ج٤ ص٤٠٨ حدیث ٢٦٧٦۔

(۲) درحقیقت خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع ہے، کیونکہ خلفاء راشدین پر قدیم صحبت اور سابقین اولین ہونے کی وجہ سے سیرتِ نبوی غالب آگئی تھی، اور یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی غیر نبی انسان کا کمال اُس کے نبی کی اتباع میں ہوتا ہے، جبکہ اتباع صحبت کے بغیر ممکن ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ خلفاء راشدین تو کجا تمام سابقین واوّلین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اللہ جل جلالہ نے نہ صرف یہ کہ تعریف فرمائی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اُن کی اتباع کرے اللہ تعالیٰ اُس سے بھی راضی ہوجائے گا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَالسَّابِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ.

''اور مہاجرین وانصار میں سے جو سابقین اولین ہیں اور وہ جنہوں نے بھلائی کے ساتھ اُن کی اتباع کی، اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہوا اور وہ اُس سے راضی ہیں''۔(التوبة: ۱۰۰)

کتنے بدبخت ہیں وہ لوگ جنہوں نے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی نہ صرف یہ کہ اتباع سے روگردانی کی بلکہ وہ سبّ وشتم سے بھی باز نہ آئے، حالانکہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم مہاجرین میں سے تھے۔ ذرا سوچیے کہ جو لوگ کسی مہاجر صحابی پر ہی نہیں بلکہ کسی خلیفۂ راشد پر سبّ وشتم کریں، کیا وہ ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ'' کے حق دار ہوسکتے ہیں؟

٦۔ اس میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے معصوم نہ ہونے کی دلیل ہے، جیسا کہ اس پر ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''لا نبي بعدي'' دلالت کر رہا ہے۔

٧۔ اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی عالی حوصلگی کی دلیل ہے کہ اُنہوں نے بیٹھے رہنے پر جہاد کو ترجیح دینے اور راہِ الٰہی میں جان کا نذرانہ پیش کرنے کو ترجیح دی، حتیٰ کہ متعدد صحیح احادیث میں آیا ہے کہ وہ اس موقعہ پر رو پڑے تھے، اور ایسے مواقع پر فقط وہی شخص روتا ہے جس پر رضائے الٰہی کی خاطر جان قربان کرنا آسان ہو۔

٨۔ اس میں دلیل ہے کہ جب سربراہ سفر پر جائے تو مستحب ہے کہ اہل بیت میں سے صالح شخص کو خلیفہ مقرر کر جائے۔

٩۔ اس میں دلیل ہے کہ اگر صالح شخص جہاد فی سبیل اللہ سے پیچھے رہ جائے بشرطیکہ ضرورتاً ہو تو یہ پیچھے رہنا اُس کے مقام و مرتبہ کو نہیں گھٹاتا۔

١٠۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''بمنزلة هارون من موسیٰ'' سے بعض لوگ دلیل لیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلیفہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں، مگر یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات انہیں غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینہ طیبہ میں خلیفہ بنانے کے لیے فرمائی تھی، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مشبہ بہ (جس سے تشبیہ دی گئی) ھارون علیہ السلام ہیں اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلیفہ نہیں بنے تھے بلکہ ان زندگی میں وصال کر گئے تھے، جیسا کہ مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے ہاں مسلّم ہے۔ پس واضح ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے مرتبہ کی عظمت اور مدینہ طیبہ پر اُن کی نیابت کا ارادہ فرمایا ہے نہ کہ اپنے وصال کے بعد خلیفہ بنانے کا، اور جزئی خلافت کلی خلافت کو لازم نہیں کرتی، ورنہ یہ خلافت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے حضرات کے لیے بھی لازم آئے گی، کیونکہ (مختلف اوقات میں) ایک جماعت کو مدینہ طیبہ پر نائب بنایا گیا اور کسی شخص نے بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کے بارے میں خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔(١)

١١۔ اس میں دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کبار اہلِ بیت کا دفاع کرتے تھے، چنانچہ جب امیر المومنین سیدنا

---

(١) خیال رہے کہ متعدد اشخاص کو مدینہ طیبہ پر نائب تو بنایا گیا لیکن کسی کو ''أنت مني بمنزلة هارون من موسیٰ'' کے عظیم الشان مژدہ سے نہیں نوازا گیا۔

علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ناصبیوں کا بغض ظاہر ہونے لگا تو اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے فضائل پھیلانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، ان میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماموں سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہیں، انہوں نے زمانۂ اختلاف میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی یہ منقبت اور دوسرے فضائل بیان کیے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی "فتح الباري" میں فرماتے ہیں:

> احمد، قاضی اسماعیل، امام نسائی اور ابو علی نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں: جس قدر جید اسناد کے ساتھ سیدنا علی علیہ السلام کے بارے میں احادیث وارد ہوئی ہیں اس قدر کسی اور صحابی کے بارے میں وارد نہیں ہوئیں"۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کی خلافت مؤخر تھی اور ان کے دور میں اختلاف رونما ہوا، کچھ لوگوں نے ان کے خلاف خروج کیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جس کو اُن کے مناقب معلوم تھے اُس نے مخالفین کی تردید میں اُن کا خوب چرچا کیا تو اُن کے مناقب کثرت سے پھیل گئے"۔(۱) (۲)

---

(۱) فتح الباري ج۸ص ۴۲۰۔

(۲) دورِ صحابہ میں ناصبیت کیسے؟

اس گیارھویں فائدہ میں فاضل مؤلف نے عجیب بات لکھ دی ہے، وہ یہ کہ انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ناصبیت کا، سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نواصب کے بغض کا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے نواصب کی تردید میں مرتضوی فضائل پھیلانے کا ذکر کیا ہے۔ پھر جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دفاع میں فضائل مرتضوی پھیلاتے تھے اُن میں بالخصوص سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے یہ اور اس کے علاوہ بھی فضائل بیان کیے۔ اس ترتیب سے مؤلف کی یہ نام زدگی انتہائی بھیانک ہے۔ چنانچہ اگر آپ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول احادیثِ فضائلِ مرتضوی میں غور کرنے کی زحمت گوارا نہ بھی فرمائیں اور فقط مصنف کے نامزد کردہ صحابی سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ہی ایسی احادیث کا تتبع فرمائیں جو اُنہوں نے فضائل مرتضوی میں پھیلائیں تو مؤلف کا یہ انداز آپ کو تلخ حقیقت تک لے جائے گا۔ بطور مثال ایک حدیث ملاحظہ فرمائیے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حضرت عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اپنے والد (سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ) سے=

....

= روایت کرتے ہیں کہ اُنہیں معاویہ نے امیر مقرر کیا، پھر ان سے پوچھا: ابوتراب (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) کو برا کہنے سے تمہیں کیا چیز مانع ہے؟ انہوں نے کہا: جب تک مجھے وہ تین باتیں یاد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی شان میں ارشاد فرمائی تھیں، میں اُنہیں ہرگز برا نہیں کہوں گا۔ اگر اُن میں سے کوئی ایک بات بھی میرے اندر ہوتی تو وہ مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہوتی۔

۱۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا: آپ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو فرما رہے تھے، جبکہ آپ نے اُنہیں بعض غزوات میں پیچھے چھوڑا تھا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو عرض کیا تھا: یارسول اللہ! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ رہے ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمہاری منزلت میرے ساتھ ایسی ہے جیسی ھارون علیہ السلام کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، مگر یہ کہ میرے بعد نبوت نہیں ہے۔

۲۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیبر کے دن فرماتے ہوئے سنا: کل میں ایسے شخص کو پرچم عطا کروں گا جو اللہ جل جلالہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محبوب رکھتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو محبوب رکھتے ہیں۔ پس ہم سب اُس پرچم کے امیدوار تھے کہ آپ نے فرمایا: علی کو میرے پاس لاؤ! اُنہیں لایا گیا تو وہ آشوبِ چشم میں مبتلا تھے، آپ نے اُن کی آنکھوں میں لعابِ دہن ڈالا اور پرچم اُنہیں سپرد کیا۔

۳۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے دور کردے پلیدی کو اے نبی کے گھر والو! اور تم کو پوری طرح پاک صاف کردے﴾ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات علی، فاطمہ حسن اور حسین کو بلایا پھر فرمایا: اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت''۔(1)

دوسرے مقامات پر یہی حدیث مزید وضاحت کے ساتھ آئی ہے، اُس میں ہے کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سامنے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ایک حاکم نے سب وشتم کیا تو پہلے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اُس شاتم حاکم کے =

---

(1) مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه، حديث ٢٤٠٤۔

۱۲۔ اس میں دلیل ہے کہ اربابِ علم وحکمت اور نیکوکار لوگوں پر لازم ہے کہ وہ فتنہ کے زمانے میں اپنے سربراہ کے فضائل کو پھیلائیں، لوگوں پر اُس کی خوبیاں ظاہر کریں، اُن میں اُس کی محبت پیدا کریں اور وحدت وحفاظتِ امت کی خاطر لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف مائل کریں، تاکہ لوگ ایک دوسرے کے درپے ہوکر فنا کے گھاٹ میں اترنے سے باز رہیں۔(۱)

۱۳۔ اس میں دلیل ہے کہ امام (سربراہِ اہلِ اسلام) کو چاہیۓ کہ وہ داخلی محاذ کو محفوظ بنانے کے لیے ایسے شخص کو مقرر کرے جو قوت اور امانت میں سب سے بڑھ کر ہو، پھر اگر وہ اُس کے اقرباء سے ہو تو اُس کی غیر موجودگی میں معاملات کو زیادہ اچھے طریقے سے سنبھالے گا، چونکہ روم ایک بڑا ملک تھا جس سے غزوہ کے لیے نبی کریم ﷺ تشریف لے جانے لگے تو مناسب تربات یہ تھی کہ سیاست، شجاعت اور کفاءت میں جو عرب میں عظیم شخص ہو اُسے نائب مقرر کیا جاتا، اور وہ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے۔

= سامنے فضائل مرتضوی بیان فرمائے پھر اُس پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

لاأدخل علیک دار بعد الیوم ،ثم نفض رداء ہ ثم خرج.

''آج کے بعد میں تمہارے ایوان میں داخل نہیں ہوں گا، پھر وہ اپنی چادر جھاڑتے ہوئے چلے گئے''۔(1)

اگر آپ اصل مآخذ میں جا کر مکمل حدیث میں غور وخوض فرمائیں گے تو ضرور آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ کتابِ ہذا ''**الأربعین في فضائل آل البیت الطاھرین**'' کے مؤلف نے ناصبیت کی اصل تک پہنچنے کے لیے کُھرے (قدموں کے آثار) کی مکمل نشان دہی کردی ہے۔

(۱) صرف دنیوی ہی نہیں بلکہ لوگوں کی اُخروی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ اُنہیں حب اہل بیت سے سرشار کیا جائے، کیونکہ اس کے بغیر تمام عبادات بیکار ہیں۔

---

(1) تاریخ دمشق ج۴۲ ص ۱۱۹ ؛مختصر تایخ دمشق ج۱۷ ص ۳۳۵ ؛البدایة والنھایة ج۵ ص ۴۵۳، وط: ج۷ ص ۵۶۵۔

١٤۔ اس میں دلیل ہے کہ بچوں اور خواتین کو کسی طور بھی جنگ میں شامل نہ کیا جائے۔(١)

گیارھویں حدیث

حضرت ابو حازم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ غزوۂ خیبر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کل میں ایک شخص کو جھنڈا دوں گا اللہ تعالیٰ جس کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائے گا، وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہے اور اس کو اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوب رکھتے ہیں۔ پس جب صبح ہوئی تو تمام لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے، ان میں سے ہر ایک کو امید تھی کہ پرچم اسے عطا کیا جائے گا، لیکن آپ نے فرمایا: علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! علی کو آنکھوں کی تکلیف ہے، تو آپ نے فرمایا: اُنہیں لے آؤ! پس انہیں لایا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن لگایا اور دعا فرمائی تو وہ ایسے ٹھیک ہو گئے گویا کہ اُنہیں کوئی تکلیف ہوئی ہی نہیں تھی۔ پھر آپ نے اُنہیں جھنڈا عطا فرمایا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اُن سے اُس وقت تک جہاد کروں یہاں تک کہ وہ ہماری مثل ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: دھیمی رفتار سے جاؤ، جب تم اُن کے میدان میں اُترو تو اُنہیں اسلام کی دعوت دینا اور اُنہیں بتلانا کہ اُن پر اللہ کے کیا حقوق واجب ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر تمہاری وجہ سے کسی ایک شخص کو بھی اللہ تعالیٰ ہدایت عطا کر دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

اس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے، اور امام مسلم نے قتیبہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

''یدوکون'' کا معنی ''یخوضون'' ہے، یعنی سوچ و بچار میں رہے۔(٢)

---

(١) جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو اِس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے، لیکن دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمارداری، مرہم پٹی اور دوسری ضروریات کے لیے خواتین کی شمولیت جائز ہے۔

(٢) بخاري: کتاب الجهاد والسير، باب دعاء النبي ﷺ إلى الإسلام والنبوة، وأن لا يتخذ بعضهم بعضاً أرباباً من دون الله، حديث ٢٩٤٢؛ مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه حديث ٢٤٠٦۔

گیارھویں حدیث سے ماخوذ مسائل

١۔ اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبتِ عظیمہ ہے، کیونکہ اِس میں اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا بیان ہے۔

٢۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم مخلوق کو اسلام کی طرف بلانے میں تمام لوگوں سے زیادہ حق دار ہیں۔

٣۔ اس میں دلیل ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ بعض اہل بیت کرام کے لیے فتح ونصرت اور ہدایت کو ایسی شان سے بچا کر رکھتا ہے کہ دوسروں کے لیے اس طرح بچا کر نہیں رکھتا۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کے لیے تمام دینی معاملات میں تحمل اور بردباری لازم ہے، اس لیے کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: ’’عَلیٰ رِسْلِکَ‘‘

٥۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام پر معاملاتِ دین کی رعایت میں سب سے پہلے جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ اخلاص، توحید اور اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کو اولیت دیں۔

٦۔ اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے صبر کا اور راہِ الٰہی میں اُنہیں جو مرض لاحق ہوا، اُس کے ثواب کا ذکر ہے۔

٧۔ اس حدیث میں ایک عجیب امر کی طرف اشارہ ہے، اور وہ یہ کہ اللہ جل جلالہ اپنے دین کے قیام کے لیے اپنے متقی، غنی اور مخفی بندوں میں سے کسی ایسے شخص کو میدان عمل میں لاتا ہے جو کسی عہدے اور منصب کی تمنا اور خواہش نہیں رکھتا، اور جو اُس کی خواہش اور تمنا رکھتا ہے اُسے اس سے محروم رکھا جاتا ہے۔

٨۔ اس میں دلیل ہے کہ اللہ جل جلالہ کی طرف بلانا صالحین کے تمام اعمال سے افضل ہے، حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسم کھا کر اس کو مؤکد فرمایا۔

٩۔ اس میں دلیل ہے کہ یہ بات اہل بیت کرام کی تعظیم میں شامل ہے کہ اُن کے حق میں دعا کرنے میں جلدی کی جائے، بالخصوص بیماری کی صورت میں۔

١٠۔ اس میں اہل بیت کے لیے نفیس ترین اشیاء خریدنے کا جواز مذکور ہے، کیونکہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے **’’حمر النعم‘‘** (سرخ اونٹ) اور یہ عرب کے نزدیک نفیس ترین اور بہت عمدہ مالوں میں سے ہے۔

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اکابر اہل بیت میں سب سے بڑے ہیں، اُن پر شریعت کی بعض باتیں مخفی ہوسکتی ہیں، اس لیے کہ جب انہوں نے کہا: ''أقاتلهم حتىٰ يكونوا مثلنا'' (میں اُن سے اُس وقت تک جہاد کروں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں فرمایا: نرمی اور دھیمے انداز سے جائیں۔ لہٰذا دوسرے اہل بیت پر بعض مسائل کا مخفی رہ جانا اور زیادہ واضح ہے۔

۱۲۔ نواصب جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ عناد رکھتے ہیں، اِس میں اُن کی تردید ہے، اس لیے کہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب ہونے کے وصف سے فقط وہ شخص متصف ہوسکتا ہے جس کا انتقال بہترین حالت اور پاکیزہ ترین افعال پر ہو۔

۱۳۔ اس میں دلیل ہے کہ امام (سربراہِ مملکت) پر لازم ہے کہ وہ جنگی حالات میں بدترین دشمنوں پر اُس شخص کو مقرر فرمائے جو جنگی چالوں اور ضرب میں تمام لوگوں سے زیادہ ماہر اور قوت وشدت میں اُن سب سے بڑھ کر ہو۔

۱۴۔ اس میں دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی شان کے لائق محبت کرتا بھی ہے اور اُس سے محبت کی بھی جاسکتی ہے۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (اس کی مثل کوئی شے نہیں، اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے﴾ پھر اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ اہل بیت میں سے کسی فرد کے لیے بھی روا ہے کہ وہ محبت کرے اور اُس سے محبت کی جائے۔

۱۵۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب کے مصفیٰ ہونے کی دلیل ہے کہ انہوں نے اِس فضلِ عظیم پر حسد کیا اور نہ ہی نظر بد لگائی، بلکہ انہوں نے اس فضیلت کو آگے بیان کیا اور اس پر امت مسلمہ کی تربیت فرمائی۔

۱۶۔ اس میں دلیل ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا تقاضا ہے کہ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے محبت کی جائے۔

۱۷۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت میں سے کسی کو بیماری یا مصیبت پہنچے تو مناسب نہیں کہ وہ کسی سے شکوہ کرے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''أين علي'' (علی کہاں ہے؟) بلکہ وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ہاں باعث اجر سمجھے، اس میں سبق ہے کہ ائمہ اہل بیت کا شکوہ فقط بارگاہِ الٰہی میں ہوتا ہے۔

۱۸۔ اس میں دلیل ہے کہ یہ دین تمام جہانوں کے لیے رحمت ہے، اس لیے کہ اس دین نے لوگوں کے قتل سے نہیں بلکہ دعوت سے آغاز کیا ہے، یہ دین اس لیے آیا ہے کہ بندوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر بندوں کے رب کی عبادت پر لگائے، اور اِس دین نے قوموں کے مال کو نہیں لوٹا، خواہ وہ اس دین کے قریب تھیں یا دور، جیسا کہ کافر اقوام اور گمراہ فرقوں نے کیا، اگر چہ وہ اسلام کی طرف منسوب ہیں۔

۱۹۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت پر واجب ہے کہ عالمین پر رحمت ہوں نہ کہ پوری مخلوق پر زحمت۔

۲۰۔ اس میں دلیل ہے کہ کامل شخص بھی کبھی کسی وجہ سے خطا کر جاتا ہے اور اس سے اس کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ: ''**أقاتلهم...**'' سے ظاہر ہے۔(۱)

بارھویں حدیث

حضرت فطر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ایک کشادہ مقام میں جمع کیا، پھر فرمایا: میں تم میں سے ہر اُس شخص کو قسم دیتا ہوں جس نے ''غدیر خم'' کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو فرماتے سنا تھا اُسے بیان کرے۔ اس پر کچھ حضرات نے کھڑے ہو کر گواہی دی کہ انہوں نے ''غدیرِخُم'' کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا تھا: کیا تم نہیں جانتے کہ میں اہلِ ایمان کی جانوں سے بھی قریب تر ہوں؟ اور اس وقت آپ کھڑے ہوئے تھے۔ پھر آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا تھا: میں جس کا مولیٰ ہوں، علی بھی اس کا مولیٰ ہے۔ اے اللہ! جو اِس سے محبت رکھے، تو اُس سے محبت کر اور جو اِس سے عداوت رکھے، تو اُس سے عداوت رکھ۔

حضرت ابوالطفیل کہتے ہیں: میں باہر آیا اور میرے دل میں اس حدیث کے متعلق کچھ شک تھا، پس میری ملاقات حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو میں نے اُنہیں یہ حدیث سنائی، انہوں نے فرمایا: تمہیں شبہ کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ ارشاد سنا تھا۔ اور یہ الفاظ ابوداود کے ہیں۔

---

(۱) ہر چند کہ راقم الحروف کسی بھی غیر نبی انسان کی عصمت کا قائل نہیں ہے، لیکن مصنف کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قول ''**أقاتلهم حتى يكونوا امثلنا**'' سے اُن کی خطا کی دلیل لینا تعجب خیز ہے۔ ناجائز قول وفعل کے صدور پر تو خطا کا حکم سمجھ میں آتا ہے لیکن کسی سوال پر خطا کا حکم چہ معنیٰ دارد؟

اس کی سند قوی ہے، اس کو امام نسائی نے ''السنن الکبریٰ'' میں روایت کیا ہے اور اس کے کثیر متابع اور شواہد ہیں۔(۱)

بارھویں حدیث سے مأخوذ مسائل

۱۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ میں جس کا محبّ اور مددگار رہوں تو علی بھی اُس کے محبّ اور مددگار ہیں، اس لیے جو شخص مجھ سے محبت و مودت رکھتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ اُس سے بھی محبت رکھے، اسی مفہوم کو آپ ﷺ نے اپنی دعا: ''اللّٰھُمَّ... اے اللہ! اُس شخص کو محبوب رکھ جو اُسے محبوب رکھے، اُس کی مدد کر جو اُس کی مدد کرے اور اُسے مبغوض رکھ جو اُسے مبغوض رکھے'' سے مزید مؤکد فرمادیا۔

۲۔ اس میں امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبتِ عظمیٰ کا ثبوت ہے، اور وہ اُن کی نبی کریم ﷺ کے ساتھ دینی قربت و ولایت کی تصریح ہے، اگرچہ اس میں اُن کے ساتھ دوسرے صحابہ بھی شریک ہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا:

هذا مني و أنا منه.

''یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں''۔(۲)

اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تم ہمارے بھائی اور ہمارے مولیٰ ہو، تاہم سیدنا علی رضی اللہ عنہ اُن سب پر فضیلت رکھتے ہیں، چونکہ اُن کے حق میں جو دعا ہے (**اللّٰھم والِ من والاہ...**) وہ اس بات کو

---

(۱) السنن الکبریٰ للنسائي ج۷ ص ۱۳۰ حدیث ۸۰۹۲ و ص ۴۳۷ حدیث ۸۴۱۰ و ص ۴۴۳ حدیث ۸۴۲۸؛ خصائص علي للنسائي ص ۸۲ حدیث ۹۳؛ مسند أحمد ج ٤ ص ۳۷۰ و ط: ج ٦ ص ٥۳٤ حدیث ۱۹٥۱۷؛ فضائل الصحابة ج ۲ ص ۸٤۹ حدیث ۱۱٦۷؛ مسند أبي یعلیٰ ج ۱ ص ۲٥۷ حدیث ٥٦۳ و ج ٥ ص ٥٦۰ حدیث ٦۳۹۲، و ط: ج ۱ ص ٤۲۸ حدیث ٥٦۷ عن ابن أبي لیلیٰ و ج ۱۱ ص ۳۰۷ حدیث ٦٤۲۳ عن أبي هریرة؛ تحفة الأخیار ج ۹ ص ۱۷۷، ۱۷۸ حدیث ٦٥۸٦، ٦٤۸۷، ٦٤۹۰، ٦٤۹۱، ٦٤۹۲، ۳۹٤۲؛ صحیح ابن حبان ج ۱٥ ص ۳۷٦ حدیث ٦۹۳۱۔

(۲) مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل جلیبیب رضی اللہ عنہ حدیث ۲٤۷۲۔

کومزید مؤکد کرتی ہے۔(١)

٣۔ اس میں نبوت کے دلائل (اور پیش گوئیوں) میں سے ایک دلیل (پیش گوئی) ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کو قبول فرمانا۔ بلاشبہ جس شخص نے دنیوی نہیں دینی طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عداوت رکھی، آج تک اُس کی اسلامی عظمت بلند نہیں ہوسکی، بلکہ وہ تاریخ اسلام میں ہمیشہ رسوا اور ذلیل رہا، اور اکابر صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم میں سے جنہوں نے اُن سے محبت کی، اللہ تعالیٰ نے اُن کے پرچمِ عظمت کو بلند فرمادیا تو انہوں نے مشرق ومغرب میں چین سے اندلس تک ممالک فتح کیے اور اُن ممالک میں جن قوموں تک اسلام پہنچا وہ قومیں اُن کی نیکیوں میں درج ہوگئیں۔

٤۔ اگر کہا جائے کہ صحابہ کی ایک جماعت نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ کی، تو انہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی کوئی عقوبت نہیں پہنچی جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "اللهم عاد..." میں اشارہ فرمایا ہے، بلکہ وہ اچھی سیرت وکردار کے مالک تھے، اور لوگوں نے اُن کے علم سے استفادہ کیا اور اُن کی وجہ سے دین کو مدد حاصل ہوئی، جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے حاصل ہوئی!

میں کہتا ہوں: اسی بنا پر حفاظِ حدیث کی ایک جماعت نے جن کے آخرین شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہیں، "**اللّٰهم والِ...**" کے اضافہ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، مگر اُن کا یہ قول محل نظر ہے، اس لیے کہ یہ اضافہ

---

(١) مؤلف نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مفاضلہ کرتے ہوئے حضرت **جُلَیبِیب** رضی اللہ عنہ کے حق میں جو الفاظِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نقل کیے ہیں، وہ زیرِ تشریح حدیث کے الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتے، چونکہ اِس حدیث میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں "**علي مني وأنا منه**" کے نہیں، بلکہ "**مَولٰی**" (ولایت) کے الفاظ ہیں، البتہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے حق میں صادر شدہ الفاظ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں "**مولانا**" کا لفظ درست نقل کیا گیا ہے اور مصنف نے اُن الفاظ کی جو توضیح کی ہے وہ درست ہے۔

تعجب ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جو خصوصیت سعودیہ (ریاض) کے ایک شیخ کو سمجھ آگئی ہے وہ ہمارے ہاں کے **بعض مشائخ حدیث** کہلانے والوں کو سمجھ نہیں آئی، اور انہوں نے اس خصوصیت کا معنوی حلیہ بگاڑنے میں بڑی **زحمت اٹھائی** ہے۔ تفصیل کے لیے احقر کی کتاب "**شرح أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب** رضی اللہ عنہ" اشاعت اول ص ٩٣ ملاحظہ ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے آیا ہے اور حفاظِ حدیث کی ایک جماعت نے اسے صحیح کہا ہے۔ رہ گیا اشکال تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تأویل پر تھے اور اُن میں سے ہر ایک اجتہاد کرتے ہوئے شریعت سے دلیل حاصل کر رہا تھا اور اُسی پر عمل پیرا تھا، اور شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ صاحب تأویل کا مواخذہ نہیں ہوگا، جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں (کسی شخص کا قول) ہے: **إذا أنا مت فأحرقوني...** (جب میں مرجاؤں تو مجھے جلا دینا)۔(۱) اسی لیے سلف صالحین ائمہ کے نزدیک یہ بات طے پائی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی جھگڑوں میں سکوت اختیار کیا جائے، اس لیے کہ وہ مجتہدین تھے اور انہوں نے نصوص کی تأویل سے کام لیا ہے۔(۲)

۵۔ اس میں دلیل ہے کہ صلحاءِ اہلِ بیت پر لازم ہے کہ جب انہیں عامۃ الناس کی طرف سے تکلیف پہنچے تو وہ اُن پر اپنے فضائل کو واضح فرمائیں تاکہ وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحت کو ترک کر کے مؤاخذہ کا شکار نہ ہوں۔

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ جب حاکم کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہو جائے تو اُس پر لازم ہے کہ وہ اُن کے سامنے اپنے فضائل، خوبیوں اور قربانیوں کا ذکر کرے، یہ چیز خود ثنائی اور احسان جتلانے کے

---

(۱) بخاري: كتاب أحاديث الأنبياء، باب ٥٤، حديث ٣٤٧٨؛ مسلم: كتاب التوبة، باب في سعة رحمة الله، وأنها سبقت غضبه، حديث ٢٧٥٧۔

(۲) خیال رہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ کرنے والے لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

1۔ اصحاب جمل، بلاشبہ یہ اہل تأویل مجتہدین تھے

2۔ اصحابِ صفین، یہ مجتہدین نہیں بلکہ باغی تھے، البتہ اِس میں اکثر فوجیوں کا ہدف اُن کے سربراہوں کے ہدف سے بلند تھا، جیسا کہ شامی فوجی حضرت ذوالکلاع رضی اللہ عنہ کے واقعہ اور دوسرے شواہد سے معلوم ہوتا ہے۔

3۔ اصحاب نہروان، یہ سفہاء اور خارج از ملت تھے۔

بشمول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام اسلاف کرام کا یہی موقف ہے اور یہی احادیثِ صحیحہ کے مطابق ہے۔ تفصیل کے لیے ہماری کتاب "**شرح خصائص علي** رضی اللہ عنہ" **الطبعة الرابعة** ص ۸۰ وغیرہ ملاحظہ ہو۔

زمرے میں نہیں آتی، بلکہ اس میں امت کا تحفظ وسلامتی مضمر ہے۔

۷۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کا دفاع کرنا پسندیدہ امر ہے، اگرچہ انہوں نے اس کا تقاضا بھی نہ کیا ہو۔

۸۔ اس میں دلیل ہے کہ ذکرِ فضائلِ اہلِ بیت کرام رضی اللہ عنہم کے لیے لوگوں کو جمع کرنا مشروع ہے اور عند الضرورت اس کی مزید تاکید ہے۔

۹۔ اس میں سفر میں علم پھیلانے کی ترغیب ہے۔ (کیونکہ شانِ مرتضوی رضی اللہ عنہ میں یہ خطبۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر میں دیا گیا تھا)

۱۰۔ اس میں اُس شخص پر سختی کرنے کی دلیل ہے جو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید کرے۔

۱۱۔ اس میں اُن لوگوں کو ٹوکنے کی دلیل ہے جو اہل بیت کرام کے بارے میں بدگمانی کریں۔

تیرھویں حدیث

حضرت عبیدہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: سیدہ فاطمہ نے میرے سامنے چکی پیسنے کی شکایت کی تو میں نے اُنہیں کہا: آپ اپنے ابا حضور کے ہاں جا کر اُن سے خادم مانگ لیتیں! فرمایا: وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں تو آپ کو وہاں نہ پا کر گھر لوٹ آئیں۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو آپ کو بتایا گیا۔ آپ ہمارے ہاں تشریف لائے تو ہم پر ایک چادر تھی، جسے ہم لمبائی میں اوڑھتے تو ہمارے پہلو کھل جاتے اور جب ہم اُسے چوڑائی میں اوڑھتے تو ہمارے قدم اور سر کھلے رہ جاتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ! مجھے بتلایا گیا کہ تم میرے ہاں آئی تھیں، کیا تمہیں کوئی ضرورت درپیش تھی؟ انہوں نے عرض کیا: نہیں۔ میں نے عرض کیا: جی ہاں، انہوں نے مجھ سے چکی چلانے کی شکایت کی تھی تو میں نے انہیں کہا تھا: آپ نے اپنے ابا کے ہاں جا کر خادم مانگا ہوتا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتلاؤں جو تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے؟ جب تم اپنے بستر میں آیا کرو تو تینتیس تینتیس مرتبہ **سُبْحَانَ اللّٰهِ** اور **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ** اور چونتیس مرتبہ **اَللّٰهُ اَكْبَرُ** کہا کرو۔

یہ صحیح سند والی حدیث ہے، اس کو امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے، اور اس طرح کی

حدیث امام بخاری اور مسلم نے بواسطہ عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

امام ابن حبان اور شیخین کی بعض روایات میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ کلمات سنے ہیں کبھی ترک نہیں کیے۔ لوگوں نے کہا: جنگ صِفّین کی شب کو بھی؟ فرمایا: ہاں صِفّین کی شب کو بھی۔(۱)

تیرھویں حدیث سے مأخوذ فوائد

۱۔ اس حدیث میں اہلِ بیت کی مالی لحاظ سے تنگی کا مگر سوال سے گریز کا بیان ہے۔

۲۔ اس میں دلیل ہے کہ شوہر کے گھر میں امورِ خانہ داری انجام دینا عورت کے ذمہ ہے، اگر یہ لازم نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر سکوت نہ فرماتے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی درخواست قبول نہ کی (کہ خادم نہ دیا) مگر اُنہیں ایسا عمل بتلایا کہ کام کاج میں وہ اس سے مدد لے سکتی تھیں۔

۳۔ اس میں دلیل ہے کہ جب جنتی عورتوں کی سردار کی یہ صورتِ حال ہے تو باقی عورتوں پر تو بدرجۂ اَولیٰ یہ خدمت لازم ہے۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ اہلِ بیت کو جب کوئی ضرورت پیش آئے تو ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ صلحاء اہل بیت ہی سے سوال کریں اور دوسرے لوگوں سے کچھ بھی نہ مانگیں۔

٥۔ اس میں مشکل حالات میں اہلِ بیت کرام رضی اللہ عنہم کے صبر کا بیان ہے اور ان کی اولاد کے لیے اس میں نمونہ ہے۔

٦۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **"خیر لکما من خادم"** کے تحت علامہ ابنِ قیم **"الوابل الصیّب"** میں

---

(۱) صحیح ابن حبان: کتاب إخباره ﷺ عن مناقب الصحابة رضي الله عنهم رجالهم ونسائهم، باب ذكر علي بن أبي طالب بن عبدالمطلب الهاشمي رضوان الله عليه، وقد فعل، ج١٥ ص٣٦٤ حديث ٦٩٢٢؛ بخاري: كتاب فرض الخمس، باب الدليل على أن الخمس لنوائب رسول الله ﷺ، حديث ٣١١٣، وكتاب النفقات، باب خادم المرأة، حديث ٥٣٦٢؛ مسلم كتاب الذكر والدعاء باب التسبيح أول النهار وعندالنوم، ٢٧٢٧۔

فرماتے ہیں:

''شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ قدّس اللہ روحہ نے فرمایا: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ جو شخص ان کلمات (تسبیح فاطمہ) کی پابندی کرے گا اسے اپنی ذمہ داری کے کام کاج سے کوئی تکان محسوس نہ ہوگی''۔(١)

تقاضائے حدیث اسی بات پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ خادم انسان کو رات دن کی تکان سے بچاتا ہے جبکہ یہ ذکر خادم سے بھی بہتر ہے، اور اس کی دلیل حضرت ھود علیہ السلام کے اِس قول میں موجود ہے:

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً.

''اے میری قوم! مغفرت طلب کرو اپنے رب سے، پھر رجوع کرو اس کی طرف، وہ اتارے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش، اور تمہاری قوت کو مزید بڑھادے گا''۔(٢)

٧۔ اس میں دلیل ہے کہ مخلوق سے سوال کرنے اور اُن کے سامنے اپنی ضرورت پیش کرنے سے باز رہنے میں پروردگار کی جومعیت اور قرب حاصل ہوتا ہے وہ مخلوق سے سوال اور حاجت طلب کرنے سے زیادہ مفید ہوتا ہے، اگر چہ ایسی صورت ہو کہ سوال کرنا اور ضرورت کا اظہار کرنا شرعاً جائز ہو۔

٨۔ اس میں دلیل ہے کہ جو شخص خوشحالی میں ذکرِ الٰہی سے وابستہ رہے تو سختی میں اللہ تعالیٰ اُس کا مددگار بنتا ہے۔

٩۔ اس میں اہل بیت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیوی تحفظ کی دلیل ہے، تاکہ وہ دنیا کے اثرات ومضمرات سے محفوظ رہیں۔

١٠۔ اس میں اہل بیت کا ایثار کر کے اپنے اوپر فقراء اور حاجت مندوں کو مقدم رکھنے کا ذکر ہے، باوجود اس کے کہ وہ خود شدید ضرورت مند ہوں۔ چنانچہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جب سیدہ فاطمہ خادم مانگنے

---

(١) الوابل الصيب ص ١٦٤۔

(٢) هود: ٥٢۔

آئی تھیں اُن ہی دنوں میں نبی کریم ﷺ نے اہل بیت کے حصے میں آنے والے غلاموں کو فروخت کیا تا کہ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم پر خرچ کر کے اُن کی تنگی کا مداوا کیا جائے۔(۱)

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام کے صالح شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کی بے لاگ طور پر خیر خواہی چاہے، اگرچہ نتیجتاً وہ اُس کی اپنی اور اُس کی اولاد کی خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

۱۲۔ اس میں اہل بیت کرام کی ضروریات کو پورا کرنے اور کامل ترین وجوہ سے اُن کی ضرورت کو معلوم کرنے کے پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے۔

۱۳۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کے لیے تواضع کرنا اور اُن کے کاشانوں میں جا کر اُن سے ملاقات کرنا سنت ہے۔

۱٤۔ اس میں مذکور ہے کہ کبھی اہل بیت کا کوئی فرد اپنی کسی دنیوی ضرورت کی تکمیل میں کوشاں ہوتا ہے تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ اُس کے لیے بعینہٖ وہ چیز مقدر نہیں فرماتا۔(۲)

---

(۱) مسند أحمد ج۱ ص۱۰٦، وط: [شاکر] ج۱ ص ۵۳۰ حدیث ۸۳۸۔

(۲) حدیث نمبر ۱۳ میں ایک اشکال کا حل

اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب سیدنا علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کے گھر تشریف لائے اور سیدہ سے پوچھا کہ آپ ہمارے ہاں آئی تھیں، کیا آپ کو کوئی ضرورت تھی؟ سیدہ نے عرض کیا: لَا (نہیں) حالانکہ سیدہ ضرورت سے گئی تھیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر سیدہ نے ”لا“ کیوں کہا؟ میری دانست کے مطابق اس کا جواب یہ ہے کہ خادم مانگنے کے معاملہ میں سیدہ کا وہ عزم (سو فیصد ارادہ) نہیں رہا ہوگا، اس لیے انہوں نے عرض کیا: لَا۔ بعض روایات میں ہے کہ سیدہ کا جذبۂ حیا مانع آ گیا اور وہ سوال سے باز رہیں۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے شبث بن ربعی کی حدیث میں ہے کہ سیدہ نے عرض کیا:

لاشيء ، جئتُ أُسَلِّمُ عليک، واستحَيَت أن تسأل شيئاً.

”کوئی حاجت نہیں، آپ کی بارگاہ میں سلام کی خاطر آئی تھی، اور کچھ مانگنے سے شرما گئیں“۔(1) =

---

(1) السنن الکبریٰ للنسائي ج۹ ص ۳۰۰ حدیث ۱۰۵۸۳، وط: ج۱۰ ص ۳۱۳ حدیث ۱۰۷٦۲۔

چودھویں حدیث

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے جبکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نیند میں تھے، اور وہ لیٹی ہوئی تھیں اور اُن کے دونوں فرزند اُن کے

= خیال رہے کہ بعض احادیث میں ہے کہ سیدہ نے عرض کیا: "بَلٰی" (کیوں نہیں) ایسی سب احادیث کے مابین مطابقت یہ ہوسکتی ہے کہ جب "لا" کہا تھا اُس وقت اُن کے دل میں سوال کا ارادہ نہیں رہا تھا اور جب گھر میں "بلٰی" کہا تو دبے الفاظ میں اپنے ارادے کا اظہار کر دیا۔ لیکن بعض احادیث میں ہے کہ تیسرے روز سیدنا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما اکٹھے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مدعا عرض کیا۔ ان سب احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کبھی اس واقعہ کو مفصل اور کبھی مختصر بیان کیا گیا، اور ایسا اکثر احادیث میں ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اجمال و اکمال کے پیشِ نظر کہیں "لا" اور کہیں "بلٰی" کے الفاظ آ گئے، اور الفاظ کے ایسے اختلاف کی موجودگی میں سیدہ کے بارے میں صدق کے علاوہ کچھ اور خیال دل میں لانا اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

وہ اہل کساء علیہم السلام، جن سے ہر طرح کی رجس کو دور رکھا گیا، اگر اُن کی زبان اقدس سے صدق کے علاوہ کسی اور چیز کا صدور ہو تو پھر صدق کو کہیں ٹھکانہ ہی نہیں ملے گا، جبکہ سیدہ تو ہیئت، ہدایت، سیرت اور صورت تمام امور میں اپنے بابا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قدر مشابہ تھیں کہ اتنا مشابہ دوسرا کوئی انسان نہیں تھا۔ صدقِ فاطمہ کے بارے میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ کس قدر وقیع ہیں! وہ فرماتی ہیں:

ما رأيت أحداً قط أصدقَ من فاطمة غير أبيها.

"میں نے کبھی بھی سیدہ فاطمہ سے بڑھ کر کسی کو سچا نہیں دیکھا، ماسوا اُن کے بابا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے"۔ (1)

---

(1) مسند أبي يعلىٰ ج٨ ص ١٥٣ حديث ٤٧٠٠؛ المطالب العالية ج٤ ص ٧٠ حديث ٣٩٨٦، وط: ج ١٦ ص ١٧٧ حديث ٣٩٥٧؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص ٢٣٥ حديث ٦٧٤٥ وط: ج٩ ص ٣١٤ حديث ٩٠٤٥؛ المقصد العلي ج٢ ص ٢٠٣ حديث ١٣٧٢؛ مجمع الزوائد ج٩ ص ٢٠١، وط: ج٩ ص ٣٢٥ حديث ١٥١٩٣۔

پہلو میں تھے۔ سیدنا حسن علیہ السلام نے پانی مانگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونٹنی کی طرف گئے، اس سے دودھ نکال کر واپس آئے تو سیدنا حسین علیہ السلام بیدار ہو گئے اور پہلے پینے کا تقاضا کرنے لگے، یہاں تک کہ رو پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہارے بھائی نے پہلے مانگا ہے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: گویا حسن علیہ السلام آپ کو زیادہ پیارے ہیں۔ فرمایا: نہیں، وہ مجھے اُس سے زیادہ پیارے نہیں، میرے نزدیک اُن کا مرتبہ برابر ہے۔ میں، آپ، یہ دونوں اور یہ سونے والا قیامت کے دن ایک ہی مقام میں ہوں گے۔

اس سند میں کوئی حرج نہیں، اس کو امام طبرانی نے اپنی "**المعجم الکبیر**" میں روایت کیا ہے، اور ہمیں یہ حدیث متعدد سندوں سے امام احمد اور دوسرے محدثین سے پہنچی ہے۔(١)

چودھویں حدیث سے مأخوذ مسائل

١۔ اس میں اہلِ کساء (چادر والوں) کی عظیم ترین فضیلت ہے، اس لحاظ سے کہ وہ جنت میں سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہوں گے۔

٢۔ اس میں دلیل ہے کہ انسان کتنا ہی عظیم المرتبت ہو، اہلِ بیت کی خدمت کرنا اُس کے لیے قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔

٣۔ اس میں دلیل ہے کہ اہلِ بیت کرام کے تنازع میں اصول یہ ہے کہ ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دی جائے بلکہ وہ ایک ہی مرتبہ میں ہوں گے۔

---

(١) المعجم الكبير ج٢٢ ص٤٠٥، ٤٠٦ حديث١٠١٧، وط: ج٩ ص٣٦٦ حديث١٨٤٤٩؛ مسند أحمد ج١ ص١٠١ حديث٧٩٢؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٨٦٢ حديث١١٨٣؛ مسند أبي يعلىٰ ج١ ص٢٤٠ حديث٥٠٦؛ مسند البزار ج٣ ص٣٠ حديث٧٧٩؛ مسند أبي داود الطيالسي ص٢٦ حديث١٩٠، وط: ج١ ص١٠٥ حديث١٨٦؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم ص٥٨٤ حديث١٣٢٢؛ كشف الأستار ج٣ ص٢٢٣ حديث٢٦١٦؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١٦٩ حديث١٤٩٩١، وط: ج١٨ ص٤٦٨ حديث١٤٩٨٧؛ المطالب العالية ج٤ ص٦٩ حديث٣٩٨٣، وط: ج١٦ ص١٦٩ حديث٣٩٥٤۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ جب اہلِ بیت کا کسی معاملے میں تنازع ہو جائے تو ضروری ہے کہ اس تنازع کو شریعت کی طرف لوٹایا جائے، اگر چہ اُن کی رائے میں فرق اور مرتبہ میں تفاوت ہو، پھر دوسرے لوگ تو اس حکم کے اور زیادہ پابند ہیں۔

٥۔ ارشادِ نبوی ﷺ "**بمنزلة واحدة**" اور "**مكان واحد**" حسنین کریمین کی ایک دوسرے پر فضیلت نہ ہونے کی دلیل ہے، اس کی تائید میں متعدد احادیث ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں: "**إن الحسن والحسين سيدا شباب أهل الجنة**" (حسنین کریمین نوجوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں) الا یہ کہ احادیثِ صحیحہ امام حسن علیہ السلام کی فضیلت میں مشہور اور زیادہ ہیں، اسی لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے "**المنهاج**" میں کہا ہے:

"وہ باتفاق اہل السنۃ اور شیعہ امام حسین علیہ السلام سے افضل ہیں"۔(١)

اور یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر عمل مترتب نہیں ہوتا۔ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے۔(٢)

---

(١) منهاج السنة ج٤ ص٤٧ وط: ج٢ ص٥٥٣۔

(٢) مؤلف نے اِس پانچویں فائدے میں پہلے تو دونوں شہزادوں کو فضائل میں برابر کہا، لیکن بعد میں علامہ ابن تیمیہ کے حوالے سے سیدنا حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی افضلیت کا قول کیا اور اس پر اہل سنت و شیعہ کے اتفاق کا دعویٰ بھی کر دیا، لیکن دلیل کوئی پیش نہیں کی۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ علامہ ابن تیمیہ نے کیا لکھا ہے؟ وہ بعض روافض کی تردید میں لکھتے ہیں:

والأحاديث الصحيحة تدل علىٰ أن الحسن كان أفضلهما، وهو كذلك باتفاق أهل السنة والشيعة. وقد ثبت في الصحيح أنه كان يقول عن الحسن: اللّٰهم إني أحبه فأحبه وأحب من يحبه.

"احادیث صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دونوں میں امام حسن افضل تھے، اور باتفاق اہل السنۃ اور شیعہ ایسا ہی ہے، اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت حسن کے متعلق فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! میں اس کو محبوب رکھتا ہوں، لہٰذا تو بھی اس کو محبوب رکھ اور جو اِس کو=

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ اہلِ بیت میں سے کوئی فرد پانی طلب کرے تو اسے پلانے کے لیے اٹھنا سنت ہے، اگر چہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

٧۔ اس میں نواصب کا رد ہے، بایں طور کہ انہوں نے امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کی، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خبر دے رہے ہیں کہ وہ جنت میں آپ کے ساتھ ہوں گے، پھر اس کے بعد اُن کی طرف ضلالت کی

محبوب رکھے اُس کو بھی محبوب رکھ"۔(1)

علامہ ابن تیمیہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی افضلیت میں اس ایک حدیث کے علاوہ کوئی اور حدیث پیش نہیں کر سکے۔ بیشک اس حدیث میں تنہا امام حسن رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے، لیکن بہت ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس وقت ضمیر واحد اس لیے استعمال فرمائی ہو کہ آپ نے اُس وقت تنہا اُن ہی کو اٹھا رکھا تھا، اگر آپ نے دونوں کو اٹھا رکھا ہوتا تو ضرور تثنیہ کی ضمیر استعمال فرماتے، اور کئی بار ایسا ہوا بھی۔ چنانچہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ مسئلہ دریافت کرنے آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں بازوؤں پر یہ دونوں نورِ نظر تھے۔ آپ نے اس موقعہ پر دعا فرمائی:

اللّٰهم إني أحبهما فأحبهما و أحب من يحبهما.

اے اللہ! میں ان دونوں کو محبوب رکھتا ہوں، لہٰذا تو بھی ان کو محبوب رکھ اور جو ان دونوں کو محبوب رکھے اُس کو بھی محبوب رکھ"۔(2)

اس کے علاوہ بھی متعدد احادیث ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دونوں کو اپنے پھول فرماتے، انہیں چومتے اور سونگھتے تھے۔ لہٰذا ایسی احادیث کے ہوتے ہوئے تقابل اور تفاضل کی بات کیونکر مناسب ہے؟

---

(1) منهاج السنة ج٤ ص٤٧ وط: ج٢ ص٥٥٣۔

(2) سنن الترمذي: أبواب المناقب، باب مناقب أبي محمد الحسن بن علي بن أبي طالب والحسين بن علي بن أبي طالب رضي الله عنهما، حديث ٣٧٦٩؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ ص٤٥٩ حديث ٨٤٧١، وط: ج٥ ص١٤٩ حديث ٨٥٢٤؛ صحيح ابن حبان ج٩ ص٥٧، ٥٨ حديث ٦٩٢٨، وط: ج١٥ ص٤٢٣ حديث ٦٩٦٧؛ مشكاة حديث ٦١٦٥؛ مصابيح السنة ج ٤ ص ١٩٤ حديث ٤٨٢٩؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص٣٨١ حديث ٣٢١٧٣۔

نسبت کیسی؟ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگتے ہیں۔

٨۔ اس میں دلیل ہے کہ ائمہ اہلِ بیت کو چاہیئے کہ وہ آل اور خصوصاً اپنی اولاد کے مابین تفضیل کی بات نہ کریں، ارشادِ نبوی ﷺ: ''ما هو بآثر عندي'' کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

٩۔ مناسب ہے کہ اس قاعدہ سے بعض اہل بیت کی تفضیل کو وصفِ شرعی کی وجہ سے مستثنیٰ رکھا جائے، کیونکہ شرعی وصف کی وجہ سے تفضیل کی اصل پر متعدد نصوص ہیں اور اس کے قواعد مقرر ہیں، مثلاً جس نے پہلے مانگا پہلے پلانے کی فضیلت اُسی کو دی جائے، جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ ''إن أخاك استسقى قبلك'' (تمہارے بھائی نے تم سے پہلے پانی مانگا) سے ظاہر ہے۔(١)

١٠۔ اس میں اہلِ بیت کے سادہ اور بے تکلف رہن سہن کی دلیل ہے، کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سامنے سوئے رہے اور اہل خانہ نے اُنہیں نہ جگایا۔

١١۔ اس میں دلیل ہے کہ جس شخص کو اہلِ بیت کے معاملے میں کوئی اشکال ہو وہ اُن کے متعلق اُن باخبر اہل علم سے پوچھے جو اُن کے احوال سے واقف ہوں، یا ائمہ اہل بیت سے دریافت کرے، اور اُن پر اعتراض ومخالفت میں جلدی نہ کرے، کیونکہ جگر گوشۂ نبی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا: ''كأن الحسن إلخ ...'' (گویا حسن آپ کو زیادہ پیارے ہیں)۔

---

(١) اس حدیث سے دلائل کے استنباط میں پانچویں اور آٹھویں نمبر پر مؤلف کا استدلال وزنی معلوم نہیں ہوتا، شاید بعد میں انہیں بھی یہ بات کھٹک گئی تو نویں نمبر میں اُنہیں استثناء کا قاعدہ یاد آ گیا۔ اگر وہ استثناء کی بات نہ کرتے تو متعدد نصوصِ شرعیہ کا انکار لازم آتا۔ مثلاً اگر پینے پلانے ہی کی بات کو لیا جائے تو بعض متفق علیہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دائیں جانب ہونے کی وجہ سے ایک بدوی کو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر مقدم فرمایا اور پہلے اُسی کو پلایا، دوسرے موقعہ پر متعدد مشائخ پر کم سن بچے (ابن عباس رضی اللہ عنہما) کو مقدم فرما دیا۔

اسی طرح دوسرے معاملات میں بھی شرعی دلائل کی وجہ سے فرقِ مراتب کا لحاظ ضروری ہے، مثلاً آل میں سے اگر کوئی شخص خیر ونیکی میں دوسروں پر سبقت لے جائے اور وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو تو اُسے دوسروں سے افضل ماننا لازم ہوگا۔ فَتَأَمَّلْ!

۱۲۔ اس میں دلیل ہے کہ بعض اوقات ائمہ اہلِ بیت پر شرعی مسائل مخفی رہ جاتے، جیسا کہ سیدہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ: ”كأن الحسن إلخ...“ سے ظاہر ہے۔

پندرھویں حدیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا حسن علیہ السلام نے صدقے کی کھجوروں میں سے ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”کخ کخ اسے نکال دو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم اہلِ بیت صدقہ نہیں کھاتے“۔

یہ سند صحیح ہے، اسے امام احمد نے روایت کیا ہے، اور امام مسلم نے اسے محمد بن جعفر سے اور امام بخاری نے شعبہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔(۱)

پندرھویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں اہلِ بیت کے بچوں کو حسی اور معنوی میل کچیل سے پاک صاف رکھنے کا بیان ہے۔

۲۔ اس میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی پانچ وجوہ سے فضیلت کا ذکر ہے:

1۔ پہلی فضیلت: زکاۃ سے پرہیز جو کہ لوگوں کے مال کا میل ہے۔

2۔ دوسری فضیلت: ان کے پدری نسب کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسباً اور اباً منسوب ہونا، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: إنا أهل بيت“ (ہم اہل بیت ہیں) اور دوسری روایت میں ہے: ”يا بني ألقها“ (بچے! اسے پھینک دو) جبکہ دوسرے لوگوں کی بچیوں کی اولاد اُن کے ددھیال کی طرف منسوب ہوتی ہے، جیسا کہ جمہور کا قول ہے اور یہی حق ہے۔

3۔ تیسری بات: اُن کی اہل بیت کے دوسرے بچوں پر فضیلت ہے، بایں وجہ کہ اُن سب کے

---

(۱) مسند أحمد ج۳ ص٤٧٦ حديث ٩٢٩٧؛ مسلم: كتاب الزكاة، باب تحريم الزكاة على رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلّم وعلىٰ آله وهم بنوهاشم وبنو المطلب دون غيرهم، حديث ١٠٦٩؛ بخاري: كتاب الجهاد والسير، باب من تكلم بالفارسية والرطانة، حديث ٣٠٧٢۔

لیے اس حکمِ شرعی کا سبب وہی ٹھہرے۔

4۔ ایک اور سبب سے بھی اُن کی اُن بچوں پر فضیلت ہے، وہ یہ کہ اصل یہ ہے کہ آل کے چھوٹے بچوں کو مارنا پیٹنا نہیں چاہیے، چنانچہ جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ لوگوں کے میل کی آلودگی سے ملوث ہونے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں مارا نہیں بلکہ "أرشده" اُن کی رہنمائی فرمائی۔(١)

---

(١) حسنین کریمین کا مرشد کون؟

فاضل مؤلف نے یہ اچھا استنباط کیا ہے، اس کی توضیح یہ ہے کہ اتنی عمر کے بچے مکلّف ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں مارنا جائز ہے، لیکن چونکہ یہ اہل بیت کے بچے ہیں اور شاہین کا بچہ شاہین ہی ہوتا ہے، اس لیے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن پر واضح فرمادیا کہ صدقات وزکات کی اِن اشیاء کا استعمال تمہاری شان کے خلاف ہے۔

سبحان اللہ، کیا شان ہے اُن بچوں کی جن کے مربّی ومرشد سید الأولین والآخرین، امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ہوں! اس تربیت کے لیے مؤلف نے یہاں لفظ "أرشده" استعمال کیا ہے، اس کے اصلی حروف "رش ذ" ہیں، اسی سے لفظ "رُشد" اور "مرشد" وغیرہ نکلتے ہیں۔ مرشد کا معنیٰ ہے: ہدایت ورہنمائی کرنے والا۔ فارسی اور اردو وغیرہ زبانوں میں مرشد کو پیر کہتے ہیں۔ یہاں ہم اس لفظ "رشـــد" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دورِ حاضر کے بعض لکھاریوں کی گمراہ کن غلطی پر تنبیہ کرنا لازمی سمجھتے ہیں، لیکن اس سے پہلے لفظ رشد کی معنوی وضاحت ضروری ہے۔

دنیوی رشد اور اُس کے درجات

دنیوی رشد کے بارے میں یہ آیت قابل غور ہے:

فَإِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ.

"پس اگر محسوس کرو تم اُن (یتیموں) میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال"۔(النساء: ٦)

اس آیت میں دنیوی نفع ونقصان کی تمیز کو "رُشـــد" فرمایا گیا ہے، اور یتیم بچوں کی کفالت کرنے والوں کو فرمایا گیا ہے کہ جب اُن بچوں میں مال کی افادیت کی اور کھوٹے کھرے کی تمیز پیدا ہوجائے تو اُن کا مال اُن کے حوالے کردو۔ چونکہ ہر عقل مند جانتا ہے کہ دنیوی "رُشد" کے حوالے سے تمام بچے تو کیا بڑے بھی برابر =

....

= نہیں ہوتے، اس لیے اس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دینی رُشد اور اُس کے درجات

اصل رُشد دینی ہے، یہ اگر نہ ہو تو کوئی دنیوی نفع ونقصان کے لحاظ سے کتنا ہی طاق، چالاک اور ہوشیار کیوں نہ ہو، قرآن کی رو سے وہ "غَوِيٌّ" (بہکا ہوا) ہے۔ "غَوِيٌّ" غوایۃ سے ہے اور اِس کی ضد رُشد ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَاإِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ.

''کوئی زبردستی نہیں ہے دین میں، بے شک خوب واضح ہوگئی ہے ہدایت گمراہی سے''۔

(البقرة ٢٥٦)

جس طرح دنیوی رُشد (سوجھ بوجھ) میں سب لوگ برابر نہیں ہوتے، اسی طرح دینی رُشد میں بھی تمام لوگ یکساں نہیں ہوتے، چنانچہ بعض خوش نصیب پیدا ہوتے ہی ایسے قابلِ رشک رُشد پر فائز ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ بڑھاپے میں بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ قرآن کریم میں ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا إِبْرَاهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ﴾ میں، قولِ مسیح علیہ السلام ﴿إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتَانِيَ الْكِتَابَ﴾ میں یا بعض شیر خوار بچوں کی طرف سے رمضان المبارک کے دنوں میں ماں کے دودھ پینے کے انکار میں ایسے ہی اعلیٰ رُشد کی طرف اشارہ ہے۔

فائدہ

اس سے اُن ناصبی لوگوں کی تردید ہوگئی جو حسنین کریمین کی صحابیت کا انکار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو اتنی عقل بھی نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن بچوں کو شریعت کے اس قدر باریک مسائل کو سمجھنے کا اہل سمجھتے تھے، کیا وہ بچے اپنے جد کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی کی حیثیت سے نہیں پہچانتے ہوں گے؟ اگر نواصب کے اس خیال کو درست سمجھا جائے تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین لازم آتی ہے کہ آپ اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دین کے مسائل سمجھانے بیٹھ گئے جن میں سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں تھی۔

اس میں اُن لوگوں کی بھی تردید ہے جو سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اول المسلمین ہونے کی عظمت کو یہ =

. . . .

= کہہ کر گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب وہ اسلام لائے تھے تو ننھے سے بچے تھے۔ ایسے لوگوں کی عقل سے یہ پہلو کیوں اوجھل رہ جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے ننھے سے بچے کو دعوتِ اسلام دی ہی کیوں؟

پیر یا مرشد کون ہوسکتا ہے؟

جس سے کسی دوسرے کو رُشد و ہدایت ملے تو وہ اُس کے حق میں مرشد ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ہدایت پذیر اور ہدایت یافتہ کا اوّلین مرشد خالق جَلَّ جَلَالُہٗ خود ہے۔ پھر مخلوق میں ہر انسان کے اولین مرشد اُس کے والدین اور اساتذہ کرام ہیں، خواہ ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر بیعت کی جائے یا نہ کی جائے۔ پھر اگر کوئی علمی اور روحانی کمی رہ جائے تو کتاب وسنت کے باعمل عالم سے علمی، عملی اور روحانی تربیتی استفادہ کیا جاتا ہے، اور اگر اُس کا سلسلۂ فیض وطریقت نبی کریم ﷺ کی ذات پاک تک متصل ہو تو اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت بھی کی جاتی ہے۔ ماں باپ اور اساتذہ کرام سے زیادہ عالم اور زیادہ باکمال ایسی روحانی شخصیت کو مرشد کہا جاتا ہے، جبکہ اہل فارس اور ہندو پاک کے لوگ ایسی شخصیت کو ''پیر'' کہتے ہیں۔

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اگر یہ حق ہے تو پھر بتلایئے کہ جن بچوں کے کانوں میں اذان امام الانبیاء والمرسلین ﷺ نے دی ہو، جنہیں گھٹی بھی خاتم النبیین نے دی ہو، جن کے نام بھی سیدالاولین والآخرین نے رکھے ہوں (حسن وحسین، یعنی اچھائی والے) جنہیں لوری سیدۃ نساء العالمین نے دی ہو، چھ سات برس تک جن کی تربیت آغوشِ نبوی میں ہوئی ہو، اور ایسی تربیت کی گئی ہو کہ بیت المال کی کھجور کے ایک دانے تک سے بھی انہیں محفوظ رکھا گیا ہو، جیسا کہ زیرِ تشریح حدیث میں مذکور ہے، اور پھر وہ تقریباً سینتیس اڑتیس برس تک مولائے کائنات اور باب مدینۃ العلم سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تربیت میں بھی رہے ہوں، کیا اُنہیں کسی مرشد (پیر) کی ضرورت ہوسکتی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر کہا جائے کہ امام الانبیاء والمرسلین، سیدۃ نساء العالمین اور مولی المؤمنین کے بعد بھی اِن سینتیس سال کی عمر کی شخصیات کو کسی دوسرے پیر (مرشد) کی ضرورت تھی تو لازماً اُس پیر (مرشد) کو نہ صرف یہ کہ اِن نبی کے بیٹوں سے افضل ماننا پڑے گا بلکہ اُسے اِن دونوں کے سابق مرشدین سے بھی افضل ماننا ہوگا۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ماضی قریب میں سنی لبادہ میں بعض لوگ اسی گمراہ کن عقیدہ کی پرچار کرتے رہے۔ چنانچہ بعض لکھاریوں نے اپنی طرف سے بعض طلقاء کے فضائل بناتے ہوئے لکھا ہے: =

....

=''آپ عظیم المرتبت صحابی، کاتبِ وحی اور مجتہد ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھائی ہیں۔ امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے پیر ہیں''۔(1)

خود کو رضوی کہلانے والے ایسے لکھاریوں سے ہم پوچھتے ہیں:

- امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما اُن کے مرید کب اور کیسے ہوئے؟
- کیا مسلمانوں کی جان و مال کی خاطر اُن کی ملوکیت کو گوارا کرنا، مرید ہونا ہے؟
- اگر یہی وجہ ہے تو پھر اُنہیں فقط حسنین کریمین کا ہی پیر کیوں لکھا؟
- سیدنا سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید (یہ دونوں عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) حبر الامۃ ابن عباس، پیکر زھد وتقویٰ ابن عمر، ابن زبیر اور عظیم محدث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا پیر کیوں نہیں لکھا؟
- پیر (مرشد) رہنمائی کرتا ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ مصنف مذکور نے جنہیں پیر بنایا ہے، انہیں اُن کے مریدین یعنی سیدنا سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم ٹوکتے رہتے تھے؟
- پیر و مرشد وہ ہوتا ہے جو شریعت و طریقت سمجھائے، لیکن بعض لکھاریوں نے جس صاحب کو حسنین کریمین کا پیر بنا ڈالا، اُنہیں مناسک حج نہیں آتے تھے، اُنہیں مسائلِ حج اُن کے ایک مرید (معاذ اللہ) سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے سکھائے تھے۔(2)
- مصنف مذکور کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ اُس نے جن کو پیر لکھ دیا ہے اُن کا شمار طلقاء میں ہوتا ہے اور شریعت میں طلقاء کی اتنی حیثیت بھی نہیں تھی کہ اُنہیں مجلسِ شوریٰ میں شامل کیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعض طلقاء کو کچھ ذمہ داریاں سونپ بیٹھے تھے تو بعد میں نادم ہوئے تھے، جیسا کہ آئندہ حدیث کی شرح میں تفصیل آرہی ہے۔
- مصنف مذکور کی اس حد تک مت ماری گئی کہ اُسے حدیث الثقلین بھی یاد نہ رہی، جس میں صراحۃً قرآن واہل بیت کو منبع رشد فرمایا گیا ہے، اور اُن کے تمسک میں ہدایت کی حتمی ضمانت دی گئی ہے۔ =

---

(1) رشد الإيمان للعبدالرشيد رضوي، ص ١٥٣۔

(2) تاريخ دمشق ج ٤٢ ص ١١٩؛ مختصر تاريخ دمشق ج ١٧ ص ٣٣٥؛ البداية والنهاية ج ٥ ص ٤٥٣، وط: ج ٧ ص ٥٦٥۔

....

کیا مصنف مذکور سنیت سے اتنا بھی آگاہ نہیں کہ قرآن مجید سے تمسک کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ قرآن امام ہے، اور پھر جس طرح قرآن امام ہے اسی طرح عترتِ رسول بھی امام ہے، کیونکہ یہ ''الثقلین'' میں سے دوسری ثقل ہیں، یہی وجہ ہے کہ اہل سنت اُنہیں امام مانتے اور کہتے ہیں اوران کے ناموں کے ساتھ بھی لفظ امام لکھا جاتا ہے، البتہ ناصبی لوگ ''حضرت حسن'' اور ''حضرت حسین'' لکھتے اور کہتے ہیں۔ قرآن اس لیے امام ہے کہ اس کی طاعت کی جاتی ہے، اسی طرح اہل بیت بھی ائمہ ہیں کہ قرآن کے ساتھ اُن کی بھی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، ورنہ وہ امام مسجد (یعنی دو رکعت کے امام) تو نہیں تھے۔ اسی لیے علماء اہل سنت اہل بیت کی امامت کو امامتِ مطلقہ اور دوسروں کی امامت کو امامتِ مقیدہ مانتے ہیں۔

غوایت وسفاہت کی حد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل بیت کو بشمول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام اہل اسلام کا امام ومرشد فرمایا ہے اور آج کل کے غبی لوگ طلقاء کو اہل بیت کا پیر بنانے پر تلے ہوئے ہیں، کیا یہ آوازِ نبی پر آواز بلند کرنے کے مترادف نہیں؟

کیا ایسے لوگوں کو اتنی سمجھ بوجھ بھی نہیں کہ جن نبی زادوں نے شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو فرمایا: ''**أنزل عن منبر أبي...**'' یعنی ہمارے بابا کے منبر سے اتر کر اپنے بابا کے منبر پر چلے جائیں، وہ ''**مَلِکٌ عَضُوضٌ**'' (کاٹنے والے بادشاہ) کو کیونکر اپنا پیر بنائیں گے؟

یاد رہے کہ حسنین کریمین کے مذکورہ بالا جملہ پر شیخین کریمین کے پاس سکوت یا حُسنِ سلوک کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا، اور یہ بھی یاد رہے کہ اُن کا یہ فرمانا آج کل کے کسی ادارہ کے مہتمم زادے یا پیرزادے کی بھڑک نہیں تھی، بلکہ یہ اُن نوجوانانِ اہل جنت کے سرداروں کا ارشاد تھا جن سے لغو، جھوٹ، مکر وفریب اور ہر طرح کی رِجس کو دور کیا ہوا تھا، اسی لیے اُن کے بچپن میں اُن کی سیادت کا اعلان زبانِ وحی کے علاوہ ایسے مخصوص فرشتہ نے بھی آکر کیا تھا جو پہلے کبھی زمین پر آیا ہی نہیں تھا۔

کیا آج کوئی مہتمم یا پیر اِس بات پر راضی ہوگا کہ اگر اُس کے بچے مادرزاد ولی بھی ہوں اور اہل جنت کے سردار بھی ہوں اور پھر ایسے شخص کو اُن کا پیر بنا دیا جائے جو تقریباً اکیس برس تک اُس مہتمم یا پیر کے ادارے اور مشن کا دشمن رہا ہو، اور پھر وہ نسب، علم، عمل، روحانیت، زہد اور مقام ومرتبہ میں بھی اُن مادرزاد ولی بچوں سے اتنا کم ہو کہ=

....

= اُن کا پاسنگ بھی نہ ہو؟

اگر اس بات کا جواب اثبات میں ہو تو اِس پر کوئی نظیر پیش کی جائے اور اگر نفی میں ہو تو نبی زادوں اور ثقلین میں سے ایک ثقل کی شان کے حامل قطعی جنتی سرداروں کے لیے ایسا کیوں کہا گیا؟ کیا اِسی کا نام شریعت، طریقت، روحانیت اور رضویت ہے؟

میں پوچھتا ہوں: اگر فتنہ سے بچنے کے لیے کسی جابر کے اقتدار کو تسلیم کرنا، اُسے پیر ماننا ہے تو جو حضرت معاویہ نے رشوت، دھونس اور دھمکی کے ذریعے یزید پلید کی ولی عہدی کا عہد لیا، پھر یزید نے بھی لوگوں سے جبراً بیعت لی اور اکثر صحابہ کرام ﷺ نے عزیمت کی بجائے رُخصت پر عمل کرتے ہوئے اُس کی بیعت کر لی، اُس سے عہدے قبول کیے اور جہاد میں بھی حصہ لیا، مثلاً سیدنا ابوایوب انصاری اور سیدنا عبداللہ بن عمر ﷺ، تو کیا ایسے سب حضرات یزید کے مرید اور یزید پلید اُن کا پیر ہو گیا تھا؟؟

وہ کیسا پیر جس کے سامنے سچ بولنا دشوار؟

مرشد سچ پسند ہوتا ہے اور سچ کی تلقین کرتا ہے، مگر امام حسن بصری ﷺ بیان کرتے ہیں:

ذكروا عند معاوية شيئا، فتكلموا ،والأحنف ساكت، فقال معاوية: تكلّم يا أبا بحر، فقال: أخاف اللّٰهَ إن كذبت وأخافكم إن صدقتُ.

''لوگوں نے معاویہ کی مجلس میں کسی چیز کا ذکر کیا تو اُس میں کلام کیا اور حضرت احنف خاموش رہے، اس پر معاویہ نے اُنہیں کہا: اے ابوبحر آپ بھی کچھ بولیں، اُنہوں نے فرمایا: اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کا ڈر ہے اور اگر سچ کہوں تو تمہارا ڈر ہے''۔(1) =

(1) الطبقات الكبرى ج٩ص٩٤؛الكامل فى اللغةللمبرد ج١ ص٩٨؛المنتظم ج٦ ص٩٣، ٩٤؛ تاريخ دمشق ج٢٤ ص٣٢٧؛عيون الأخبارج٢ ص١٨٠؛تهذيب الكمال ج١ ص٤٧٩؛سير أعلام النبلاء ج٤ ص٩٢؛تاريخ الإسلام للذهبي ج٥ ص٣٥١؛تذهيب تهذيب الكمال ج١ ص٢٩١؛كنز الدرر لابن أيبك ج٤ ص٤٥؛العقدالفريدج١ ص٥٦؛تاريخ اسلام للندوي حصه سوم ص٢٩٤۔

. . . .

= یہ گفتگو کس سلسلے میں ہو رہی تھی، اس کا اظہار ان شاء اللہ ہم اپنی کتاب ''**سیدنا الإمام الحسین** رضی اللہ عنہ'' میں کریں گے۔ اِس وقت ہمارا مدعا یہ ہے کہ جنابِ معاویہ بلکہ اُن کے گورنروں کے دربار میں بھی سچ بولنا دشوار تھا۔ شاید کوئی شخص اس کی یہ تاویل پیش کرنے کی کوشش کرے کہ حضرت احنف سکوت کے عادی تھے، اس لیے اُنہوں نے وہ کہا جو کہا، لیکن یہ تاویل باطل ہے، اس لیے کہ وہ حق گو آدمی تھے اور ظاہر ہے کہ ہر وقت و ہر جگہ حق گوئی آسان نہیں ہوتی، الا یہ کہ سامنے والا بھی حق پسند ہو۔ چنانچہ یہی احنف بن قیس تھے جنہوں نے ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے جلال بھرے دربار میں حق گوئی کی۔ امام ابن سعد لکھتے ہیں:

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بنوتمیم قبیلے کا ذکر کیا تو اُن کی مذمت فرمائی، اس پر حضرت احنف نے کھڑے ہو کر کہا: امیر المومنین مجھے بولنے کی اجازت دیجئے! فرمایا: بولیے۔ انہوں نے کہا: آپ نے بنوتمیم کا ذکر کیا تو سب کی مذمت کر دی، حالانکہ وہ بھی دوسروں کی طرح لوگ ہیں، اور لوگوں میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ نے سچ کہا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خوبصورت طریقے سے معذرت کی''۔(1)

جبکہ دربارِ معاویہ میں تو سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے فرزندار جمند سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی بوجہ خوف حق گوئی سے باز رہے، حالانکہ اُسی مجلس میں اُن کی اور اُن کے والد گرامی کی توہین کی گئی تھی۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ جو حق بات اُس مجلس میں کہنا چاہتے تھے، اُس کا اظہار اُنہوں نے بعد میں کیا، جیسا کہ بخاری شریف میں اس کی تصریح اور شروحِ بخاری میں تفصیل آئی ہے۔(2)

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کے سامنے اظہارِ سچ اور احقاقِ حق انتہائی دشوار تھا، اُسے اُن مقدس ہستیوں کا پیر بناڈالا جو رُشد و ہدایت اور صدق و صداقت کے مصادر و منابع ہیں۔ **فیاللعجب!**

---

(1) الطبقات الكبرى لابن سعد ج٩ ص٩٣؛ سير أعلام النبلاء ج٤ ص٩١؛ تاريخ دمشق ج٢٤ ص٣١٥؛ مختصر تاريخ دمشق ج١١ ص١٤٠؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج٥ ص٣٤٩۔

(2) بخاري: كتاب المغازي، باب غزوة الخندق، وهي الأحزاب، ص٥٦٠ حديث٤١٠٨؛ فتح الباري ج٩ ص١٩٩، ٢٠٠۔

٥۔ اُن کی فضیلت دوسری آل پر مسلمانوں کے بیت المال کی حفاظت کی تاکید میں بھی مضمر ہے، اگرچہ بیت المال سے حاصل کی جانے والی چیز کتنی ہی معمولی ہو، حاصل کرنے والا ضرورت مند ہو اور اُس کے لینے سے مسلمانوں کو نقصان بھی نہ پہنچتا ہو۔(١)

---

(١) اس پیراگراف کا مفہوم یہ ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے جو چیز اٹھائی تھی وہ بہت تھوڑی تھی، اُس وقت اُنہیں بھوک بھی تھی اور کھجور کا ایک دانہ لینے سے کسی کا نقصان بھی نہیں ہو رہا تھا، لیکن پھر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑے اہتمام سے اُنہیں منع کر دیا، یہ اہتمام سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی دلیل ہے۔

کھجور کا ایک دانہ اور سونا

یہ ہے حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے مرشد کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعلیٰ تربیت کا نمونہ، اب آپ خود انصاف فرمائیے کہ جن خوش نصیبوں کو اوّلین مرشد ایسا عطا ہوا ہو، کیا اُنہیں باقاعدہ ہاتھوں میں ہاتھوں دے کر کسی دوسرے پیر کی بیعت کی ضرورت ہو سکتی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر کہا جائے کہ وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت وہ کم سن تھے، لہٰذا بعد میں اُنہیں تجدید بیعت کی ضرورت تھی۔ اس پر میں کہوں گا کہ پھر کم از کم ایسا پیر تو ہوتا جس کی اپنی زندگی منہاجِ نبوی اور اُسوۂ نبوی کا نمونہ ہوتی، جبکہ بعض لکھاریوں نے تو اُس بادشاہ کو حسنین کریمین کا پیر بنا ڈالا جو بیت المال کا قیمتی سامان اپنے لیے رکھنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ متعدد کتب حدیث و سیر وغیرہ میں ہے کہ زیاد ابن ابیہ جب حضرت معاویہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا تو اُس نے خراسان کی طرف ایک لشکر بھیجا اور اُس کا سربراہ صحابیِ رسول سیدنا حَکَم بن عمرو الغفاری رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ انہوں نے خراسان کو فتح کر لیا اور کثیر مالِ غنیمت حاصل کیا۔ زیاد نے اُنہیں ایک خط روانہ کیا، جس کا مضمون یہ تھا:

أما بعد، فإن أمير المؤمنين كتب إليّ أن اصطفى له الصفراء والبيضاء، فلا تقسم بين الناس ذهباً ولا فضةً.

''امابعد، امیر المؤمنین نے میری طرف ایک خط لکھا ہے کہ سونا چاندی اُن کے لیے الگ کر لیا جائے، لہٰذا سونا چاندی مجاہدین میں تقسیم نہ کیا جائے''۔

جواباً سیدنا حکم بن عمرو الغفاری رضی اللہ عنہ نے اُس کی طرف یوں لکھ بھیجا:

''تمہارا خط مجھے پہنچ چکا ہے، تم نے اُس میں امیر المؤمنین کی کتاب (خط) کا ذکر کیا ہے، =

....

جبکہ میرے پاس امیر المومنین کی کتاب (خط) سے قبل اللہ کی کتاب موجود ہے، اور اللہ کی قسم! اگر زمین وآسمان کسی بندے کو کچلنے کے لیے باہم مل جائیں اور وہ خوفِ الٰہی رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اُس کے نکلنے کی سبیل پیدا فرما دے گا، والسلام۔ پھر سیدنا حکم بن عمرو الغفاری رضی اللہ عنہ نے لوگوں میں اعلان کرا دیا کہ وہ مال غنیمت آپس میں تقسیم کرلیں۔ حضرت معاویہ نے چونکہ سیدنا حکم بن عمرو کو تقسیم کے متعلق ایک حکم کیا تھا، اُنہوں نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو انہیں قید کر دیا گیا اور وہ اسی قید ہی میں انتقال فرما گئے۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب اُن کے پاس یہ خط پہنچا اور اُنہوں نے اس کی تعمیل نہ کی تو اس موقعہ پر اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوگئے:

''اے اللہ! اگر میرے لیے تیرے پاس کوئی خیر ہے تو مجھے اپنے پاس بلا لے، پھر وہ اسی عرصہ میں خراسان کے علاقہ مَرْو میں انتقال فرما گئے''۔(1)

یہ سنہ ۵۰ھ کا واقعہ ہے، پھر مامون الرشید کی خلافت (جو کہ ۱۹۸ھ میں شروع ہوئی) کے دور میں کسی شخص کی تدفین کے لیے قبر کھودی جا رہی تھی تو سیدنا حکم بن عمرو الغفاری رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک کھل گئی، دیکھا گیا تو وہ یوں تروتازہ موجود تھے کہ اُن کے کفن اور بدن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔(2)

اگر آپ نے یہ باحوالہ چند سطور بغور پڑھ لی ہیں تو ذرا سوچئے کہ بعض لوگ ایسے بادشاہ کو سیدینا حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کا پیر بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں جو بیت المال میں اِس حد تک ناجائز تصرف کرنے =

---

(1) المستدرك قديم ج٣ص٤٤٢، وط: ج٣ص٥٠١ حديث ٥٨٦٩؛ الطبقات الكبرى لابن سعد ج٩ص٢٨؛ تاريخ الطبري ج٤ ص٢٧؛ الاستيعاب [قديم] ص٣٥٧، ٣٥٨؛ الكامل فى التاريخ لابن أثير ج٣ص٣٢٤؛ أسد الغابة ج٢ ص٥٢؛ معرفة الصحابة لأبي نعيم ج٢ ص٧٠٨؛ المنتظم لابن الجوزي ج٥ ص٢٣٠؛ صفة الصفوة ج١ ص٦٧٢؛ تهذيب الكمال ج٧ص١٢٧؛ تذهيب تهذيب الكمال للذهبي ج٢ ص٤١٦؛ سير أعلام النبلاء ج٢ ص٤٧٤، ٤٧٥۔

(2) تهذيب الكمال ج٧ص١٢٧، تذهيب تهذيب الكمال للذهبي ج٢ ص٤١٦۔

٣۔ اس حدیث میں چھوٹے بچوں کو احکام شرعیہ کی اسماء کے ساتھ تعلیم دینے کی دلیل ہے (جیسا کہ یہ فرمانا کہ: یہ صدقہ ہے)۔

٤۔ اس حدیث میں ایک اہم مسئلہ بیان ہوا ہے اور وہ صدقہ کی حرمت ہے، اور صحیح قول کے مطابق اس سے فرض صدقہ (یعنی زکاۃ) مراد ہے۔

٥۔ ارشادِ نبوی ﷺ "أَخَذَ تَمْرَةً" (انہوں نے کھجور کا ایک دانہ اٹھایا) میں دلیل ہے کہ اہل بیت پر جب صدقہ کی چھوٹی سی چیز بھی حرام ہے تو بڑی چیز کی حرمت کا کیا پوچھنا۔

٦۔ ارشادِ نبوی ﷺ "الصدقة" میں تمام بنو ہاشم پر صدقہ کی حرمت کی دلیل ہے، چاہے وہ صدقہ (زکاۃ) بنو ہاشم کے کسی فرد کی طرف سے ہو یا اُن کے علاوہ کسی فرد سے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے مطلقاً اور بلا تفریق فرمایا کہ اُن پر صدقہ حرام ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ یہ اطلاق نفلی صدقات پر بھی تو اسی طرح ہونا چاہیے۔

جواب: نصوص میں نفلی صدقات مراد نہیں لیے جاتے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾ (اے حبیب) وصول کیجئے اُن کے مالوں صدقہ تاکہ آپ پاک کریں اُنہیں اور بابرکت فرمائیں اُنہیں اِس ذریعے سے، نیز دعا مانگیے اُن کے لیے) یہ اُسلوب فرض صدقہ (زکاۃ) کا ہے نفلی خیرات کا نہیں۔ یعنی 'خُذْ، صَدَقَةً، تُطَهِّرُهُمْ، تُزَكِّيهِم بِهَا" اور 'صَلِّ عَلَيْهِمْ" کے الفاظ زکاۃ کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں جبکہ نفلی صدقہ کے لیے "هدية، تبرع، صلة، وصية اور "وقف" وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ صدقات کی یہ تمام قسمیں لوگ از خود رضا کارانہ

= کے روادار تھے؟ یہاں اگر صحیح مسلم "كتاب الإمارة، باب وجوب الأمر بالوفاء ببيعة الخلفاء، الأول فالأول، حديث ١٨٤٤" کا فقط متن ہی پڑھ لیا جائے تو آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہوگا۔

بہرحال ایسی ہستیاں جن سے ہر طرح کے رِجس کو دور رکھا گیا اور اُن کی ایسی تربیت کی گئی کہ بیت المال سے کھجور کا ایک دانہ لینا بھی اُن کے نزدیک حرام تھا، وہ ایسے شخص کو کیونکر اپنا پیر بنائیں گے جس کا طرزِ عمل بہت سے امور میں تصریحاتِ کتاب و سنت اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کے سراسر خلاف تھا؟

طور پر پیش کرتے ہیں، جبکہ فرض صدقہ (زکاۃ) اُن سے وصول کی جاتی ہے۔

حافظ ابو عمر ابن عبد البر نے ''التمهيد'' میں لکھا ہے:

''اس کی صحت پر جو بات دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ سیدنا علی، سیدنا عباس اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہم اور دوسرے حضرات نے صدقہ (نفلی خیر خیرات) کیا اور اُسے بنو ہاشم کے کچھ افراد پر وقف کیا، اور اُن کے وقف کردہ صدقات معروف و مشہور ہیں''۔(۱)

۷۔ سیدنا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو بعض ہاشمیوں کے لیے بعض ہاشمیوں کے صدقہ کی حلت کا ذکر ہوا ہے تو وہ بے بنیاد روایت ہے، متعدد حفاظ حدیث نے اسے من گھڑت قرار دیا ہے۔ علامہ شوکانی نے ''شرح المنتقى'' میں اس کی عمدہ وضاحت کی ہے۔(۲)

۸۔ کئی فقہاء نے مجبوری کی حالت میں ہاشمی شخص کے لیے زکاۃ کا مال استعمال میں لانے کو جائز کہا ہے اور یہ درست ہے، کیونکہ مردار جو نہایت قبیح اور گھناؤنا ہے، زکاۃ سے زیادہ حلال نہیں ہوسکتا، بلکہ ضرورت کو اضطرار کی جگہ پر رکھا جانا چاہیۓ۔ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کئی صالحین کو ہم نے دیکھا جو دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، حالانکہ احادیث مقبولہ میں مانگنے کی جو وعید آئی ہے وہ کسی پر مخفی

---

(۱) التمهيد لما في الموطأ من المعاني والمسانيد ج٢ ص٥٦۔

(۲) مؤلف نے جس غیر معتبر روایت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہے:

أن عباس بن عبد المطلب قال: قلت: يا رسول الله! إنك حرمت علينا صدقات الناس هل تحل لنا صدقات بعضنا لِبَعْضٍ؟ قال: نعم.

''سیدنا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے ہم پر لوگوں کے صدقات حرام کردیے ہیں، کیا ہمارے لیے ایک ہاشمی کا صدقہ (زکاۃ) دوسرے ہاشمی پر حلال ہے؟ فرمایا: ہاں''۔(1)

---

(1) نيل الأوطار شرح منتقى الأخبار ج٢ ص٦٤٣، وط: ج ٨ ص١٧٩، ١٨٠، معرفة علوم الحديث للحاكم ص١٧٥۔

نہیں۔ فقہاء کا یہ قول مانگنے کی قباحت اور اہل بیت کی عظمت کے پیشِ نظر ہے، البتہ اگر ہم کہیں کہ اُن کے لیے زکاۃ کے بدلے خمس ہے، (اور اب خمس رہا ہی نہیں) تو اُس کی عدم موجودگی میں زکاۃ کا مال لینا جائز ہوگا، یہی قوی قول ہے، جیسا کہ اس کی طرف ایک جماعت گئی ہے۔

۹۔ اس میں دلیل ہے کہ قلیل حرام سے بھی بچنا انبیاء اور اولیاء کا طریقہ ہے۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ اہلِ بیت پر لازم ہے کہ اپنی اولاد کی خیر خواہی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے سیدنا حسن علیہ السلام کو نصیحت کرتے ہوئے **"کخ کخ"** کا تکرار کیا، پھر فرمایا: **"ألقها"** پھر فرمایا: **"أما شعرت"**۔

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ گھر کے زیرِ کفالت افراد کی تعلیم و تربیت کے لیے کمر بستہ رہنا چاہیے، نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں بھی اُن میں شامل ہیں۔

۱۲۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ بچے کو اس بات کی مشق کرائی جائے کہ وہ شرعی احکام کو اُن کے اسباب، وجوہات اور حکمتوں کے ساتھ سمجھے، اس سے اُس کی سمجھ بوجھ اور ذہانت میں اضافہ ہوگا۔

۱۳۔ اس میں دلیل ہے کہ اگر برائی شروع کر دی جائے تو اس بنا پر اس سے سکوت نہیں اختیار کرنا چاہیے کہ وہ تو معمولی سی چیز ہے، حالانکہ کھجور بھی ایک معمولی سی چیز تھی اور وہ منہ میں بھی ڈالی جا چکی تھی۔

۱٤۔ اس میں دلیل ہے کہ کسی چیز کی ممانعت میں بچوں کو ممانعت کی وجہ بھی بتلائی جائے، بشرطیکہ اسباب و وجوہات کا سمجھنا اُن کے لیے ممکن ہو۔ بلا دلیل ممانعت کے مقابلے میں یہ طریقہ زیادہ مفید ہوتا ہے۔(۱)

۱۵۔ اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے حکمرانوں کا محاسبہ فرمائے گا، حتیٰ کہ بیت المال کی کھجور کے ایک دانے پر بھی۔

---

(۱) مؤلف کے اس پیراگراف کا مطلب یہ ہے کہ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ حرمتِ زکوۃ کی علت کو سمجھتے تھے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اُن پر علت بھی واضح فرمائی۔ اس میں اُن نواصب کی بھرپور تردید ہے جو حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی صحابیت کا انکار کرتے ہیں، جبکہ نبی کریم ﷺ اُنہیں علل و حکمتوں کے ساتھ احکام شرعیہ کی فہم کا اہل سمجھتے تھے۔ **فَتَأَمَّلْ!**

سولہویں حدیث

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حسن بصری رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سنا کہ اللہ کی قسم! جب امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما معاویہ کے مقابلہ میں پہاڑوں جیسے لشکر کے ساتھ آئے تو عمرو بن العاص نے کہا: میں ایسا لشکر دیکھ رہا ہوں جو مخالفین کو مارے بغیر نہیں لوٹے گا۔ اس پر حضرت معاویہ نے کہا: (اور اللہ کی قسم! وہ دو شخصوں میں بہتر تھے) اے عمرو! اگر اِن لوگوں نے اُنہیں اور اُنہوں نے اِنہیں قتل کر دیا تو پھر لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کون ہوگا؟ اُن کی عورتوں کی حفاظت کے لیے کون ہوگا؟ اور اُن کی جائیداد کے لیے کون ہوگا؟ پھر انہوں نے قریش کے دو اشخاص جو بنی عبد شمس کی اولاد میں سے تھے، عبد الرحمٰن بن سمرہ اور عبداللہ بن عامر بن کریز کو امام حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور کہا: ان کے پاس جاؤ اور صلح کی پیشکش کرو، ان سے بات چیت کرو اور وہ جو مطالبہ کریں قبول کرلو۔ وہ دونوں ان کے پاس گئے، گفتگو کی اور صلح کی درخواست کی۔

امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے انہیں فرمایا: ہم عبد المطلب کی اولاد ہیں اور ہم کو اس مال سے حصہ ملا ہے اور امت میں بہت خون ریزی ہوئی ہے۔ ان دونوں نے کہا: معاویہ نے آپ کو یہ یہ پیش کش کی ہے، وہ آپ سے صلح کی درخواست کرتا ہے اور آپ جو مطالبہ فرمائیں وہ قبول کرنے کو تیار ہے۔ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: اس کی ضمانت کون دے گا؟ انہوں نے کہا: ہم ذمہ دار ہیں۔ پھر امام حسن نے جو بات چاہی انہوں نے کہا: ہم ذمہ دار ہیں، تو اس پر انہوں نے معاویہ سے صلح کر لی۔

حسن بصری کہتے ہیں: میں نے حضرت ابوبکرہ کو بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منبر پر دیکھا جبکہ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما آپ کے پہلو میں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی ان کی طرف، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے: میرا یہ بیٹا سید ہے اور امید ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کے سبب سے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کرادے گا۔

امام بخاری اس حدیث کی روایت میں منفرد ہیں، امام حاکم اس حدیث کو لائے تو امام ذہبی نے ان پر اعتراض کیا۔

امام حسن بصری رضی اللہ عنہ کا قول: ''وكان والله إلخ...'' سے مراد یہ ہے کہ (اس معاملہ میں) معاویہ عمرو بن العاص سے بہتر تھے۔(۱)

۱۶ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس حدیث میں امام حسن رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافت کے تنازع میں اُن کی اصلاح کی تعریف فرمائی ہے، اور یہ مسلمانوں کے اتحاد کی عظیم اصل اور صلح پر ابھارنے کی دلیل ہے۔ اس کے برخلاف جو مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرے، اُن میں تفریق پیدا کرے اور اچھے حکمرانوں کے خلاف خروج کرے تو ایسے شخص کو کہیں بھی قابل ستائش نہیں ٹھہرایا گیا۔

۲۔ امام ابوحفص بن شاہین کہتے ہیں:

''اس فضیلت میں امام حسن علیہ السلام تنہا ہیں، اس میں اُن کا اور کوئی شریک نہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بجز امام حسن علیہ السلام کے کسی کی مطلق سیادت کا ذکر نہیں فرمایا''۔(۲)

جہاں تک مقید سیادت کا تعلق ہے تو وہ متعدد احادیث میں آئی ہے، جیسا کہ صحیحین میں سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے لیے آیا: ''قوموا إلى سيدكم'' [اپنے سردار (کی تعظیم) کے لیے کھڑے ہو جاؤ] (۳)

۳۔ حافظ ابوبکر بیہقی نے اپنی کتاب ''الاعتقاد'' میں لکھا ہے کہ حضرت سفیان نے فرمایا: ''ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ''فئتين من المسلمين'' ہمیں بہت پسند ہے۔ شیخ فرماتے ہیں:

---

(۱) بخاري: كتاب الصلح، باب قول النبي ﷺ للحسن بن علي رضي الله عنهما ''ابني هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين، حديث ٢٧٠٤؛ المستدرك: كتاب معرفة الصحابة، ومن فضائل الحسن بن علي بن أبي طالب رضي الله عنه وذكر مولده ومقتله ج٣ ص ١٩١ حديث ٤٨٠٨۔

(۲) شرح مذاهب أهل السنة لابن شاهين ص٢٦٣۔

(۳) بخاري: كتاب الجهاد والسير، باب إذا نزل العدو على حكم رجل، حديث ٣٠٤٣؛ مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب جواز قتال من نقض العهد، حديث ١٧٦٨۔

''اُنہیں یہ ارشاد اِس لیے پسند ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سب کو مسلمان کہا۔ امام حسن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی اِس پیش گوئی کا تعلق اُس وقت سے ہے جب انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد معاویہ بن ابوسفیان کو حکومت سپرد کردی تھی''۔(١)

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ جب حق سے متعلق قربانی عظیم ہو تو اُس کی جزا بھی عظیم ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب امام حسن رضی اللہ عنہ دنیا میں اپنے حق سے دست بردار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں دنیا میں سیادت عطا کی اور وہ آخرت میں جنتی جوانوں کے سردار ہوں گے اور جزا عمل کے مطابق ہوتی ہے۔(٢)

---

(١) الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد ص ٥٠٤، وط: ص ٥٣٣، ٥٣٤۔

(٢) امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا راز

مؤلف نے دوسرے نمبر کے استدلال میں کہا ہے کہ اس حدیث میں جس فضیلت کا ذکر ہے اُس میں امام حسن رضی اللہ عنہ کا کوئی شریک نہیں۔ بلاشبہ یہ حقیقت ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ حدیثِ ھٰذا میں جس صلح کا ذکر ہے وہ فقط امام حسن علیہ السلام کی جانب سے تھی، کیونکہ مدمقابل شخص نے تو اقتدار کے طمع میں اپنے بھیجے ہوئے دو شخصوں کو کہا تھا کہ تم فلاں فلاں پیش کش کر کے امام حسن کو صلح پر آمادہ کرو۔ ظاہر ہے کہ امام حسن مذکورہ پیش کشوں کے باوجود صلح پر آمادہ نہ ہوتے تو موصوف ضرور جنگ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں بھی اس صلح کی نسبت فقط امام حسن علیہ السلام کی طرف کی گئی اور ضمیر بھی واحد استعمال فرمائی گئی۔ نیز صلح کے وقت جانبین سے موجود لوگوں کے نزدیک بھی سببِ صلح امام حسن رضی اللہ عنہ تھے، اور موردِ طعن بھی وہی ہوئے تھے، خود اُن پر اُن کے بعض لشکریوں نے طعن کیا اور باعث عار سمجھا تھا، جس پر امام پاک نے فرمایا تھا: ''العَارُ خَيْرٌ مِنَ النَّارِ'' (عار نار (آگ) سے بہتر ہے)۔

صلح میں امام حسن رضی اللہ عنہ کے مدنظر کیا تھا؟

کچھ لوگ اس صلح کو عمومی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن مدبّرین کے نزدیک یہ عظیم ترین قربانی اور دوررَس نتائج کی حامل صلح تھی، کیونکہ اس کی بدولت جانبین سے ہزاروں مسلمانوں کی جانیں اور اسلام کا مستقبل محفوظ ہوا تھا۔

اس صلح کی قدر و منزلت پر مزید روشنی ہم اپنی کتاب ''**سیدنا الإمام الحسن** رضی اللہ عنہ'' میں ڈالیں گے۔ **إن شاء الله تبارك وتعالیٰ**۔=

. . . .

= سردست اس امر پر روشنی ڈالنا ضروری ہے کہ اس صلح میں امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے مدنظر کیا چیز تھی؟ آیا کسی فرد کی اہلیت تھی یا اہل اسلام کا تحفظ؟ کئی لوگ امام حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری کو حضرت معاویہ کی اہلیت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض کتب میں ہے:

''امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز انہیں تفویض نہ فرماتے''۔

بعض علماء نے لکھا ہے:

''اگر مدت خلافت ختم ہو چکی تھی اور آپ بادشاہت منظور نہیں فرماتے تو صحابہ حجاز میں کوئی اور قابلیتِ نظم ونسقِ دین نہ رکھتا تھا جو اُنہیں کو اختیار کیا؟'' (بعض کتبِ فتاوی)

کیا کسی کی اہلیت مدّنظر تھی؟

مذکورہ بالا دونوں فقرے نمونۃً نقل کیے گئے ہیں، ان فقروں کو نقل کرنے میں ہمارا مقصود یہ ہے کہ عربی اردو وغیرہ کسی بھی زبان میں ایسا مفہوم کسی بھی کتاب میں کسی بھی چھوٹی یا بڑی شخصیت سے منقول ہو تو وہ کتاب وسنت کے منافی اور مردود قول ہے۔

بعض کتب کے مذکورہ بالا دو فقروں میں سے دوسرے فقرے میں استفہامیہ انداز میں یہ الفاظ بھی ہیں:

''صحابہ حجاز میں کوئی اور قابلیتِ نظم ونسقِ دین نہ رکھتا تھا جو اُنہیں کو اختیار کیا؟''۔

میں کہتا ہوں: یقیناً اُس وقت حجازِ مقدس وغیرہ مقامات پر جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیات تھے، مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماموں سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا عمر کے چچازاد سیدنا سعید بن زید (دونوں سابقین اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) ترجمان القرآن اور حبر الامہ ابن عباس، پیکر ورع ابن عمر، میزبانِ رسول سیدنا ابو ایوب انصاری، خادم رسول سیدنا انس، بے باک حق گو عبدالرحمان بن ابی بکر، ''وِعَائَین'' (دو بھاری علموں) کے امین سیدنا ابو ہریرہ وغیرھم رضی اللہ عنہم موجود تھے، لیکن ان میں سے کسی کو بھی بادشاہ بنانے سے فتنہ ختم نہ ہوتا، کیونکہ جو صاحب امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں مسلح لشکر لے کر آئے تھے اُن کا منشا یہ نہیں تھا کہ امام حسن کی جگہ کسی دوسرے شخص کو منتخب کیا جائے بلکہ وہ خود ہی کو مکمل اقتدار پر دیکھنا چاہتے تھے، حتیٰ کہ ایسے آثار بھی ملتے ہیں کہ وہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے =

....

= وقت سے اقتدار کی تیاریوں میں تھے۔ چنانچہ امام نعیم بن حماد لکھتے ہیں:

عن محمد بن سيرين قال: واللّٰه إني لأراه كان يتصنع لها -يعني معاوية- على عهد أبي بكر وعمر رضي اللّٰه عنهما. يعني للخلافة.

''محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: اللہ کی قسم! میں سمجھتا ہوں کہ معاویہ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں خلافت کے لیے تیار نظر آتے تھے''۔(1)

اس بات کا خدشہ خلیفۂ ثانی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو بھی تھا، چنانچہ وہ فرماتے تھے:

يا أصحاب رسول اللّٰه! تناصحوا، فإنكم إن لا تفعلوا غلبكم عليها يعني الخلافة، مثل عمرو بن العاص ومعاوية بن أبي سفيان.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیو! باہم اتحاد رکھو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خلافت کے معاملہ میں عمرو بن العاص اور معاویہ بن ابوسفیان تم پر غالب آجائیں گے''۔(2)

اگر کسی شخص کو امام نعیم بن حماد کی روایت میں تردد ہو تو ہم اُسے درجِ ذیل عبارت میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ علماء سیر و تاریخ نے سند کے ساتھ عبداللہ بن سعد بن اُبی سرح کے حالات میں لکھا ہے:

أقام عبد اللّٰه بن سعد بعسقلان، بعد قتل عثمان، وكره أن يكون مع معاوية، وقال: لم أكن لأجامع رجلاً قد عرفته، إن كان ليهوى قتل عثمان.

''عبداللہ بن سعد، سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عسقلان میں رہنے لگا اور معاویہ کے ساتھ رہنا پسند نہ کیا، اور کہا: میں اُس شخص کے ساتھ نہیں رہوں گا جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل چاہتا تھا''۔(3) =

---

(1) كتاب الفتن ص١٢٨۔

(2) كتاب الفتن ص١٢٨۔

(3) المعرفة والتاريخ للفسوي ج١ ص١٠٢؛ سير أعلام النبلاء ج٣ ص٣٥؛ تاريخ دمشق لابن عساكر ج٢٩ ص٤٢۔

. . . .

لہٰذا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فقط جانبین کے اہل اسلام کے تحفظ کی خاطر مستقبل کی مملکت کو اُن پر چھوڑنا گوارا کیا۔ اگر کوئی شخص امام پاک کے فیصلہ سے حضرت معاویہ کی اہلیت ثابت کرنے پر مُصر ہو تو اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام پاک کے نزدیک درجِ بالا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت معاویہ کے مقابلہ میں نظم ونسقِ دین کے حوالہ سے نااہل تھے، اور ایسا تصور بھی کتاب وسنت اور نبوی تربیت کے منافی ہے۔

امام پاک کے مدنظر فقط کتاب وسنت تھی

حقیقت یہ ہے کہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کا صلح کی پیش کش کو قبول فرمانا کتاب وسنت کی روشنی میں تھا، کیونکہ قرآن کریم میں ہے:

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا.

''اور اگر وہ مائل ہوں صلح کے لیے تو آپ بھی اُس کے لیے مائل ہو جایئے''۔(الأنفال: ٦١)

امن کی خاطر یا آئندہ نسلوں سے اسلامی منافع کی امید میں کفار کے ساتھ بھی صلح کرنا جائز ہے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

قال أصحابنا يجوز الصلح مع الكفار بمال يؤخذ منهم أويدفع إليهم ، إذا كان الصلح خيراً في حق المسلمين.

''ہمارے ائمہ احناف نے کہا ہے: کفار کے ساتھ صلح کرنا اُن سے کچھ مال لے کر یا اُنہیں کچھ مال دے کر جائز ہے، بشرطیکہ وہ صلح مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو''۔(1)

اور اِس صلح میں تو تھے ہی جانبین سے سب مسلمان، اور ہر چند کہ فریقِ ثانی کے سربراہ اِس بات کے اہل نہیں تھے کہ اکابر صحابہ کو چھوڑ کر انہیں مملکتِ اسلامیہ سونپی جاتی، لیکن چونکہ وہ مسلح لشکر لائے تھے، اس لیے لوگوں کے تحفظ کی خاطر امام حسن رضی اللہ عنہ کا صلح کرنا ہی بہتر تھا۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کی بقا اور اُس کی اشاعت ہی ہمیشہ اہل بیت کا ہدف رہا ہے۔ چنانچہ اگر آپ =

---

(1) عمدة القاري ج ١٤ ص ١٨ ،وط: ج ١٤ ص ٢٤۔

....

= حدیبیہ کی صلح میں یا طائف والوں پر عذاب کی پیش کش کو رد کرنے میں غور فرمائیں گے تو آپ کو اسلام کی بقا، یا اُس کی اشاعت کے علاوہ کوئی اور بات نظر نہیں آئے گی۔ یہاں اگر سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اِن الفاظ ''**سلامة الدینِ أحب إلینا من غیره**'' (دین کا باقی رہنا ہمیں دوسری باتوں سے زیادہ محبوب ہے) میں غور کیا جائے اور پھر یہ پہلو بھی مدنظر رکھا جائے کہ یہ الفاظ انہوں نے کب ارشاد فرمائے تھے تو عقل مند انسان پکار اٹھے گا کہ اہل بیت کا ہدف کتنا بلند ہے! یہ الفاظ اُس وقت کہے گئے تھے جب وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا معاملہ غیر بنو ہاشم کی طرف جا رہا تھا تو ایک عاقبت نا اندیش شخص نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پیش کش کی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی مدد کے لیے گھڑ سوار لشکر مہیا کر دوں؟ اس پر مولا علی رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا جواب دیا تھا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ کتاب وسنت اور امت سب کچھ اہل بیت کا ہے، لہٰذا اگر کسی لڑائی میں ان چیزوں کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو نقصان کس کا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ نقصان اُسی کا ہوگا جس کی چیز ہے۔ اس لیے امام پاک نے چاہا کہ مخصوص مدت تک کے لیے اِن چیزوں کا وجود کسی طور بھی محفوظ رہ جائے تو فائدہ اُن ہی کا ہے۔ اس حقیقت کو درج ذیل مثال سے سمجھا سکتا ہے۔

''حدیث میں آیا ہے کہ دو عورتیں تھیں، اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا بچہ تھا۔ بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک کے بچے کو کھا گیا۔ ایک نے دوسری سے کہا: بھیڑیے نے تمہارے بچے کو کھایا ہے، دوسری نے کہا: نہیں، بلکہ تمہارے بچے کو کھایا ہے.... دونوں سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس فیصلہ کے لیے گئیں تو انہوں نے فرمایا: چھری لاؤ، میں اس بچے کے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ اس پر چھوٹی کہنے لگی: ''**أتشقه**'' (آپ اس کے دو ٹکڑے کریں گے؟) فرمایا: ہاں، کہنے لگی: ''**لا تفعل حظي منه لها، قال: هو ابنک، فقضیٰ به لها**'' (ایسا نہ کریں، میرا حصہ بھی اسی کو دے دیں، اس پر سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: یہ بچہ تمہارا ہی ہے، پھر اُسی کے حق میں فیصلہ دے دیا''۔(1) =

(1) بخاري: کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول الله تعالیٰ: ﴿وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ﴾ إلخ، حدیث ۳٤۲۷؛ مسلم: کتاب الأقضیة، باب بیان اختلاف المجتهدین، حدیث ۱۷۲۰؛ سنن النسائي: کتاب آداب القضاة، باب حکم الحاکم بعلمه، ص ۸۱۲، ۸۱۳ حدیث ۵٤۰۳، ۵٤۰٤۔

....

= غور فرمایئے کہ چھوٹی عورت کیوں تیار ہوگئی کہ اُس کا بچہ دوسری کو دے دیا جائے؟ فقط اس لیے کہ وہ سمجھتی تھی کہ اگرچہ دوسری عورت اُس بچے کی دیکھ بھال اُس طرح نہیں کر سکے گی جس طرح حقیقی ماں کرتی ہے، لیکن اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ بچے کا وجود سلامت رہے گا اور خدا نے چاہا تو کبھی وہ اُسے دوبارہ مل بھی جائے گا۔ بعینہٖ یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے، ہر چند کہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کا مدمقابل خلافت یا سلطنت کا حق دار اور اہل نہیں تھا، تاہم اِس صلح میں جانبین کے اہل اسلام کی حفاظت مقصود تھی، اور یہ امید بھی تھی کہ کسی نہ کسی دن ''حق بحق دار رسید'' (حق دار کو حق مل جائے گا)۔ یہی وجہ ہے کہ امام پاک نے شرائط میں یہ بھی لکھوایا تھا کہ:

۱۔ تمہیں کتاب وسنت کے مطابق حکومت کرنا ہوگی

۲۔ اور تم اپنے بعد حکومت اپنے خاندان کو نہیں دو گے بلکہ ہمیں واپس کرنا ہوگی۔ (1)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے کسی دوسرے افضل شخص کے بجائے مدمقابل اور مسلح لشکر کے سربراہ کو سلطنت سونپنے کا کڑوا گھونٹ فقط اس لیے پیا کہ اہل اسلام محفوظ رہ جائیں، اور ہمیشہ اہل بیت کا ہدف یہی رہا ہے۔

کیا مدمقابل شخص امام حسن رضی اللہ عنہ کے نزدیک پسندیدہ تھا؟

لوگ حضرت معاویہ کی اہلیت وعظمت کو ثابت کرنے میں بیشک زمین وآسماں کے قلابے ملاتے رہیں، لیکن وہ امام حسن رضی اللہ عنہ کے نزدیک پسندیدہ اور اہل نہیں تھے۔ کوئی شخص سوال کر سکتا ہے کہ اس پر دلیل کیا ہے؟ میں عرض کرتا ہوں: اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت معاویہ کا شمار طلقاء میں ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کو کسی منصب کے تو کجا اہل اسلام کی مجلسِ شوریٰ میں شامل ہونے کے لائق بھی نہیں سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ سیدنا عبدالرحمان بن غنم اشعری رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے یہ حقیقت رکھی تھی تو وہ نادم ہوئے تھے۔ خلیفۂ ثانی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا مسلک بھی یہی تھا، لیکن خدا کی تقدیر کہ وہ بعض طلقاء کو منصب سونپ بیٹھے تھے، تاہم وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے اس فیصلہ پر نادم ہوئے تھے۔ چنانچہ امام ابی مالکی اور دوسرے شارحینِ حدیث لکھتے ہیں:

وتطاول عمرو بن العاص للشوریٰ، فقال له عمر: اطمئن كما وضعك الله =

---

(1) أسد الغابة ج۲ ص۱۸۔

....

والله لا جعلت فيها أحداً حمل السلاح علىٰ رسول الله ﷺ،وقال مرةً: إن هذا الأمر لايصلح للطلقاء ولالأبناء الطلقاء،ولواستقبلت من أمري ماستدبرت ما جمعت ليزيد بن أبي سفيان ومعاوية بن أبي سفيان ولاية الشام.

''حضرت عمرو بن العاص نے شوریٰ (میں شمولیت) کی آرزو کی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: وہیں رہو، جہاں اللہ نے تمہیں رکھا ہے۔ بخدا! میں اس معاملہ میں کسی ایسے شخص کو شامل نہیں کروں گا جس نے رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں ہتھیار اُٹھائے تھے، نیز فرمایا: طلقاء اور طلقاء کی اولاد کارِحکومت کے لائق نہیں، اور اگر میں اس معاملہ کو پہلے جان لیتا تو یزید بن ابوسفیان اور معاویہ بن ابوسفیان کو شام کی حکومت پر نہ رہنے دیتا''۔(1)

لیکن اب وقت گذر چکا تھا اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، تاہم آخری ایام میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی یہ ندامت اُن کے مرتبہ، فضیلت اور عشرہ مبشرہ میں ہونے کی دلیل ہے۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا وصال کسی بیماری کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ اُن پر اچانک قاتلانہ حملہ ہوا، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ وہ مستقبل قریب میں کچھ اہم فیصلے کرنے کا عزم رکھتے ہوں، لیکن حضرت مغیرہ بن شعبہ کے غلام ابولؤلؤ مجوسی پر خدا کی لعنت ہو کہ اُس نے سراج اہل جنت کو شہید کر دیا، نہ معلوم اُس نے اتنا بڑا اقدم کیوں اُٹھایا ہوگا؟ حالانکہ اُسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فقط اتنا کہا تھا کہ تمہارا مالک تم سے زیادہ ٹیکس نہیں لے رہا۔(2)

کیا امام حسن رضی اللہ عنہ نے بیعت اطاعت کر لی تھی؟

خلاصہ یہ ہے کہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کا اقدام فقط تحفظ اہل اسلام کی خاطر تھا، کسی شخص کی اہلیت کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض لوگوں نے لکھ دیا ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے: =

---

(1) إكمال إكمال المعلم ج٢ ص٤٧٤؛مكمل إكمال الإكمال ج٢ ص٤٧٤؛فتح الملهم للعثماني ج٤ ص١١٨؛الكوكب الوهاج ج٨ ص٢٠٧؛أسدالغابة[مفهوماً] ج٥ ص٢٠٤۔

(2) تاريخ الخلفاء ص١٤١؛محض الصواب في مناقب عمربن الخطاب ص٨٠٨۔

= ''اُن کے ہاتھ پر بیعتِ اطاعت فرمائی''۔

امام پاک نے قطعاً کوئی بیعت اطاعت نہیں فرمائی تھی۔کیا قومی یا بین الاقوامی امور کے بارے میں شرائط طے کرنے کے بعد معاہدہ کی صورت میں جو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جاتا ہے، اُسے بیعت اطاعت کہتے ہیں؟نہیں، ہرگز نہیں! بلکہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ فریقین میں شرائط کے ساتھ جو معاہدہ ہوا، اُسے وہ نبھائیں گے۔اس کو مطلقاً بیعتِ اطاعت پر محمول کرنا پرلے درجے کی جہالت ہے۔ایسے ہی الفاظ سے دھوکہ کھا کر بعض لوگوں نے لکھ دیا کہ حضرت معاویہ سیدنا حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے پیر ہیں نعوذ باللّٰہ ۔جیسا کہ ہم پندرھویں حدیث کی شرح میں اُن کی تردید کر چکے ہیں۔

اگر اب بھی کوئی شخص شک میں مبتلا ہو تو ہم اُسے اس بیعتِ اطاعت کی دھجیاں بکھرتی ہوئی دکھاتے ہیں۔

معاہدہ لکھے جانے کے بعد جب امام پاک مستقبل کی سلطنت سے دستبردار ہو کر عازمِ مدینہ ہوئے تو جناب معاویہ کو خیال آیا کہ اُنہیں خوارج کے خلاف جنگ کے لیے بھیجا جائے لیکن امام پاک رضی اللہ عنہ نے اُنہیں فرمایا: خوارج کے بجائے تمہارے خلاف جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے۔چنانچہ امام ابو العباس المبرّد لکھتے ہیں:

ثم خرج الحسن يريد المدينة فوجّه إليه معاوية وقد تجاوزَ في طريقه يسأله أن يكون المتولي لمحاربتهم، فقال الحسن: واللّٰهِ لقد كففتُ عنک لحقن دماء المسلمين، وما أحسب ذلک يسعني، أفأقاتل عنک قوماً، أنت واللّٰهِ أولىٰ بالقتال منهم.

''پھر امام حسن عازم مدینہ ہوئے تو معاویہ اُن کے پیچھے گئے اور امام پاک کافی راستہ طے کر چکے تھے،انہوں نے امام پاک سے درخواست کی کہ وہ خوارج کے خلاف جنگ کے سپہ سالار بنیں تو امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم !میں نے تو تجھ سے بھی فقط مسلمانوں کے خون کی وجہ سے ہاتھ روکا ہے، میں اس کام کو مناسب نہیں سمجھتا، کیا میں تیری خاطر ایک قوم سے قتال کروں؟ اللہ کی قسم: اُن کی بہ نسبت تجھ سے جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے''۔(1) =

(1) الکامل فی اللغة والأدب ص٥٧٧ ،وط: ج٣ص ٧٠۔

....

= معلوم ہوا کہ بیعتِ اطاعت کا لفظ مردود و باطل ہے۔ اگر بعض لکھاری ''مشروط صلح'' کو مدنظر رکھتے تو ایسی فاش بلکہ فحش غلطی کے مرتکب نہ ہوتے۔ بھلا امام پاک ایسے شخص کو کیونکر اہل اور قابلِ اطاعت سمجھ سکتے تھے جس سے دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ باقاعدہ یہ شرط بھی لکھوائی تھی کہ وہ اُن کے بابا سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم نہیں کرے گا۔ چنانچہ علماء کرام لکھتے ہیں:

وأن لایشتم علیّاً فلم یجبه إلی الکف عن شتم علي،فطلب أن لایُشتمَ وهو یسمع، فأجابه إلیٰ ذلک،ثم لم یف له به أیضاً.

''اور یہ کہ تم سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم نہیں کرو گے، لیکن انہوں نے شتمِ علی سے باز رہنے کو قبول نہ کیا، پھر امام حسن نے مطالبہ کیا کہ جب وہ سن رہے ہوں تو اُس وقت سبّ وشتم نہ کیا جائے، اس بات کو اُنہوں نے قبول کرلیا لیکن بعد میں اس کی بھی پاسداری نہ کی''۔(1)

وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو، مگر انہوں نے یہ وعدہ تو فوراً ہی توڑ ڈالا تھا۔ چنانچہ کتبِ تاریخ ہی نہیں بلکہ کتب حدیث بھری پڑی ہیں کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی دستبرداری کے بعد سبّ وشتم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا، حتیٰ کہ موصوف کا پسندیدہ گورنر (ملعون ابن ملعون مروان بن الحکم) مسجد نبوی شریف کے منبر پر اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے روبرو سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم اور لعنت کرتا تھا۔

چنانچہ ابوالفداء عمادالدین بن اسماعیل الشافعی لکھتے ہیں:

کان خلفاء بني أمیة یسبون علیاً رضی اللہ عنہ من سنة إحدی وأبعین ،وهي السنة اللتي خلع الحسن فیها نفسه من الخلافة إلیٰ أول سنة تسع وتسعین، آخر أیام سلیمان بن عبد الملک، فلماولّیٰ عمر أبطل ذلک.

''خلفاء بنو امیہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر ۴۱ھ سے، جبکہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ خلافت سے =

---

(1) الکامل لابن أثیر ج۳ ص۲۷۲؛المختصر من أخبار البشر لأبی الفداء ج۱ ص۱۸۳؛تاریخ دمشق ج ١٣ ص ٢٦٤؛البدایة والنهایة ج۷ ص٦١٧؛تاریخ ابن الوردي ج١ ص١٦٦؛ العبر في أخبار من غبر للذهبي ج١ ص ٣٥ ۔

....

= دست بردار ہوئے تھے (زور و شور سے) سبّ وشتم شروع کیا اور یہ سلسلہ ۹۹ھ سلیمان بن عبد الملک کے آخری ایام تک جاری رہا، پھر جب سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالی تو اُنہوں نے اس کو ختم کیا''۔(1)

دل پر ہاتھ رکھ کر بتلایئے! جس شخص کے بارے میں امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ وہ اُن کے بابا کو سبّ وشتم کرتا ہے اور اُنہیں آئندہ بھی اُس سے اسی ناشائستہ حرکت کا خدشہ تھا، کیا وہ اُسے خلافت کا اہل سمجھتے تھے؟ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ. کیا کسی راشد اور سراپا خیر سے بھی سبّ وشتم کا خدشہ ہوتا ہے؟

تعجب ہے کہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ شرائط لکھواتے ہوئے جس شخص سے باقاعدہ یہ شرط بھی لکھوا رہے تھے کہ جب مکمل اقتدار اُس کے ہاتھ میں آجائے تو وہ اُن کے بابا کو برا نہیں کہے گا، اُسے بعض لوگ پورے حجاز سے زیادہ اہل قرار دے رہے ہیں! تف ہے ایسی عقل پر اور افسوس ہے ایسی دین داری پر۔

خود سوچئے! اگر کوئی پیر یا سربراہ آپ کے مرحوم باپ کو سبّ وشتم کرتا ہو، اور آپ کو بھی معلوم ہو اور زمانہ بھی معترف ہو کہ آپ کا بابا ہر لحاظ سے اُس سے افضل اور اعلیٰ ہے تو کیا آپ کا ضمیر اُس شخص کو اپنا سربراہ اور پیر بنانے پر آمادہ ہوگا، اور کیا آپ اُس کی بیعتِ اطاعت قبول کریں گے؟ اگر جواب نفی میں ہو تو پھر بتلایئے کہ کیا معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے سینہ میں ضمیر اور غیرت نام کی کوئی چیز نہیں تھی؟ تھی اور یقیناً تھی، لیکن اُنہوں نے محض تحفظ اہل اسلام کی خاطر برداشت کی حد کر دی تھی۔ اَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ.

امام حسن رضی اللہ عنہ کی خطبہ میں تعریض

صلح کے وقت جو شخص امام پاک کے مدمقابل تھا وہ قطعاً اُنہیں پسند نہیں تھا، اس کی ایک اور شہادت امام حسن رضی اللہ عنہ کی اُس تقریر میں بھی موجود ہے جس کے لیے اُنہیں مجبور کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ امام پاک نے معاہدۂ صلح کی شرائط لکھوانے پر ہی اکتفا کر لیا تھا، لیکن حضرت عمرو بن العاص نے امام پاک کو بھرے مجمع میں رُسوا کرنے کی ایک ترکیب سوچی یا جنابِ معاویہ کے ہاں اپنے نمبر بنانے کی کوشش کی۔ ان کا گمان تھا کہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ =

(1) المختصر في أخبار البشر ج١ ص٢٠١۔

....

= تقریر نہیں کر سکتے ۔ چنانچہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ صحیح سند کے ساتھ لکھتے ہیں کہ انہوں نے جنابِ معاویہ کو اصراراً کہا:

إن الحسن مرتفع في الأنفس لقرابته من رسول الله ﷺ،وإنه حديث السن عَيِيٌّ، فمُرُه فليخطب ، فإنه سيعيىٰ فيسقط من أنفس الناس.

''رسول اللہ ﷺ سے قرابت داری کی وجہ سے حسن کا لوگوں کے دلوں میں بڑا رتبہ ہے، اور وہ ابھی ناپختہ ہیں، بولنے میں ہچکچاتے ہیں، آپ اُنہیں حکم دیں کہ وہ تقریر کریں، یقیناً وہ ہچکچائیں گے تو لوگوں کے دلوں سے گر جائیں گے''۔(1)

لیکن مثل مشہور ہے ''چاہ کن راپیش آمد چاہ'' پھر ہوا کیا؟ ملاحظہ ہو! امام ابن عساکر سند کے ساتھ لکھتے ہیں کہ امام پاک نے کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے بغیر بلا تردد اور فی البدیہہ ایک خطبہ دیا، جس میں حمد وثنا کے بعد فرمایا:

أيها الناس فإنَّ الله ﷻ هداكم بأولنا وحقن دمائكم بآخرنا،وإن لهذا الأمر مدة ،وإن الدنيا دول، وإن الله قال لنبيه ﷺ: ﴿وَإِنْ أَدْرِيْ أَقَرِيْبٌ أَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ،إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَمِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَاتَكْتُمُوْنَ، وَإِنْ أَدْرِيْ لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ﴾ فلما قالها أجلسها معاوية ، ثم خطب معاوية ثَمَّ الناس، فلم يزل صرماً علىٰ عمرو بن العاص،وقال: هذا من رأيک؟

''لوگو! اللہ ﷻ نے ہمارے اولین کے طفیل تمہیں ہدایت دی اور ہمارے آخرین کے طفیل تمہارے خون کو محفوظ کیا، یہ معاہدہ ایک مدت کے لیے ہے اور دنیا قرار پکڑنے کی چیز نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا ہے: ﴿اور میں نہیں سمجھتا کہ قریب ہے یا بعید جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو بات تم بلند آواز سے کہتے ہو اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو، اور میں کیا جانوں (اس ڈھیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا اور ایک وقت تک تمہیں لطف اندوز کرنا مطلوب ہو﴾ جب امام حسن رضی اللہ عنہ نے یہ بات فرمائی تو معاویہ نے انہیں =

(1) سیر أعلام النبلاء للذهبي ج٣ ص ٢٧١۔

....

= بٹھادیا، پھر معاویہ نے لوگوں کو خطبہ دیا، پھر وہ مسلسل حضرت عمرو بن العاص کو کوستے رہے اور کہتے رہے: کیا تم یہی چاہتے تھے؟''۔(1)

دوسری روایت میں ہے:

''امام حسن رضی اللہ عنہ نے ﴿لَعَلَّهُ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ﴾ آیت پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ سے معاویہ کی طرف اشارہ کیا تو معاویہ غضب ناک ہوئے، پھر معاویہ نے اُن کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں اُن پر مرعوبیت نمایاں تھی، پھر منبر سے اتر کر امام حسن رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ﴿فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ﴾ (تمہارے لیے فتنہ اور سامان) سے تم نے کیا ارادہ کیا تھا؟ امام پاک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے میں نے وہی ارادہ کیا جو اللہ جل جلالہ کا ارادہ ہے''۔(2)

اس تقریر میں امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے آیات کی تلاوت فرما کر جو تعریض فرمائی، اُس میں غور فرمایئے لیکن خصوصاً اُس منظر کو ضرور سامنے لایئے جو اُنہوں نے ﴿لَعَلَّهُ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ﴾ کی تلاوت کے وقت اپنے ہاتھوں سے موصوف کی طرف اشارہ فرمایا، حتیٰ کہ وہ غضب ناک ہوگئے اور مزید تقریر سے روکنے پر مجبور ہوگئے، اور جن صاحب نے اُنہیں امام حسن رضی اللہ عنہ سے تقریر کرانے پر اُبھارا تھا، اُنہیں کوسنا شروع کر دیا۔ بتلایئے! کیا ایسے ماحول و منظر سے امام حسن رضی اللہ عنہ کی رضامندی، بیعتِ اطاعت اور سامنے والے کی خلافت کی موزونیت و اہلیت عیاں ہو رہی ہے؟ **فیاللعجب!**

دستورِ دُنیا یہ ہے کہ انسان رضامندی کے ساتھ جس کے حق میں دستبردار ہوتا ہے تو اُس کی موجودگی میں اور جانبین کی پبلک کے سامنے ایسے کلمات ادا کرتا ہے جن سے مدمقابل شخص بھی اور جانبین کے عوام بھی مطمئن ہوتے ہیں، لیکن کیا وجہ ہے کہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی مبارک زبان سے ایسے الفاظ صادر نہیں ہو سکے، حالانکہ اُنہیں دعوتِ خطاب بھی اُنہیں لوگوں نے دی تھی؟ شاید اس کی حکمت اُن لوگوں کو معلوم ہوگی جو کہتے ہیں کہ امام حسن =

---

(1) تاریخ دمشق ج١٣ ص٢٧٥، ٢٧٦، ٢٧٧۔

(2) سیر أعلام النبلاء للذهبي ج٣ ص٢٧١، ٢٧٢؛ أسد الغابة ج٢ ص٢١؛ تاریخ دمشق ج١٣ ص٢٧٥، ٢٧٦، ٢٧٧؛ البداية والنهاية ج٨ ص٤٨۔

....

= مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے اس لیے صلح فرمائی تھی کہ اُن کے نزدیک مدمقابل شخص خلافت کا اہل تھا۔

فی الجملہ یہ کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کی صلح اور دستبرداری قطعاً حضرت معاویہ کی اہلیت ،لیاقت اور صلاحیت کے پیشِ نظر نہیں تھی بلکہ فتنہ کو فرو کرنے کے لیے تھی۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

الضرورات تبیح المحذورات انعقادِ اجماع بر خلافۃ معاویہ برائے دفع فتنہ شدہ است.

''ضرورتیں ممنوعات کو مباح بنادیتی ہیں،اور معاویہ کی خلافت پر اجماع کا انعقاد فتنے کو دفع کرنے کے پیش نظر تھا''۔(1)

کیا امام حسن رضی اللہ عنہ کو معاویہ کی پیش کش مرغوب تھی؟

یہاں ایک اور پہلو بھی مدنظر رہے کہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی اکثریت جنگ کے لیے آمادہ تھی، اور آپ کو بھی مرغوب یہی بات تھی۔ چنانچہ امام ابن اثیر جزری ایک مفصل روایت لائے ہیں،اُس میں ہے کہ امام پاک نے فرمایا:

ألا وإن معاویة دعانا إلیٰ أمر لیس فیه عز ولا نَصَفَة.

''معاویہ نے ہمیں ایک امر کی دعوت دی ہے جس میں عزت اور انصاف نہیں ہے''۔(2)

لیکن اس کے باوجود امام پاک بقائے امت کی خاطر اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے صلح پر آمادہ ہو گئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صلح کی پیش کش کو مسترد نہ کیا کرو، اگرچہ صلح کی پیش کش کرنے والے کی نیت بھی درست نہ ہو، چنانچہ اس سے قبل ہم ایک آیت کا ایک جملہ لکھ چکے ہیں، اَب ہم اُس کے ساتھ بقیہ حصہ بھی لکھ رہے ہیں، ذرا توجہ سے پڑھئے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ ، إِنَّهُ هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ،وَإِنْ =

---

(1) السیف المسلول ص٢٠٧۔

(2) أسدالغابة ج٢ ص ٢٠ ،وط: ج٢ ص ١٩۔

....

= يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ.

''اور اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں، بیشک وہی خوب سننے والا جاننے والا ہے، اور اگر وہ ارادہ کریں کہ آپ کو دھوکہ دیں تو بیشک کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ''۔(الأنفال: ٦١، ٦٢)

سو اگر چہ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کو مدمقابل شخص پسند تھا اور نہ ہی اُس سے صلح کرنا پسند تھا، تاہم فرمانِ الٰہی کو مدنظر رکھتے ہوئے جانبین کے اہل اسلام کے تحفظ کی خاطر اُنہوں نے ناگواری کے باوجود صلح کی پیش کش قبول فرمائی تھی۔

آخر میں یہاں حدیث کی روشنی میں ایک صلح کا ذکر ملاحظہ ہو، اس میں واضح طور پر مذکور ہے کہ ناگواری کے باوجود ایک صلح ہوگی۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں ہے کہ اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فتنوں کے بارے میں چند سوالات کیے تو اُن کے ایک سوال کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

هدنة على دخن ، وجماعة على أقذاء فيها أو فيهم، قلتُ: يارسول اللّٰه! الهدنة على الدخن ما هي؟ قال: لا ترجع قلوب أقوام على الذي كانت عليه.

''ناگواری کے باوجود صلح ہوگی، اور ایسا اتحاد ہوگا جس میں کدورت ہوگی۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ''الهدنة على الدخن'' کیا ہے؟ فرمایا: قوم پہلے جس حالت پر تھی اُن کے دل اُس حالت کی طرف نہیں لوٹیں گے''۔(1)

اس سے کونسی صلح مراد ہے؟ اس پر کئی اقوال ہیں، ان میں سے ایک قول یہ ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

وهدنة علىٰ دخن، الصلح الذي وقع بين معاوية والحسن بن علي رضي =

(1) سنن أبي داود: كتاب الفتن والملاحم، باب ذكر الفتن ودلائلها، ج٤ ص ٢٨٨، ٢٨٩ حديث ٤٢٤٦؛ مسند أحمد [شاكر] ج١٦ ص٥٧٨ حديث ٢٣١٧٥۔

= الله عنهما.

''ناگواری کے باوجود صلح سے مراد وہ صلح ہے جو معاویہ اور سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے مابین واقع ہوئی''۔(1)

ظاہر ہے کہ جو شخص صلح اور اقتدار کا خواہاں تھا اُسے تو یہ صلح پسند تھی، لہٰذا اب یہ کوئی معمہ نہ رہا کہ جسے یہ صلح ناگوار تھی وہ کون تھا؟ اظہر من الشمس ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کو یہ صلح ناگوار تھی، لیکن انہوں نے جانبین کے اہل اسلام کی حفاظت کی خاطر ایک ایسے ناگوار شخص سے صلح کر کے اُسے سلطنت سونپ دی جس سے ہزار ہا درجہ بہتر لوگ موجود تھے، جیسا کہ ہم اُن میں سے چند حضرات کے اسماء درج کر چکے ہیں۔

اہلیتِ معاویہ یا تحفّظِ امت؟

خیال رہے کہ ہماری اِس ساری گفتگو کا مقصد محض کسی کی اہلیت وعدم اہلیت کو ثابت کرنا نہیں، بلکہ یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جو کچھ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے مدنظر تھا اُس سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے اپنی ناقص سوچ اُن کے سر تھوپنے کی کوشش نہ کی جائے، اور یہ نہ کہا جائے کہ اگر اُن کے نزدیک معاویہ خلافت کے اہل نہ ہوتے تو وہ اُنہیں تفویض کیوں کرتے۔ امام پاک کی یہ فکر ہرگز نہیں تھی بلکہ یہ اُن لکھاریوں کی عقلی تک بندیاں اور ڈھکوسلے بازیاں ہیں جو بعض بادشاہوں اور طلقاء لوگوں کو پورے حجاز مقدس سے لائق فائق ثابت کرنے کے درپے ہیں، مگر امت اُن لکھاریوں کی نہیں بلکہ اہل بیت کی پیروی کی پابند ہے، کیونکہ قرآن کے ساتھ دوسرا ثقل اہل بیت ہی ہیں، لہٰذا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی تصریح وفکر کو مضبوطی سے تھامنا چاہیئے اور معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کیوں دست بردار ہوئے؟ اُن کے مدنظر جو اعلیٰ مقصد تھا اُسے ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں اور مزید بھی سنیے۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: لوگ کہتے ہیں کہ آپ خلافت کے خواہاں ہیں۔ فرمایا: عرب کی گردنیں میرے قبضے میں تھیں، میں جس سے جنگ کرتا وہ اُس سے جنگ کرتے اور میں جس سے صلح کرتا وہ اُس سے صلح کرتے۔ میں نے تو اقتدار کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے خون کے تحفظ =

(1) حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۵۷۹۔

....

= کی خاطر چھوڑا ہے‘‘۔(1)

جب امام پاک رضی اللہ عنہ خود فرما رہے ہیں کہ انہوں نے خونِ مسلمین کے تحفظ کے لیے محض رضائے الٰہی کی خاطر منصب کو چھوڑا اور اُس شخص کو سونپنا گوارا کیا جو صلح نہ ہونے کی صورت میں جنگ کے لیے آمادہ تھا تو پھر اِس صلح میں اُس کی اہلیت کہاں سے آگئی؟ البتہ اگر وہ مسلح لشکر کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور وہ کوئی غیر جانبدار شخص ہوتا اور پھر پورے حجاز میں سے فقط اُسی کو منتخب کیا جاتا تو تب اُس کی اہلیت کی بات درست ہوتی۔

اگر کسی کے پاس خداوندِ قدوس کی عطا کردہ عقل ہو تو وہ اُس واقعہ میں غور کرے جسے ہم اس سے قبل بھی نقل کر چکے ہیں کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس جو دو عورتیں ایک بچے کا مقدمہ لے کر آئی تھیں اور سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اُن سے فرمایا تھا کہ ہم اِس بچے کے دو ٹکڑے کر کے تم دونوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، اِس پر چھوٹی عورت (جو دراصل بچے کی ماں تھی) نے چیخ کر کہا تھا کہ نہیں نہیں! ایسا مت کیجئے، میں اپنا حصہ بھی اِس کو دیتی ہوں۔ بتلایئے! اُس خاتون کے پیشِ نظر مدمقابل عورت کی اہلیت تھی یا اُس کے اپنے لختِ جگر کی جان تھی، آخر کیوں اُس نے اپنا لختِ جگر اُس کو دینا گوارا کیا؟

اگر کوئی شخص کہے کہ اُس خاتون کے پیشِ نظر مدمقابل عورت کی اہلیت تھی تو کیا آپ ایسے شخص کو عقل مند تسلیم کریں گے؟ اگر جواب نفی میں ہو تو پھر اُن تمام مصنفین اور دیگر لوگوں کی عقل کے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہے جو سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی دستبرداری کے وقت سے لے کر اب تک امام پاک کے مدمقابل کی اہلیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں؟

امام حسن کی باریک بینی سے صَرفِ نظر کرنے میں خرابیاں

اس لیے اپنی عقلی تک بندیاں چھوڑ کر سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی باریک بینی کی بات کیجئے، کیونکہ اسی میں قرآن وسنت کی پیروی اور ایمان کی سلامتی ہے، اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر کئی خرابیاں لازم آتی ہیں، جن میں =

(1) المستدرك: كتاب معرفة الصحابة، ومن فضائل الحسن بن علي بن أبي طالب رضي الله عنهما ج ٣ ص١٨٦ حديث ٤٧٩٥؛ تاريخ الخلفاء للسيوطي ص٣١٨۔

....

= سے بعض یہ ہیں:

ا۔ اوّلاً یہ کہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے اُسوہ سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ جب حالات اس قدر سنگین ہو جائیں کہ جانبین سے ہزاروں اہل اسلام کی جانوں کے جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو پھر محض اہل اسلام کی خاطر مخصوص مدت تک کے لیے ایسے شخص سے بھی سمجھوتہ کرنا جائز ہے جو پسندیدہ نہ ہو۔ لہٰذا اگر اہل اسلام کو قیامت تک کبھی بھی ایسی صورتِ حال پیش آجائے اور وہ اُسوۂ حسن مجتبیٰ کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی ناخوشگوار شخص کے ساتھ مقرر المیعاد معاملہ کریں گے تو اُن کا شمار حدیث الثقلین پر کاربند لوگوں میں ہوگا، اور اسی میں دارین کی فلاح ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضمانت دی ہے کہ جب تک اہل اسلام قرآن اور اہلِ بیت کا دامن تھامے رکھیں گے تو گمراہ نہیں ہوں گے۔ لہٰذا صلح کے مذکورہ عمل میں اگر امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی باریک بینی مدنظر نہ رکھی جائے تو پھر اُن کا معاذ اللہ یا تو عقل سے عاری ہونا یا پھر بزدل ہونا لازم آتا ہے اور یہ دونوں باتیں قابلِ اُسوہ نہیں بلکہ قابل مذمت ہیں۔

۲۔ ثانیاً یہ کہ جو لوگ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی مذکور الصدر حقیقی اور واقعاتی باریک بینی سے نظریں چرا لیتے ہیں اور اُلٹا اُن کی صلح سے مدمقابل کی اہلیت ثابت کرنے لگ جاتے ہیں تو اِن کی ایسی غیر مشکور سعی کی آلودگی میں مقامِ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ مستور ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے محبین قولاً نہ سہی مگر عملاً سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے ذکر وشان کی محافل، کانفرنسز اور تقریر و تحریر سے محض اسی وجہ سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ **فَافْهَمْ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْجَاهِلِيْنَ.**

۳۔ ثالثاً یہ خرابی لازم آتی ہے کہ گویا امام حسن رضی اللہ عنہ نے ملوکیت کو خلافت پر ترجیح دی تھی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے تحفظ اہل اسلام کی خاطر فقط اس بات کو مجبوراً گوارا کیا تھا۔ چنانچہ جب انہیں کسی شخص نے کہا تھا: ''**یا مذل المؤمنین**'' (اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے) تو اُنہوں نے جواب دیا تھا:

ولکن کرهتُ أن أقتلکم علی الملک.

''لیکن میں نے بادشاہت پر جنگ کرنے کو پسند نہیں کیا''۔(1) =

(1) سیر أعلام النبلاء للذهبي ج٣ ص ٢٧٢۔

....

= یہی وہ بات ہے جو امام پاک نے تعریضاً اپنے خطبہ میں بھی ارشاد فرمائی تھی کہ دنیا کو قرار نہیں اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ مملکت تمہارے لیے آزمائش ثابت ہوگی یا سامانِ آسائش۔

جب دو مصیبتیں سامنے ہوں تو؟

مصیبت چھوٹی ہو یا بڑی مصیبت ہی ہوتی ہے اور مصیبت بہر حال پسندیدہ نہیں ہوتی، لیکن قاعدہ یہ ہے کہ فرد یا قوم کے سامنے جب ایسی صورت آجائے کہ اُن کا بیک وقت دونوں مصیبتوں سے بچنا مشکل ہو تو عقل و دانش کو کام میں لاتے ہوئے بڑی مصیبت سے جان چھڑائی جاتی ہے اور چھوٹی مصیبت کو بادلِ ناخواستہ برداشت کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد بن ابراہیم ابن الوزیر یمانی لکھتے ہیں:

ولم يزل العقلاء يدفعون المضرة العظمىٰ بما دونها.

''ہمیشہ سے اہلِ دانش بڑی مصیبت کو اُس سے چھوٹی سے ٹالتے آئے ہیں''۔(1)

امام ابن عبد السلام نے اس پر مستقل ایک فصل قائم فرمائی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

فصل في تنفيذ تصرف البغاة وأئمة الجور لما وافق الحق لضرورة العامة.

''عام لوگوں کی ضرورت کے لیے حالات کی مناسبت سے باغی اور جائر حکام کے تقرر کی فصل''۔(2)

ظاہر ہے کہ جائر اور باغی پسندیدہ نہیں ہوتا، لیکن رعایہ کی مصلحت کی خاطر اُنہیں چھوٹی مصیبت کے طور پر برداشت کرنا پڑتا ہے، اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے جس شخص کو برداشت کیا تھا مذاہبِ اربعہ کے جمہور علماء نے اُس کے جائر، ظالم اور باغی ہونے کی تصریح کی ہے۔ باحوالہ تفصیل جاننے کے لیے راقم الحروف کی کتاب ''شرح **خصائص علي** رضی اللہ عنہ'' **الطبعة الرابعة** کا مطالعہ فرمائیں۔ فی الجملہ یہ کہ جس شخص کو سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ نے مجبوراً مملکت تفویض فرمائی تھی وہ اُن کے نزدیک نہ تو اہل تھا اور نہ ہی پسندیدہ، لیکن امام پاک نے اُسے جانبین کے اہلِ اسلام کے تحفظ کی خاطر چھوٹی مصیبت کے طور پر برداشت کیا تھا۔ =

---

(1) العواصم والقواصم لابن الوزير ج٨ ص١٧٦۔

(2) قواعد الأحكام في إصلاح الأنام ج١ ص١١١۔

....

عدم اہلیت پر ایک اشکال اور اُس کا حل

بعض ذہنوں میں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ کیا اہل اور نا اہل کی رٹ لگا رکھی ہے، جبکہ احادیث سے تو اُن کی اہلیت ثابت ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

يا معاوية إن ملكت فأحسن.

''اے معاویہ! اگر تو بادشاہ بن جائے تو اچھائی کرنا''۔

دوسری حدیث کے الفاظ ہیں:

يامعاوية! إنْ وُلِّيتَ أمرًا فاتق الله واعدِل.

''اے معاویہ! اگر تجھے اقتدار سونپا جائے تو اللہ سے ڈرنا اور عدل کرنا''۔(1)

یہ احادیث روایۃً ضعیف ہیں، اگر انہیں معناً درست تسلیم کیا جائے تو اِن میں اُن کے لیے نہ تو کوئی خوشخبری ہے اور نہ ہی اُن کی اہلیت کا ذکر ہے، بلکہ یہ محض پیش گوئی ہے کہ وہ بادشاہت تک پہنچ سکیں گے، البتہ اگر اِس کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے ازخود اُن کے حق میں عدل وانصاف کی دعا کی ہوتی، یا اُنہوں نے اِس بھاری ذمہ داری سے معذوری ظاہر کر کے دعا کی درخواست کی ہوتی تو پھر یہ احادیث اُن کی فضیلت واہلیت پر دلالت کرتیں، جب یہ دونوں صورتیں مفقود ہیں تو اِن احادیث کو اُن کے خلاف وارننگ کے علاوہ کوئی اور مفہوم کیسے دیا جاسکتا ہے؟ اب ہم اس مسئلہ کی مزید توضیح حسبِ ذیل عنوان کے تحت کر رہے ہیں۔

تقدیر کے باوجود تدبیر کیوں؟

اس بحث سے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ سوال بھی حل ہو جائے گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اتنی بڑی لڑائیاں کیوں ہوئیں؟

قانونِ قدرت ہے کہ ایک طرف اچھے اور برے تمام معاملات طے شدہ ہیں اور دوسری طرف اہل ایمان کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اچھائی کو قائم رکھیں اور برائی کا نہ صرف یہ کہ سدّ باب کریں بلکہ حتی المقدور اُسے بھلائی =

---

(1) دلائل النبوة للبيهقي ج٦ ص٤٤٦، البداية والنهاية ج٩ ص٢١١ وج١١ ص١٤٣، ١٤٤۔

....

= میں تبدیل کریں۔اس سلسلے میں درج ذیل جامع آیت میں غور فرمائیے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا.

''اللہ تمھیں حکم فرماتا ہے کہ (اُن کے) سپرد کرو امانتوں کو جو اُن کے اہل ہوں''۔[النساء:٥٨]

حدیث شریف میں ہے:

الإمارة أمانة ،وهي يوم القيامة خزي وندامة، إلامن أمر بحق وأدى بالحق عليه فيها.

''امارت ایک امانت ہے اور یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا باعث ہوگی، ماسوا اُس شخص کے جس نے حق کا حکم کیا اور حق پر قائم رہا''۔(1)

ظاہر ہے کہ اگر یہ امانت کسی کم اہل یا نااہل کے سپرد کی جائے گی تو حسبِ حکم خیانت ہوگی۔اس سلسلے میں اس قدر احادیث ہیں جن کا احاطہ کرنا دشوار ہے،بطورِ نمونہ ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں۔سیدنا ابن عباس ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من استعمل رجلا من عصابة ، وفي تلك العصابة من هو أرضىٰ للّٰه منه فقد خان اللّٰه وخان رسولَه وخان المؤمنين.

جس شخص نے کسی آدمی کو کسی جماعت کا امیر بنایا حالانکہ اُس جماعت میں اُس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بندہ موجود تھا تو اُس نے اللہ تعالیٰ سے خیانت کی ،اُس کے رسول ﷺ سے خیانت کی اور مومنین سے خیانت کی''۔(2)

''إنما العصمة للّٰه ولرسوله''،بعض خلفاء راشدین اپنے دورِ خلافت میں یزید بن ابوسفیان کو گورنر بنا بیٹھے، پھر اُس کی وفات کے بعد معاویہ بن ابوسفیان کو شام کی گورنری سونپ دی گئی اور یہ دونوں طلقاء =

(1) المستدرك ج٤ ص٩١،وط: ج٥ ص١٢٥ حديث٧١٠٢۔

(2) المستدرك ج٤ ص٩١،٩٢،وط: ج٥ ص١٢٦ حديث٨١٠٥؛شرح صحيح مسلم للسعيدي ج ٣ ص٦٠٢،٦٠٣۔

....

= میں سے تھے، جبکہ اُس وقت عنداللہ، عندالرسول اور عندالناس اِن دونوں سے زیادہ پسندیدہ حضرات بکثرت موجود تھے۔ مزید برآں یہ کہ جس خلیفۂ راشد نے حضرت معاویہ بن ابوسفیان کو گورنر بنایا تھا خود اُن کا اپنا مذہب یہ تھا کہ طلقاء اور طلقاء کی اولاد کسی منصب وامارت کے تو کجا محض مجلسِ شوری میں شمولیت کے اہل بھی نہیں، لیکن چونکہ تقدیر تدبیر پر حاوی ہوجاتی ہے، اِس لیے اُس وقت تو وہ اُنہیں گورنر بنا بیٹھے مگر اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے ہی اُس فیصلہ پر نادم ہوئے، جیسا کہ ہم اِسی حدیث کے تحت لکھ چکے ہیں، اور اصول ہے "الندم توبة" (ندامت توبہ ہے) اور حدیث میں ہے: "التائب من الذنب کمن لاذنب له" (گناہ سے تائب ایسا ہے جیسے بے گناہ) لہٰذا اس ندامت کی وجہ سے وہ عنداللہ بری الذمہ ہوگئے، اور اُن سے ایسی ندامت کا اظہار ضروری بھی تھا، اس لیے کہ زبانِ نبوی سے اُن کا جنتی ہونا منصوص تھا، لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ انفرادی نہیں بلکہ قومی نوعیت کا کوئی غلط فیصلہ ہوجائے، خواہ فیصلہ کرنے والے کی نیت کتنا ہی اچھی ہو، اُس کا مثبت نتیجہ برآمد ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

سابق خلفاء کی طرز پر چلنا کیوں نا قبول؟

یہاں پہنچ کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اُس انکار کی حکمت واضح ہوجاتی ہے جو اُنہوں نے سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ایام میں کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلسِ شوریٰ نے سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کو اختیار دیا کہ وہ سیدنا علی اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما میں سے جس کو چاہیں خلیفہ بنا دیں تو اُنہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف پہل کرتے ہوئے اُن سے عرض کیا:

هل أنت مبايعي علىٰ كتاب الله وسنة نبيه ﷺ وفعل أبي بكر و عمر؟ قال: اللّٰهم لا.

"کیا آپ میرے ساتھ عہد کرتے ہیں کہ آپ کتابِ الٰہی، سنت نبوی اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے طریقے پر عمل کریں گے؟ انہوں نے فرمایا: خدا کی قسم نہیں"۔ (1) =

---

(1) البداية والنهاية ج٧ص ٢٨٢، وط: ج١٠ ص٢١٢، ٢١٣؛ أشهر مشاهير الإسلام ص٦٥٢۔

....

= سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا علی ﷺ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے کن امور کے بارے میں تحفظات رکھتے ہوں گے؟ اس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، تاہم ایک امر بالکل واضح ہے، اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے خلافت سنبھالتے ہی طلقاء کو عہدوں سے ہٹ جانے کا حکم صادر فرمایا تھا، مگر چونکہ بعض طلقاء طویل عرصہ سے ایک ہی صوبہ میں گورنری کر رہے تھے اور وہاں اُن کی حکومت مضبوط ہو چکی تھی، اس لیے اُنہوں نے خلیفۂ راشد کی حکم عدولی کی اور باغی قرار پائے، اور دوسری طرف اُنہیں سیدنا عثمان غنی ﷺ کے قصاص کا بہانہ مل گیا تھا، اس لیے اُن کی ملوکیت کی راہ ہموار ہوتی چلی گئی۔

یہاں پہنچ کر ذرا غور وفکر کی زحمت گوارا کیجئے کہ کس طرح تقدیر اور تدبیر دونوں ایک ساتھ چل رہی تھیں کہ ایک طرف سیدنا علی ﷺ امانتِ امارت کو طلقاء سے آزاد کرانا چاہتے تھے کہ یہ تقاضائے کتاب وسنت تھا اور دوسری طرف ملوکیت کو پر پُرزے لگ رہے تھے اور مدّتِ خلافت ختم ہونے والی تھی۔

خدا کی قدرت دیکھئے کہ ایک طرف سیدنا علی ﷺ کی شان میں وارد شدہ بہت سی احادیث دلائلِ نبوت بن کر حق ثابت ہو رہی تھیں، مثلاً:

علی قرآن کے ساتھ اور قرآن علی کے ساتھ۔

علی حق کے ساتھ اور حق علی کے ساتھ۔

علی تاویلِ قرآن پر جنگ کریں گے۔

اور دوسری طرف ملوکیت کی پیش گوئی پر مبنی احادیث پوری ہو رہی تھیں، اور چونکہ ملوکیت مکر وفریب اور جبر وتسلط کے بغیر نہیں ہوتی، اِس لیے اُن ہی حالات میں بعض لوگوں کی مذمت میں وارد حدیث کہ وہ باغی ہوں گے، بھی حق ثابت ہو رہی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف تقدیری فیصلہ تھا کہ ملوکیت ہوگی اور دوسری طرف کتاب وسنت کا تقاضا تھا کہ امانتیں اُن کے سپرد کی جائیں جو اہل ہوں، اور ظاہر ہے کہ اہل اسلام عمل کے پابند ہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا شیوۂ مومن نہیں، چنانچہ جب اس قرآنی حکم کو مدنظر رکھتے ہوئے سیدنا علی ﷺ نے ایک مجتمع مگر نااہل قوت کو ہٹانا چاہا تو تصادم کی صورت پیدا ہوگئی، جس سے ایک طرف ایک گروہ کا باغی ہونا عین الیقین کی حد تک ظاہر =

....

= محقق ہوا اور نبوی پیش گوئی پوری ہوئی، تو دوسری طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شان میں وارد شدہ کئی نبوی پیش گوئیاں متحقق اور واقع ہوئیں، اور اُنہیں اس پر فرض کی ادائیگی کا اجر وثواب عطا ہوا۔

جب ملوکیت مقدر تھی تو پھر روکنا کیسا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بہت سی احادیث اس امر دلالت کر رہی تھیں کہ ملوکیت آ کر رہے گی تو پھر اُس کی رکاوٹ میں اس قدر کیوں کوشش کی گئی، کیا یہ پانی میں مدھانی چلانے والی بات نہیں؟

جواباً عرض ہے کہ ہرگز یہ پانی میں مدھانی چلانے کے مترادف نہیں ہے، بلکہ اس سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے، مثلاً:

- دینی اور دنیوی فکر واضح ہو کر سامنے آئی،
- دینی زاویۂ نگاہ سے اہل ونا اہل کا فرق نمایاں ہوا،
- تاویلِ قرآن کی عملی شکل وجود میں آئی
- اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ باغیوں کے ساتھ جنگی احکام کا عملی نمونہ سامنے آیا، چنانچہ اس بات پر اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سیرت کے علاوہ باغیوں کے خلاف جنگ اور مابعد جنگ کے احکام کا اور کوئی نمونہ نہیں ہے۔

یہ اور اِن کے علاوہ بہت سے فوائد ہیں، مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ مومن تقدیر کا پابند ہی نہیں، تقدیر نے تو جس طرف سے بھی آنا ہوتا ہے آ جاتی ہے، اور اُس کا عام بندے کو علم ہی نہیں ہوتا، اور جن خواص کو علم ہوتا ہے وہ اُس کی پروا کیے بغیر احکام الٰہی پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں اور نتیجہ اُس ذات پر چھوڑتے ہیں جو بندے اور اُس کے اعمال کی خالق ہے۔ کتاب وسنت میں غور کیا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بندہ تقدیر کا نہیں بلکہ کتاب وسنت کے احکام کا پابند ہے۔ اس حقیقت کو مفکر اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بہت عمدہ انداز میں سمجھایا ہے، وہ فرماتے ہیں ؎

پابندئ تقدیر کہ پابندئ احکام؟
یہ مسئلہ مشکل نہیں، اے مردِ خردمند=

....

=اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش، ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات وجمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند (1)

جو سابقین نے نہ کیا وہ علی نے کیوں کیا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے وقت سے شام کے گورنر چلے آرہے تھے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُن کی معزولی کا حکم دے کر معاذ اللہ کیوں پنگا لیا؟

جواباً عرض ہے کہ یہ پنگا نہیں بلکہ کتاب وسنت کا تقاضا تھا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سابق خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن نہیں آتا تھا؟ جواباً عرض ہے کہ یقیناً اُنہیں قرآن آتا تھا مگر دو وجوہ سے اُن سے یہ معزولی ممکن نہیں تھی۔

اوّلاً: اس لیے کہ یہ چیز اُن کے مقدر میں نہیں تھی، لہٰذا اُن کا اس طرف دھیان ہی نہ گیا،

ثانیاً: اس لیے کہ اُنہیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرح علم میں رسوخ نہیں تھا، اس بات کی متعدد مثالیں ہم نے اپنی کتاب ''**شرح أسنی المطالب في مناقب علي بن أبي طالب** رضی اللہ عنہ'' میں نقل کی ہیں، نیز عنقریب اس پر بعض علماء کی تصریح بھی آرہی ہے۔

علاوہ ازیں اِن دو باتوں میں سے پہلی بات کی دلیل یہ صحیح حدیث بھی ہے:

''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم بیٹھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انتظار کر رہے تھے کہ آپ ہماری طرف تشریف لائے۔ آپ کی نعل (جوتی) مبارک کا تسمہ ٹوٹ چکا تھا، اسے آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف بڑھایا، پھر فرمایا: تم میں سے ایک شخص تفسیر قرآن پر اسی طرح جہاد کرے گا جس طرح میں نے تنزیلِ قرآن پر جہاد کیا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا وہ میں ہوں؟ فرمایا: نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا وہ میں ہوں؟ فرمایا: نہیں، لیکن وہ جوتی کی مرمت کرنے والا ہے۔ (اُس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتی =

---

(1) ضربِ کلیم ص ٦٤، کلیاتِ اقبال اردو ص ٥٢٦۔

....

= کی مرمت فرما رہے تھے)''۔(1)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تاویلِ قرآن پر یہ جنگیں خلفاء ثلاثہ ﷺ کے مقدر میں نہیں تھیں، کیونکہ یہ جنگیں سیدنا عثمان ﷺ کی شہادت کے بعد منتخب خلیفۂ راشد کے ساتھ ہونا مقدر تھیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طلیق شخص کے ساتھ سیدنا علی ﷺ کی جنگ ہوئی وہ تو سابق دو خلفاء کے دور میں بھی گورنر تھا، اُنہوں نے جب اُسے نہیں ہٹایا تو سیدنا علی ﷺ نے کیوں ہٹایا؟

میں کہتا ہوں: یہی تو وہ تاویلِ قرآن ہے جس تک اُن کی عقل نہ پہنچ سکی، اور سیدنا علی ﷺ کی عقلِ رسا پہنچ گئی، اور اس لیے پہنچی کہ وہ باب العلم تھے، قرآن اُن کے ساتھ اور وہ قرآن کے ساتھ تھے، وہ جدھر رُخ کرتے حق اُسی طرف ہو جاتا۔ حدیث پاک کے الفاظ ہیں:

اللّٰهُمَّ أَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ.

''اے اللہ! حق کو اُس کے ساتھ کر دے وہ جہاں بھی ہو''۔(2)

خیال رہے کہ حدیث کا مفہوم یہ نہیں کہ جدھر حق ہو اُدھر علی کو کر دے، بلکہ یہ ہے کہ جدھر علی ہو اُدھر حق کو کر دے، لہٰذا جدھر سیدنا علی ﷺ کی عقل و فکر نے رُخ کیا حق اُدھر ہوتا گیا اور وہی تاویلِ قرآن بنتی چلی گئی۔ بعض =

(1) السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص ٤٦٥ حديث٨٤٨٨ وط: ج٥ص ١٥٤ حديث ٨٥٤١؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ص ٣٧٠ حديث ٣٢٠٧٣؛ مسند أحمد ج٣ص ٣١ حديث ١١٢٧٨ وص٣٣ حديث ١١٣٠٩ وص٨٢ حديث ١١٧٩٥؛ فضائل الصحابة ج٢ص ٧٧٧؛ صحيح ابن حبان ج١٥ص ٣٨٥ حديث ٦٩٣٧ وط: ج٩ص ٤٦ حديث ٦٨٩٨؛ مسند أبي يعلىٰ ج١ص ٤٦٣ حديث ١٠٨١؛ المستدرك ج٣ ص١٢٢ حديث ٤٦٧٩؛ دلائل النبوة للبيهقي ج٦ص ٤٣٥، ٤٣٦؛ مجمع الزوائد ج٩ص ١٣٣ حديث ١٤٧٦٣۔

(2) جامع الترمذي ص ٨٤٥، وط: ج٦ص ٨٠ حديث ٣٧١٤؛ المستدرك للحاكم ج٣ص ١٢٤ حديث ٤٦٨٦؛ تاريخ دمشق ج ٤٢ ص٤٤٨؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص ٤٥؛ الدين الخالص للقنوجي ج٣ص ٣١٦؛ المسند الجامع ج١٣ص ٤٠١ حديث ١٠٣٢٥۔

....

= علماء کرام نے اس حقیقت کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے علمی رسوخ اور اجتہاد سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد بن ابراہیم الوزیر الیمانی متوفّٰی ۸۴۰ھ لکھتے ہیں:

ألا ترى أن أبابكر وعمر وعثمان وكثيرا من الصحابة كانوا مجتهدين، ولم يكونوا في الرسوخ في العلم كأمير المؤمنين.

”کیا آپ غور نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بہت حضرات مجتہدین تھے، لیکن اُنہیں امیر المومنین کی طرح علم میں رسوخ نہیں تھا“۔(1)

علامہ موصوف ایک اور مقام میں لکھتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد علم میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی کوئی نظیر پائی ہی نہیں گئی۔ اُن کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

هذا أمير المؤمنين ـ عليه السلام ـ اختص من بين الصحابة والقرابة بالعلم الذي لم يماثل فيه، ولم يشارَكْ ولم يشابه فيه، ولم يقارب، بحيث إنه لم يُعلم ـ بعد الأنبياء عليهم السلام ـ نظير له في علمه، الذي حير العقول، وأسكت الواصفين.

”یہ امیر المومنین (سیدنا علی) علیہ السلام ہیں جو صحابہ واہل بیت کے مابین علم میں اس قدر مخصوص تھے کہ اُس میں اُن کا کوئی مدمقابل، شریک، مشابہ اور قریب بھی نہیں تھا، علم میں جو اُن کی حیثیت تھی انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اُس کی نظیر نہیں جانی گئی، اُن کے علمی مقام نے عقلوں کو حیران اور بیان کرنے والوں کو ششدر کر رکھا تھا“۔(2)

خلاصہ یہ ہے کہ اِس علمی رسوخ اور اُس تاویل قرآن کے پیش نظر جو مقدر ہو چکی تھی، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک طلقاء کی معزولی ضروری تھی۔ اُنہوں نے خداداد اور محیر العقول فہمِ قرآن کی روشنی میں جو قدم اٹھایا وہ سو فیصد برحق تھا، اس لیے اُس پر اُنہیں مکمل اجر دیا گیا، لیکن آگے ہوا وہی جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو منظور تھا۔ =

(1) العواصم والقواصم فی الذب عن سنة أبی القاسم ج٨ ص٢٦٥۔

(2) العواصم والقواصم فی الذب عن سنة أبی القاسم ج١ ص٢٤١۔

= قارئین کرام کو چاہیے کہ وہ مزید تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب ''شرح خصائص علي ﷜'' ضرور بالضرور ملاحظہ فرمائیں۔

اتباع میں مقدم کون، اہلِ بیت یا صحابہ؟

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سابق خلفاء ﷡ کا طلقاء کو مناصب سونپنے اور مناصب پر قائم رکھنے کا عمل قابلِ تقلید نہیں تھا اور سیدنا علی ﷜ نے جو طلقاء کی معزولی کا حکم فرمایا وہ قابلِ تقلید ہے۔ یہی تقاضائے کتاب وسنت ہے اور یہی وجہ ہے کہ آخری ساعتوں میں سیدنا عمر ﷜ نے اسی کی طرف رجوع فرمالیا تھا، مگر اُنہیں اتنا وقت نہ مل سکا کہ اس پر عمل درآمد بھی کرالیتے۔ بھلا یہ وقت اُنہیں ملتا ہی کیسے جبکہ دوسری طرف قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

سیدنا علی ﷜ کے بعد اُن کے لختِ جگر سیدنا امام حسن مجتبیٰ ﷜ کے مدنظر بھی یہی اصول تھا مگر اُنہوں نے دو مصیبتوں میں سے چھوٹی مصیبت کو برداشت کیا اور یوں اُن کے حق میں ''ابني هذا سيد...'' کا فرمان حق ثابت ہوا۔ پھر چونکہ یزید نہ صرف یہ کہ طلقاء کی اولاد سے تھا بلکہ اُس کا تقرر کتاب وسنت کے خلاف محض دھن، دھونس اور دھمکی پر مبنی تھا، اس لیے اُس کی حکومت کے خلاف بھی اہل بیت کرام ﷡ سے ہی ایک ہستی کھڑی ہوئی تھی۔

نوٹ

خیال رہے کہ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو یہ عاجز اپنے اِس جملے کہ یزید کی حکومت ''کتاب وسنت کے خلاف محض دھن، دھونس اور دھمکی پر مبنی تھی'' کے ایک ایک لفظ پر دلائل کا انبار لگا دیتا۔ مختصراً یہ دلائل امام ابن جوزی کی کتاب ''الرد على المتعصب العنيد'' اور اردو زبان میں علامہ سراج احمد سعیدی کی تصنیف ''القول السديد في حكم يزيد'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

فی الجملہ یہ کہ مخصوص حالات میں دوسروں کی بجائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اہل بیت کرام ﷡ کی ذواتِ مقدسہ کو متبوع اور اُسوہ بنایا، اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ نبی کریم ﷺ علی الاطلاق پوری امت کو پہلے ہی فرما چکے تھے کہ قرآن اور میرے اہل بیت کی پیروی کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل بیت کی امامت مطلق ہے، ظاہری خلافت کے ساتھ مقید نہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

....

''اہل سنت اُن کو بے قید امام جانتے ہیں، نہ کہ وہ امامت جس سے مراد خلافت ہے''۔(1)

یعنی خلافت اہل بیت کرام علیہم السلام کے پاس ہو یا نہ ہو مگر سیرت اُن ہی کی سب سے زیادہ قابلِ اتباع ہے۔کاش! شروع سے ہی امت اہل بیت کرام خصوصاً اُس ہستی کی امامت پر متفق ہو جاتی جن کے حق میں آیا کہ **''علي مع القرآن والقرآن مع علي''** تو نہ طلقاء کو مناصب پر پہنچنا نصیب ہوتا اور نہ ہی امت قیامت تک کے لیے مصائب سے دوچار ہوتی،لیکن اُمت اِس پر متفق نہ ہوئی اور نہ اُس نے ہونا تھا، چونکہ نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ لوگ ایسا نہیں کریں گے۔چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:''حضرت زید بن یثیع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا گیا:

''یارسول اللہ! ہم آپ کے بعد کس کو امیر بنائیں؟ فرمایا: اگر تم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر بناؤ گے تو انہیں امین، دنیا سے کنارہ کش اور آخرت میں رغبت کرنے والا پاؤ گے، اور اگر تم عمر رضی اللہ عنہ کو امیر بناؤ گے تو انہیں قوی، امین اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کرنے والا پاؤ گے، اور اگر تم علی رضی اللہ عنہ کو امیر بناؤ گے، اور میرا خیال ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے، تو اُنہیں ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ پاؤ گے، وہ تمہیں صراطِ مستقیم پر چلائے گا''۔ (2)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: =

---

(1) تحفه اثناعشریه ص ٣٦٠۔

(2) مسند أحمد ج١ ص ١٠٩ حديث ٨٥٩؛ فضائل الصحابة ج١ ص ٢٨٤ حديث ٢٨٤؛ السنة لعبد الله ص ٢١٨ حديث ١١٨٦، وط: ٢ ص ٥٣٦ حديث ١٢٥٧؛ مسند البزار ج٣ ص ٣٣ حديث ٧٨٣؛ المستدرك ج٣ ص ٦٩ حديث ٤٤٩١؛ معرفة علوم الحديث ص ٢٩؛ المعجم الأوسط ج٣ ص ٣٤١ حديث ٢٨٦٦؛ أسد الغابة ج٤ ص ٢١؛ مشكاة ج٢ ص ٥١٠ حديث ٦١٣٣؛ كشف الأستار ج٢ ص ٢٢٥ حديث ١٥٧١؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص ٤١٩، ٤٢٠، ٤٢١؛ البداية والنهاية ج ٥ ص ٤٧٧؛ جمع الجوامع ج١٣ ص ٤١ حديث ٥٥٧٢؛ مجمع البحرين ج٣ ص ٣٩٣ حديث ٢٤٩٠۔

....

یہ حدیث امام احمد، امام طبرانی اور امام بزار رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کی ہے اور امام بزار کے تمام راوی ثقہ (معتبر) ہیں۔(1)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا ہے: امام احمد کی سند جید ہے۔(2)

شیخ احمد شاکر نے کہا: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔(3)

فضائل الصحابہ کے محقق نے کہا: اس حدیث کی سند حسن ہے۔(4)

معاویہ بن یزید کی گواہی

چونکہ اِس بحث کا آغاز اسلام میں اولین بادشاہ کی اہلیت اور عدم اہلیت سے ہوا تھا، اس لیے آخر میں اہل علم سے گذارش ہے کہ اس مقام پر اگروہ یزید پلید کے بیٹے معاویہ بن یزید جسے معاویہ صغیر بھی کہا جاتا ہے، کے اُس خطبہ کا مطالعہ کرلیں جو اُس نے اپنے باپ یزید کے مرنے کے بعد دیا تھا تو اُنہیں معلوم ہو جائے گا کہ اُس کے نزدیک اُس کا دادا معاویہ بن ابوسفیان اور اُس کا باپ یزید بن معاویہ کتنے اہل تھے؟ اُس خطبہ کو 'البدأ والتاریخ، ج ٦ ص ١٢٧، اور ''حیاۃ الحیوان'' وغیرہ میں مکمل نقل کیا گیا ہے، مگر ''حیاۃ الحیوان'' مترجم اردو میں اُس خطبہ کے ترجمہ میں خیانت کی گئی ہے، لہٰذا اہل علم کو چاہیئے کہ وہ اصل عربی نسخے کو ضرور سامنے رکھیں۔ اُس خطبہ میں جہاں معاویہ بن یزیدؒ نے اپنے باپ یزید بن معاویہ کو نااہل قرار دینے کے بعد اُس کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:

فصار في قبره رهيناً بذنوبه.

''تو وہ اپنی قبر میں اپنے گناہوں کے ساتھ گرفتار ہے''۔

وہیں اُس نے بعینہٖ یہی الفاظ اپنے دادا معاویہ بن ابی سفیان کے بارے میں بھی استعمال کیے ہیں، اور=

---

(1) مجمع الزوائد ج ٥ ص ١٧٦ حديث ٨٩٠٩۔

(2) الإصابة ج ٤ ص ٤٦٨، وط: ج ٧ ص ٢٨٢۔

(3) مسند أحمد بتحقيق أحمد شاكر ج ١ ص ٥٣٧ حديث ٨٥٩۔

(4) تحقيق: فضائل الصحابة للإمام أحمد ج ١ ص ٢٨٤ حديث ٢٨٤۔

....

= اُس کے یہ الفاظ ردّ روافض میں مشہور مؤلف علامہ ابن حجر مکی نے بھی نقل کیے ہیں۔(1)

اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے کسی فرد کی اہلیت کی بنا پر اُس سے صلح کر کے اُسے خلافت تفویض فرمائی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے ہاتھوں سے ہی امت کی تباہی اور فساد کی بنیاد رکھی تھی، کیونکہ امام پاک کی دستبرداری کے معاً بعد ہی کاٹنے والی ملوکیت کا آغاز ہو گیا تھا۔

انصاف سے بتلایئے! اس پندرھویں صدی میں امتِ مسلمہ میں سے کوئی خداترس عالمِ حق بلا جبر واکراہ خلافت کے مقابلہ میں ملوکیت کو چاہے گا؟ اگر جواب میں نفی میں ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ اُن ہستیوں کے بارے میں لکھ دیا گیا جو ثقلین میں سے ایک ثقل اور قرآنِ ناطق کا مقام رکھتے ہیں، کہ اُنہوں نے ایک ملک (بادشاہ) اور طلیق شخص کو خلافت کا اہل سمجھ لیا تھا اور اُس کے ہاتھ پر بیعت اطاعت کر لی تھی! نعوذ باللہ۔ اہل بیت کائنات کے لیے باعثِ امن وامان ہیں، لہٰذا بھول کر بھی وہ ملوکیت پر راضی نہیں ہو سکتے، کیونکہ ملوکیت تباہی اور بربادی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ملکہ سباء کی زبانی ملوکیت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

إِنَّ الْمُلُوْكَ إِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً أَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً.

''اِس میں شک نہیں کہ بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی آبادی میں تو اُسے برباد کر دیتے ہیں اور بنا دیتے ہیں وہاں کے معزز شہریوں کو ذلیل''۔

یہ ملکہ سباء کا قول ہے، جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے آگے فرمایا ہے:

وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ.

''اور وہ ایسا ہی کرتے ہیں''۔[النمل: ٣٤]

اس پہلی ملوکیت میں کتنے شرفاء اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تذلیل ہوئی، کتنے ناحق قتل ہوئے؟ یہ حقائق حدیث وتاریخ کے ذی شعور اہل مطالعہ پر مخفی نہیں، پھر اس پہلی ملوکیت کے بعد جو شہر تباہ ہوئے حتیٰ کہ کعبہ معظّمہ اور مسجد نبوی شریف بھی محفوظ نہ رہی، وہ بھی اسی پہلی ملوکیت کا بویا ہوا بیج اور اُسی کا ثمرہ تھا۔

لوگ غور کیوں نہیں کرتے کہ سابقہ چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم بھی صاحبِ اولاد تھے، لیکن اُن میں سے کسی نے بھی =

---

(1) الصواعق المحرقة ص ٢٢٤، وط: ص ٦٠١، حياة الحيوان ج١ ص ٢٢١، ٢٢٢۔

....

= اپنے بیٹے کو ولی عہد بنایا اور نہ ہی خلیفہ نامزد کیا، ورنہ سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکر، سیدنا عبداللہ بن عمر اور سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ میں سے کون خلافت کا اہل نہیں تھا؟ اگر وہ حضرات بھی بلامشورہ ازخود اپنی صالح اور لائق اولاد کو خلیفہ نامزد کرتے تو اُن کا بھی وہ اقدام قرآن وسنت کے خلاف ہوتا، پھر خود سوچیے کہ یزید ایسے نالائق، نامراد، فاسق، فاجر اور خبیث شخص کو رشوت و دھونس وغیرہ کے ذریعہ نامزد کرنا، کیونکر ھادیت اور مھدیت کی دلیل ہوسکتی ہے؟

فی الجملہ یہ کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا بلامجبوری ایک طلیق شخص کو گورنر مقرر کرنا ایسا نادرست اقدام تھا جس پر وہ خود اخیر وقت میں نادم ہوئے تھے، اور پھر اُن کے بعد سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا اُس طلیق شخص کو اُس منصب پر مقرر رکھنا، جہاں ایک قسم کی زلّت ولغزش ہے وہیں اُس میں قضا کا بھی دخل ہے، لیکن سیدنا علی اور امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کا معاملہ اُن دونوں حضرات سے برعکس ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُسے معزول کردیا اور اُن کے اس اقدام کی حقانیت قرآن وسنت کی روشنی میں ثابت ہے۔ پھر اسی طرح سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کا اُسے خونِ مسلمین کی خاطر برداشت کرنا اور اُس پر برملا تعریض کرنا اور اُس سے جنگ کرنے کو خوارج کے خلاف جنگ کرنے سے بھی زیادہ اچھا سمجھنا، اِس بات کی دلیل ہے کہ جیسی دوررَس نگاہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کو عطا کی گئی، ایسی دوررَس نگاہ کسی دوسرے شخص کو عطا نہیں ہوئی۔ آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یونہی تو نہیں یہ ارشاد فرمایا تھا:

''میں تمہارے درمیان (دو بھاری چیزیں) چھوڑ رہا ہوں، اگر تم نے انہیں تھامے رکھا تو ''لن تضلوا بعدي'' (میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہوگے) ایک کتابِ الٰہی اور دوسری میری اولاد میرے اہل بیت''۔(1)

یا اِلٰہَ العالمین! امتِ مسلمہ کو پھر سے خلافت کی برکات سے بہرہ فرما اور ملوکیت کے شکنجے سے آزادی عطا فرما، آمین۔

---

(1) سنن الترمذي ص٨٥٩ حديث ٣٧٨٦، ٣٧٨٨؛ المعجم الكبير ج٣ ص٦٢، ٦٣ حديث ٢٦٧٩، ٢٦٨٠؛ المستدرك للحاكم ج٣ ص١٠٩ حديث ٤٦٣٤ وص٥٣٢ حديث ٥٣٢٩؛ جواهر العقدين للسمهودي ص٢٣١، ٢٣٣؛ استجلاب ارتقاء الغرف ج١ ص٣٤٢؛ السلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني ج٤ ص٣٥٥ حديث ١٧٦١۔

٥۔ اس میں دلیل ہے کہ خطبہ میں اہلِ بیت کی عظمت اوران کے مناقب بیان ہوں۔

٦۔ اس میں نبوت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے، اس لحاظ سے کہ آپ ﷺ نے مستقبل میں وقوع پذیر ایک منقبت کی خبر دی تو تیس سال بعد وہ ویسے ہی واقع ہوئی جیسے اُس کی خبر دی گئی تھی۔

٧۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کا قول "عاثت في دمائها" (ایک دوسرے کو قتل کیا) لہٰذا عنایات سے ان کے دلوں کو خوش کرنا چاہیئے۔ یہ امام حسن رضی اللہ عنہ کی سیادت اور دانائی کی دلیل ہے، کیونکہ فتنہ کو دبانے کے لیے مال خرچ کرنے سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔

٨۔ اس میں تاریخِ اسلامی کی تصویروں میں سے ایک خوبصورت تصویر ہے، اور وہ سب کا ایک آدمی پر جمع ہونا ہے۔ اس لیے اس سال کو عام الجماعة کہا گیا ہے، اس کے بعد مسلمان اشاعتِ اسلام اور ممالک کو فتح کرنے کے لیے نکلے، جو گزشتہ کئی سالوں سے آپس میں لڑ رہے تھے۔

٩۔ اس میں دلیل ہے کہ افضل کی موجودگی میں مفضول کی حکمرانی جائز ہے۔

١٠۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ "فتح الباري" میں لکھتے ہیں: (١)

"اس حدیث میں نواسے پر بیٹے کا اطلاق کیا گیا ہے، اور اس پر اجماع ہے کہ نانی نواسے پر حرام ہے اور نواسے کی بیوی نانے پر حرام ہے، اگرچہ وراثت میں اختلاف ہے"۔ (٢)

١١۔ ابوداود کی روایت میں یہ اضافہ ہے: کہ امام مہدی جو آخری زمانے میں تشریف لائیں گے امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوں گے، لیکن اس حدیث میں ضعف ہے، اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس میں ایک لطیف نکتہ ہے، جیسا کہ علماء نے بیان کیا ہے: وہ یہ کہ امام حسن رضی اللہ عنہ رضائے الٰہی کی خاطر خلافت سے دستبردار ہوئے تو اللہ تعالی نے اُس کا بدلہ اُن کی ذریت میں رکھ دیا، لہٰذا اُن کی اولاد میں ایک ایسا شخص ہوگا جو پوری زمین پر خلافت کرے گا، اور وہ زمین کو عدل وانصاف سے یونہی بھر دے گا جیسا کہ وہ ظلم وناانصافی سے بھر

---

(١) فتح الباري ج١٤ ص٥٧١۔

(٢) یعنی نانی نواسے پر اور نواسے کی بیوی نانے پر اسی طرح حرام ہے جس طرح دادی پوتے پر اور پوتے کی بیوی دادے پر حرام ہے، لیکن یہ یکسانیت مسئلۂ وراثت میں نہیں ہے۔

چکی ہوگی۔(١)

١٢۔ اس میں دلیل ہے کہ تنازعات کی صورت میں صلح میں پہل کرنا اہل بیت کرام کی سنت ہے، کیونکہ وہ اہل اصلاح ہیں اہل فساد نہیں۔

سترہویں حدیث

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عبید اللہ بن زیاد کے پاس سیدنا امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک ایک طشت میں لایا گیا، وہ سر مبارک کو لکڑی سے چھیڑنے لگا، اور اس نے آپ کے حسن کے متعلق کوئی بات کہی، سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ تھے اور اُن کے بالوں میں سیاہی مائل خضاب لگا ہوا تھا۔

امام بخاری نے اسی طرح روایت کیا ہے۔(٢)

مسند أبو یعلیٰ وغیرہ کی روایت ہمیں اس سند سے پہنچی ہے: از حماد بن سلمہ، از علی بن زید بن جدعان، از حضرت انس، وہ بیان کرتے ہیں کہ ابن زیاد اپنی چھڑی سے اُن کے سامنے کے دندان مبارک کو کریدنے لگا اور کہنے لگا: خوبصورت دانتوں والے تھے، میں نے کہا: کیوں نہیں، بخدا! تم برا سلوک کر رہے ہو، پھر فرمایا: ”جس جگہ تم چھڑی لگا رہے ہو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ جگہ چومتے ہوئے دیکھا ہے“۔(٣)

امام طبرانی کے ہاں زید بن ارقم سے اس حدیث کا شاہد موجود ہے۔(٤)

---

(١) سنن أبي داود ج٤ ص١٤٣ حديث ٤٢٩٠؛ مختصر أبوداود ج٣ ص١١٨ حديث ٤١٢١؛ عقد الدرر في أخبار المنتظر ص٢٨ حديث ٣١۔

(٢) بخاري: كتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب الحسن والحسين رضي الله عنهما حديث ٣٧٤٨۔

(٣) مسند أبي يعلى ج٥ ص٢٢٧ حديث ٢٨٤١ وط: ج٧ ص٦١ حديث ٣٩٨٢؛ جامع الترمذي ص٨٥٧ حديث ٣٧٧٨؛ صحيح ابن حبان ج١٥ ص٤٢٩ حديث ٦٩٧٢۔

(٤) المعجم الكبير ج٣ ص٣١٩ حديث ٤٩٦٤؛ مجمع الزوائد ج٩ ص٢٢٨ حديث ١٥١٥٠۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے قول "و کان مخضوباً" سے امام حسین علیہ السلام مراد ہیں، اور "مخضوبا" کا معنیٰ ہے رنگا ہوا، "بالوسمة" یہ ایک بوٹی ہے جس سے کالا رنگ کیا جاتا ہے۔

۱۷ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں امام حسین علیہ السلام کی فضیلت ہے، جبکہ وہ سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ ہوں، لیکن احادیث مبارکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہت میں امام حسین علیہ السلام کی بنسبت امام حسن علیہ السلام کے حق میں زیادہ آئی ہیں، بلکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ خود کہتے ہیں: حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ کوئی نہیں تھا۔ اس لیے علماء کی ایک جماعت نے ان احادیث میں یوں تطبیق دی ہے کہ امام حسن علیہ السلام سر سے لے کر سینہ تک مشابہ تھے اور امام حسین علیہ السلام اس سے نیچے تک۔ اس بارے میں انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول بھی ذکر کیا ہے، جسے امام ترمذی نے روایت کر کے صحیح قرار دیا ہے، لیکن اس میں نظر ہے۔ (۱)

دوسرے علماء نے اس کی یوں توجیہ کی ہے:

امام حسن رضی اللہ عنہ کی حیات میں ان سے بڑھ کر کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم شکل نہیں تھا اور پھر جب امام حسین رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو ان سے زیادہ کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم شکل نہیں تھا۔ اس توجیہ کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ "كان من أشبههم برسول الله" (وہ یعنی امام حسین سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ تھے) (۲)

اور اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی بنسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔

---

(۱) سنن الترمذي ص ۸۵۸ حديث ۳۷۷۹؛ صحيح ابن حبان ج ۱۵ ص ۴۲۹ حديث ۶۹۷۲؛ فضائل الصحابة ج ۲ ص ۹۸۴ حديث ۱۳۹۴۔

(۲) سنن الترمذي ص ۸۵۷ حديث ۳۷۷۸؛ فضائل الصحابة ج ۲ ص ۹۷۱ حديث ۱۳۶۶؛ صحيح ابن حبان ج ۱۵ ص ۴۳۰، ۴۳۱ حديث ۶۹۷۴۔

٢۔ اس میں امام حسین علیہ السلام کی عظیم منقبت ہے کہ وہ ظلماً شہید کیے گئے، کسی مسلمان کے خون سے آلودہ نہیں ہوئے بلکہ آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں میں سے اُس کی مانند تھے جو بہتر تھا۔(١)

٣۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چومنے کی وجہ سے بھی ان کی منقبت ہے۔

٤۔ اس حدیث میں بیان ہے کہ سلف صالحین اہلِ بیت کی کتنی تعظیم کرتے تھے۔

٥۔ اس میں بیان ہے کہ فاجر وفاسق لوگوں کے نزدیک اہلِ بیت کا کیسا مقام تھا، خصوصاً مجوسی الاصل لوگوں کے ہاں۔

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ جو اہلِ بیت کو تکلیف دے گا اُسے اس جیسی بلکہ اس سے بڑھ کر اذیت دی جائے گی، سو عبید اللہ ابن زیاد کو ابراہیم بن اشتر نے قتل کیا، اور اُس کے ساتھ اُس کے مددگاروں کو بھی، جیسا

---

(١) اللہ سبحانہ وتعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ اُنہوں نے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں حق بات کہی کہ وہ "قُتِلَ مَظْلُوْمًا" (ظلماً شہید کیے گئے)۔اس سے معلوم ہوا کہ شہید کرنے والے ظالم اور موذیانِ خدا اور رسول تھے، اور ایسوں پر بتصریحِ قرآن دنیا وآخرت میں لعنت ہوتی رہتی ہے، اور جو بدبخت لوگ اُن کے اقدام کی تصویب یا تاویل کرتے ہیں وہ بھی اس لعنت میں شریک ہیں، بلکہ اس سلسلے میں زیادہ جامع کلام وہ ہے جو شارحِ عقائد علامہ سعد الدین تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ہے، وہ یزید پر لعنت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

فنحن لا نتوقف في شأنه بل في إيمانه،لعنة الله عليه وعلىٰ أنصاره وأعوانه.

''پس ہم اُس کی حالت بلکہ اُس کے ایمان کے بارے میں توقف نہیں کرتے، اُس پر اور اُس کے سہولت کاروں اور مددگاروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو''۔ (1)

آگے اسی حدیث سے ماخوذ آٹھویں مسئلہ میں بھی مؤلف نے ایسی ہی بات کہی ہے۔ یہ مؤلف کی حق وانصاف پسندی کی دلیل ہے، ورنہ اِس مقام پر بڑے بڑے لوگوں کا قلم وقدم ڈگمگا گیا اور اُن بدبختوں نے امام عالی مقام کو باغی اور خارجی تک لکھ دیا، اور کھلم کھلا یا دبے الفاظ میں یزید پلید کی حمایت کر گئے۔ ہم ایسے تمام خوش نما علماء کو مسترد کرتے ہیں۔

---

(1) شرح العقائد ص ١٦٤، وط: ص ٣٣٢، وط: ص ٥٥٤۔

کہ تاریخ میں یہ تصریح آئی ہے، اور اُس نے ان سب کے سروں کو اٹھا کر مختار ثقفی کے سامنے پھینک دیا، پھر ان کے جسموں کو مکہ لے جا کر جلایا گیا۔

امام ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب ابن زیاد کا سر کاٹ دیا گیا تو ایک سانپ اس کے نتھنے میں داخل ہو گیا۔(۱) (۲)

۷۔ ہمیں جو امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر مبارک کے بارے میں صحیح احادیث پہنچی ہیں ان سے معلوم نہیں ہو سکا کہ اُن کا سر مبارک کس جگہ ہے، اور جو روایات سر مبارک کی تعیین کے بارے میں بیان کی گئی ہیں ان کی کوئی اصل نہیں بلکہ وہ جھوٹی اور بے سند ہیں۔

بہر حال امت پر اُن کے جسدِ اطہر یا سر مبارک (کے مقام) کی معرفت لازم نہیں بلکہ شرعی طور پر

---

(۱) جامع الترمذي ص ۸۵۸ حدیث ۳۷۸۰۔

(۲) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کردہ مکمل حدیث یوں ہے:

''عمارہ بن عمیر روایت کرتے ہیں کہ عبید اللہ بن زیاد اور اس کے ساتھیوں کے سر لائے گئے، انہیں مسجد میں کشادہ جگہ پر ترتیب کے ساتھ رکھ دیا گیا، میں ان کے قریب گیا تو لوگ کہہ رہے تھے: وہ آیا، وہ آیا، دیکھا گیا تو ایک اژدہا تھا جو تمام سروں کے بیچ میں سے سرکتا ہوا آیا اور عبید اللہ بن زیاد کے نتھنوں میں داخل ہوا، کچھ دیر کے بعد نکل کر چلا گیا، یہاں تک کہ غائب ہو گیا۔ پھر لوگ کہنے لگے وہ آیا، وہ آیا، اس طرح اُس سانپ نے یہ عمل دو یا تین مرتبہ کیا''۔

دنیا میں مکافاتِ عمل تو دیکھئے کہ ابن زیاد نے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی آنکھوں اور ناک مبارک میں چھڑی لگائی تو اللہ جبار و قہار نے دنیا میں ہی دکھا دیا کہ عین اُسی مقام پر ابن زیاد کا سر لایا گیا جہاں کچھ عرصہ قبل امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر اقدس رکھا گیا تھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سانپ کی شکل میں اپنی چھڑی بھیجی جو دو تین مرتبہ ابن زیاد کے نتھنوں میں داخل ہو کر غضبِ خداوندی کا نظارہ کرا گئی۔ یاد رکھئے! سانپ اور چھڑی میں کافی مناسبت ہے۔ اگر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی چھڑی کے سانپ بن جانے اور پھر دوبارہ چھڑی بن جانے میں غور فرمائیں گے تو بآسانی اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ یہ دنیا میں اُس جبار و قہار کے انتقام کا ایک نظارہ تھا، جبکہ ''وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقٰی''۔

اُن کے لیے دعاء اور رضا مانگنا چاہیئے ، رضي الله عنه۔(۱)

---

(۱) امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک کہاں ہے؟

مؤلف کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک اُن کے تن مبارک سے جدا کیا گیا تو پھر اُس سر کا مدفن معلوم نہیں۔ اس لیے مصنف کے نزدیک سرِ اقدس کے مدفن کے تعیّن میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں البتہ اُن کے لیے رضا اور دعا مانگنا چاہیئے۔ اِس پر ہم عرض کرتے ہیں کہ اس کے مدفن کے تعیّن کی ضرورت ہے، اس لیے کہ یہ عام آدمی کا سر نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب، سید الشہداء اور نوجوانانِ اہلِ جنت کے سردار کا سر ہے۔ تابوتِ سکینہ جس میں منّ وسلوی کے بچے کھچے ٹکڑے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور اُن کی نعلین وغیرہ تھے، قرآن کریم میں باقاعدہ اُن کا ذکر آیا ہے۔ (ابن کثیر) امام عالی مقام کا مبارک سر تو اُن اشیاء سے بدرجہا افضل ہے، لہٰذا اُس کے تعین کے بارے میں معلوم ہونا یقیناً اہل محبت کے حق میں مفید ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر ہر چیز کی عظمت، اہمیت اور برکت ہے حتیٰ کہ ناخن، موئے مبارک اور نعلین شریفین کی بھی۔ بخاری میں ہے کہ امام ابن سیرین رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر اُنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک موئے مبارک مل جائے تو وہ اُنہیں دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہوگا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس سے کونین کے تمام امور سنور جاتے ہیں، لہٰذا اُس سر مبارک کی عظمت کا اندازہ خود کیجئے جو جسم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصہ تھا اور تن سے جدا ہونے کے بعد بھی ناطق و مفید تھا۔

سرِ اقدس کی کرامات و برکت

(1)۔ امام ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ طویل سند کے ساتھ لکھتے ہیں کہ امام اعمش منہال بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

أنا واللّٰه رأيتُ رأسَ الحسين حين حُمل وأنا بدمشق وبين يدي الرأس رجل يقرأ سورةَ الكهف حتىٰ بلغ قوله تعالىٰ ﴿اَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْامِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا﴾ فأنطق اللّٰه الرأس بلسان ذرب، فقال: أعجب من أصحاب الكهف قتلي وحملي. =

....

= ''اللہ کی قسم! میں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے سرِ مبارک کو دیکھا جب اُسے نیزے پر اٹھایا گیا اور میں اُس وقت دمشق میں تھا، سرِ مبارک کے سامنے ایک شخص سورۂ کہف پڑھ رہا تھا، جب وہ اس آیت پر پہنچا: ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا﴾ (کیا تو نے جانا کہ اصحاب کہف اور رقیم ہماری نشانیوں میں سے ایک عجوبہ تھے) تو اللہ تعالیٰ نے سرِ مبارک کو گویائی دی، اس نے واضح الفاظ میں فرمایا: اصحاب کہف کے واقعہ سے میرا قتل اور میرے سر کو پھرایا جانا عجیب تر ہے''۔(1)

نوٹ

زبانِ زدِ عام ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے سرِ اقدس نے نیزے کی نوک پر قرآن کریم کی تلاوت فرمائی تھی، غالباً اُس سے یہی واقعہ مراد ہے، کیونکہ اِس میں نہ صرف یہ کہ بغور قرآن کریم سننا مذکور ہے بلکہ اُس کو سمجھ کر اُس میں مذکور اصحابِ کہف کے واقعے پر اپنے واقعہ کو ترجیح دینا بھی مذکور ہے۔ راقم الحروف کو اس کے علاوہ خود تلاوت کرنے کا کوئی واقعہ نہیں ملا، اگر کسی شخص کو مل جائے تو راقم کو ضرور اطلاع بخشیں۔

2۔ امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کربلا کے واقعات کے تسلسل میں لکھتے ہیں:

''پھر عبید اللہ بن زیاد نے سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے سرِ اقدس کو، اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچوں اور خواتین کو قیدی بنا کر اُنہیں کھلے چہروں اور برہنہ سروں کے ساتھ کجاووں پر بٹھا کر شام کی طرف بھیجا۔ جب وہ (یزیدی لوگ) کسی مقام پر پڑاؤ کرتے تو سرِ اقدس کو صندوق سے نکال کر نیزے پر لٹکا لیتے اور اُس کی نگہداشت رکھتے، پھر جب چلنے لگتے تو اُسے صندوق میں بند کر دیتے، پس وہ اسی طرح کرتے ہوئے ایک ایسے مقام میں پہنچے جہاں ایک راہب قیام پذیر تھا، اُنہوں نے حسبِ دستور سرِ اقدس نکال کر نیزے پر لٹکا کر کھڑا کر دیا اور نیزے کو اُس راہب =

---

(1) تاریخ دمشق ج ۶۰ ص ۳۶۹، ۳۷۰؛ شرح الصدور ص ۲۰۹؛ الکواکب الدریة للمناوي ج ۱ ص ۱۲۰؛ نور الأبصار للشبلنجي ص ۱۴۹؛ سر الشهادتین ص ۶۰۔

= کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ رات کے وقت راہب کی نگاہ اُس کے عبادت خانہ کی دیوار کی طرف اٹھی تو اُسے عبادت خانہ کی دیوار سے آسماں تک روشن نور نظر آیا۔ وہ قافلہ والوں کی طرف متوجہ ہوکر پوچھنے لگا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم شامی ہیں۔ اُس نے پوچھا: یہ سر کس شخص کا ہے؟ انہوں نے بتایا: یہ حسین بن علی کا سر ہے۔ اُس نے کہا: تم بدترین لوگ ہو، خدا کی قسم! اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی بیٹا ہوتا تو ہم اُسے اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں بٹھاتے۔ پھر کہا: اے قوم! میرے پاس دس ہزار دینار موجود ہیں جو مجھے میرے والد سے اور میرے والد کو اُن کے بابا سے ملے تھے، تو کیا تم سے ایسا ہوسکتا ہے کہ تم یہ سر مبارک ایک شب کے لیے مجھے دے دو اور میں تمہیں اِس کے بدلے میں یہ دس ہزار دینار دے دوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں، اِس پر راہب نے اُنہیں دینار پیش کر دیے تو انہوں نے اُن کا وزن کیا، پھر اُنہیں تھیلی میں ڈال کر تھیلی کو مہر لگائی اور اُسے صندوق میں بند کر دیا، اور سرِ اقدس راہب کو پیش کر دیا۔ راہب نے سرِ اقدس کو دھویا اور اُسے اپنی گود میں رکھ کر ساری رات اُس کے غم میں گریہ کرتا رہا۔

جب صبح کا اجالا نمودار ہونے لگا تو اُس نے عرض کیا: اے مبارک سر! اِس وقت میں اپنی ذات کے علاوہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوں (جو میں تجھ پر وار دوں) میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ جل جلالہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یقیناً آپ کے نانا کریم اللہ ﷺ کے رسول ہیں، پھر وہ سعادتِ اسلام حاصل کرتے ہوئے غلامِ حسین بن گیا۔ پھر اُس نے سرِ اقدس یزیدیوں کو واپس کر دیا تو وہ اُسے صندوق میں رکھ کر روانہ ہوگئے۔ جب دمشق کے قریب پہنچے تو آپس میں کہنے لگے: بہتر ہے کہ یہ دینار ہم تقسیم کرلیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یزید ہم سے چھین لے۔ یہ کہہ کر انہوں نے صندوق کھولی، اُس میں سے مہر زدہ تھیلی نکالی تو اُس میں موجود تمام دینار ٹھیکریوں میں بدل چکے تھے، اُن کی ایک طرف یہ آیت لکھی ہوئی تھی ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلاً عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (اور تم یہ مت خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ بے خبر ہے ان کرتوتوں سے جو ظالم کر رہے ہیں) اور دوسری طرف یہ آیت مرقوم تھی ﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾

۸۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا عبید اللہ ابن زیاد کو ٹوکنا، اور اسی طرح ابو برزہ اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا ٹوکنا، اور اسی طرح کے انکار کے متعلق دوسری روایات جو بعض کتبِ تاریخ میں منقول ہیں کہ یہ واقعہ یزید بن معاویہ کے سامنے شام میں پیش آیا، (تو یاد رکھیے) یہ صحابہ کرام شام میں نہیں تھے بلکہ عراق میں تھے، بایں ہمہ عبید اللہ (ابن زیاد) کے جرائم قیامت کے دن یزید کے نامۂ اعمال میں شامل ہوں گے، کیونکہ وہ امام (حکمران) تھا اور یہ سب اس کی رعیت میں تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے کی حفاظت اس پر لازم تھی، کیونکہ وہ حد کے مرتکب ہوئے، نہ ہی واجب القتل تھے اور نہ ہی خارجی تھے، تو کس گناہ کی پاداش میں ان کا خون حلال ہوا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. (۱)

= ﴿عنقریب جان لیں گے جنہوں نے ظلم وستم کیے کہ وہ کس جگہ لوٹ کر آ رہے ہیں﴾ (1)

معلوم ہوا کہ یہ کسی عام شہید کا نہیں بلکہ نواسۂ مصطفیٰ اور ایسے سید الشہداء کا سر اقدس ہے جس کی شہادت کی اطلاع اُس کی ولادت کے ساتھ ہی دے دی گئی تھی۔ لہٰذا ایسے بابرکت وباکرامت سر مبارک کے بارے میں معلوم ہونا ضروری ہے کہ اُسے کہاں کہاں لے جایا گیا اور پھر کون سا مقام اُس کا مدفن بنا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے تا کہ جہاں اس تفصیل کی روشنی میں ظالموں کا ظلم معلوم ہو وہیں محبین کو اُن کے محبوب کے تن اور سر کا مدفن معلوم ہو، تا کہ وہ اس کی قربت وزیارت کے ذریعے سعادتِ دارین حاصل کر سکیں۔

(۱) کیا سر مبارک دربارِ یزید میں لایا گیا تھا؟

یہاں مؤلف علامہ ابن تیمیہ کی پیروی کر رہے ہیں، کیونکہ یہ بات انہوں نے ہی اپنی کتاب "رأس الحسین" میں لکھی ہے۔ (2)

علامہ ابن تیمیہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ سر مبارک یزید کے دربار میں پیش کیا گیا اور اُس بدبخت نے دندان مبارک کو چھڑی لگائی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: =

---

(1) کتاب الثقات لابن حبان ج۱ ص۲۳۵، الصواعق المحرقة ص۱۹۹، وط: ص۵۴۴، ۵۴۵۔

(2) رأس الحسين لابن تيمية ص۱۹۹۔

....

والمقصود هنا أن نقل الرأس الحسين إلى الشام لا أصل له في زمن يزيد، فكيف بنقله بعد زمن يزيد؟.

''مقصد یہ ہے کہ زمانۂ یزید میں امام حسین کے سر کے بارے میں شام میں منتقل ہونے کی کوئی اصل نہیں تو پھر یزید کے زمانہ کے بعد کیونکر منتقل ہوگا؟''۔(1)

ایک اور مقام میں علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

أجمعوا علىٰ أن الرأس لم يغترب.

''علماء کا اجماع ہے کہ سر مبارک دوسرے شہروں کی طرف نہیں لے جایا گیا''۔(2)

لیکن چند سطور بعد لکھتے ہیں:

أن الذي ذكره من يعتمد عليه من العلماء والمؤرخين أن الرأس حمل إلى المدينة ودفن عند أخيه.

''قابل اعتماد علماء اور مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ سر مبارک مدینہ مقدسہ کی طرف لے جایا گیا اور اُن کے برادر سیدنا امام حسن کے قریب دفن کیا گیا''۔(3)

علامہ ابن تیمہ نے آگے صفحہ ۲۰۷ پر لکھا ہے:

إنما الثابت: هو نقله إلىٰ أمير العراق عبد (عبيد)اللّٰه بن زياد بالكوفة، والذي ذكر العلماء أنه دفن بالمدينة.

''فقط اتنا ثابت ہے کہ سر اقدس امیرِ عراق عبیداللہ بن زیاد کی طرف کوفہ منتقل کیا گیا اور علماء نے ذکر کیا ہے کہ اُسے مدینہ میں دفن کیا گیا''۔(4)=

---

(1) رأس الحسين لابن تيمية ص۲۰۷۔

(2) رأس الحسين لابن تيمية ص۱۹۷۔

(3) رأس الحسين لابن تيمية ص۱۹۷۔

(4) رأس الحسين لابن تيمية ص۲۰۷۔

= بندہ پوچھے کہ اگر سر مبارک "لم یغترب" (پھرایا نہیں گیا تھا) تو عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں کوفہ کیسے پہنچا، پھر وہاں سے مدینہ منورہ کیسے پہنچا؟ جبکہ یہ ذکر کہیں نہیں ملتا کہ ابن زیاد نے کوفہ سے براہِ راست مدینہ منورہ کی طرف سرِ اقدس بھیجا، البتہ یہ بات بالتواتر ثابت ہے کہ پہلے سرِ اقدس ابن زیاد کے ہاں لے جایا گیا پھر اُس نے اہل بیت کے قافلہ کے ساتھ دربارِ یزید کی طرف روانہ کیا۔ اس سلسلے میں چند تصریحات ملاحظہ ہوں:

امام ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "**الرد علی المتعصب العنید، المانع من ذم یزید**" میں جو تفصیل پیش فرمائی ہے، اُس کا خلاصہ ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

"ابن زیاد نے زحر بن قیس کو امام حسین رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کے سر دے کر یزید کے پاس بھیجا۔ ابوالوصنی نے کہا: جب تمام سر یزید کے پاس پہنچے تو اُس نے دربار لگایا اور شام کی اشرافیہ کو جمع کیا، جب وہ سب اُس کے اردگرد بیٹھ گئے تو اُس کے سامنے سر رکھا گیا، وہ اُس کے منہ میں اپنی چھڑی مارتا رہا اور اشعار پڑھتا رہا۔ قبیصہ بن ذؤیب خزاعی بیان کرتے ہیں: یزید ہاتھ میں چھڑی لے کر امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر پر مارتا رہا اور شعر گنگناتا رہا۔ زید بن ارقم نے کہا: میں یزید بن معاویہ کے پاس تھا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر لایا گیا، یزید اس پر چھڑی مارتا رہا۔ اسی طرح ابو برزہ اسلمی نے بھی روایت کیا ہے۔

امام حسن بصری اور امام مجاہد رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ جب سر اقدس یزید کے سامنے رکھا گیا تو اُس نے اشعار پڑھے، جن کا مفہوم یہ ہے کہ کاش بدر میں جو میرے (کافر) بزرگ مارے گئے تھے آج وہ یہ مشاہدہ کرتے۔

آگے چل کر امام ابن جوزی نے لکھا ہے:

"پھر یزید نے انہیں مدینہ بھیجا اور امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک بھی اُس نے مدینہ میں اپنے گورنر عمرو بن سعید کی طرف بھیج دیا تو اُس نے تکفین کے بعد اُسے اُن کی والدہ فاطمہ کے قریب دفن کرایا"۔(1)=

(1) الردعلی المتعصب العنید، المانع من ذم یزید ملخَّصاً ص ۵۶ تا ۶۱۔

....

= اس سے قبل ہم امام ابن حبان سے سر اقدس کی کرامات کے ضمن میں مکمل واقعہ نقل کر چکے ہیں کہ سر اقدس یزید کے دربار میں پہنچا تھا۔

امام ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

''امام حسین رضی اللہ عنہ کو بنو مذحج کے ایک آدمی نے قتل کیا، اور اُن کا سر مبارک کاٹ کر جسم سے الگ کیا، پھر اُسے ابن زیاد کے پاس لے گیا، ابن زیاد نے اُس شخص کو سر اقدس کے ساتھ یزید کے پاس بھیج دیا''۔(1)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ چند صفحات آگے لکھتے ہیں:

''یونس بن حبیب بیان کرتے ہیں کہ جب عبید اللہ بن زیاد نے امام حسین اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کیا تو اُن کے سروں کو یزید کے پاس بھیجا، اوّلاً تو یزید اُن کے قتل پر خوش ہوا لیکن یہ خوشی زیادہ دیر نہ رہی اور وہ نادم ہونے لگا۔۔۔اور کہنے لگا: ابن زیاد نے اس قتل سے مسلمانوں کے دلوں میں مجھے مبغوض بنا دیا ہے اور اُن کے دلوں میں میری عداوت کا بیج بو دیا ہے''۔(2)

امام ذہبی مزید لکھتے ہیں:

''ابو حمزہ بن یزید حضرمی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے یزید کی دایا کو دیکھا جبکہ اُس کی عمر سو برس کو پہنچ چکی تھی، اور اُس کا نام ریّا تھا۔ اُس نے بیان کیا کہ ایک شخص نے یزید کے پاس آ کر کہا تھا: خوشخبری ہو اے یزید! اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسین سے نجات دے دی، یہ کہتے ہوئے اُس نے امام حسین کا سر یزید کے سامنے رکھ دیا۔۔۔ حضرمی کہتے ہیں: میں نے پوچھا: کیا یزید نے اپنی چھڑی امام حسین کے دانتوں کو ماری تھی؟ اُس نے کہا: ہاں خدا کی قسم۔ پھر حمزہ نے کہا کہ اُسے گھر کے بعض افراد نے بتایا کہ تین دن تک امام حسین کا سر مبارک دمشق میں لٹکا رہا''۔(3) =

---

(1) سير أعلام النبلاء ج٣ ص٣٠٩؛ تهذيب التهذيب ج٢ ص٣٥٣۔

(2) سير أعلام النبلاء ج٣ ص٣١٧۔

(3) سير أعلام النبلاء ج٣ ص٣١٩۔

....

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ترجمہ (حالات) کے آخر میں لکھتے ہیں:

''میدان کربلا کے آخری شہید امام حسین رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کا سر مبارک ابن زیاد کے پاس لایا گیا، پھر اُس نے سر مبارک کو اور بچے کھچے قافلہ کو یزید کے پاس بھیج دیا''۔(1)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے توثیق سند کے ساتھ متعدد احادیث نقل فرمائی ہیں، جن میں صراحت ہے کہ سر مبارک ابن زیاد اور پھر یزید کے پاس پہنچا تھا۔(2)

اس سلسلے میں اس قدر تصریحات ہیں کہ اُن کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ علامہ ابن تیمیہ کا اس بات سے انکار کرنا اُن کا تفرد ہے۔ چنانچہ دورِ حاضر کے ایک محقق دکتور ھیثم عبدالسلام محمد لکھتے ہیں:

وأما كلام ابن تيمية من أنه لم يحمل الرأس وإن هذا كذب، فدعوى من غير دليل وهو يخالف ما عليه جمهور المؤرخين.

''علامہ ابن تیمیہ کا کہنا کہ سر مبارک کے پھرائے جانے کا قول کذب ہے، ابن تیمیہ کا یہ دعویٰ بلا دلیل اور جمہور مؤرخین کے قول کے خلاف ہے''۔(3)

خیال رہے کہ اس سلسلے میں علامہ ابن تیمیہ کی پیروی اُن کے تلامذہ نے بھی نہیں کی، جیسا کہ ہم امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔ نیز حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وَأَمَّا رَأْسُ الْحُسَيْنِ فَالْمَشْهُورُ عِنْدَ أَهْلِ التَّارِيْخِ وَأَهْلِ السِّيَرِ أَنَّهُ بَعَثَ بِهِ ابنُ زِيَاد إِلٰى يَزِيْدِ بْنِ مُعَاوِيَةَ، وَمِنَ النَّاسِ مَنْ أَنْكَرَ ذٰلِکَ، وَعِنْدِيْ أَنَّ الْاَوَّلَ أَشْهَرُ.

''اہل سیر و تاریخ کے نزدیک مشہور ہے کہ ابن زیاد نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر مبارک کو یزید کے پاس بھیجا تھا۔ کچھ لوگ اس کے منکر ہیں مگر میرے نزدیک پہلا قول زیادہ مشہور ہے''۔(4)=

---

(1) الإصابة ج۲ ص ۵۵٤۔

(2) مجمع الزوائد ج۹ ص۱۹۳، ۱۹۵ وط: ج۹ ص۳۱۲ حدیث ۱۵۱٤۵، ۱۵۱٤۸۔

(3) تحقیق: الرد علی المتعصب العنید، المانع من ذم یزید ص٦۲۔

(4) البدایة والنهایة ج۸ ص۲۸۵۔

....

= باقی رہی یہ بات کہ سر مبارک مدفون کہاں ہے؟ تو اس سلسلے میں اہل تحقیق کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں سیدتنا فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی تربت انور کے قریب مدفون ہے۔ اس کے علاوہ عسقلان، دمشق اور دوسرے مقامات میں تدفین کے جتنے اقوال ہیں علماء کرام نے اُنہیں مسترد کر دیا ہے۔

كلكم مسئول عن رعيته

مؤلف نے آٹھویں فائدے میں ایک بات یہ بھی لکھی ہے:

ومع هذا فإن جرائم عبيد الله في صحيفة يزيد يوم القيامة، لأنه الإمام، وهم رعيته.

''بایں ہمہ عبیداللہ (ابن زیاد) کے جرائم قیامت کے دن یزید کے نامۂ اعمال میں شامل ہوں گے، کیونکہ وہ حکمران تھا اور یہ سب اس کی رعیت میں تھے''۔

سو فیصد یہ شرعی حقیقت ہے، لہٰذا ہر سربراہِ مملکت کو چاہیے کہ وہ اپنی مملکت میں ایسے لوگوں کو منصب وعہدہ پر فائز کرے جو عدل وانصاف سے تجاوز نہ کریں، ورنہ اُن کا گناہ بھی اسی کے نامۂ عمل میں شامل ہوگا، اگرچہ اُن کے گناہ میں اس کی رضا شامل نہ بھی ہو۔

اس اٹل حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یزید پلید سے قبل جو امام (سربراہ مملکت) تھے، کیا اُن کے نامۂ اعمال میں زیاد ابن ابیہ، بسر بن ابی ارطاۃ اور مروان بن الحکم وغیرہ کے کرتوت شامل ہوں گے یا نہیں؟ کیونکہ بسر بن ابی ارطاۃ ہر چند کہ صحابی تھا لیکن انتہائی برا انسان تھا، اس نے سینکڑوں کی تعداد میں اہل اسلام کو قتل کیا، حتیٰ کہ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے نابالغ بچوں کو قتل کیا اور مسلم خواتین کو لونڈی بنایا۔ تفصیل کے لیے تاریخ ابن عساکر، الاستیعاب، اسد الغابہ اور الإصابۃ وغیرہ ملاحظہ ہو۔

زیاد ابن ابیہ نے کئی ناحق قتل کیے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کیا اور مروان بن الحکم کے سیاہ کارنامے ان دونوں سے کم نہیں تھے، جیسا کہ ہم ''شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ'' میں لکھ چکے ہیں، اور یہ تینوں یزید پلید سے سابق حاکم کے گورنر وغیرہ تھے۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ خود یزید کے کارنامے کس کے نامہ عمل میں شامل ہوں گے؟ =

۹۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے "منهاج السنة" میں بیان کیا ہے:
"اہلِ بیت کی خواتین اور بچوں کو قیدی بنانے، انہیں شہروں میں پھرانے اور انہیں بغیر کجاوہ کے اونٹوں پر بٹھانے کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، سب جھوٹ اور باطل ہے۔ اللہ اکبر! مسلمان ہاشمیوں کو کبھی قیدی نہیں بنا سکتے، اور نہ ہی کبھی امتِ محمد ﷺ نے بنو ہاشم کو قیدی بنانے کو حلال قرار دیا، لیکن خواہش پرست اور جاہل لوگ بہت جھوٹ بولتے ہیں..."۔(۱) (۲)

۱۰۔ اس میں بیان ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے اتباعِ سنت میں اپنے بالوں کو خضاب لگایا ہوا تھا، بالوں کو سیاہ خضاب لگانے میں صحابہ اور بعد کے لوگوں کا اختلاف معروف ہے۔

اٹھارھویں حدیث

عبداللہ بن نُجَي اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل رہے تھے اور وہ ان کے خدمت گزار تھے، جب وہ نینویٰ کے محاذات میں پہنچے، جبکہ وہ صفین کی طرف جا رہے تھے تو سیدنا علی علیہ السلام نے پکار کر فرمایا: اے ابو عبداللہ! فرات کے کنارے پر صبر کرنا، اے ابو عبداللہ! فرات کے کنارے پر صبر کرنا۔ میں نے عرض کیا: حضور کیا بات ہے؟ فرمایا: ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر

= شرعی اصول کی روشنی میں ایسے تمام سوالات کے جوابات مشکل نہیں ہیں، معمولی سوجھ بوجھ والا مسلمان بھی سمجھتا ہے کہ اگر کوئی انسان ذاتی کوششوں سے تختِ حکومت پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اُس کی تمام تر بھلائی اور برائی اُس کی ذات تک محدود رہے گی اور اگر کسی دوسرے شخص نے اُس کی حکومت کے لیے کوشش کی ہو، راہ ہموار کی ہو یا دل چسپی لی ہو تو یقیناً اُس کی بھلائی اور برائی اُس کے نامۂ عمل میں بھی لکھی جائے گی۔
یاد رکھنا چاہیے کہ جو لوگ بلا جبر و اکراہ کسی ظالم یا نااہل شخص کو حاکم بناتے یا تسلیم کرتے ہیں وہ اُس حاکم کے گناہوں میں شریک ہوتے ہیں لیکن جو جبر و اکراہ کی وجہ سے مجبور ہوتے ہیں وہ مستثنیٰ ہوتے ہیں۔

(۱) منهاج السنة ج۳ ص ۱۷۷، وط: ج٤ ص ٥٥٨۔
(۲) نہ معلوم شیخ الاسلام کے نزدیک بنو ہاشم کو قتل کرنا بڑا جرم ہے یا اُنہیں قیدی بنانا؟

ہوا تھا، جبکہ آپ کی چشمانِ کرم سے آنسو جاری تھے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا کسی نے آپ کو ناراض کیا ہے؟! آپ کی مقدس آنکھوں سے آنسو کیوں رواں ہیں؟ فرمایا: نہیں بلکہ ابھی ابھی میرے پاس سے جبریل علیہ السلام اُٹھ کر گئے ہیں، انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ حسین کو فرات کے کنارے شہید کیا جائے گا۔ پھر انہوں نے کہا: کیا میں آپ کو حسین کی شہادت گاہ کی مٹی سونگھاؤں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے کہا: ہاں تو جبریل علیہ السلام نے ہاتھ بڑھایا اور مٹی کی ایک مُٹھی بھر کر مجھے پیش کی، پس اس وجہ سے میں اپنی آنکھوں پر قابو نہیں رکھ سکا، تو اُن سے آنسو رواں ہو گئے۔

امام احمد نے کثیر شواہد کی روشنی میں اس حدیث کو حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اور بہت سے محدثین نے اس کی سند کو قوی قرار دیا ہے۔(۱)

اٹھارھویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے، اور وہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امام حسین رضی اللہ عنہ کی جائے شہادت کو (ملاحظہ) فرما کر گریا کرنا، اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُنہیں ظلماً شہید کیا جائے گا۔

---

(۱) مسند أحمد ج۱ ص۸۵، وط: ج۱ ص۲۶۵، ۲۶۴ حدیث۶٤۸، وط: [شاكر] ج۱ ص٤٤٦ حدیث ٦٤۸؛ وط: [الأرنؤوط] ج۲ ص۷۷، ۷۸ حدیث٦٤۸؛ وط: المنهاج، ج۱ ص۱۹۸ حدیث ٦٥۸؛ تاریخ دمشق ج١٤ ص١٨٧ و١٨٨؛ المحصّل لمسند أحمد بن حنبل ج١٩ ص٢٦٩ حدیث ٢٧٦٤١، وج١٨ ص٢٥٢ حدیث ٢٦١٦١؛ غاية المقصد في زوائد المسند ج٣ ص٣٨٨ حدیث ٣٧٣٠؛ حاشية السندي على مسند أحمد ج١ ص٣٤٣ حديث ٤٥٤؛ مسند أبي يعلىٰ ج ١ ص٢٩٨ حديث٣٦٣؛ المقصد العلي ج٢ ص٢٠٠ حديث ١٣٦٤؛ مسند البزار ج٣ ص١٠١ حديث ٨٨٤؛ المعجم الكبير ج٢ ص٢٣١ حديث ٢٧٤٣؛ دلائل النبوة للبيهقي ج٦ ص٤٦٨؛ كشف الأستار ج٣ ص٣٢١ حديث ٢٦٤١؛ الأحاديث المختارة ج٢ ص٣٧٥ حديث٧٥٨؛ مجمع الزوائد ج٩ ص٢١٨ حديث ١٥١١٢؛ سير أعلام النبلاء ج٣ ص٢٨٨؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٩ ص ٣١٨ حديث ٩٠٥٣، وط: ج٧ ص٢٣٧ حديث ٦٧٥٣؛ تهذيب الخصائص ص٢٩٨ حديث٣٨٨۔

۲۔ اس میں تصریح ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کربلاء میں عراق کی سرزمین پر شہید کیے جائیں گے۔

۳۔ اس میں نبوت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے، وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جیسے امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی وہ ویسے ہی وقوع پذیر ہوئی۔

٤۔ نیز اس میں نبوت کی ایک اور دلیل بھی ہے، اور وہ عراق کے فتح ہونے کا اشارہ ہے۔

٥۔ ابنِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا سانحہ تاریخِ اسلام کا انتہائی اندوہناک واقعہ ہے، لیکن اس پر جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا اُس پر اضافہ کرنا دین میں زیادتی ہے، جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ مثلاً نوحہ کرنا، منہ پیٹنا، مسلمانوں کی باہمی دشمنی، منافرت، تکفیر اور تفسیق، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے زیادہ کچھ نہیں فرمایا: ''فلم أملک عینيّ أن فاضتا'' (بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے)

٦۔ اس آزمائش اور اس طرح کی دوسری آزمائشوں میں قرآن وسنت کے مطابق عمل کیا جائے۔ صبر ونماز سے مدد لی جائے اور إِنَّــا لِــلّٰـهِ وَإِنَّــا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا جائے۔ اس سلسلے میں امام احمد اور دوسرے محدثین نے سیدہ فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہما جو اپنے بابا کے مقتل پر موجود تھیں، سے روایت کیا ہے، وہ اپنے بابا حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> ''کسی بھی مسلمان مرد یا عورت کو جو کوئی تکلیف پہنچے، پھر وہ تکلیف اُسے بعد میں یاد آئے، اگرچہ زمانہ گذر چکا ہو، اور وہ اس پر إِنَّــا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہے تو اُسے پھر بھی ایسا ثواب ملے گا جیسا کہ مصیبت کے دن ملا تھا''۔(۱)

اسی معنی میں صحیح مسلم میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔(۲)

اور اسی مفہوم میں محمد بن نصر المروزی نے نماز کی اہمیت کے متعلق از امامِ جلیل زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ بواسطہ امام حسین رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ابن عباس رضی اللہ عنہ سفر میں تھے، انہیں ان کے بیٹے کے انتقال کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے کہا: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پھر سواری سے اتر کر دو رکعت نماز

---

(۱) مسند أحمد ج۱ ص٥٣٦ حدیث۱۷۳۷، سنن ابنِ ماجه ج۲ ص٥٣٢ حدیث ۱٦۰۰۔

(۲) مسلم: کتاب الجنائز، باب مایقال عند المصیبة حدیث۹۱۸۔

ادا کر کے فرمایا: ہم نے وہ عمل کیا جس کا اللہ ﷻ نے ہمیں حکم دیا ہے اور یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾.(۱)

۷۔ ارشادِ نبوی ﷺ "هل لک أنا أشمک من تربته" کا مطلب ہے کہ کیا میں آپ کو وہ مٹی دکھاؤں اور آپ کے قریب کروں؟ اس معنیٰ کی تصریح بہت سی روایات میں آئی ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں: "هل تحبک أن أريک من تربته؟" (کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو وہ مٹی دکھاؤں؟)

یہ روایت صحیح نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس مٹی کو سونگھا، اسے طبرانی نے روایت کیا ہے، اس کی سند ضعیف اور متن منکر ہے۔ اگر اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو سیاقِ کلام اس کا ساتھ نہیں دیتا، کیونکہ روایت میں یوں ہے: رسول اللہ ﷺ نے اسے سونگھا اور فرمایا "ويحَ كربٌ وبلاء" اور یہ ذم ہے مدح نہیں۔(۲)

۸۔ ارشادِ نبوی ﷺ "هل لک أنا أشمک من تربته" میں اُس مٹی کی فضیلت کی کوئی دلیل نہیں ہے جسے "التربة الحسينة" (حسینی مٹی) کہا جاتا ہے۔ اس کی تردید میں متعدد دلائل ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

اوّلاً: حدیث پاک میں فقط مٹی دینے کا ذکر ہے جیسا کہ گزرا، سو اس کا مقصد تاکید ہے تقدیس نہیں۔

ثانیاً: حدیث نبوی میں کوئی ایک بھی ایسا حرف نہیں جو اشارہ کرتا ہو کہ آپ ﷺ نے اس (مٹی) پر نماز پڑھی، یا اس کی تعظیم کی یا اس کے ذریعے شفا طلب کی ہو۔

ثالثاً: اگر یہ مٹی مقدس ہوتی تو آپ ﷺ اس کی تقدیس کا اپنے اہلِ بیت، صحابہ اور اس کے بعد امت کو حکم فرماتے، ورنہ دین میں کمی رہ جاتی اور (دین میں کمی) آپ ﷺ سے ناممکن ہے۔

رابعاً: اہلِ بیت اطہار نے اس مٹی کی تعظیم نہیں کی، اور اس بارے میں ان سے کوئی روایت ثابت نہیں ہے۔

خامساً: تقدیس کے قائلین کو کہا جائے کہ اس مٹی کا تعیّن ضروری ہے، کیونکہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: "تربته"

---

(۱) المستدرك ج۲ ص۲۶۹، ۲۷۰، وط: ج۲ ص۲۹۶ حديث ۳۰۶۷، الجامع لشعب الإيمان ج۱۲ ص۱۷۳ حديث ۹۲۳۲، الدر المنثور ج۱ ص ۳۵۹۔

(۲) المعجم الكبير ج۲ ص۲۳۳ حديث ۲۷۴۸۔

اس سے مراد وہ مٹی ہے جس پر امام حسین شہید کیے گئے اور وہ محدود و مختصر حصہ ہے، اور تعیّن کے بغیر اس کا ملنا مشکل ہے، پس جب مقدمہ باطل ہے تو نتیجہ کا بطلان اس سے بڑھ کر ہے۔

۹۔ اگر کہا جائے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے زمانے میں صحابہ موجود تھے تو انہوں نے اُنہیں اس اقدام (کربلا جانے) سے روکا کیوں نہیں؟

جواب: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دو قسمیں تھیں:

کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ میں تھے جیسا کہ ابنِ عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم، اُنہوں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں خدشہ محسوس کیا تو انہوں نے عراق کی طرف جانے سے روکا تھا، لیکن امام حسین نے ان کی بات قبول نہ فرمائی، اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عراق میں تھے، جیسا کہ حضرت انس اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہم تو اُن کے بارے میں کوئی ایک حرف بھی ایسا نہیں ملتا کہ وہ ان کے قتل پہ راضی تھے، بلکہ اچانک یہ معاملہ ہو گیا اور سر مبارک عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں لایا گیا تو سیدنا انس اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہم اُس پر برہم ہوئے، حالانکہ عبید اللہ کا ظالم و سفاک ہونا معروف تھا، اُس کا صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کو قتل کرنا مشہور تھا اور کوئی شخص اُسے منع کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، حتیٰ کہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم بھی اُس کی شدت و خباثت کی وجہ سے اُسے منع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بنسبت اُن پر زیادہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔

(دوسرا شبہ) بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اعتراض ہو سکتا ہے: اور وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود جانتے تھے کہ امام حسین کو قتل کیا جائے گا جیسا کہ اِسی حدیث میں مذکور ہے، تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی دفاعی صورت اختیار فرمائی، یا اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اِس قتل کو امام حسین سے پھیر دے؟

جواب: امورِ تکوینیہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت (طریقہ) یہ ہے کہ وہ مخلوق کے بارے میں اُس کی تخلیق سے بھی پچاس ہزار سال قبل فیصلہ فرما چکا ہے، اور جب وہ کسی فیصلہ کو جاری کرنا چاہتا ہے تو اُسے ٹالتا نہیں۔ ابنِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا معاملہ بھی اِنہیں امور میں سے ہے، کہ وہ کس شہر میں ہو گی اور کس دور میں ہو گی، ایک گھڑی اُس سے آگے جا سکتی تھی اور نہ ہی پیچھے، لہٰذا اس پر اعتراض کرنا دراصل اللہ عزوجل پر اعتراض کرنا ہے۔

بلکہ دانش مندی یہ ہے کہ اس واقعہ میں جو حکمت الٰہی ہے اُس میں غور کیا جائے جیسا کہ اہل ایمان کا طریقہ ہے۔سو ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے تا کہ اُن کے اجر کو بڑھائے اور اُن کے مراتب کو بلند فرمائے ،اور جب موت لازمی اور یقینی ہے تو شہادت اُس کی اعلیٰ صورت ہے،جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ،وَاللّٰهُ لَايُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾

(تا کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کو ظاہر فرمائے اور کچھ کو شہداء بنائے ،اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا)۔(آل عمران ۱٤۰)

اور جب سید الاولین والآخرین ﷺ نے اپنے بیٹے کا دفاع نہیں فرمایا اور ان کے قتل ہو جانے کے پیشگی علم کے باوجود زبان مبارک پر کوئی حرف لایا اور نہ ہی اُس میں کوئی تشریعی حکم فرمایا،تو معلوم ہوا کہ وہ ایک حتمی تقدیر تھی ،لہٰذا اِس قتل کو نہ روکنے پر آپ ﷺ کے بعد والوں سے مواخذہ نہیں کیا جا سکتا ،جیسا کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے کوئی سدّ باب نہیں کیا،حالانکہ وہ تو جانتے تھے کہ اُن کا بیٹا قتل کیا جائے گا،اور ایسے ہی دوسرے لوگ قابلِ مواخذہ نہیں ہیں۔(۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنی کتاب ''المنہاج''میں لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ ظلماً شہید کیے گئے،جیسا کہ ان کی مثل دوسرے مظلوم بھی قتل کیے گئے۔امام حسین رضی اللہ عنہ کو جس نے قتل کیا،جس نے قتل میں مدد کی یا جو اُن کے قتل پر راضی ہوا اُس نے اللہ جل جلالہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔یہ ایسا قتل تھا جس کی وجہ سے اہل بیت اور دوسرے مسلمانوں کو تکلیف پہنچی اور امام حسین کو شہادت کا رتبہ نصیب ہوا،اُن کا درجہ بلند اور منزلت اعلیٰ ہوئی۔دراصل بارگاہِ الٰہی

---

(۱) کیونکہ اعتراض قائم ہو سکتا تھا کہ قاتلین امامِ حسین رضی اللہ عنہ نے جو اپنا منہ کالا کیا سو کیا،لیکن اُس وقت کے اہل اسلام اس قتل کی راہ میں رکاوٹ کیوں نہ بنے؟ سو مؤلف حفظہ اللہ تعالیٰ نے مذکور الصدر سوال وجواب میں اسی اعتراض کو دفع کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔جزاہ اللہ تعالیٰ۔

سے اُن کے لیے اور اُن کے بھائی کے لیے جس عظیم سعادت کا فیصلہ ہو چکا تھا اُس کو پانا ایسی ہی آزمائش سے ممکن تھا۔ اُن دونوں کے نامۂ عمل میں وہ کچھ نہیں تھا جو اُن کے اسلاف کو حاصل تھا، کیونکہ اُنہوں نے آغوشِ اسلام میں عزت وسکون سے تربیت پائی۔ لہٰذا اُن میں سے ایک کو مسموم (زہر سے) شہید کیا گیا اور دوسرے کو قتل سے، تاکہ یہ دونوں سعداء کے مراتب اور شہداء کے عیش کو پالیں''۔(۱)

۱۰۔ اس میں امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عظیم صبر کا بیان ہے، کیونکہ اُنہوں نے اپنی شہادت تک اپنے بیٹے حسین کے قتل کی خبر کو صبر وشکر کے ساتھ اپنے سینے میں اٹھائے رکھا۔ رضی اللہ عنہما۔

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ جو شخص اکابر علماء خصوصاً ائمہ اہلِ بیت کا دامن تھامے رکھے تو اس کے علم میں برکت دی جاتی ہے، اور وہ ان سے کتاب وحکمت کے رموز کا فیض پاتا ہے۔(۲)

انیسویں حدیث

ابویعقوب ابنُعم سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: میں ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر تھا، ایک شخص نے مچھر کے خون کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اُس سے پوچھا: تم کہاں سے تعلق رکھتے ہو؟ اُس نے جواب دیا عراق سے۔ فرمایا: اِسے دیکھو تو ذرا! مچھر کے خون کے بارے میں پوچھ رہا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ابنِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کیا، اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: ''یہ دونوں دنیا میں میرے پھول ہیں''۔

امام بخاری اس حدیث کو لانے میں منفرد ہیں۔

---

(۱) منهاج السنة ج۳ ص۱۷۲، وط: ج٤ ص۵۵۰۔

(۲) گیارھویں فائدے میں مؤلف نے حضرت نجی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ وہ ''کان صاحب مطهرته'' (سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خادم تھے) بلاشبہ اہل علم وعرفان کی محبت وخدمت سے جس طرح علم وحکمت حاصل ہوتی ہے، اس طرح دوسرے ذرائع سے ہاتھ نہیں آتی۔ سیدنا ابن مسعود، ابن عباس اور خود مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے احوال میں غور فرمایئے۔

امام ترمذی کی روایت میں ہے ''مچھر کے اُس معمولی خون کے بارے میں پوچھ رہا ہے جو کپڑے کو لگ جاتا ہے''۔(١)

انیسویں حدیث سے ماخوذ مسائل

١۔ اس میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے کہ ان کی (بیٹے ہونے کی) نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔

٢۔ اس میں دلیل ہے کہ اہلِ بیت کا اپنے بچوں کو سونگھنا مستحب ہے، اور اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعدد صریح احادیث آئی ہیں۔

٣۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''ریحانتاي'' (میرے دو پھول) میں اہلِ بیت کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ فرع (شاخ) کی عمدگی اصل (بیج اور جڑ) کی عمدگی کی دلیل ہوتی ہے، مہکتا پھول دلالت کرتا ہے کہ عمدہ زمین سے نکلا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا﴾ اور جو زمین عمدہ ہے، نکلتی ہے اس کی پیداوار اپنے رب کے حکم سے، اور جو خبیث ہے نہیں نکلتی اس سے (پیداوار) مگر قلیل گھٹیا۔ (الأعراف: ٥٨)

٤۔ اس میں دلیل ہے جیسا کہ حافظ ابنِ رجب نے ''جامع العلوم والحکم'' میں لکھا ہے:

''دقیق شبہات سے بچنے میں وہ شخص کوشش کرے جس کے تمام احوال درست ہوں اور اُس کے تمام اعمال تقوی اور ورع کے مشابہ ہوں، رہا وہ شخص جو کھلم کھلا محرمات کا بھی مرتکب ہو جاتا ہے، پھر وہ تقوی کی ایسی باریکیوں کو پوچھتا پھرے تو اُسے لائق التفات نہ سمجھا جائے بلکہ اُسے ڈانٹ دیا جائے، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ڈانٹ دیا''۔(٢)

---

(١) بخاري، كتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب الحسن والحسين رضي الله عنهما، حديث ٣٧٥٣، سنن الترمذي، أبواب المناقب، باب مناقب أبي محمد الحسن بن علي بن أبي طالب والحسين بن علي بن أبي طالب رضي الله عنهما حديث ٣٧٧٠۔

(٢) جامع العلوم والحكم ص ٢٦٥ حديث ١١۔

۵۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام کو چاہیے کہ وہ عمدہ خوشبو حاصل کیا کریں۔

٦۔ اِس میں اشارہ ہے کہ جس جان دار کا خون بہنے والا نہ ہو وہ طہارت کے حکم میں ہے، لیکن یہ وہ جاندار ہے جو نجاست کی پیداوار نہ ہو۔

۷۔ اِس میں دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک اصل بات یہ تھی کہ وہ معیّن فاسق پر لعنت نہیں کرتے تھے، اس مسئلہ کی تقویت میں بخاری، مسلم اور دوسری کتبِ حدیث میں وہ احادیث موجود ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن لوگوں پر لعنت کی ممانعت آئی ہے جن پر حد وغیرہ قائم کی گئی۔

۸۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ جب جمہور کسی شہر کی طرف خون کی نسبت کرنے پر متفق ہو جائیں تو اُس شہر کے کچھ لوگوں کے خون میں ملوث ہونے کی وجہ سے (سب کی طرف) یہ نسبت جائز ہے۔

۹۔ اِس حدیث میں دلیل ہے کہ عقل کی کمی اور اہل علم سے دوری اُن فتنوں اور مصائب کا سبب ہے جو تاریخ اسلام میں بپا ہوئیں۔

۱۰۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فتنوں کی طرف جلدی کرنا چھوٹے قبیلوں کا وطیرہ ہوتا ہے بڑے قبائل کا نہیں، اور یہ پہلو اُن کی تربیت کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ طبیعتیں مصلح کی قوت کو قبول کر لیتی ہیں۔

۱۱۔ اِس میں دلیل ہے کہ فتنوں کے خاتمے کے لیے صاف اور اُمت کے بہترین لوگ آگے آتے ہیں۔

بیسویں حدیث

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن مجھ سے میری والدہ نے پوچھا: ''تم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں کب حاضر ہوئے تھے؟ میں نے عرض کیا: تقریباً اتنا عرصہ ہو چکا ہے، وہ مجھ پر برہم ہوئیں اور برا بھلا کہا۔ میں نے عرض کیا: مجھے معاف کر دیں، میں ابھی ابھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری دیتا ہوں، میں آپ کے ساتھ نمازِ مغرب پڑھوں گا اور اُس وقت تک آپ کے ساتھ رہوں گا جب تک کہ اپنے لیے اور آپ کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرا لوں گا۔ پس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ کے ساتھ نمازِ مغرب ادا کی۔ اس کے بعد آپ نوافل پڑھتے رہے حتیٰ کہ نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد گھر کی طرف روانہ ہوئے تو میں آپ کے پیچھے چل پڑا۔ آپ نے میرے چلنے کی آواز سنی تو فرمایا: ''کون

ہے؟ میں نے عرض کیا: حذیفہ ہوں۔ فرمایا: تمہاری کیا حاجت ہے؟ میں نے اپنی درخواست عرض کی تو فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری اور تمہاری والدہ کی مغفرت فرمائے، پھر فرمایا: ''کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو ابھی ابھی ہمارے سامنے آیا تھا؟'' میں نے عرض کیا: کیوں نہیں، فرمایا: یہ فرشتہ ہے جو اس رات سے پہلے کبھی بھی زمین پر نہیں اترا، اس نے اپنے رب تعالیٰ سے اجازت مانگی کہ مجھے آ کر سلام عرض کرے اور بشارت دے کہ حسن اور حسین نوجوانانِ اہلِ جنت کے سید ہیں اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خواتینِ جنت کی سیدہ ہیں۔

یہ سند صحیح ہے، اس کو امام احمد اور دوسرے محدثین نے اس طریقہ کے علاوہ حضرت حذیفہ اور دوسرے صحابہ کرام ﷺ سے بھی روایت کیا ہے۔(۱)

بیسویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اِس حدیث میں تصریح ہے کہ سیدنا حسن اور حسین نوجوانانِ اہل جنت کے سردار ہوں گے، اور یہ اہل بیت کے عظیم فضائل میں سے ہے۔

---

(۱) مسند أحمد ج٥ ص٣٩٢ وط: ج٧ ص٧١٥ حديث ٢٣٧١٨، ٢٣٧١٩ وط: [شاكر] ج١٦ ص٥٩٢ حديث ٢٣٢٢٢؛ السنن الكبریٰ للنسائي ج٧ ص٣٦٧ حديث ٨٢٤٠ وص٣٩١ حديث ٨٣٠٧، وط: ج٥ ص٩٥ حديث ٨٣٦٥؛ فضائل الصحابة للنسائي ص٥٨ حديث ١٩٣، وص٧٦ حديث ٢٦٠؛ صحيح ابن حبان ج٩ ص٥٥ حديث ٦٩٢١ وط: ج١٥ ص٤١٣ حديث ٦٩٦٠؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص٣٨١ حديث ٣٢١٦٨، وط: ج١٧ ص٢١٣ حديث ٣٢٩٣٧؛ المعجم الكبير ج٢ ص١٧٣ حديث ٢٥٤١، ٢٥٤٢، ٢٥٤٣ وج٩ ص٣٦٤ حديث ١٨٤٣٨؛ جامع الأصول ج٦ ص٣٦٢ حديث ٦٥٩٥ وص٤١٠ حديث ٦٦٧٣؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١٨٤، وط: ج٩ ص٢٩٣ حديث ١٥٠٨٦، ١٥٠٨٧؛ تقريب البغية للهيثمي ج٣ ص١١٩ حديث ٣٣٥٨؛ الزهر الباسم للمغطائي ج١ ص٥٤٩؛ مسند فاطمة الزهراء ص٥٧ حديث ١١٢ وص٥٩ حديث ١٢٨؛ جمع الجوامع ج١٤ ص٢٨٨ حديث ١٠٦١٤، ١٠٦١٥؛ در السحابة للشوكاني ص٢٧٦؛ نزل الأبرار للبدخشاني ص١٠٩۔

۲۔ اِس میں اُن لوگوں کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ تمام جہانوں کی خواتین سے افضل ہیں، اِسی حدیث اور ایسی دوسری احادیث کی وجہ سے، اور اُن کے جسم نبوی ﷺ کا حصہ ہونے کی وجہ سے۔

۳۔ ارشادِ نبوی ﷺ: "سیدة نساء أهل الجنة" (اہل جنت کی سیدہ) میں اُن لوگوں کی تردید ہے جو خواتین کی نبوت کے قائل ہیں، اس لیے کہ باجماعِ امت نبی کا مرتبہ ولی کے مرتبہ سے بلند ہے۔(۱)

٤۔ اِس میں اہل بیت کرام کو خوشخبری دینے میں جلدی کرنے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے۔

٥۔ اِس میں اُس شخص کی فضیلت کی دلیل ہے جو اہل بیت کو خوشی پہنچائے۔

٦۔ اِس میں دلیل ہے کہ یہ بات اہل بیت کرام کی عظمت سے ہے کہ ہر حال میں اُنہیں سلام کرنے میں ابتدا کی جائے، لیکن مجھے ایک اور استثنائی صورت نظر آرہی ہے، اور وہ یہ کہ جب اہل بیت کے فرد کا کسی کے ساتھ مکالمہ منقطع ہو جائے تو پھر بہتر یہ ہے کہ اہل بیت کا فرد ہی سلام کا آغاز کرے، اس لیے کہ اِس ابتدا میں عظمت اور فضیلت ہے۔ گذشتہ سطور میں حدیث نمبر ۱٦ میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں جو حدیث بیان ہوئی کہ "میرا یہ بیٹا سید ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے دو گروہوں میں صلح فرمائے گا" میں بھی اسی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

۷۔ اِس میں نبوت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے کہ سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما حضور ﷺ کے وصال کے وقت ابھی بچے تھے اور آپ نے بشارت دی کہ وہ جوان ہوں گے اور نوجوانانِ اہل جنت کے سردار ہوں گے۔

۸۔ اِس میں فرشتوں کی اہل بیت رضی اللہ عنہم سے شدید محبت کا اور اُن کا اِس محبت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا ذکر ہے۔

۹۔ اِس میں اُس اچھی تربیت کا ذکر ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے محبتِ نبوی ﷺ میں اپنی اولاد کی فرمائی

---

(۱) مؤلف کے اِن الفاظ میں اشارہ ہے کہ جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا تمام جہانوں کی خواتین سے افضل ہیں تو سیدہ مریم کی نبوت کے قائلین کی تردید ہوگئی، اس لیے کہ اگر وہ نبی ہوتیں تو سیدہ فاطمہ تمام جہانوں کی خواتین سے افضل نہ ہوتیں؟ کیونکہ غیر نبی انسان نبی انسان سے افضل نہیں ہوتا۔

تھی۔ بہتر تو اللہ ہی جانتا ہے، لیکن محسوس یوں ہوتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھ اُن کی اِس محبت کو دیکھا تو اُنہیں لطیف انداز میں اشارہ کیا کہ مجھ سے محبت کی علامت میری آل سے محبت ہے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو فرشتے کی بشارت سے آگاہی میں بھی یہی راز مضمر ہے، اور یہ لطیف ترین اشارہ اور بشارت ہے۔

۱۰۔ اِس میں دلیل ہے کہ آپ ﷺ بشر تھے، کبھی آپ پر بھی وہ بات مخفی رہ جاتی تھی جو عام لوگوں پر مخفی ہوتی ہے، اِس کی دلیل آپ کے یہ الفاظ ہیں "من هذا؟" (کون ہے یہ؟) پھر ائمہ اہل بیت تو بدرجۂ اتم بشر ہیں۔ (۱)

---

(۱) بشریت کی انوکھی دلیل

بشریت کے ثبوت کے لیے فاضل مؤلف کا یہ عجیب استدلال ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک تو اِس استدلال کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ نبی اگر زمین و آسماں کے غیوب پر بھی مطلع ہو اور اُمت کو دنیا و آخرت کے غیب سے آگاہی بھی بخشے تب بھی وہ بشر ہوتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں: کیا بشر ہی پر بعض امور مخفی ہوتے ہیں ملائکہ پر نہیں ہوتے؟ اور اگر نبی کریم ﷺ پر یہ امر مخفی نہ ہوتا اور آپ از خود بتا دیتے کہ آپ کے پیچھے پیچھے جو آرہا ہے وہ حذیفہ ہے تو کیا آپ بشر نہ ہوتے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے اور وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سن سکتے۔ (سنن الترمذي) اور فرمایا: مجھ پر تمہارا رکوع مخفی ہے اور نہ ہی خشوع اور میں اپنی پشت کے پیچھے بھی تمہیں دیکھتا ہوں (بخاري) تو کیا اِن امور کی وجہ سے آپ کی بشریت کا انکار کر دیا جائے گا؟

خود اِسی حدیث کے دوسرے طرق میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے از خود ہی بتا دیا تھا کہ پیچھے حذیفہ ہیں اور اُن کی وہ دلی تمنا بھی از خود بتلا دی تھی جسے وہ گھر سے لے کر چلے تھے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

من هذا، حذيفة؟ قلتُ: نعم. قال: ما حاجتک غفر الله لک و لأمک؟

"یہ کون ہے، حذیفہ ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: تمہاری کیا حاجت ہے؟ اللہ تمہاری اور تمہاری والدہ کی مغفرت فرمائے"۔ (1)=

---

(1) سنن الترمذي، أبواب المناقب، باب [۳۰] ج۶ ص ۱۲۱، وط: ص ۸۵۸ حدیث ۳۷۸۱۔

١١۔ اِس حدیث میں سیدنا امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی ایسی منقبتِ عظیمہ کا ذکر ہے جس میں اُن کا کوئی شریک نہیں، چنانچہ اُن کی زوجہ فاطمہ خواتینِ جنت کی سیدہ ہیں اور اُن کے دونوں بیٹے حسن اور حسین نو جوانانِ اہل جنت کے سید ہیں۔

١٢ یہ روایت "السنن الکبریٰ للنسائي" وغیرہ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مختصراً ایں الفاظ روایت کی گئی ہے: "**الحسن والحسین سیدا شبابِ أهل الجنة إلا ابني الخالة عیسی بن مریم ویحییٰ بن زکریا**". (حسن وحسین نو جوانانِ اہل جنت کے سید ہیں ماسوا دو خالہ زاد بھائی عیسیٰ بن مریم اور یحییٰ بن زکریا علیہم السلام کے) اِس کی سند میں حَکَم بن عبد الرحمان ہے، جس کا حافظہ خراب تھا، اِس وجہ سے یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے تاہم اِس بات پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا درجہ اولیاء سے بلند ہے۔

اکیسویں حدیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نمازِ عشاء پڑھ رہے تھے کہ اچانک حسن اور حسین آپ کی پشت مبارکہ پر چڑھ بیٹھے۔ جب آپ سجدہ میں جاتے تو اُنہیں اپنے ہاتھ سے نرمی کے ساتھ پکڑ کر زمین پر بٹھا دیتے، پھر جب آپ دوبارہ سجدہ میں جاتے تو وہ دوبارہ کمرِ اقدس پر بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ جب آپ نے نماز پوری کی تو اُنہیں اپنی گود میں بٹھا لیا۔ میں نے اٹھ کر عرض کیا: یا رسول

= اگر فاضل مؤلف سنن الترمذی (جس کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے) کی یہ حدیث نقل کرتے تو پھر اُن کے استدلال کی کیا صورت ہوتی۔ نیز اگر وہ بخاری کی اُس حدیث کی شرح کرتے جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب جنت میں چل رہے تھے تو زمین پر چلنے والے بلال کے جوتوں کی آواز کو سن بھی لیا اور پہچان بھی لیا تو کیا وہ بشریتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کر دیتے؟

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم اور غیبی امور پر آگاہی کے لیے راقم الحروف کی کتاب "**أنوار العرفان في أسماء القرآن**" میں (جامعیتِ قرآن حدیث کے بغیر ناممکن) کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ! کیا میں انہیں گھر پر چھوڑ آؤں؟ اِس پر اچانک ایک روشنی نمودار ہوئی تو آپ ﷺ نے اُنہیں فرمایا: جاؤ انہیں ان کی امی کے پاس پہنچادو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ روشنی اُن کے گھر میں داخل ہونے تک برقرار رہی۔

یہ سند حسن ہے اور یہ حدیث مسند احمد کی اُن احادیث سے ہے جو صحاح ستہ پر زائد ہیں۔

''فَبَرَقَتْ'' کا معنی ہے ''أَضَاءَ تْ'' یعنی روشنی ہوگئی، اور مستدرک میں امام حاکم تک سند کے ساتھ مذکور ہے: پس وہ دونوں بچے اُس روشنی میں چلتے رہے یہاں تک کہ گھر میں داخل ہو گئے۔ (۱)

اکیسویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اِس میں اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم پر اُن کے بچپن میں اللہ تعالیٰ کی عنایت کی دلیل ہے، اور جب ابتدا میں عنایت ہو جائے تو انتہا میں ولایت کا ظہور ہوتا ہے۔

۲۔ اِس میں مذکور ہے کہ سیدنا امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما سے کرامت کا اظہار ہوا، جبکہ وہ دونوں ابھی غیر مکلّف تھے۔ (۲)

---

(۱) مسند أحمد ج۲ ص۵۱۳ وط: [شعیب] ج۱۶ ص۳۸٦ حدیث ۱۰٦۵۹؛ المستدرك ج۳ ص۱٦۷ وط: ج۳ ص۱۸۳ حدیث ۴۴۸۲؛ مجمع الزوائد ج۹ ص۱۸۱ وط: ج۹ ص۲۹۰ حدیث ۱۵۰۷٦، وط: ج۱۸ ص۵۱۳ حدیث ۱۵۰۷۲۔

(۲) اس حدیث کے دوسرے طرق میں وضاحت آئی ہے کہ وہ اندھیری رات تھی۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كنت عند النبي ﷺ في ليلة مظلمة، وعنده الحسن والحسين، فبرقت برقة.

''میں ایک اندھیری رات میں نبی کریم ﷺ کے پاس تھا اور آپ کے پاس سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما تھے تو ایک روشنی نمودار ہوئی''۔ (1)

---

(1) کشف الأستار ج۳ ص۲۲۷ حدیث ۲٦۳۰؛ مجمع الزوائد ج۹ ص۱۸۱ وط: ج۹ ص۲۹۰ حدیث ۱۵۰۷٦، وط: ج۱۸ ص۵۱۳ حدیث ۱۵۰۷۲۔

۳۔ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی کم سنی کے باوجود صحابہ کرام ﷺ کے روبرو اِس کرامت کا ظہور صحابہ کرام ﷺ کو اُن کی تعظیم اور اُن سے محبت پر اُبھارنے کی طرف اشارہ ہے۔(۱)

٤۔ اِس میں اہل بیت پر شفقت ورحمت کا ذکر ہے۔

٥۔ اِس میں اہل بیت کی خدمت کے لیے جلدی کرنے کے مستحب ہونے پر دلیل ہے، اگرچہ وہ فرمائش نہ بھی کریں۔

٦۔ اِس میں حالتِ نماز میں بچوں کو اٹھانے کے جواز کا ذکر ہے۔

۷۔ اِس میں بچوں کو غلطی پر نہ مارنے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے، اگرچہ وہ بار بار غلطی کریں۔

۸۔ اِس میں دلیل ہے کہ اگر ضرورت ہو تو نماز میں حرکت سے نماز بلا کراہت جائز ہے، اگرچہ بار بار حرکت کرنا پڑے۔

۹۔ اِس میں راویِ حدیث سیدنا ابو ہریرہ ﷺ کی فضیلت ہے، کیونکہ وہ اِس کرامت کے بلا واسطہ شاہد

---

(۱) مؤلف موصوف نے بہترین استدلال کیا ہے، جزاہ اللہ تعالیٰ، لیکن اِس حدیث کے بعض طرق میں اِس محبت کی تلمیح نہیں بلکہ تصریح آئی ہے۔ چنانچہ امام ابونعیم اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہما سیدنا عبد اللہ بن مسعود ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا:

''ایک دن رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک حسن اور حسین ﷺ آئے، وہ دونوں بچے تھے، سو جب حضور ﷺ سجدہ میں گئے تو وہ آپ کی پشت پر کودنے لگے، لوگ اُن دونوں کی طرف بڑھے تا کہ اُنہیں ہٹا دیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ذروهما بأبي وأمي من أحبني فليحب هذين.

''اِنہیں رہنے دو! اِن پر میرے ماں باپ قربان ہوں، جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ اِن سے محبت کرے''۔(1)

---

(1) حلية الأولياء ج۸ص ۳۰٥؛السنن الكبرى للبيهقي ج۲ ص۲٦۳ وط: ج۲ ص۳۷۳ حديث ۳٤۲٤، وط: ج٤ ص۳۰۸ حديث ۳٤۷۱، تقريب البغية ج۳ ص۱۱۹ حديث۳۳٥۷۔

ہیں اور اُنہوں نے اِس فضیلت کو آگے بیان کیا ہے۔ اگر معاذ اللہ اُن کے قلب میں اہل بیت کے خلاف کوئی بغض ہوتا تو وہ ہماری طرف اُن کے فضائل نہ نقل کرتے۔

۱۰۔ اِس میں بچوں کے مساجد میں داخل اور نمازوں میں حاضر ہونے کے جواز کی دلیل ہے۔ یہ بات بخاری و مسلم وغیرہا کی متعدد احادیث میں بیان کی گئی ہے، اور یہ اُس روایت کی غرابت کی دلیل ہے جو بایں الفاظ مرفوعاً روایت کی گئی کہ ''اپنی مساجد کو بچوں سے محفوظ رکھو'' اگر یہ روایت صحیح ہو تو پھر اِس کو اُن بچوں پر محمول کیا جائے گا جن کی طبیعت میں ایذا رسانی اور شرارت کا عنصر موجود ہو، بہرحال جواز کی صورت میں بچوں کو نماز کی صف کے بیچ میں نہیں کھڑا کیا جائے گا بلکہ آخری صف میں کھڑا کیا جائے گا، بالخصوص جب وہ نا سمجھ ہوں۔ رہا نبی کریم ﷺ کا معاملہ تو آپ کسی صف میں نہیں تھے، اور یہ بھی منقول نہیں کہ آپ نے امام حسن، حسین اور اُمامہ رضی اللہ عنہم کو اٹھایا اور اُنہیں اپنی ایک جانب کھڑا کیا۔ (۱)

---

(۱) پشت پر سوار ہونا ایک بار ہوا، یا کئی بار؟

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کئی بار ہوا، کیونکہ مؤلف کی نقل کردہ حدیث میں ذکر ہے کہ دونوں بچے اکٹھے پشت مبارکہ پر سوار ہو بیٹھے، جبکہ ایک اور حدیث میں ہے کہ کوئی ایک بچہ تھا۔ پھر مؤلف کی پیش کردہ حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ جب سجدہ سے سر اقدس اٹھاتے تو بچوں کو نرمی سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیتے، جبکہ دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے اتنا لمبا سجدہ کیا کہ صحابہ کو طرح طرح کے خیالات آنے لگے، نیز اُس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ منفرد نہیں تھے بلکہ امامت کرا رہے تھے۔ چنانچہ محدثین کرام لکھتے ہیں:

''عبداللہ بن شداد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس نماز عشاء میں تشریف لائے تو آپ نے حسن یا حسین کو اٹھا رکھا تھا۔ آپ نے آگے بڑھ کر بچے کو بٹھایا، پھر نماز کے لیے اقامت کہی گئی تو آپ نے نماز پڑھانا شروع فرمائی، پھر آپ نے سجدہ کیا تو اُسے بہت لمبا کر دیا۔ میرے والد کہتے ہیں: میں نے اپنا سر اٹھا کر دیکھا تو بچہ آپ کی پشت پر بیٹھا ہوا تھا، تو میں دوبارہ سجدہ کی طرف لوٹ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب نماز پوری فرمائی تو لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جب آپ نے دورانِ نماز سجدہ =

بائیسویں حدیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو عرض کیا: یارسول اللہ! یہ خدیجہ آرہی ہیں، اُن کے پاس ایک برتن ہے، جس میں سالن، کھانا یا پانی ہے۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچ جائیں تو اُنہیں اُن کے رب کی طرف سے اور میری طرف سے سلام کہیے، اور اُنہیں جنت میں موتیوں کے ایسے گھر کی بشارت دیجیے جس میں کوئی شور وغل اور تکلیف نہیں ہوگی۔

= کیا تو اتنا طویل کیا کہ ہم گمان کرنے لگے کہ کوئی معاملہ (وصال) ہو گیا ہے، یا پھر آپ کی طرف وحی کی جارہی ہے۔ آپ نے فرمایا: اِن میں سے کوئی بات نہیں تھی۔

لكن ابني ارتحلني فكرهت أن أعجّله حتى يقضي حاجته.

"لیکن میرے بیٹے نے مجھے سواری بنالیا تھا تو میں نے اُس کی خوشی کی تکمیل میں عجلت کو پسند نہیں کیا"۔(1)

ایسا واقعہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔(2)

---

(1) سنن النسائي[بتحقيق الباني]ص١٨٦ حديث١١٤١؛السنن الكبرى للنسائي ج١ ص٣٦٦ حديث٧٣١؛مسند أحمد ج٣ ص٤٩٣ وج ٦ ص٤٦٧ وط:[شعيب]ج٢٥ ص٤١٩ حديث ١٦٠٣٣ وج٤٥ ص٦١٣ حديث٢٧٦٤٧؛المصنف لابن أبي شيبة ج١٢ ص١٠٠، ١٠١،و ط: ج ١١ ص١٦٦ حديث٣٢٧٢٨؛المستدرك ج٣ ص١٦٦ وص٦٢٦ وط: ج٣ ص١٨١ حديث ٤٧٤٥ وص٧٢٦ حديث٦٦٣١؛شرح مشكل الآثار ج١٤ ص٢١٤ حديث ٥٥٨٠؛السنن الكبرى للبيهقي ج٢ ص٢٦٣ وط: ج٢ ص٣٧٢ حديث٣٤٢٣؛المعجم الكبير ج٧ ص٣٢٦ حديث ٧١٠٧؛ الآحاد والمثاني ج٢ ص١٨٧ حديث ٩٣٤۔

(2) مسند أبي يعلىٰ ج٦ ص١٥٠ حديث٣٤٢٨؛المقصد العلي ج٢ ص٢٠٢ حديث ١٣٦٧؛ مجمع الزوائد ٩ ص١٨٠،وط: ج١٨ ص٥١٤ حديث١٥٠٧٣؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٩ ص٣٢٥ حديث ٩٠٧٢؛المطالب العالية ج١٦ ص٢١٠ حديث ٣٩٧٠۔

اِس کوامام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اِسے ابن فضیل سے اسی طرح روایت کیا ہے۔(۱)

دورانِ تعلیم مجھے میرے شیخ عبدالرحمان بن عبداللہ الملاّ نے اَحساء کے مقام میں امام نسائی کی "السنن الکبری" سے سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت سنائی تھی کہ سیدہ خدیجہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا: اللہ خود سلام ہے، جبریل پر سلام ہو اور آپ پر بھی اللہ کی سلامتی، اُس کی رحمت اور برکتیں ہوں۔ (۲)

بائیسویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اِس میں ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عظیم فضیلت ہے کہ رب تبارک وتعالیٰ نے اُن کی طرف خصوصی سلام بھیجا۔ حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یہ اُن کی خصوصیت ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے سلام کے ساتھ اُن کے لیے جبریل علیہ السلام کو بھیجا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں وہ سلام پہنچایا۔ اللہ کی قسم! یہ اُن کی ایسی خصوصیت ہے جس میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔(۳)

۲۔ اس میں اشارہ ہے کہ اہل بیت کرام کی خواتین کے ساتھ سلام وکلام وغیرہ میں ادب کا برتاؤ فقط ابلاغ تک ہے، آمنا سامنا ممنوع ہے، اور اِس کی دلیل قرآن مجید میں یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اور جب تم اُن سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو﴾ [الأحزاب: ۵۳] یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

---

(۱) بخاري، کتاب مناقب الأنصار، باب تزویج النبي ﷺ خدیجة وفضلها رضي الله عنها ص حدیث ۳۸۲۰؛ مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خدیجة أم المؤمنین رضي الله عنها حدیث ۲۴۳۲۔

(۲) السنن الکبری للنسائي ج۷ ص ۳۸۹، ۳۹۰ حدیث ۸۳۰۱؛ المستدرك ج۳ ص ۱۸۶ وط: ج ۴ ص ۱۸۶ حدیث ۴۹۰۸۔

(۳) تفسیر ابن کثیر ج۶ ص ۴۰۴، دار طیبة۔

اکرام کے پیشِ نظر ہے۔

۳۔ اِس میں ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ہے، کیونکہ اُنہوں نے اپنی ذمہ داری نبھانے اور اپنے شوہر کی خدمت کرنے کا اِس حد تک حق ادا کیا کہ نبی کریم ﷺ کو کسی اور خاتون کی حاجت ہی محسوس نہ ہونے دی، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے جس قدر شادیاں کیں سب اُن کی وفات کے بعد کیں، رضی اللہ عنہا۔

٤۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے:

''علماء کرام فرماتے ہیں: اس سے سیدہ خدیجہ کی وسیع ذہانت کا ثبوت ملتا ہے، کیونکہ انہوں نے یوں نہیں کہا ''وَعَلَیْهِ السَّلَامُ'' (اور اُس پر سلام) جیسا کہ بعض صحابہ کرام نے التحیات میں کہہ دیا تھا ''السلام علی اللّٰه'' (اللہ پر سلام) تو نبی کریم ﷺ نے منع کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اللہ ہی ''السلام'' ہے۔ اس سے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فہم ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر مخلوق کی طرح سلام نہیں لوٹایا، کیونکہ ''السلام'' اسماء الٰہیہ میں سے ایک اسم ہے، نیز یہ ایک سلامتی کی دعا ہے، اس لیے دونوں طرح اس کا اللہ ﷻ کی طرف لوٹانا درست نہیں، وہی ''السـلام'' ہے، اُسی سے سلامتی مانگی جاتی ہے اور اُسی سے ہی سلامتی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق فقط اُس کی ثنا ہے، اس لیے سیدہ خدیجہ نے اللہ تعالیٰ کے سلام کے جواب میں فقط اُس کی ثنا کر دی اور اُس کے اور مخلوق کے مابین ایک فرق کر دیا اور کہا: جبریل پر سلام''۔(۱)

میں کہتا ہوں: اُس روایت سے مغالطہ نہیں کھانا چاہیئے کہ نبی کریم ﷺ نے اُن کے حق میں فرمایا: ''مردوں میں سے بہت سے کامل ہوئے ہیں اور خواتین میں سے کامل نہیں ہوئیں مگر...... اور خدیجہ بنت خویلد''۔ ان الفاظ میں اعتراض ہے جیسا کہ عنقریب چوبیسویں حدیث میں وضاحت آرہی ہے، تاہم اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ سیدہ کی شان میں نبی کریم ﷺ سے جو صحیح احادیث آئی ہیں وہ اُن کے کمال

(۱) فتح الباري ج۷ ص۵۱۹۔

کے لیے کافی ہیں، جیسا کہ آئندہ حدیث آ رہی ہے۔(۱)

۵۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کہا ہے: سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے خصائص سے ہے کہ اُنہوں نے کبھی حضور ﷺ کو تکلیف نہیں پہنچائی، نہ غضب ناک کیا، نہ اُن سے حضور ﷺ نے ایلاء (قسم کھا کر چند دن کے لیے الگ ہو جانا) کیا، نہ اُن پر عتاب کیا اور نہ ہی اُن سے روٹھے، اور یہ اُن کی فضیلت و منقبت کے لیے کافی دلیل ہے۔(۲)

میں کہتا ہوں: گویا سیدہ کی اِسی سیرت کی بدولت اُنہیں جنت میں ایسا عظیم محل دیا گیا جس میں کوئی شور اور تکلیف نہیں ہوگی، اور جزا عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

٦۔ اس حدیث سے بعض علماء نے سیدہ خدیجہ کی افضلیت پر استدلال کیا ہے۔ اس لحاظ سے کہ سیدہ عائشہ کو جبریل علیہ السلام نے اپنی جانب سے سلام کہا اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اُن کے رب کی جانب سے سلام پہنچایا۔ لیکن اس میں اعتراض ہے، کیونکہ تخصیص مطلق تفضیل کا تقاضا نہیں کرتی، مطلق تفضیل کے دلائل اور ہیں۔(۳)

---

(۱) اس پیراگراف کو صحیح سمجھنے کے لیے حدیث نمبر چوبیس کے پانچویں فائدے میں غور فرمائیں۔

(۲) تفسیر ابن کثیر ج٦ ص ٤٠٤ ، دار طيبة۔

(۳) سیدہ خدیجہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہما میں مفاضلہ

مؤلف نے کہا "بعض علماء نے استدلال کیا" اس پر ہماری گزارش ہے کہ آغاز میں یہ استدلال بعض علماء نے کیا، لیکن بعد میں اسے متعدد اور معتبر علماء کرام نے بلا تردید قبول کیا۔ چنانچہ امام ابو القاسم سہیلی لکھتے ہیں:

"محدث ابو بکر بن داود سے دریافت کیا گیا کہ امی عائشہ افضل ہیں یا امی خدیجہ؟ انہوں نے کہا: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کی جانب سے سلام کہا اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اُن کے رب کی جانب سے سلام فرمایا، لہٰذا سیدہ خدیجہ افضل ہیں"۔(1)=

---

(1) الروض الأنف ج١ ص٤١٨۔

....

امام ابن حجر عسقلانی، ابن الملقن، امام عینی، امام سیوطی، امام قسطلانی اور امام زرقانی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔(1)

باقی رہی مؤلف کی یہ بات کہ ''مطلق تفضیل کے دلائل اور ہیں'' خدا جانے وہ کیسے دلائل ہوں گے؟ تاہم مجھ ناقص کی معلومات کے مطابق بعض نبوی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے کوئی بھی ام المومنین افضل نہیں۔ چنانچہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کرتے تو اُن کی تعریف کرتے اور خوب تعریف کرتے۔ فرماتی ہیں: ایک دن مجھے اس بات پر غیرت پیدا ہوئی تو میں نے عرض کیا: آپ اُس سرخ جبڑوں والی کا بہت زیادہ ذکر کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ نے آپ کو اُن کا نعم البدل عطا فرمایا ہے۔ فرمایا:

ما أبدلني الله عز وجل خيراً منها.

''اللہ عزوجل نے مجھے اُن سے بہتر بدل عطا نہیں فرمایا''۔

حافظ ہیثمی اور شیخ احمد شاکر نے کہا: اس حدیث کی سند حسن ہے، اور شیخ شعیب الارنؤوط نے کہا: یہ حدیث صحیح ہے اور اس کی سند حسن ہے۔(2)=

---

(1) فتح الباري ج٧ص ٥١٩،وط: ج٨ص ٥٢٨؛التوضيح لابن الملقن ج٢٠ص ٤٣٢؛عمدة القاري ج١٦ص ٣٤٤؛التوشيح للسيوطي ص ٢٤٠٥؛المواهب اللدنية ج٢ص ٧٨؛زرقاني على المواهب ج٤ص ٣٧٢۔

(2) مسند أحمد ج٦ص ١١٨ وط: ج٨ص ٣٠٤ رقم ٢٥٣٧٦،وط:[شاكر] ج١٧ص ٤٥٠ حديث ٢٤٧٤٥،وط:[الأرنؤوط] ج٤١ص ٤٥٦ حديث ٢٤٨٦؛المعجم الكبير ج٢٣ص ١٣ حديث ٢٢؛سير أعلام النبلاء ج٢ص ١١٧؛مجمع الزوائد ج٩ص ٢٦٥ حديث ١٥٢٨١؛غاية المقصد ج٤ص ٤،٥ حديث ٣٧٣٣؛البداية والنهاية ج٤ص ٣٢٠ وج١١ص ٣٤٠،وط: ج٣ص ٣٧١ وج٨ص ١٣٥؛إتحاف الخيرة المهرة ج٧ص ٢٤٥ حديث ٦٧٧٥؛سبل الهدىٰ ج١١ص ١٥٨۔

....

= حافظ ابن کثیر کا تضاد، یا؟

حافظ ابن کثیر نے دو مقامات پر یہ حدیث مکمل نقل کی ہے، اُن میں سے پہلے مقام پر لکھا ہے:

إسناده لابأس به.

''اس کی سند میں کوئی حرج نہیں''۔(1)

جبکہ دوسرے مقام پر لکھا ہے:

فأما ما یروی فیه من الزیادة ''ما أبدلني الله عزوجل خیراً منها'' فلیس یصح سندها.

''وہ جو اِس حدیث میں ''**ما أبدلني الله عزوجل خیراً منها**'' کے اضافی الفاظ روایت کیے جاتے ہیں تو اس کی سند صحیح نہیں ہے''۔(2)

یہ تضاد کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انہوں نے اس کی سند کو غیر صحیح کہا وہاں وہ ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کو ثابت کر رہے ہیں اور چونکہ اِن الفاظ سے اُن کا موقف کمزور ہوسکتا تھا، اس لیے اُنہوں نے جہاں اِن الفاظ کو اضافہ قرار دیا وہیں اس کی سند کو بھی کمزور کہہ دیا، تاکہ ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'' جبکہ جہاں اُنہیں اس حدیث کی سند میں کوئی حرج نظر نہیں آیا، وہاں وہ بلا تقابل ام المومنین سیدتنا خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کر رہے ہیں۔ بہر کیف حافظ ابن کثیر کا میلان سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کی طرف ہے، اور اُن کے کلام کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک شیعہ کی ضد میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کا موقف ضروری ہے، چنانچہ اُن کے نزدیک سیدتنا خدیجہ رضی اللہ عنہا کے جس قدر صحیح اور مستند فضائل ہیں وہ شیعہ وغیرہ کے دلائل ہیں۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام کی تمام باتیں کتبِ اہل سنت میں موجود ہیں، لہٰذا اُنہیں ''**أهل التشیع** =

---

(1) البدایة والنهایة ج٤ ص ٣٢٠۔

(2) البدایة والنهایة ج١١ ص ٣٤٠۔

= وغيرهم“ کے الفاظ سے دھندلانے کی کوشش کرنا سنیت کی خدمت نہیں ہے۔خود نبی کریم ﷺ نے ایسے ہی دلائل پیش فرما کر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو لاجواب فرمادیا تھا،تو کیا معاذ اللہ حضور ﷺ شیعہ تھے؟

سب سے اہم بات یہ ہے کہ حدیث ”ما أبدلني الله عزوجل خيراً منها“ (اللہ ﷻ نے مجھے خدیجہ سے بہتر بدل عطا نہیں فرمایا) اپنے سیاق وسباق کے ساتھ صحیح یا حسن ہے،اور حافظ ابن کثیر اس کی عدم صحت پر کوئی دلیل بھی پیش نہیں کر سکے، بلکہ ایک مقام پر ”إسناده لابأس به“ بھی لکھ چکے ہیں،تو پھر شیعہ کی ضد میں نبوی تصریح کے منافی حافظ ابن کثیر کے افکار کیسے لائق التفات ہو سکتے ہیں؟

افسوس کہ سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما سے لے کر نیچے تک تمام اہل بیت کی افضلیت اِسی مذہبی تعصب کی نذر ہو جاتی ہے،تاہم انصاف پسند طبیعتیں فقط دلائل کے تابع رہتی ہیں،چنانچہ ایسی ہی تصریحاتِ نبویہ ﷺ کے پیش نظر زیر بحث مسئلہ میں امام عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے دوٹوک انداز میں فرمایا ہے:

أفضلهن مطلقاً خديجةُ
وبعدها عائشةُ الصديقةُ

”تمام امہات میں مطلقاً سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا افضل ہیں اور ان کے بعد سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں“۔(1)

حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام مناوی رحمۃ اللہ علیہما نے امام زین الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تصریح کی توثیق وتائید کی ہے۔(2)

تنبيه

حافظ ابن کثیر نے جو یہاں بلا دلیل حدیث پر حکم لگایا ہے،اُس سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ وہم کا شکار ہو جاتے تھے،چنانچہ آئندہ صفحات میں حدیث نمبر ۲۴ کے مسئلہ نمبر ۵ میں مذکور ہے کہ ابن کثیر=

(1) نظم الدرر السنية في السيرة النبوية،للعراقي ص ۱۰۰۔

(2) فتح الباري ج۷ ص ۵۱۴؛العجالة السنية على الفية السيرة النبوية ص ۱۵۲۔

۷۔ قولِ جبریل "ببيت من قصب" کا معنی ہے: کھوکھلے موتیوں کا محل۔ بعض روایات میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

لفظ "لُؤلُؤٌ" کے بجائے لفظ "قَصَبٌ" کیوں؟

۸۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ امام سہیلی فرماتے ہیں: "من قصب" فرمایا اور

= نے ایک حدیث کو صحیحین کی حدیث سمجھ لیا، حالانکہ وہ حدیث صحیحین میں نہیں ہے، اور اس کے بعد ایک جماعت ابن کثیر کی اِس خطا کی پیروی کرتی چلی گئی۔

کافی غور و خوض کے بعد مجھے تو یہ بھی شبہ ہونے لگا ہے کہ وہ بعض مرتبہ احادیث و آثار کے متن میں بھی من مانی ترمیم کر دیتے تھے۔ راقم الحروف بھی "شرح خصائص علي ﷺ" کے الطبعة الأولیٰ میں اُن کی ایسی ہی ترمیم کا شکار ہو گیا تھا، اُن کی مشہور تصنیف البداية والنهاية میں حضرت معاویہ کے بارے میں بحوالہ مسلم "کان یکتب الوحي" کے الفاظ مرقوم تھے، میں نے بھی اُن پر بھروسہ کرتے ہوئے یہی الفاظ لکھ دیے تھے، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ صحیح مسلم میں یہ الفاظ نہیں ہیں، پھر مجھے "الطبعة الثانية" میں اس غلطی کی وضاحت کرنا پڑی تھی۔

اسی طرح ایک اور مقام پر حضرت معاویہ ہی کے متعلق تھوڑی سی ترمیم کر دی۔ واقعہ یہ ہے کہ زیاد ابن ابیہ نے حضرت حکم بن عمرو الغفاری ﷺ کو ایک خط لکھا، جس کا متن یوں تھا:

> **أما بعد، فإن أمير المؤمنين كتب إليّ أن اصطفى له الصفراء والبيضاء، فلا تقسم بين الناس ذهباً ولا فضةً.**
>
> "امابعد، امیر المومنین (معاویہ) نے میری طرف ایک خط لکھا ہے کہ سونا چاندی اُن کے لیے الگ کر لیا جائے، لہٰذا سونا چاندی مجاہدین میں تقسیم نہ کیا جائے"۔

یہ بات ہم پندرھویں حدیث کی تشریح میں متعدد کتب کے حوالے سے لکھ چکے ہیں، چونکہ اِس متن کے اِن الفاظ "أن اصطفى له" کا اثر براہ راست حضرت معاویہ پر پڑتا ہے، اس لیے حافظ ابن کثیر نے "له" کے لفظ کو "لِبَيْتِ المَالِ" سے تبدیل کر دیا ہے، جبکہ اُن کی کتاب کے علاوہ دوسری کسی کتاب میں یہ لفظ نہیں ہے۔(1)

---

(1) البداية والنهاية ج ۱۱ ص ۲۱۷۔

"مِن لؤلؤ" نہ فرمایا۔لفظ"قصب" کے استعمال میں نکتہ یہ ہے کہ سیدہ نے جلد ایمان لانے میں"قَصَبُ السَّبَق" کیا۔اسی لیے پوری حدیث میں مناسبتِ لفظی واقع ہوئی ہے۔ (١)

لفظ"قَصَب" کے استعمال میں جہت کی سیدھ کے لحاظ سے بھی ایک مناسبت ہے۔وہ یہ کہ تیر چلانے میں جس کا نشانہ دوسروں سے زیادہ سیدھا ہواُس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے،اور اِس میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا کوئی مدمقابل نہیں،کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کو خوش کرنے میں ہر ممکن حدتک حریص تھیں،یہی وجہ ہے کہ دوسری امہات رضی اللہ عنہن کی طرح اُن سے کبھی بھی ایسی بات صادر نہیں ہوئی جو حضور ﷺ کی ناراضگی کا سبب بنی ہو۔(٢) [٣]

لفظ"قصر" کے بجائے لفظ"بیت" کیوں؟

---

(١) الروض الأنف ج٢ ص٤٢٩،وط: ج١ ص٤١٧۔

(٢) فتح الباري ج٧ ص٥١٧، ٥١٨،وط: ج٨ ص٥٢٧۔

[٣] فائدہ

آٹھویں فائدے کے پہلے پیراگراف کے صحیح مفہوم کے لیے عرب کے درجِ ذیل محاورہ کو سمجھنا ضروری ہے۔اہل لغت لکھتے ہیں:

> "أَحرَزَ قَصَبَ السَّبقِ" یعنی غالب رہا،اوراس کی اصل یوں ہے کہ میدانِ مسابقت میں ایک بانس گاڑ دیا کرتے تھے،جوشخص آگے بڑھ جاتا تھاوہ اُسے اُکھاڑ لیتا تھا تاکہ غالب رہنے کی علامت رہے"۔(1)

سوجس طرح دوڑنے یا گھڑ دور میں آگے نکل جانے والا"أَحرَزَ قَصَبَ السَّبقِ" قرار پاتا تھااِسی طرح سیدہ میدانِ ایمان میں مطلقاً تمام انسانوں سے سبقت کرنے پر"أَحرَزَتْ قَصَبَ السَّبقِ" قرار پائیں،کیونکہ اعلانِ نبوت کے بعد ایمان لانے میں اُن پر کوئی سبقت نہیں کرسکا۔

آٹھویں فائدے کے دوسرے پیراگراف کومزید سمجھنے کے لیے پانچویں فائدے کودوبارہ پڑھ لیجئے۔

---

(1) مصباح اللغات ص٦٨٣۔

۹۔ (قَصر کے بجائے) لفظ "بَیت" سے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جنت میں گھر کی بشارت دینے میں مناسبت یہ ہے کہ سیدہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کا گھر اسلام میں اول "بَیت" ہے جس میں اسلام نے احسن طریقہ سے قیام کیا تو اللہ تعالیٰ نے سیدہ کو اپنے ہاں جنت میں اُس سے بہتر "بَیت" کا بدلہ دیا، اور جزا عمل کے مطابق ہوتی ہے۔(۱)

---

(۱) مؤلف نے یہ مفہوم "فتح الباري" سے لیا ہے، لیکن اتنا زیادہ اختصار کیا ہے کہ لفظی ترجمہ کیا جائے تو سمجھنا مشکل ہے، جبکہ حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ مفہوم "الروض الأنف" سے اخذ کیا ہے، اور اختصار تو انہوں نے بھی کیا ہے تاہم اُسے سمجھنا آسان ہے۔ یہاں ہم براہ راست "الروض الأنف" کی عبارت کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں تا کہ بات پوری طرح سمجھ آ جائے۔ امام سہیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

یہاں لفظ "قصر" کے بجائے لفظ "بیت" کا استعمال الفاظ کے ظاہر کی مطابقت میں ہے، اور یہ اس لیے کہ سیدہ کا "بیت" اسلامی تربیت کے لحاظ سے اولین "بیت" ہے، جس وقت وہ ایمان لائیں روئے زمین پر اُن کے "بیت" کے علاوہ کوئی اور مسلم "بیت" نہیں تھا۔ نیز اُنہوں نے قلبی رغبت سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شادی کر کے اپنے گھر کو اولین "بیت الإسلام" بنایا تھا، اور یہ قاعدہ ہے کہ ہر فعل کی جزا کا بیان اُسی فعل کے الفاظ میں کیا جاتا ہے، اگر چہ وہ جزا حقیقت میں کتنی ہی اعلیٰ ہو۔ مثلاً حدیث میں ہے: "جس نے بے لباس مسلمان کو لباس پہنایا تو اللہ اُسے جنتی حلّوں کا لباس پہنائے گا، اور جس نے پیاسے مسلمان کو پلایا تو اللہ تعالیٰ اُسے رحیق مختوم سے پلائے گا۔ ایسے ہی یہ ارشادِ نبوی ہے: "جس نے اللہ کے لیے مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ اُس کی مثل اُس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا"۔ اِس سے مراد ہو بہو مسجد نہیں، لیکن عمارت کے مقابلے میں عمارت کا، لباس کے بدلے میں لباس کا اور پلانے کے بدلے میں پلانے کا ذکر کیا گیا۔ یہ فصاحت کے قواعد کی رو سے محض لفظی مماثلت ہے کہ سیدہ کی جزا کے ذکر میں اُن کے "بیت" کے مقابلہ میں "بیت" کا ذکر کیا گیا، ورنہ وہاں جو کچھ جزا کے طور پر دیا جائے گا اُسے کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں اور نہ ہی وہ کسی انسان کے تصور میں آ سکتا ہے۔ جزا کا نام لفظاً عمل کے مطابق آنے کی مثال میں یہ ارشاداتِ الٰہیہ بھی ہیں: =

١٠۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اُن کی طرف سلام کا آنا اِس طرف اشارہ ہے کہ اُن کی ذات اللہ جل جلالہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مختص تھی، اور یہ بات دین میں ایک عظیم اصل ہے کہ بندہ جتنا خود کو اللہ جل جلالہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کرے گا اتنا ہی اُس کے لیے سلامتی ہوگی۔

١١۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''لَاصَخَبَ فِيْهِ وَلَانَصَبَ'' صخب کا معنی ہے شور و غل اور نصب کا معنی ہے تھکاوٹ، یعنی اُس جنتی گھر میں یہ تکالیف نہیں ہوں گی۔ اِن الفاظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ سیدہ خدیجہ

= ﴿نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ (اُنہوں نے بھلا دیا ہے اللہ کو تو اُس نے بھی بھلا دیا اُن کو) [التوبة:٦٧] ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ (اور انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے مکر (یعنی اُس کا توڑ) کیا۔ [آل عمران:٥٤]''۔(1)

مطلب یہ ہے کہ بیتِ خدیجہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جزا میں لفظاً ''بیت'' آیا ہے۔ یہاں حافظ رحمہ اللہ نے ایک اور زاویہ سے بھی دل چسپ روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لفظ ''بیت'' ذکر کرنے میں ایک اور حکمت بھی ہے، وہ یہ کہ اہل بیتِ نبی کا محور سیدہ کی ذات ہے، اس لیے کہ ارشادِ الٰہی ﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ﴾ کی تفسیر میں ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدہ فاطمہ، علی، حسن اور حسین علیہم السلام کو بلایا، پھر اُن پر چادر ڈال کر فرمایا: اے اللہ: یہ میرے اہل بیت ہیں۔ الحدیث۔ اس حدیث کو امام ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ یہ تمام اہل بیت سیدہ خدیجہ کے گرد گھومتے ہیں، چنانچہ حسنین کریمین سیدہ فاطمہ سے ہیں، جبکہ سیدہ فاطمہ اُن کی بیٹی ہیں، اور سیدنا علی علیہ السلام نے سیدہ خدیجہ کے بیت میں پرورش پائی جبکہ وہ بچے تھے، پھر سیدنا علی کی سیدہ خدیجہ کے وصال کے بعد اُن کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ پس خانوادۂ نبوی کا رُخ سیدہ کے علاوہ کسی اور طرف نہیں جاتا''۔(2)

---

(1) الروض الأنف ج٢ ص٤٢٦، ٤٢٧، وط: ج١ ص ٤١٦، ٤١٧۔

(2) فتح الباري ج٨ ص٥٢٧۔

نے بیتِ نبوی کے امور کو نبھانے میں جو تھکاوٹ اور تکالیف اٹھائیں، یہ اُن کا بدلہ ہے۔ ہر خاتون کے لیے بالخصوص جب وہ اہل بیت سے ہو تو اُس کے لیے بھی ایسی بشارت میں حصہ ہے۔

۱۲۔ حافظ ابن حجر نے "فتح الباري" میں متنبہ کیا ہے کہ امام طبرانی نے از یونس سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اُن کی شان میں بھی سیدہ خدیجہ کی مانند بارگاہ الٰہی سے سلام آیا، لیکن یہ روایت شاذ ہے، اسی لیے حافظ نے اس کے بطلان پر تنبیہ فرمائی ہے۔(۱)

تئیسویں حدیث

عکرمہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار لکیریں کھینچیں پھر فرمایا: تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ اِس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اہل جنت کی خواتین میں سب سے افضل خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد، مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم فرعون کی بیوی ہیں۔

یہ سند صحیح ہے، اِس کو امام عبد بن حُمید نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے، اور اِس کو امام احمد، امام نسائی اور دوسرے محدثین نے داود سے اسی طرح روایت کیا ہے، اور اِس کے متعدد شواھد بھی موجود ہیں۔(۲)

۲۳ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اِس میں بضعۂ نبویہ (لختِ جگرِ مصطفیٰ) اور اُن کی اَمّی رضی اللہ عنہما کی عظیم فضیلت ہے کہ وہ کائنات

---

(۱) فتح الباري ج۸ص ۵۲۹۔

(۲) المنتخب من مسند عبد بن حمید ج۱ ص ٤٦١ حدیث ٥٩٥؛ مسند أحمد ج۱ ص ۲۹۳، ۳۱٦، ۳۲۲ وط: [شاکر] ج۳ ص ۱۹۳ حدیث ۲٦٦۸ وص ۲۷۹ حدیث ۲۹۰۳، وص ۳۳۰ حدیث ۹٦۰؛ السنن الکبری للنسائي ج۷ص ۳۸۹، ۳۹۱ حدیث ۸۲۹۹، ۸۳۰٦؛ مسند أبي یعلیٰ ج٥ ص ۱۱۰ حدیث ۲۷۲۲؛ صحیح ابن حبان ج۱٥ ص ٤۷۰ حدیث ۷۰۱۰؛ شرح مشکل الآثار ج ۱ ص ۱٤۰ حدیث ۱٤۸؛ المستدرك للحاکم ج۳ ص ۱۸٥، وط: ج۳ ص ۲۰٥ حدیث ٤۸٥۲۔

کی اُن چار افضل خواتین میں سے ہیں جن میں دوحضرت مریم وآسیہ ہیں۔

۲۔ یہاں ''أفضل'' کا لفظ اُن لوگوں کی دلیل ہے جو فضیلت میں سیدہ فاطمہ اور خدیجہ کو سیدہ عائشہ پر مقدم کہتے ہیں، جیسا کہ اہل علم کی ایک جماعت کا مذہب ہے۔

اِس مذہب کی تائید میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباري'' میں امام بزار اور امام طبرانی سے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع روایت ذکر کی ہے:

''سیدہ خدیجہ کی میری امت کی خواتین پر ایسی فضیلت ہے جیسی سیدہ مریم کی عالمین کی خواتین پر''۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ فتح الباری کی عبارت ختم ہوئی۔ (۱)

لیکن اِس میں اعتراض ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث امام ابن جریر طبری نے روایت کی ہے، طبرانی نے نہیں، لہٰذا یہاں یا تو راویوں کے نام تبدیل ہوگئے یا پھر یہ سبقتِ قلم ہے۔

راوی بھی اِس میں عمار بن یاسر نہیں بلکہ عمار بن سعد القرظ ہے، جنہوں نے اِن کو صحابہ میں شمار کیا ہے اُنہیں وہم ہوا ہے۔ اِس روایت میں ابن لھیعہ کو اضطراب ہوا ہے، کیونکہ عمار بن سعد مذکور سے جس نے روایت کیا ہے وہ ابو یزید حمَیری مصری ہے، جو مجھول ہے، تو پھر یہ حدیث حسن کیونکر ہوگئی؟ لہٰذا اِس حدیث کی کوئی حاجت نہیں۔ زیرِ تشریح حدیث ہی سیدہ کی افضلیت میں صریح ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ''أفضل'' اور ''أربعة خطوط'' میں غور فرمایئے۔

اہل سنت کے درمیان اِس مسئلہ میں اختلاف قدیم اور معروف ہے اور اِس سلسلے میں اُن کے تین قول ہیں۔ ایک یہی، دوسرا اِس کے برعکس اور تیسرا عدم تفضیل کا ہے، کیونکہ اِن خواتین میں سے ہر ایک کی کسی نہ کسی جہت سے فضیلت ہے۔ یہی قول قوی ہے اور اِس مسئلہ سے عمل کا کوئی تعلق نہیں۔ (۲)

---

(۱) فتح الباري ج۸ ص ۵۲۲۔

(۲) نہ معلوم ''ولا یترتب علی المسألة عمل'' سے مؤلف کی کیا مراد ہے؟

اگر اِس سے اُن کی مراد یہ ہے کہ اُن خواتین میں سے کسی خاتون کی افضلیت کے علم سے دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو یہ درست نہیں، اس لیے کہ اِن چاروں خواتین میں سے ہر ایک کی سیرت میں غور کرنے سے =

۳۔ بعض علماء نے سیدہ فاطمہ اور سیدہ خدیجہ پر سیدہ مریم کی افضلیت کی دلیل اُس حدیث سے لی ہے جسے زبیر بن بکار نے اپنی کتاب ''أزواج النبي'' میں از محمد بن حسن، از عبدالعزیز بن محمد، از موسیٰ بن عقبہ، از کُریب از ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''اہل جنت کی خواتین کی سیدات مریم بنتِ عمران، پھر فاطمہ، پھر خدیجہ، پھر آسیہ فرعون کی بیوی ہیں۔(۱)

اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو اختلاف رفع ہو جاتا مگر یہ جھوٹی ہے، اور جھوٹ کی یہ آفت محمد بن حسن بن زبالہ سے ہے، متعدد ائمہ نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے، اور اِس میں اُن ائمہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ امام ابوداود اور دوسرے محدثین نے از عبدالعزیز بن محمد، از ابراہیم بن عقبہ، از کریب، از ابن عباس زیر بحث حدیث کی طرح ''واؤ'' کے ساتھ روایت کی ہے ''ثُمَّ'' کے ساتھ نہیں، اور یہی سند اور متن کے لحاظ سے محفوظ ہے۔

یہاں اس روایت کے متعلق ایک اور تنبیہ یہ ہے کہ اِس کو امام ابوالعباس قرطبی نے ''المفهم'' میں

= اُس کی سیرت کو اپنانے کا دل میں داعیہ پیدا ہوتا ہے، اسی لیے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ.

''یقیناً اُن کے قصوں میں سمجھداروں کے لیے عبرت کا حصہ ہے''۔(یوسف: ۱۱۱)

دوسری بات یہ ہے کہ سب سے افضل کے تعیّن میں جب انسان دلائل و براہین کی تحقیق و جستجو کرتا ہے تو اُسے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ اُس کے ذہن میں پہلے سے جو سماعی اور نقلی مواد موجود ہوتا ہے، اُس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ اُس کی عقلی پرواز مزید بلند ہو جاتی ہے اور وہ جمود و تعطّل سے محفوظ رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء کرام نے اِن چاروں خواتین کی افضلیت کی ترتیب پر غور و خوض کیا تو وہ اِن میں سے سب سے افضل خاتون کے تعیّن میں کامیاب ہوئے، جیسا کہ ہم اس سے قبل آٹھویں حدیث کی تشریح میں بیان کر چکے ہیں۔

(۱) أزواج النبي لمحمدبن حسن بن زباله ص۳۶، ۳۷۔

امام ابن عبدالبر کی "الاستیعاب" سے از زبیر بن بکار، از محمد بن حسین روایت کیا ہے اور یہ تصحیف ہے، صحیح یہ ہے کہ اِس میں راوی محمد بن حسن ہے اور یہی ابن زبالہ ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔ اسی تصحیف (لکھا ہوا پورا سمجھ نہ آنے کی وجہ سے غلطی کا شکار ہونا) کی وجہ سے امام قرطبی نے اس روایت کو حسن قرار دے دیا ہے۔

امام ابن عبدالبر نے اِس کے شذوذ کو ظاہر کیا ہے اور محفوظ یہ ہے کہ یہ روایت ابوداود سے ہے۔ (۱)

حافظ نے "فتح الباري" میں کہا ہے: "یہ حدیث ثابت نہیں"۔ یہ الفاظ نرم ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت باطل ہے، کیونکہ ابن زبالہ پر کذب کا الزام ہے، اُس نے سند اور متن کے ساتھ عبث کام کیا ہے، پس اللہ تعالیٰ اگلے پچھلے تمام ائمہ حدیث پر رحمت فرمائے۔

٤۔ اگر کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے جو لکیریں کھینچی ہیں اُن کا کیا فائدہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ احادیث کے عمیق مطالعہ اور نبی کریم ﷺ کی سیرت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جب آپ کسی بات کو مؤکد اور ذہن نشین کرانے کا ارادہ فرماتے تو قول کو فعل سے مؤکد فرماتے، واللہ اعلم۔

٥۔ اس میں سیدہ مریم اور آسیہ کی عظیم منقبت ہے کہ اُنہیں اہل جنت کی سادات خواتین سے بیان کیا گیا ہے۔

٦۔ اِس میں اُن لوگوں کی تردید ہے جو سیدہ مریم کی نبوت کے قائل ہیں۔ اگر وہ نبیہ ہوتیں تو ذکر اور فضیلت میں اولیاء کے ساتھ مذکور نہ ہوتیں، کیونکہ بالاجماع نبی کا مقام ولی کے مقام سے بلند ہے۔

اگر کہا جائے کہ پھر تم ارشادِ الٰہی ﴿وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَا ئِكَةُ يَا مَرْيَمُ﴾ (جب کہا فرشتوں نے اے

---

(۱) واقعی "الاستیعاب" میں محمد بن حسن کے بجائے محمد بن حسین مرقوم ہے، یقیناً اِس سے امام ابوالعباس قرطبی رحمۃ اللہ علیہ دھوکہ کا شکار ہو گئے۔ (1)

جبکہ یہ روایت محمد بن حسن بن زبالہ سے ہی روایت کی گئی ہے، جیسا کہ ہم اوپر براہِ راست اُس کی کتاب کا حوالہ دے چکے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں دکتور محمد اکرم ضیاء العمری نے کافی تفصیل کے بعد ابن زبالہ کے بارے میں وہی فیصلہ دیا ہے جو مؤلف دے چکے ہیں، یعنی ابن زبالہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

---

(1) المفهم ج٦ ص ٣١٥؛ الاستيعاب ج٢ ص ٥٠٨۔

مریم)[آل عمران: ٤٢] کا کیا جواب دوگے؟

جواب: ملائکہ کی گفتگو اور نبوت لازم وملزوم نہیں، ورنہ اِس سے زیادہ صریح الفاظ بھی ہیں اور وہ وحی کے الفاظ ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَوْحٰى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ﴾ (اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی فرمائی)[النحل: ٦٨] اور فرشتوں نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سلام کیا اور اِس کے علاوہ دوسری کرامات بھی فرشتوں سے متعلق ہیں، بلکہ اِس اِرشادِ الٰہی میں غور کیجئے: ﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيْقَةٌ﴾ (نہیں مسیح بن مریم مگر ایک رسول، گزر چکے ہیں اُن سے پہلے کئی رسول، اور اُن کی ماں بڑی صدیقہ تھیں) [المائدة: ٧٥] اللہ تعالیٰ نے مقام نبوت اور ولایت میں کیسے فرق کر دیا ہے؟ اور اِس ارشادِ الٰہی میں عموم اور حصر کے صیغے میں ذرا غور فرمایئے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ إِلَيْهِمْ﴾ (اور ہم نے نہیں بنایا آپ سے پہلے رسول مگر مردوں کو، وحی بھیجتے ہیں ہم اُن کی طرف)[النحل: ٤٣] حتیٰ کہ امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں فرمایا ہے:

> ''مریم وآسیہ کی نبوت کا قول ضعیف اور غریب ہے اور اُنہوں نے اُن کی عدم نبوت پر اجماع نقل کیا ہے''۔(۱)

۷۔ اِس حدیث میں اِس امت کی بھی فضیلت ہے، اِس لحاظ سے کہ اِس امت سے جنت کی دو سردار خواتین ہیں یعنی سیدہ فاطمہ اور سیدہ خدیجہ، جبکہ دوسری تمام امتیں باقی دو جنتی سردارہ خواتین میں مشترک ہیں اور وہ سیدہ مریم اور آسیہ ہیں، رضی اللہ عنہن۔

۸۔ اِس میں اہل بیت کرام کی عظیم فضیلت ہے، اِس لحاظ سے کہ اہل بیت کو دو جنتی سردارہ خواتین سے مختص فرمایا گیا ہے، اور ایسی خصوصیت کائنات کے اعلیٰ خانوادوں میں سے کسی خانوادہ کو حاصل نہیں۔(۲)

---

(۱) المنهاج للنووي ج١٥ ص٢٨٥ حديث ٢٤٣١۔

(۲) اِس حدیث کے الفاظ اور مؤلف کے آخری دو فائدوں میں غور کیا جائے تو اِس میں اُن لوگوں کی تردید ہے جو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ام المومنین سیدہ خدیجہ اور سیدہ نساء اہل الجنۃ فاطمہ رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتے ہیں، کیونکہ کائنات کی سردار یہ چار خواتین ہیں اور اِن میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا نام نہیں ہے۔

چوبیسویں حدیث

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مردوں میں بہت باکمال ہوئے اور خواتین میں سے ماسوا مریم بنت عمران اور آسیہ فرعون کی بیوی کے اور کوئی نہیں ہوئی، اور سیدہ عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت دوسرے کھانوں پر۔

یہ سند صحیح اور انتہائی عالی ہے، یہ امام ابن ماجہ نے روایت کی ہے، اور اسے امام بخاری اور مسلم نے محمد بن بشار سے اسی طرح روایت کیا ہے۔(١)

چوبیسویں حدیث سے ماخوذ مسائل

١۔ اس میں ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی فضیلت ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں دوسری عورتوں پر ایسی فضیلت دی جیسی فضیلت ثرید کی باقی کھانوں پر ہے۔

٢۔ اس میں سیدہ مریم اور آسیہ رضی اللہ عنہما کی فضیلت ہے کہ اُن کے کمال کی شہادت دی گئی ہے۔

٣۔ امام ابن القیم نے ''الهَدْي'' میں لکھا ہے:

''ثرید روٹی اور شوربے کا مرکب ہوتی ہے، روٹی افضل غذا ہے اور گوشت تمام سالنوں کا سردار ہے، جب یہ دونوں جمع ہو جائیں تو پھر کوئی مزید غذائی ضرورت باقی نہیں رہتی''۔(٢)

پس اِس میں اِن دونوں کے عظیم فائدے اور فضیلت کی دلیل ہے۔

٤۔ امام نووی ''**شرح مسلم**'' میں فرماتے ہیں:

''لفظ ''**الكمال**'' کا اطلاق کسی چیز کے تمام اور اپنے باب میں پورے ہونے

---

(١) سنن ابن ماجه: كتاب الأطعمة، باب فضل الثريد على الطعام، حديث ٣٢٨٠؛ بخاري: كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ: وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَأَتَ، حديث ٣٤١١؛ مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة أم المؤمنين رضي الله عنها، حديث ٢٤٣١۔

(٢) زادالمعاد ج ٤ ص ٢٧١۔

پر ہوتا ہے، لہٰذا یہاں مراد ہے فضائل، نیکیوں اور تقویٰ میں کامل ہونا‘‘۔(١)

٥۔ ارشادِ نبوی ﷺ ’’**ولم یکمل......**‘‘ پر علماء نے فرمایا ہے: اُن دونوں (مریم وآسیہ) کو اُن کے زمانے میں کمال سے مختص فرمایا گیا ہے، تمام جہانوں کی خواتین میں کمال فقط ان دونوں میں مقید نہیں۔ میں کہتا ہوں: اس کی تائید اُس صحیح حدیث سے ہوتی ہے جو سیدہ فاطمہ اور خدیجہ کے مناقب میں آئی ہے کہ وہ اہل جنت کی خواتین سے افضل ہیں۔

رہے اس حدیث کے یہ الفاظ ’’**ولم یکمل من النساء إلا آسیة امرأة فرعون ومریم ابنة عمران وخدیجة بنت خویلد**‘‘ تو یہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کیے ہیں اور اِن کو صحیحین کی طرف منسوب کیا ہے۔(٢)

متأخرین کی ایک جماعت نے حافظ ابن کثیر کی پیروی کی ہے، حالانکہ یہ اُن سب کا سہو ہے، رحمھم اللہ۔ صحیحین میں اِس مقام پر سیدہ خدیجہ کا ذکر نہیں ہے، البتہ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں از مثنیٰ بن ابراہیم الآملی، از آدم بن ابی ایاس، از شعبہ روایت کیا ہے اور یہ الفاظ زائد ہیں: ’’**وخدیجة بنت خویلد وفاطمة بنت محمد**‘‘ جبکہ ایک جماعت نے اِس اضافہ کے بغیر اس کو روایت کیا ہے۔ اِس میں مثنیٰ مجہول ہے، لیکن ابو اسامہ حماد بن اسامہ نے از شعبہ اس اضافہ میں اس کی متابعت کی ہے، جیسا کہ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے ’’**البدایة والنهایة**‘‘ میں اس کو ابن مردَویہ کی تفسیر سے از شعبہ، از معاویہ بن قرۃ، از والد خود مرفوعاً بایں الفاظ نقل کیا ہے: ’’**إلا ثلاث: مریم بنت عمران وآسیة امرأة فرعون وخدیجة بنت خویلد...**‘‘ اور کہا: شعبہ تک یہ سند صحیح ہے۔(٣)

اس میں غرابت ہے، پس اگر یہ اضافہ محفوظ ہو تو فبہا ورنہ یہ تفضیل عالمین کی خواتین پر کمال کا تقاضا کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

---

(١) شرح صحیح مسلم ج١٥ ص٢٨٥۔

(٢) تفسیر ابن کثیر ج١٤ ص٦٧ تحت التفسیر: التحریم، آیة: ١٢۔

(٣) الکشف والبیان للثعلبي ج٩ ص٣٥٣؛ البدایة والنهایة ج٢ ص٤٣٠، ٤٣١۔

٦۔ سیدہ مریم اور آسیہ رضی اللہ عنہما کو اکٹھے ذکر کرنے میں ایک لطیف نکتہ ہے، جس کی طرف محققین کی ایک جماعت نے اشارہ کیا ہے، اُن میں سے ایک حافظ ابن کثیر بھی ہیں، (١) اور وہ یہ کہ ان دونوں نے ایک ایک نبی کی اُن کے بچپن میں کفالت کی اور اپنی شفقت کا سایہ اُن پر پھیلایا۔ (٢)

٧۔ اس میں دلیل ہے کہ کائنات میں جس عمل کا اجر تمام اعمال سے بڑا ہے وہ دعوتِ الٰہی کی حمایت ونصرت ہے، اور واللہ اعلم یہی وجہ ہے کہ ان تمام سیدات کریمات کی تفصیل کو اِس حدیث میں یکجا بیان کیا گیا، رضی اللہ عنہن ۔ (٣)

٨۔ حافظ ابن کثیر نے ''**البداية و النهاية**'' میں کہا ہے: ارشادِ نبوی ''**فضل عائشة على النساء**'' میں اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ یہ عموم پر ہو، اور مذکورہ اور غیر مذکورہ خواتین سب کے لیے عام ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ خواتین کو چھوڑ کر باقی خواتین کے بارے میں ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کلام سیدہ عائشہ اور دوسری خواتین کے مابین برابری کے احتمال پر موقوف ہو۔ بہر حال جو شخص اِن میں سے کسی ایک خاتون کو باقی خواتین پر ترجیح دے گا تو اُسے کوئی دوسری دلیل بیان کرنا ہوگی۔ (٤) (٥)

---

(١) البداية والنهاية ج٢ ص ٤٣١؛ اللؤلؤ المكنون في سيرة النبي المأمون ج١ ص ٤٢٠۔

(٢) سیدہ مریم کا ایک نبی کی کفالت وتربیت کرنا محتاجِ بیان نہیں، کیونکہ وہ نبی اُن کے حقیقی بیٹے تھے، جبکہ اکثر لوگ فرعون کی بیوی سیدہ آسیہ کے بارے میں بھی جانتے ہیں کہ اُنہوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنایا تھا اور اُن کی کفالت وتربیت فرمائی تھی۔ سبحان اللہ۔ **هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ**.

(٣) راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اِس لطیف نکتہ کی روشنی میں ذرا اُس ہستی کی شان کا اندازہ لگایئے جنہوں نے آخر الزماں نبی کی اُن کے بچپن میں نہ صرف یہ کہ کفالت وتربیت کی بلکہ اعلانِ نبوت کے بعد اُن کی تبلیغ کی بھی بھرپور حمایت کی!!

(٤) البداية والنهاية ج٤ ص ٣٢٤۔

(٥) جی ہاں علماءِ اسلام نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کائنات کی تمام خواتین پر ترجیح دی ہے اور اُنہوں نے اس پر دلائل بھی دیے ہیں۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل حدیث نمبر آٹھ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

۹۔ اگر کہا جائے کہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ثرید سے تشبیہ دینے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: عرب کے نزدیک ثرید اپنے عظیم فوائد کی وجہ سے اور کھانے والے کو دوسرے کھانوں سے بے نیاز کر دینے کے لحاظ سے مکمل غذا ہے۔ پس آپ ﷺ نے اِس مثال سے اُس فائدے سے آگاہ فرمایا ہے جو مستقبل میں علم اور دین کے بارے میں ام المومنین رضی اللہ عنہا سے حاصل ہونے والا تھا، یقیناً جیسے آپ نے خبر دی تھی واقعتاً ایسا ہی ہوا۔ سو اُن سے ہمیں صحیح علم پہنچا، وہ احکام کی احادیث اور بیتِ نبوی میں مخفی احوال اور سنتوں کے بیان میں یکتا تھیں، حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُن کے علم کے محتاج تھے، اور یہ اُن کی ایسی خصوصیت ہے کہ اِس میں عالمین کی خواتین میں سے اُن کی کوئی شریک نہیں۔

۱۰۔ اِس میں دلیل ہے کہ عورت کی خوبیوں میں سے اشرف ترین خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کے علم میں وسیع ہو۔ پس حرمِ نبوی ﷺ میں آنے کے بعد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم اُن کی واضح ترین خوبی تھی، اُنہیں ثرید سے تشبیہ اسی لیے دی گئی کہ اُن سے علمی توانائی حاصل ہوتی تھی، حتیٰ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب بھی کوئی علمی اشکال پیش آیا تو ہم نے سیدہ عائشہ سے پوچھا اور اُن کے پاس اُس کے بارے میں علم پایا۔ اس کو امام ترمذی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔(۱)

پچیسویں حدیث

نبی کریم ﷺ کی زوجہ اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کرتے تو ازواج کے مابین قرعہ اندازی فرماتے، جس کے نام کا قرعہ نکل آتا اس کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ ایک غزوہ میں جا رہے تھے، آپ نے ہمارے درمیان قرعہ اندازی کی، اس میں میرے نام کا قرعہ نکل آیا، میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روانہ ہوگئی، یہ حجاب نازل ہونے کے بعد کا واقعہ تھا، مجھے اپنے ہودج میں سوار کیا جاتا اور جہاں ہم قیام کرتے وہاں مجھے ہودج سے اتار لیا جاتا، حتیٰ کہ جب رسول اللہ ﷺ جہاد سے فارغ ہو کر واپس آئے اور ہم مدینہ کے قریب پہنچے، آپ ﷺ نے ایک رات کوچ کا اعلان کر دیا، جب آپ نے کوچ

---

(۱) الجامع الكبير وهو سنن الترمذي ج٦ ص ١٨٢ حديث ٣٨٨٣۔

کا اعلان کیا تو میں اُٹھ کر لشکر سے دور نکل گئی، قضائے حاجت کے بعد میں اپنے کجاوہ کی طرف آئی، میں نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا تو یمن کی سیپوں کا جو ہار میں پہنے ہوئے تھی وہ نہیں تھا، میں واپس لوٹ کر ہار تلاش کرنے لگی اور اس کی کھوج میں مشغول ہوگئی، جو لوگ میرا کجاوہ اٹھاتے تھے جب وہ آئے تو انہوں نے میرا کجاوہ اٹھا کر میری سواری کے اونٹ پر رکھ دیا، اُن کا خیال تھا کہ میں کجاوے میں موجود ہوں، چونکہ اس زمانہ میں عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں، گوشت سے بھرپور اور فربہ نہیں ہوتی تھیں، بہت کم کھانا کھاتی تھیں، اس لیے ان لوگوں نے جب کجاوہ اٹھا کر اونٹ پر رکھا تو اُن کی توجہ کجاوے کے کم وزن کی طرف نہ گئی، اور میں ویسے بھی کم سن لڑکی تھی، انہوں نے اونٹ کو اٹھایا اور روانہ ہوگئے لشکر روانہ ہونے کے بعد مجھے ہار مل گیا، میں ان کے پڑاؤ پر آئی مگر وہاں پر کوئی پکارنے والا تھا نہ جواب دینے والا، میں نے اپنی اُس جگہ کا قصد کیا جہاں پر میں پہلے تھی، اور میرا خیال تھا کہ لوگ جب مجھے گم پائیں گے تو میری طرف لوٹیں گے، جس وقت میں اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی تو نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو میں سوگئی، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔

صفوان بن معطل سلمی ذکوانی رضی اللہ عنہ اخیر شب میں لشکر کے پیچھے رہ گئے تھے، وہ روانہ ہوئے اور علی الصبح میری جگہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے ایک سوئے ہوئے انسان کا وجود دیکھا تو وہ میرے پاس آئے، انہوں نے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا، کیونکہ حجاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے دیکھا ہوا تھا، انہوں نے مجھے پہچان کر "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھا اور میں اُن کی آواز سے بیدار ہوگئی، میں نے اپنے چہرے پر چادر ڈال لی، خدا کی قسم! انہوں نے "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کے سوا کوئی بات نہ کی، انہوں نے اونٹنی کو اس کے اگلے پیروں پر بٹھایا اور میں اس اونٹنی پر سوار ہوگئی، حتیٰ کہ لشکر کے پڑاؤ ڈالنے کے بعد ہم اس سے آ کر مل گئے، لشکر والے ٹھیک دوپہر کے وقت پہنچے، میرے اس واقعہ میں جس شخص نے اپنی ہلاکت کا سامان کیا سو کیا، اور سرغنہ عبداللہ بن ابی ابن السلول تھا۔ بہر حال ہم مدینہ پہنچ گئے اور میں وہاں پہنچتے ہی ایک ماہ تک بیمار رہی، لوگ بہتان تراشوں کے الزام میں مشغول رہے، جبکہ میں ان تمام باتوں سے بے خبر تھی، البتہ اُس بیماری میں میرے لیے یہ بات باعث اذیت تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا جو لطف و کرم مجھ پر پہلے کسی بیماری میں ہوتا تھا، اب وہ نہیں رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ آنے کے بعد صرف سلام کرتے، پھر

فرماتے تمہارا کیا حال ہے؟ اس سے مجھے شک پڑتا تھا مگر مجھے حالات کی خرابی کا علم نہیں تھا، حتیٰ کہ میں شفایاب ہونے کے بعد ایک دن قضائے حاجت کے لیے مناصع کی طرف نکلی، وہی ہماری قضائے حاجت کی جگہ تھی، میرے ساتھ اُم مسطح بھی تھی، اور ہم فقط رات کو ہی نکلتے تھے، اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہم نے اپنے گھروں کے قریب بیت الخلاء نہیں بنائے تھے۔ پس میں اور ام مسطح چل پڑیں، ام مسطح ابورہم بن مطلب بن عبد مناف کی بیٹی تھی اور اس کی والدہ ام صخر بن عامر تھی، جو کہ حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کی خالہ تھی اور اس کا بیٹا مسطح بن اثاثہ بن عباد بن عبد المطلب تھا۔ پس میں اور ام مسطح اپنی ضرورت سے فارغ ہو کر واپس گھر کو آ رہی تھیں کہ ام مسطح چادر میں الجھ کر گر گئی، اس پر وہ کہنے لگی: مسطح ہلاک ہو جائے۔ میں نے کہا: تم نے بری بات کہی، کیا تم ایسے شخص کو برا کہہ رہی ہو جو بدر میں حاضر ہوا تھا؟ انہوں نے کہا: اے خاتون! کیا آپ نے نہیں سنا کہ اُس نے کیا کہا؟ میں نے پوچھا: کیا کہا؟ اِس پر انہوں نے بہتان تراشوں کی پوری داستان سنا دی، جسے سنتے ہی میری بیماری میں اضافہ ہو گیا، جب میں گھر پہنچی تو رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، سلام کیا اور پوچھا: تمہارا کیا حال ہے؟ میں نے کہا: کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں؟ میں چاہتی تھی کہ میں اپنے ماں باپ سے اس خبر کی تحقیق کروں، مجھے رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی، میں اپنے والدین کے پاس گئی، میں نے اپنی امی سے کہا: امی جان! یہ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: بیٹی! اپنے حواس پر قابو رکھو، بخدا ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کے نزدیک بہت خوبصورت ہو، وہ اس سے محبت کرتا ہو، اس کی سوکنیں بھی ہوں اور پھر وہ اس کے خلاف کوئی بات نہ بنائیں۔ میں نے کہا: سبحان اللہ، کیا لوگ اس طرح کی بات بھی کر سکتے ہیں؟ ماں نے کہا: بالکل۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: پھر میں ساری رات روتی رہی، میرے آنسو نہ رکے، اور نہ ہی نیند کے لیے پلک جھپکی، پھر میں صبح کو بھی روتی رہی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب اور اُسامہ بن زید ﷛ کو بلایا، آپ ان سے اپنی اہلیہ کو علیحدہ کرنے کے متعلق مشورہ کرنا چاہتے تھے، اس وقت وحی نازل نہیں ہوئی تھی، حضرت اسامہ بن زید ﷛ نے تو رسول اللہ ﷺ کو آپ کی اہلیہ کی براءت کا اشارہ دیا، اور وہ بات کہی جسے وہ اپنے خیال میں بہتر سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے کہا: یا رسول اللہ! وہ آپ کی

اہلیہ ہیں اور ہمیں ان کے متعلق صرف پارسائی کا یقین ہے، البتہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی اور ان کے سوا اور بھی عورتیں ہیں، اور اگر آپ (ان کی) باندی سے دریافت فرمائیں تو وہ آپ کو صحیح بات بتائے گی۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور پوچھا: کیا تم نے ایسی چیز دیکھی ہے جس سے تم کو عائشہ کے متعلق کوئی شک ہو؟ انہوں نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا، میرے علم کے مطابق اگر کوئی چیز اُن میں باعث عیب ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ کم سن لڑکی ہیں اپنے گھر کا آٹا گوندھتے گوندھتے سو جاتی ہیں اور بکری آ کر وہ آٹا کھا جاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اٹھ کر عبد اللہ بن ابی ابن السلول کے بارے میں وضاحت چاہی، منبر پر جلوہ افروز ہو کر فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت! اس شخص کے بارے میں مجھے کون جواب دے گا جس نے مجھے میرے اہل خانہ کے معاملہ میں اذیت پہنچائی ہے، بخدا میں اپنے اہل کے متعلق پاکیزگی کے سوا کچھ نہیں جانتا، اور لوگوں نے جس شخص کا نام لیا ہے، میں اس کے متعلق بھی پاکیزگی کے سوا کچھ نہیں جانتا، وہ جب بھی میرے گھر میں داخل ہوا تو میرے ساتھ ہی داخل ہوا۔ حضرت سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! میں آپ کو اس شخص کی طرف سے جواب دیتا ہوں، اگر وہ شخص قبیلہ اَوس میں سے ہو تو ہم اس کی گردن ماردیں گے اور اگر وہ ہمارے بھائی خزرج میں سے ہو تو آپ اس کے متعلق حکم دیں ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ اس پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، وہ خزرج کے سردار تھے اور نیک شخص تھے، لیکن قبائلی تعصب نے ان کو بھڑکا دیا، انہوں نے حضرت سعد بن معاذ سے کہا: تم نے جھوٹ بولا، اللہ کی قسم تم اس کو قتل کرو گے نہ کر سکو گے۔ سعد بن معاذ کے چچازاد حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے حضرت سعد بن عبادہ سے کہا: تم نے جھوٹ بولا، بہ خدا ہم اس کو ضرور قتل کریں گے، تم خود بھی منافق ہو اور منافقوں کی طرف سے لڑ رہے ہو، پھر اوس اور خزرج دونوں قبیلے جوش میں آ گئے، اور ایک دوسرے سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو مسلسل ٹھنڈا کرتے رہے، حتیٰ کہ وہ لوگ خاموش ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی خاموش ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں سارا دن روتی رہی، میرے آنسو رکے اور نہ ہی مجھے نیند

آئی۔ میرے والدین کو خدشہ محسوس ہوا کہ اس قدر رونے سے میرا جگر پھٹ جائے گا، پس ابھی میرے والدین میرے پاس بیٹھے تھے اور میں رو رہی تھی کہ انصار کی ایک خاتون نے آنے کی اجازت مانگی، میں نے اسے اجازت دی تو وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر رونے لگی، ابھی ہم اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور بیٹھ گئے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: جب سے میرے متعلق یہ افواہیں اُڑ رہی تھیں، آپ میرے پاس نہیں بیٹھے تھے اور ایک ماہ سے میرے متعلق آپ ﷺ کے پاس کوئی وحی نہیں آئی تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے بیٹھ کر کلمۂ شہادت پڑھا، پھر فرمایا: اے عائشہ! مجھے تمہارے متعلق ایسی ایسی خبر پہنچی ہے، اگر تم (اس تہمت سے) بَری ہو تو عنقریب اللہ تعالیٰ تمہاری برأت ظاہر فرما دے گا، اور اگر (بالفرض) تم اس گناہ میں ملوث ہوگئی ہو تو اللہ تعالیٰ سے توبہ اور استغفار کرو، کیونکہ جب بندہ اپنے گناہ کا اعتراف کرے اور پھر توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات ختم کر لی تو میرے آنسو خشک ہو گئے، حتیٰ کہ مجھے ایک قطرہ بھی محسوس نہ ہوا۔ میں نے اپنے والد سے کہا: آپ میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو اِن باتوں کا جواب دیں۔ انہوں نے کہا: بخدا مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کو کیا عرض کروں؟ میں نے اپنی والدہ سے کہا: آپ میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں۔ انہوں نے (بھی) کہا: بخدا مجھے نہیں معلوم کہ میں رسول اللہ ﷺ سے کیا کہوں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں ایک کم عمر لڑکی ہوں، میں بہت زیادہ قرآن مجید نہیں پڑھتی، بخدا مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں نے اس تہمت کو سن لیا ہے اور یہ تمہارے دلوں میں گھر کر گئی ہے، اور تم اسے تسلیم کر چکے ہو۔ سو اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں بَری ہوں اور اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے کہ میں بری ہوں، تو تم میری تصدیق نہیں کرو گے، اور اگر میں اس گناہ کا اعتراف کر لوں حالانکہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ میں اس گناہ سے بَری ہوں تو تم میری تصدیق کرو گے۔ خدا کی قسم! میں اپنے اور تمہارے درمیان صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے والد کی مثال پاتی ہوں، جنہوں نے کہا تھا: ﴿میں صبر جمیل کرتا ہوں اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کے خلاف میں نے اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی ہے﴾ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: پھر میں جا کر لیٹ گئی اور بخدا مجھے یقین تھا کہ میں بَری ہوں اور اللہ تعالیٰ میری برأت ظاہر کر دے گا، لیکن اللہ کی قسم! یہ بات میرے وہم و گمان میں

بھی نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے متعلق قرآن مجید میں وحی نازل فرمائے گا، میں اپنی حیثیت اس سے کم سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے متعلق ایسا کلام نازل فرمائے گا جس کی (قیامت تک) تلاوت کی جاتی رہے گی، تاہم مجھے یہ امید تھی کہ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ کو نیند میں کوئی ایسا خواب دکھا دے گا، جس میں اللہ تعالیٰ میری برأت ظاہر فرمائے گا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: بخدا ابھی رسول اللہ ﷺ اپنی مجلس سے اٹھے تھے اور نہ ہی اٹھنے کا قصد کیا تھا اور نہ ہی گھر والوں میں سے کوئی اور باہر گیا تھا کہ اللہ ﷻ نے اپنے نبی ﷺ پر وحی نازل فرمائی، اور نبی ﷺ پر نزول وحی کے وقت جو شدت طاری ہوتی تھی وہ طاری ہوگئی، حتیٰ کہ اس انتہائی ٹھنڈے دن میں بھی آپ ﷺ سے پسینہ کے قطرات موتیوں کی طرح ٹپکنے لگے، جب رسول اللہ ﷺ سے وہ کیفیت دور ہوگئی تو آپ ہنس رہے تھے اور آپ نے جو پہلی بات کی وہ یہ تھی: اے عائشہ تم کو مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری براءت ظاہر کردی، میری والدہ نے مجھ سے کہا: حضور کے سامنے کھڑی ہو (اور شکریہ ادا کرو) میں نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گی جس نے میری براءت نازل فرمائی، اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی تھیں: ﴿بے شک تم لوگوں میں سے جس جماعت نے تہمت لگائی ہے﴾ یہ دس آیات تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے میری پاکیزگی میں نازل فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسطح سے قرابت اور اس کی تنگ دستی کی وجہ سے اس کو خرچ دیا کرتے تھے، (اور وہ تہمت لگانے والوں میں شامل تھے) حضرت ابوبکر نے کہا: مسطح نے جو عائشہ پر تہمت لگائی ہے، بخدا اس کے بعد میں اس کو کبھی خرچ نہیں دوں گا، اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرئیں: ﴿اور تم میں جو لوگ صاحب فضل اور صاحب وسعت ہیں وہ یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (کچھ) نہ دیں گے، اور انہیں چاہیئے کہ وہ معاف کردیں اور درگذر کریں، (اے ایمان والو!) کیا تم پسند نہیں کرتے کہ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے﴾ عبد اللہ بن مبارک نے کہا: سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق قرآن میں سے زیادہ امید افزا یہ آیت ہے (جب یہ آیت نازل ہوئی تو) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: بخدا میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے، پھر انہوں نے مسطح کا وہ خرچہ بحال کردیا جو وہ پہلے دیا کرتے تھے، اور کہا: میں اس خرچ کو کبھی نہیں روکوں گا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں: نبی ﷺ کی زوجہ حضرت زینب

بنت جحشؓ سے رسول اللہ ﷺ نے میرے اس معاملہ کے متعلق دریافت کیا کہ ان کو کیا علم ہے؟ انہوں نے کیا دیکھا؟ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! میں اپنے کانوں اور آنکھوں کو محفوظ رکھتی ہوں، واللہ! مجھے ان کے متعلق پاکیزگی کے سوا اور کچھ علم نہیں۔ حضرت عائشہ نے بیان کیا کہ حضرت زینب ہی نبی ﷺ کی ازواج میں میری ٹکر کی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے محفوظ رکھا، مگر اُن کی بہن حمنہ بنت جحش ان سے لڑیں اور وہ تہمت کی ہلاکت میں مبتلا ہوگئیں۔ زہری کہتے ہیں کہ یہ وہ حدیث ہے جو اس جماعت کے معاملہ کے متعلق ہم تک پہنچی ہے۔

یہ سند صحیح ہے، اس کو امام عبدالرزاق نے ”المصَنَّف“ میں روایت کیا ہے، اور اُن کی سند سے امام مسلم نے روایت کیا ہے، اور امام بخاری نے اسی طرح زہری سے روایت کیا ہے۔ (١)

پچیسویں حدیث سے ماخوذ مسائل

یہ حدیث بہت سے مسائل پر مشتمل ہے، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

١۔ اس میں صدیقہ بنت صدیق، حبیبِ خدا کی محبوبہ رضی اللہ عنہما کی عظیم منقبت ہے، اللہ تعالیٰ نے خود اُن کی براءت کا اہتمام کیا ہے، اور کئی آیات میں اُس ﷻ نے کلام فرمایا ہے، جسے امت کے طبقات در طبقات شرق وغرب میں روئے زمین پر اُس وقت تک تلاوت کرتے رہیں گے جب وہ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

٢۔ اِس میں دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ، آپ کے اہل بیت اور آپ کے صحابہ ؓ کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا واجب ہے۔

٣۔ اس میں دلیل ہے کہ سوئے ظن سے فتنوں اور مخلوق پر ظلم کے دروازے کھلتے ہیں، اور سوئے ظن بدگمانوں پر دنیا اور آخرت میں وبال ثابت ہوتا ہے۔

---

(١) المصنف لعبدالرزاق ج٥ ص ٤١٠، ٤١٩ حديث ٩٧٤٨؛ بخاري: كتاب التفسير، باب قول اللہ تعالىٰ ﴿وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا﴾ حديث ٤٧٥٠؛ مسلم: كتاب التوبة، باب في حديث الإفك وقبول توبة القاذف، ص ١٢٧٥ حديث ٢٧٧٠۔

٤۔ اِس میں دلیل ہے کہ اچھا انجام متقین کا ہوتا ہے۔لوگوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کی آل پر ظلم کیا تو انہوں نے صبر وتحمل سے کام لیا۔اس پر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُن کے اِس بہتان وشر سے نجات عطا فرمائی اور متعدد آیات میں اُن کے ذکر وشرف کو بلند فرمایا۔اس میں دلیل ہے کہ حمایت بقدرِ ولایت ہوتی ہے۔

٥۔ اس میں دلیل ہے کہ سب سے بڑا اور بڑھتے رہنے والا گناہ یہ ہے کہ انسان اپنے مسلمان بھائی کی عزت کے بارے میں زبان درازی کرے، بالخصوص نبی اور اُن کے اہل بیت کے بارے میں،غور فرمائیے اور عبرت حاصل کیجئے کہ جو لوگ اِس بہتان میں شامل ہوئے اُن کی سزا کا کیا عالم ہوگا۔

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ مومنین کے معاشرہ میں بری خبر پھیلے تو اصول یہ ہے کہ سوئے ظن پر حسنِ ظن کو مقدم رکھا جائے، بخلاف عام لوگوں کی عادت کے۔چونکہ اللہ تعالیٰ نے امتِ صالحہ کی تربیت کا ارادہ فرمایا ہے اسی لیے اُس نے فرمایا:﴿ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ افواہ سنی تو گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنوں کے بارے میں نیک گمان،اور کہہ دیا ہوتا کہ یہ تو کھلا ہوا بہتان ہے﴾۔

[النور: ١٢]

٧۔ اس میں یہ بات ظاہر ہے کہ جو اکثر باتیں مومنین کے متعلق سوئے ظن کے طور پر منقول ہیں،اگر تم اُن کی واضح نقلی دلیل حاصل کرنا چاہو تو نہیں ملے گی۔اسی لیے اللہ ﷻ نے اِس واقعہ کے متعلق اوپر والی آیت سے بعد والی آیت میں فرمایا:﴿وہ کیوں نہ پیش کر سکے اس پر چار گواہ،پس جب وہ پیش نہیں کر سکے گواہ تو وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں﴾[النور:١٣]

٨۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوا کہ مومنین کی عظمت کے منافی باتوں میں ٹوہ لگانے سے پرہیز گار ہی اجتناب کرتے ہیں،جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے حق میں فرمایا:”**فعصمها اللّٰه بالورع**“ (اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ورع کی بدولت محفوظ رکھا) اور جو ٹوہ میں پڑ گیا تو وہ ہلاک ہوا،جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سیدہ زینب کی بہن کے بارے میں فرمایا:”اور اُن کی بہن حمنہ بنت جحش اُن سے لڑیں اور تہمت کی ہلاکت میں مبتلا ہونے والے لوگوں کے ساتھ مبتلا ہو گئیں“ پس یہ ورع کی ایک میزان ہے۔

۹۔ اس میں دلیل ہے کہ معاف کرنے والوں کے لیے دنیا میں عزت اور آخرت میں عظیم مغفرت ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اور چاہیے کہ وہ معاف کردیں اور درگزر کریں، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ بخش دے اللہ تعالیٰ تمہیں﴾ یہ صدیقین اور صالحین میں سے اکابر کا طریقہ ہے، اسی لیے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ افواہ پھیلانے والیاں فتنوں اور مصیبتوں کے بڑے اسباب میں سے ہیں۔

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں رب جل وعلا کی بڑی عظمتیں اور توحید کی انفرادیت موجزن تھی۔ چنانچہ سیدہ عائشہ کو جب اُن کی والدہ نے فرمایا: اٹھ کر اپنے شوہر کا شکریہ ادا کرو تو انہوں نے کہا: میں اُن کے لیے نہیں اٹھوں گی اور اُس ذات جل جلالہ کے سوا کسی کا شکریہ ادا نہیں کروں گی جس نے میری براءت نازل فرمائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے قول کو برقرار رکھا اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن کی موافقت فرمائی۔

ہم نے امام حاکم کی "المعرفة" میں امام ابن المبارک کے تلمیذ حبان بن موسیٰ کی روایت پڑھی ہے، وہ کہتے ہیں:

"میں نے عبداللہ بن مبارک سے عرض کیا: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آسمان سے براءت نازل ہونے کے موقعہ پر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرض کیا: "**بحمد الله لا بحمدك**" (میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتی ہوں، آپ کی نہیں) میں اِس قول کو بڑی جرأت سمجھتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے اُنہیں جواب دیا: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حمد کو اُس کے اہل کے سپرد کردیا"۔(۱)

۱۲۔ اس میں دلیل ہے کہ جو شخص اہل بیت رضی اللہ عنہم کو اُن کی عزت وحرمت کے حوالے سے اذیت پہنچائے یا اُن کے خلاف سازش کرے تو اُس میں ایک طرح کی منافقت ہوتی ہے اور جلد ہی ایسے شخص کا مکر اُسی کی طرف لوٹ آتا ہے، اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿تمہارے لیے ہر شخص کے لیے اس گروہ میں سے اتنا گناہ ہے جتنا اُس نے کمایا، اور جس نے اُن میں سے سب سے زیادہ حصہ لیا تو اُس کے لیے بڑا عذاب ہے﴾

---

(۱) معرفة علوم الحديث للحاكم ص ٦٧۔

[النور: ١١] اور فرمایا: ﴿اور سازش سازشیوں کو ہی گھیرتی ہے﴾ [فاطر: ٤٣]

١٣۔ اس حدیث سے واضح ہوا کہ نفوس وعزتوں کی آزمائش تکوینی امور میں سے ہے، اِس میں عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور اِن کا وُرود اللہ تعالیٰ کے محبوبوں کے عدل وحکمت کے مطابق ہوتا ہے۔

١٤۔ اس میں دلیل ہے کہ جو شخص سواری وغیرہ امور میں اہل بیت کی کسی خاتون کی خدمت پر مامور ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ اہل بیت کی تکریم وناموس کو مدنظر رکھتے ہوئے بلاضرورت اُن سے کلام نہ کرے۔

١٥۔ اِس میں اُس شخص کی فضیلت ہے جو اہل بیت کا خیال کرے اور اُن کی ناموس کا تحفظ کرے، خصوصاً بوقتِ ضرورت۔ امام نووی نے ''شرح مسلم'' میں لکھا ہے:

''صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے فضائل ظاہر ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی پاک دامنی کی شہادت دی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو سوار کرنے میں جو اُن کا بہتر طرزِ عمل رہا اور تمام واقعے میں جو اُن کی اچھی کارکردگی رہی ساری باتیں اُن کی فضیلت کے دلائل ہیں''۔(١)

١٦۔ اس میں دلیل ہے کہ فتنوں میں اہل علم وحکمت کے بغیر دوسروں کو کلام کرنا حلال نہیں، یہی وجہ ہے کہ فتن میں احکام کے مخاطب اکابر اہل علم ہیں، اصاغر نہیں۔

١٧۔ امام نووی نے فرمایا ہے:

''بہتان کے بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت قرآن عزیز کی نص سے قطعی براءت ہے، لہٰذا اگر معاذ اللہ کسی شخص نے اس میں شک کیا تو وہ باجماع اہل اسلام کافر ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابرین نے فرمایا ہے: انبیاء کرام میں سے کسی نبی کی زوجہ فعل بد کی مرتکب نہیں ہوئی، اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کا اکرام ہے، **صلوات اللہ وسلامه علیهم أجمعین**''۔(٢)

١٨۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کی خواتین عام عورتوں کی طرح نہیں، لہٰذا اُن سے جس قدر عفت،

---

(١) شرح صحیح مسلم للنووي ج١٧ ص١٧٣۔

(٢) شرح صحیح مسلم للنووي ج١٧ ص١٧٤۔

پوشیدگی اور حجاب کا تقاضا کیا گیا ہے اس قدر دوسری عورتوں سے نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ اقتدا کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔

١٩۔ اس میں اہل بیت کی تواضع کا ذکر ہے، اور وہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول ہے: ''خدا کی قسم! میں نہیں سمجھتی تھی کہ میری شان میں وحی متلو نازل ہوگی، میں خود کو اس سے فروتر سمجھتی تھی کہ میرے معاملہ میں اللہ تعالیٰ ایسا کلام فرمائے گا جس کی تلاوت کی جائے گی''۔

حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''اُن کی تواضع کا تو یہ عالم ہے کہ خود کو اس قدر فروتر اور اپنے مقام کو چھوٹا سمجھ رہی ہیں۔ پھر تمہارا اُن لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو ایک دو دن روزہ رکھتے ہیں یا ایک دو راتیں قیام کرتے ہیں تو گمان کرنے لگتے ہیں کہ اُن پر احوال روشن ہو گئے اور خود کو اُس مقام پر تصور کرنے لگتے ہیں کہ وہ عزت و کرامت کی نگاہ سے دیکھنے جانے کے مستحق ہو گئے ہیں، اور گویا وہ اُن لوگوں میں سے ہو چکے ہیں جن کی ملاقات باعث برکت ہوتی ہے، اُن کی دعاؤں کا حصول باعثِ غنیمت ہے، لوگوں پر اُن کی تعظیم واحترام واجب ہے، اُن کے لباس کو چھوا جائے، اُن کے نشاناتِ قدم کو چوما جائے، وہ اللہ جل جلالہ کی طرف سے اُس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں اُن کی تنقیص کرنے والوں سے انتقام لینا اور سوئے ادب کے مرتکب کا فوری مواخذہ کرنا واجب ہے، اُن کی بارگاہ میں اساءتِ ادب ایسا گناہ ہے جسے کسی چیز سے مٹایا نہیں جا سکتا، الا یہ کہ وہ خود معاف کر دیں۔۔۔ یہ سب حماقتیں اور رعونتیں پختہ جہالت اور حماقت کا شاخسانہ ہیں''۔

٢٠۔ اس میں دلیل ہے کہ کبھی اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان غیرت کا معاملہ پیدا ہو سکتا ہے لیکن واجب ہے کہ غیرت اُنہیں زیادتی پر نہ اُبھارے۔

چھبیسویں حدیث

ابوبکر عیسیٰ بن طہمان روایت کرتے ہیں: میں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو بیان کرتے ہوئے سنا:

ام المؤمنین سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی دوسری ازواجِ مقدسہ پر فخر کرتے ہوئے فرماتی تھیں: اللہ عزوجل نے میرا نکاح آسماں میں کیا اور اُسی موقعہ پر آیتِ حجاب نازل ہوئی۔

یہ حدیث امام نسائی نے صحیح سند سے روایت کی ہے، اور یہ ایسی مسلسل حدیث ہے جس میں ہر راوی کا نام احمد ہے، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔(۱)

امام بخاری نے اِسے عیسیٰ سے ایسے ہی روایت کیا ہے اور اُس میں یہ اضافہ ہے:

''اُس نکاح کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے گوشت روٹی کھلائی تھی''۔(۲)

بعض احادیث کے الفاظ ہیں:

سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شکوہ کرتے ہوئے آئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمانا شروع کیا: ''اللہ کا تقوی اختیار کرو اور اپنی بیوی کا ہاتھ تھام لو'' سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر نبی کریم ﷺ کسی چیز کو چھپاتے تو اسی بات کو چھپاتے۔(۳)

۲۶ویں حدیث سے مأخوذ مسائل

۱۔ اس میں ام المومنین سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی عظیم فضیلت ہے، اس حیثیت سے کہ اُن کا نکاح کسی ولی، گواہ اور کاتب کے بغیر ہوا، اور تاریخ اسلام میں اُن کے علاوہ ایسا مرتبہ کسی خاتون کو نہیں ملا۔

۲۔ اس میں اہل بیت کی خصوصیت ہے، کیونکہ ساتوں آسمانوں کے اوپر سے رب سبحانہ وتعالیٰ ام المومنین کے نکاح کا ولی خود ہوا، اور ایسا رتبہ اہل بیت کے علاوہ کسی دوسرے خاندان کو نصیب نہیں ہوا۔

۳۔ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے علوّ (بلند ہونا) ثابت ہوتا ہے، اُس سبحانہ وتعالیٰ کی شان کے لائق ﴿اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے﴾[الشوریٰ: ۱۱]

---

(۱) سنن النسائي: كتاب النكاح، باب صلاة المرأة إذا خُطِبتُ، واستخارتها ربَّها، ص ۵۰۴ حديث ۳۲۵۲۔

(۲) بخاري: كتاب التوحيد، باب وكان عرشه على الماء، ص ۱۰۱۹ حديث ۷۴۲۱۔

(۳) بخاري: كتاب التوحيد، باب وكان عرشه على الماء ص ۱۰۱۹ حديث ۷۴۲۰۔

٤۔ اس میں پردے کے وجوب کی دلیل ہے، یہاں تک اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اپنی کتاب عزیز میں نازل فرمایا اور حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی سے تاریخ کا تعین کرتے تھے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے واقعۂ اِفک میں فرمایا: ''اور صفوان بن معطل نے مجھے قبل از حجاب دیکھا تھا''۔

٥۔ اِس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کا فرد اپنے متعلق کوئی بات بیان کرے تو جائز ہے، جبکہ اُس میں کوئی علم پوشیدہ ہو یا پھر اُس سے کوئی ضرورت وابستہ ہو۔

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی شادیوں میں دعوت اور اعلان ہوتا تھا، خاموشی اور پوشیدگی نہیں ہوتی تھی۔

٧۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کے ولیموں میں طعام سادہ اور کم خرچ ہوتا تھا، کیونکہ وہ نکاح میں راشن کی کمی کے باوجود برکت کی امید رکھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جیسا ولیمہ سیدہ زینب سے نکاح کے موقعے پر کیا ایسا کسی زوجہ کے نکاح پر نہیں کیا، اور سیدہ زینب کے نکاح پر آپ نے ایک بکری سے ولیمہ کیا تھا۔

٨۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تواضع کی دلیل ہے، کہ آپ نے سیدہ زینب سے نکاح کیا، حالانکہ وہ پہلے آپ کے غلام زید بن حارثہ کی بیوی تھیں۔

٩۔ یہ حدیث امام مسلم نے ثابت بواسطہ انس رضی اللہ عنہ روایت کی ہے اور اُس میں خِطبۂ نکاح کی صورت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی عدت پوری ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو فرمایا: زینب کے سامنے میرا ذکر کرو۔ حضرت زید چلے حتی کہ سیدہ زینب کے پاس پہنچے تو وہ آٹا گوندھ رہی تھیں۔ زید فرماتے ہیں: جب میں نے اُنہیں دیکھا تو میرے دل میں اُن کی عظمت اس قدر بڑھ گئی کہ مجھ سے جرأت نہ ہوسکی کہ میں اُن کی طرف دیکھ کر کہوں کہ رسول اللہ نے اُن کا ذکر کیا ہے۔ میں ایڑیوں کے بل گھوما اور اُن کی طرف پشت پھیر کر کہا: زینب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو پیغام بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا: میں اپنے رب سے مشورہ کیے بغیر کوئی کام نہیں کرتی، وہ اپنی جائے نماز پر کھڑی ہوگئیں، اِس پر قرآن

مجید نازل ہوا اور رسول اللہ ﷺ بغیر اجازت اُن کے گھر تشریف لائے''۔(۱)

اس میں اہل بیت کی اُس تعظیم کا ذکر ہے جس پر صحابہ کرام ﷺ کار بند تھے، خصوصاً سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ۔

اس میں سیدہ زینب سے نبی کریم ﷺ کے نکاح اور اُن کے پاس تشریف لانے کی صورت کا بیان ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے اور یہ آپ کے خصائص میں سے ہے۔

اس میں یہ بات لطیف ترین باتوں میں سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور سیدہ زینب کے مابین پیغامِ نکاح لے جانے والے اُن کے پہلے شوہر تھے۔

۱۰ اس میں دلیل ہے جیسا کہ حافظ رحمہ اللہ نے ''الفتح'' میں کہا ہے کہ جو شخص اپنا معاملہ اللہ عزوجل کے سپرد کر دے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے اس قدر آسانی پیدا کر دیتا ہے جو اُس کے لیے دنیا اور آخرت میں مفید ہوتی ہے۔(۲)

۱۱۔ اس میں نبی کریم ﷺ کی ظاہری اور باطنی زندگی کے حسن کا ذکر ہے، آپ نے امت کی خیر خواہی کی خاطر ہر چھوٹی اور بڑی بات کو امت پر ظاہر کیا، اگر آپ وحی کا کچھ حصہ چھپاتے تو اِس آیت کو چھپاتے: ﴿اور یاد کیجئے جب آپ نے فرمایا اس شخص کو جس پر اللہ نے بھی احسان فرمایا اور آپ نے بھی احسان فرمایا: اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر۔ الآیة﴾[الأحزاب:۳۷] لہٰذا ائمہ اہل بیت پر تمام لوگوں سے زیادہ فرض ہے کہ وہ اس سیرت میں لوگوں کی قیادت کریں رضی اللہ عنہم۔

۱۲۔ راوی کا کہنا کہ اسی پر آیتِ حجاب نازل ہوئی، اس سے اُن کی مراد یہ آیت ہے: ﴿اے ایمان والو! نبیِ (مکرّم ﷺ) کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، سوائے اس کے کہ تمہیں کھانے کے لیے اجازت دی جائے (پھر وقت سے پہلے پہنچ کر) کھانا پکنے کا انتظار کرنے والے نہ بنا کرو، ہاں جب تم بلائے جاؤ تو (اس وقت

---

(۱) صحيح مسلم: كتاب النكاح، باب زواج زينب بنت جحش ونزول الحجاب، وإثبات وليمة العرس ص٦٤٧ حديث١٤٢٨۔

(۲) فتح الباري ج١٠ ص٥٠٤ حديث٤٧٨٧۔

وقت) اندر آیا کرو پھر جب کھانا کھا چکو تو (وہاں سے اُٹھ کر) فوراً منتشر ہو جایا کرو اور وہاں باتوں میں دل لگا کر بیٹھے رہنے والے نہ بنو۔ یقیناً تمہارا ایسے (دیر تک بیٹھے) رہنا نبی (اکرم ﷺ) کو تکلیف دیتا ہے اور وہ تم سے (اُٹھ جانے کا کہتے ہوئے) شرماتے ہیں اور اللہ حق (بات کہنے) سے نہیں شرماتا، اور جب تم اُن (اَزواجِ مطہّرات) سے کوئی سامان مانگو تو اُن سے پسِ پردہ پوچھا کرو، یہ (ادب) تمہارے دلوں کے لیے اوران کے دلوں کے لیے بڑی طہارت کا سبب ہے ﴾[الأحزاب: ٥٣] سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا قول کہ اُن (سیدہ زینب) کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی، اس سے مراد ہے کہ وہ اس کے نزول کا سبب تھیں، جیسا کہ اس واقعہ کو کتبِ احادیث اور احادیث پر مبنی تفاسیر سے جانا جاسکتا ہے۔(١)

---

(١) اس سلسلے میں بہت طویل احادیث ہیں، جن میں سے ایک مختصر سی حدیث پیشِ خدمت ہے:

''سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا ولیمہ کیا اور روٹیوں اور گوشت کی دعوت کی، مجھے کھانے کی دعوت کا پیغام دے کر بھیجا گیا، مسلمانوں کا ایک گروہ آتا اور کھانا کھا کر چلا جاتا، پھر دوسرا گروہ آتا اور وہ کھانا کھا کر چلا جاتا، سو میں لوگوں کو بلاتا رہا حتیٰ کہ سب لوگ آچکے اور اب بلانے کے لیے کوئی نہ بچا۔ پس رسول اللہ ﷺ اس حجرے سے نکل کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف گئے، اور فرمایا: اے اہل بیت السلام علیکم ورحمۃ اللہ! سیدہ عائشہؓ نے جواب دیا: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ! آپ نے اپنے اہل (بیوی) کو کیسا پایا، اللہ آپ کو برکت دے، پھر آپ اپنی تمام ازواج کے حجروں میں گئے اور سب سے اسی طرح کلام کیا جس طرح سیدہ عائشہؓ سے کیا تھا اور سب ازواج مطہرات نے اسی طرح جواب دیا جس طرح سیدہ عائشہؓ نے جواب دیا تھا، پھر آپ واپس گھر آگئے تو تین آدمی ابھی تک گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اور نبی ﷺ بہت حیا والے تھے، آپ پھر سیدہ عائشہؓ کے حجرے کی طرف چلے گئے، مجھے یاد نہیں کہ میں نے آپ کو خبر دی تھی یا کسی اور نے کہ وہ لوگ چلے گئے، آپ واپس آئے حتیٰ کہ ابھی آپ ﷺ کا قدم مبارک دروازے کی چوکھٹ میں تھا اور دوسرا قدم باہر تھا کہ آپ نے اپنے اور میرے درمیان پردہ لٹکا دیا اور آیت حجاب نازل ہوگئی''۔(1) =

---

(1) بخاري حديث٤٧٩٣؛ مسلم: كتاب النكاح، باب زواج زينب بنت جحش ونزول الحجاب، وإثبات وليمة العرس حديث١٤٢٨۔

ستائیسویں حدیث

عُفرہ کے غلام عمر اور ایک دوسرے شخص بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا تو بحرین سے مال آیا، اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس کا حضور ﷺ کے ذمہ قرض تھا یا حضور ﷺ نے اسے کچھ دینے کا وعدہ فرما رکھا تھا تو وہ کھڑا ہو کر وصول کر لے۔ اس پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تھا: اگر میرے پاس بحرین سے مال آیا تو میں تمہیں اتنا اتنا دوں گا، یہ تین مرتبہ فرمایا تھا اور دونوں ہاتھوں سے لَپ بھر کر اشارہ فرمایا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اُن سے فرمایا: اٹھو، اور خود اپنے ہاتھ سے لے لو، وہ اٹھے اور انہوں نے ایک مرتبہ لَپ بھر کر لیا، اُسے شمار کیا گیا تو وہ پانچ سو درہم تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انہیں گن کر ایک ہزار مزید بھی دو (تاکہ تین لپیں ہو جائیں) اِس کے بعد لوگوں میں دس دس درہم تقسیم کیے اور فرمایا یہ تو وہ وعدے پورے ہوئے جو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے کیے تھے۔ اگلے سال اس سے بھی زیادہ مال آیا تو لوگوں میں بیس بیس درہم تقسیم کیے اور پھر بھی کچھ مال بچ گیا تو غلاموں میں پانچ پانچ درہم تقسیم کیے اور فرمایا: یہ تمہارے غلام تمہاری خدمت کرتے ہیں اور تمہارے کام کرتے ہیں، اِس لیے ہم نے ان کو بھی کچھ دے دیا ہے۔ اس پر لوگوں نے عرض کیا: اگر آپ حضراتِ مہاجرین و انصار کو دوسروں سے زیادہ دیں تو یہ بہتر ہوگا، کیونکہ وہ سابقین ہیں اور حضور ﷺ کے ہاں اِن حضرات کا خاص مقام تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ان لوگوں نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ تو اللہ تعالیٰ ہی ان کو دیں گے، یہ مال و متاع تو بس گزارے کی چیز ہے اسے برابر تقسیم کرنا کم یا زیادہ دینے سے بہتر ہے۔ اُنہوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں اِسی اصول پر عمل فرمایا، حتیٰ کہ جب تیرہ ہجری کا سال آیا تو جمادی الثانی کے آخری عشرہ میں اُن کا انتقال ہو گیا رضی اللہ عنہ۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اُن پر فتوحات کے دروازے کھل گئے اور اُن کے پاس اموال آئے تو

= اگر قارئینِ کرام اِس آیت اور اُس کی شانِ نزول دونوں کو ملا کر پڑھیں تو اُنہیں نرالا دستور معلوم ہوگا، وہ یہ کہ ہر صاحبِ فضیلت و مرتبہ کے آداب مخلوق سکھاتی ہے مگر یہاں خالق جل جلالہ اپنے محبوب ﷺ اور آپ کے اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے آداب کی تعلیم خود دے رہا ہے۔

اُنہوں نے فرمایا: اِس مال کی تقسیم میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے اور تھی اور میری رائے اور ہے۔ میں اُس شخص کو جس نے (حالتِ کُفر میں) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کی اور وہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا دونوں کو برابر نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اُنہوں نے مہاجرین، انصار اور بدریوں کے لیے پانچ پانچ ہزار مقرر کیے، اور جن کا اسلام اہل بدر کی طرح تھا لیکن وہ بدر میں شریک نہیں ہوسکے تھے اُن کے لیے چار چار ہزار مقرر کیے، اور تمام ازواجِ مطہرات کے لیے بارہ بارہ ہزار مقرر کیے ماسوا حضرت صفیہ اور جویریہ رضی اللہ عنہما کے، اُن دونوں کے لیے چھ چھ ہزار مقرر کیے تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے باقی ازواجِ مطہرات کے لیے بارہ بارہ ہزار اِس لیے مقرر کیے ہیں کہ وہ مہاجرین میں سے ہیں۔ اس پر اُن دونوں نے فرمایا: آپ نے ان کے لیے فقط حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق کی وجہ سے اِتنے مقرر کیے ہیں اور ہمارا بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان ہی جیسا تعلق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات سمجھ آ گئی تو اُنہوں نے اُن دونوں کے لیے بھی بارہ بارہ ہزار مقرر کر دیے، اور سیدنا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے لیے بارہ ہزار مقرر کیے، اسامہ بن زید کے لیے چار ہزار اور (اپنے بیٹے) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے لیے تین ہزار مقرر کیے۔ اس پر انہوں نے عرض کیا: ابا جان! آپ نے اُسامہ کو مجھ پر ترجیح کیوں دی؟ کیا اُن کے والد کو جو فضیلت حاصل تھی وہ میرے والد کو حاصل نہیں؟ اور جو کچھ اُنہیں مقام حاصل تھا کیا وہ مجھے حاصل نہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسامہ کے والد تمہارے والد سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محبوب تھے اور وہ خود تم سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محبوب تھے۔ سیدنا حسن و سیدنا حُسین رضی اللہ عنہما کے لیے پانچ پانچ ہزار مقرر کیے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت کی وجہ سے اُنہیں اُن کے بابا کے برابر دیا۔ مہاجرین و انصار کے بچوں کے لیے دو دو ہزار مقرر کیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما گزرے تو فرمایا: انہیں ایک ہزار اور دے دو۔ اس پر حضرت محمد بن عبد اللہ (بن جحش) رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: جو فضیلت ان کے والد کو حاصل تھی کیا وہ ہمارے آباء کو حاصل نہیں اور جو اِسے حاصل ہے کیا وہ ہمیں حاصل نہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اِن کے لیے دو ہزار اُن کے والد ابو سلمہ کی وجہ سے مقرر کیے ہیں اور مزید ایک ہزار ان کی والدہ سیدہ اُمِّ سلمہ (ام المومنین) کی وجہ سے زیادہ دیے ہیں۔ اگر تمہاری ماں اُس کی ماں جیسی ہو تو تمہیں بھی ایک ہزار

زیادہ دوں گا۔ اہل مکہ اور دوسرے لوگوں کے آٹھ آٹھ سو مقرر کیے۔ پھر اُن کے پاس طلحہ بن عبید اللہ اپنے بھائی عثمان کے ساتھ آئے تو اُن کے لیے بھی آٹھ سو مقرر کیے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے سے نَضر بن انس گزرے تو فرمایا: اس کے لیے دو ہزار مقرر کردو۔ اس پر حضرت طلحہ کہنے لگے: میں آپ کے پاس اسی کی مانند اپنے بھائی کو لایا تھا، اُس کے لیے تو آپ نے آٹھ سو مقرر کیے اور اِس کے لیے دو ہزار؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اِس لڑکے کے والد سے جنگِ اُحد میں میری ملاقات ہوئی تھی تو اُس نے مجھ سے پوچھا تھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال سناؤ! میں نے کہا تھا: میرا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید کر دیے گئے۔ یہ سنتے ہی اُنہوں نے اپنی تلوار سَونت لی اور اُس کی میان کو توڑ دیا اور کہا: اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید کر دیے گئے تو اللہ تعالیٰ زندہ ہے وہ کبھی نہیں مرے گا، پھر اُنہوں نے جنگ شروع کر دی یہاں تک کہ شہید ہو گئے، اور یہ فلاں فلاں مقام پر بکریاں چراتا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے آغاز سے اسی طریقے پر قائم رہے حتیٰ کہ انہوں نے ۲۳ھ میں حج کیا تو اُنہیں یہ بات پہنچی کہ لوگ کہہ رہے ہیں: اگر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو ہم اٹھ کر یک فلاں شخص کی بیعت کرلیں گے، آخر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی تو اچانک ہوئی تھی۔ اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ وہ ایام تشریق کے وسط میں اس پر اظہار خیال فرمائیں، لیکن اُنہیں سیدنا عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: امیر المومنین! یہ ایسا مقام ہے جہاں لوگوں کا اژدحام اور شور ہے، یہاں آپ کے کلام کو آپ کی مراد سے ہٹائے جانے کا امکان ہے، لہٰذا آپ پلٹ کر دارِ ہجرت و ایمان (مدینہ منورہ) میں پہنچیں تو وہاں خطاب کرنا، وہاں آپ کی گفتگو کو بغور سنا جائے گا۔ انہوں نے جلدی فرمائی، مدینہ معظّمہ پہنچے تو لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے حمد وصلاۃ کے بعد ارشاد فرمایا:

لوگو! مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم میں سے کہنے والے نے کہا ہے: اگر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو ہم اٹھ کر یکا یک فلاں کی بیعت کرلیں گے، آخر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی تو اچانک ہوئی تھی۔ ہاں اللہ کی قسم اگر چہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک ہوئی تھی اور اللہ نے ہمیں شر سے محفوظ رکھا تھا، لیکن اَب ہمیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسا آدمی کہاں مل سکتا ہے، جس سے ہم وہ امید رکھیں جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے رکھی

تھی۔ بلامشورہ اور بغیر بیعت کے امور مسلمین کے سربراہ بننے کی کوشش کرنا خودکشی کے علاوہ کچھ نہیں۔

سنو! میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور میں گمان کرتا ہوں کہ میری وفات کا وقت قریب آ پہنچا ہے، میں نے ایک مرغ کو دیکھا جو کود کر میری طرف بڑھا اور مجھے تین ٹھونگے مارے۔ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے اس کی تعبیر یہ بتلائی ہے کہ آپ کو اس شہر کا ایک شخص قتل کرے گا، پس اگر میں انتقال کر جاؤں تو تمھیں اُن چھ حضرات کی طرف توجہ کرنے کا حکم کرتا ہوں جن سے رسول اللہ ﷺ بوقتِ وصال راضی تھے: عثمان، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم۔ پھر اگر یہ اختلاف کریں تو معاملہ علی رضی اللہ عنہ کی طرف لے جائیں۔ میں اگر زندہ رہا تو عنقریب وصیت کروں گا۔ میں نے پھوپھی اور بھتیجی میں غور کیا ہے، اُنھیں وارث بنائے جانے اور بننے کا اختیار نہیں، اور اگر میں زندہ رہا تو عنقریب تمھیں ایسا امر پیش کروں گا جسے تم مضبوطی سے تھاموگے اور اگر وفات پا گیا تو تم اپنی رائے کو کام میں لانا۔ میں تمھیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دیتا ہوں۔

اللہ کی قسم! میں نے تم پر خلافت کی، تمہارے لیے رجسٹر بنائے، تمہارے لیے شہر بسائے، بحر احمر کی بندرگاہ تک تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کیا اور تمہارے لیے ایک واضح دستور چھوڑا۔ مجھے تمہارے بارے میں دو شخصوں سے اندیشہ ہے: ایک وہ شخص جو تاویل قرآن پر جنگ کرے اور قتل کیا جائے اور دوسرا وہ جو اس مال کے لیے خود کو اپنے بھائی سے زیادہ حق دار سمجھ کر قتال کرے حتیٰ کہ قتل ہو جائے۔

یہ خطبہ انھوں نے جمعہ کے دن دیا تھا اور بدھ کے روز اُن پر حملہ ہو گیا تھا۔

یہ سند حسن ہے، اس کو امام ابن ابی شیبہ نے المصنف میں روایت کیا ہے۔ اس میں جو ابو معشر ہے وہ نجیح بن عبدالرحمان بنو ہاشم کا غلام ہے، صدوق ہے، اُس کے حافظہ میں کلام کیا گیا ہے اور اُس کی حدیث کے غالب حصہ کی متابعت کی گئی ہے اور اُس کے شواھد بھی موجود ہیں، پھر اس حدیث میں ایک قصہ ہے اور امام احمد نے فرمایا ہے کہ جس حدیث میں کوئی قصہ ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے راوی نے اس کو محفوظ رکھا ہے۔

لیکن اس حدیث میں یہ قول ”فإن اختلفوا فأمرهم إلى علي“ (پھر اگر وہ اختلاف کریں تو

معاملہ علی کے سپرد کیا جائے) محلِ نظر ہے۔(۱) (۲)

۲۷ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں اُس طرزِ عمل کا ذکر ہے جس پر سیدنا عمر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم میں کاربند تھے۔

۲۔ اس میں دلیل ہے کہ حاکم کو حق حاصل ہے کہ وہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کو بیت المال سے اُن کا حق پیش کرنے کی خاطر اجتہاد کر سکتا ہے اور اُنہیں دوسرے اہل اسلام پر ترجیح دے سکتا ہے۔

۳۔ اس میں اُن ائمہ اہل بیت پر تاکید کی دلیل موجود ہے جو اپنے نسب کی صحت اور دین کی حفاظت کے اصول جانتے ہیں کہ وہ اپنے نسب کے اُن اصولوں کو ضبط کرنے میں اہتمام کریں جن سے اُن کی شاخیں پھیلتی ہیں، تاکہ کوئی غلط مدعی دعویٰ اور تمنا کرنے والا تمنا نہ کر سکے، کیونکہ بعد کے زمانوں میں شریف (سید) بننے کے دعووں کا اندیشہ تھا، جبکہ صحیحین (بخاری ومسلم) میں ثابت ہے:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے جان بوجھ کر اپنا نسب بدلا تو اُس پر جنت

---

(۱) المصنف لابن أبي شيبة ج۱۲ ص۳۰۲، ۳۰۷ حديث ۳۳۴۱۲، وط: بتحقيق محمد عوّامة ج۱۷ ص۴۷۲، ۴۷۶ حديث ۳۳۵۳۹۔

(۲) مؤلف نے پوری حدیث کو قابل قبول بنانے کی پوری کوشش کی ہے، لیکن ''فإن اختلفوا فأمرهم إلى علي'' (پھر اگر وہ اختلاف کریں تو معاملہ علی کے سپرد کیا جائے) کے قولِ عمر کو اس حدیث میں محلِ نظر قرار دے دیا ہے۔ میں کہتا ہوں: مؤلف کا اس قول کو محلِ نظر کہنا متعدد احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مستند اقوال کے خلاف ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہاں تک منقول ہے کہ اگر لوگوں نے اُنہیں پہلا خلیفہ بنا لیا تو وہ اُنہیں صراط مستقیم پر چلائیں گے، جبکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی ایسا ہی سمجھتے تھے اور وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے امر خلافت کے لیے زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے راقم الحروف کی کتاب ''شرح أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب'' صفحہ ۳۴۷ وغیرہ۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ اگر آپ نے وہ تفصیل پڑھ لی تو آپ مؤلف کے قول کو محلِ نظر ہی نہیں بلکہ باطل و مردود قرار دینے پر مجبور ہوں گے۔

حرام ہے"۔(۱)

٤۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اُن کے بعد امت کی عدالت پر اجماع کی دلیل ہے، کیونکہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کیے ہوئے وعدے پر یا نقل کی صحت پر کوئی دلیل طلب نہیں کی تھی اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو مقرر رکھا تھا، پس یہی اجماع ہے۔

٥۔ اس میں امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عمیق علم کا ذکر ہے، اس لحاظ سے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے محبوبوں کو مقدم رکھا، آپ کے اہل بیت کی تعظیم کی اور اُن کے بارے میں آپ کی وصیت کی حفاظت فرمائی۔ ذرا اُن کی تقسیم کے اُن وجوہ میں غور تو فرمایئے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مطہرات، آپ کے چچا سیدنا عباس، سیدنا زید بن حارثہ، اُن کے بیٹے (اسامہ) اور نضر بن انس رضی اللہ عنہم کو کیوں مقدم کیا، اور سیدنا امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو اُن کی کم سنی کے باوجود اکابر مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کے برابر کیوں حصہ پیش کیا؟

٦۔ اس میں شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے مابین عطیہ کی مقدار میں اختلاف کا ذکر ہے، اور تحقیق یہ ہے کہ یہ اجتہادی اور خلیفہ کا صوابدیدی معاملہ ہے، وہ زمانی، مکانی اور اپنے سامنے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے موزوں ترین صورت کو عمل میں لاتا ہے۔

٧۔ اس میں حاکم کے انتخاب کے طریقۂ کار کا ثبوت موجود ہے کہ وہ یا تو سابقہ خلیفہ کے تعیّن سے یا پھر اربابِ عقد وحل کی بیعت سے منتخب ہوتا ہے۔

٨۔ اس میں یہ راز مذکور ہے کہ رعایہ اور سیاست کے امور کھلے عام اور اعلانیہ بیان کیے جائیں تو اصلاح نہیں ہوتی، بلکہ حکمت یہ ہے کہ یہ معاملات خواص اہل علم وحکمت کے سامنے ہی زیر بحث لائے جائیں۔

٩۔ اس میں دلیل ہے کہ فتنوں سے محفوظ رکھنے والا سب سے بڑا ہتھیار اجتماع اور باہمی الفت ہے، نہ کہ تفرقہ اور اختلاف۔

---

(۱) بخاري: كتاب المغازي، باب غزوة الطائف ص۵۸۷ حديث٤٣٢٦، ٤٣٢٧؛ مسلم: كتاب الإيمان، باب بيان حال إيمان من رغب عن أبيه وهو يعلم، ص٤٨ حديث٦٣۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ حکمت والا عالم وہ ہے جو امت کو جمع رکھے اور اُنہیں متفرق نہ ہونے دے۔ فتنوں کے دروازے کھلنے کا سبب غوغا اور اودھم مچانے والے لوگ ہوتے ہیں نہ کہ علماء اور مصلحین۔

۱۱۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت کے اسباب اور حکمتوں کی حقیقت تک (کبھی) اکابر ائمہ بھی نہیں پہنچتے اور یہ اعتراف اخلاص، عاجزی اور خود کو اُس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سپرد کرنا ہے جو حکمتِ بالغہ کا مالک ہے۔

۱۲۔ اس میں اُس خطرے اور طاغوتِ اکبر کا ذکر ہے جو وحدتِ امت کو پارہ پارہ کر سکتا ہے، اور وہ ایسی تاویل ہے جسے نوعمر لوگ فہمِ کتاب وسنت قرار دیں گے، پھر اُس پر امتِ مسلمہ کو قتل کریں گے، اور نیم فقیہ اس کو فہم قرار دے گا اور اس کو امت پر لازم کر دے گا، اور جاہل حاکم اس کو فہم یا شاذ اقوال قرار دے کر خلقِ خدا کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔

۱۳۔ اس میں امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور سیدنا عمر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک اُن کے رتبہ کا ذکر ہے۔

۱٤۔ اس میں اُن لوگوں کی تردید ہے جو گمان کرتے ہیں کہ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کو محروم کرتے ہوئے مالِ فَدَک ہتھیا لیا تھا، حالانکہ وہ تو کثرتِ عطا میں دوسرے لوگوں پر اہل بیت کو ترجیح دیتے تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

> ''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اہل بیت کو افضلیت دینا جمیع علماءِ سیرت کے نزدیک مشہور ہے، اس میں دو شخصوں کا اختلاف بھی نہیں ہے، سو جس شخص کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ داروں اور آپ کی آل کا یہ احترام ہو، کیا وہ اُس ہستی پر زیادتی کرے گا جو سب سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محبوب تھیں اور خواتینِ اہلِ جنت کی سیدہ تھیں، وہ اُنہیں اس قدر تھوڑے سے مال کی وجہ سے کیوں رنجیدہ کرتے، جبکہ اُن کی اولاد کو اُنہوں نے اس سے کئی گنا زیادہ پیش کیا اور پھر جو اُن کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ بعید تھے اُنہیں عطا کیا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ھدیہ پیش کیا''۔(۱)

---

(۱) منهاج السنة ج٦ ص ۳۳، ۳٤، وط: ج۳ ص ۵۳۸۔

۱۵۔ اس میں دلیل ہے کہ سیدنا علی اور دوسرے اہل بیت کرام ﷡ نے سیدنا عمر ﷛ کی شرعی بیعت کی تھی، اگر وہ کافر ہوتے تو اہل بیت کے لیے حلال نہیں تھا کہ وہ اُن سے خمس اور دوسرے ہدیے قبول کرتے۔ اہل بیت کرام ﷡ تو صدقات قبول کرنے سے بھی منزہ ہیں، کیونکہ صدقات لوگوں کی میل ہیں تو پھر وہ کسی دوسرے طریقے سے یا کفار سے نجاست کو کیونکر قبول کر سکتے ہیں؟ وہ سب اس سے بلند ہیں ﷡۔

اٹھائیسویں حدیث

حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عباس بن عبدالمطلب ﷛ نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! ہم باہر نکل کر قریش کو دیکھتے ہیں کہ وہ محو گفتگو ہوتے ہیں، لیکن جب وہ ہمیں دیکھتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس پر نبی کریم ﷺ کو غصہ آ گیا اور آپ کی مقدس پیشانی کے درمیان ایک رگ مبارک حرکت میں آ گئی۔ پھر آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم کسی شخص کے قلب میں اُس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ تمہیں اللہ ﷻ اور میری قرابت کی وجہ سے محبوب نہ رکھے۔

اس حدیث کی سند حسن ہے، اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ یزید کے حافظہ میں کچھ نقص تھا، لیکن اس حدیث کے متعدد شواہد ہیں، ان میں سے ایک وہ حدیث ہے جسے امام ابن ماجہ نے از محمد بن کعب القرظی از عباس بن عبدالمطلب ﷛ روایت کیا ہے، اس کی سند جید ہے، اگر قرظی اور عباس بن عبدالمطلب ﷛ کے درمیان انقطاع نہ ہوتا، اور از ابوالضحیٰ از عباس بن عبدالمطلب امام ابن ابی شیبہ کے ہاں بھی اسی طرح ہے، اور اس کو امام طبرانی، ابن شبہ، خطیب بغدادی، ابن عساکر اور دوسرے محدثین نے از ابن عباس ﷛ متصلاً روایت کیا ہے، اور ایک جماعت نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، جیسا کہ امام ترمذی، امام حاکم اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ۔ جنھوں نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے گویا وہ اس کے شواہد سے آگاہ نہیں ہیں۔ (۱)

---

(۱) مسند أحمد ج۱ ص۱۰۷، ۱۰۸ وج ٤ ص١٦٥ وط: [شاكر] ج۲ ص۳۸۳ حديث ۱۷۷۷ وص۳۷۹ حديث ۱۷۷۲، ۱۷۷۳ وج۱۳ ص۳۹۷ حديث ١٧٤٤٤، ١٧٤٤٥؛ سنن ابن ماجه =

اٹھائیسویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔

۲۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "يُحِبُّكُمْ لِلّٰهِ" (اللہ کی خاطر تمہیں محبوب رکھے) یہ قدرِ مشترک ہے اہل بیت اور غیر اہل بیت میں، کیونکہ للہ فی اللہ تمام مومنین و مومنات کا باہم محبت کرنا موالات ہے، لیکن ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "ولقرابتي" (اور میری قرابت کی خاطر) یہ اُس محبت پر قدرِ زائد ہے، اور یہ فقط اہل بیت کے ساتھ مختص ہے۔

۳۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے قول "قُرَيْشًا" سے مراد ہے جماعتِ قریش، اور ایسا جفا زمانۂ جاہلیت کے قرب کی وجہ سے بعض سے ظاہر ہوتا تھا۔ قریش کے خانوادوں میں مقابلہ بازی کی فضا کتبِ حدیث و تاریخ

= مقدمة، فضل عباس بن عبدالمطلب رضي الله عنه حديث ١٤٠؛ المستدرك: كتاب معرفة الصحابة، باب ذكر إسلام العباس واختلاف الرواية في وقت إسلامه، ج٣ص ٣٣٣، وط: ج٣ص ٣٧٥، ٣٧٦ حديث ٥٤٣٢، ٥٤٣٣، وج٤ ص٧٦، وط: ج٤ ص٨٥ حديث ٦٩٦٠، ٦٩٦١؛ الجامع الكبير وهو سنن الترمذي: أبواب المناقب، باب مناقب أبي الفضل عم النبي صلى الله عليه وسلم وهو العباس بن عبد المطلب رضي الله عنه ج ٦ص ١٠٨ حديث ٣٧٥٨؛ الأحاديث المختارة ج٨ص ٣٨٩ حديث ٤٨١؛ مسند ابن أبي شيبة ج٢ص ٣٩٥ حديث ٩١٨؛ المصنف لابن أبي شيبة ج١٢ ص١٠٨، وط: ج١١ص ١٧١ حديث ٣٢٧٤٨؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ص ٣٢٠ حديث ٨١٢٠؛ فضائل الصحابة للنسائي ص ٢٢ حديث ٧٣؛ المعجم الكبير ج ٢٠ ص ٢٨٤، ٢٨٥ حديث ٦٧٢، ٦٧٣، ٦٧٤؛ مصابيح السنة ج٤ ص ١٩١ حديث ٤٨١٩؛ دلائل النبوة للبيهقي ج١ ص ١٦٧؛ الشريعة للآجري ج٥ ص ٢٢٧٨ حديث ١٧٦٢؛ تاريخ دمشق ج٢٦ ص ٣٠٠؛ فضل أهل البيت لابن تيمية ص ٤٣؛ رأس الحسين لابن تيمية مع استشهاد الحسين للطبري ص ٢٠١؛ كشف المناهج والتناقيح للسلّمي المناوي ج٥ ص ٣١١ حديث ٤٩٦٧؛ هداية الرواة إلى تخريج أحاديث المصابيح والمشكاة للعسقلاني ج٥ ص ٤٥٢ حديث ٦١٠٤۔

میں معروف ہے۔ یہ جذبہ اُس وقت بڑھ گیا جب مسلمانوں کے ہاتھوں سے سردارانِ قریش واصل جہنم ہوئے۔ پھر بنو ہاشم میں نبوت کی جلوہ گری نے بھی بغض کی عداوت کو بڑھا دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ علماء سیر نے ذکر کیا ہے کہ جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالی تو اُن کے والد سیدنا ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا بنو عبد مناف اور بنو مخزوم اس پر راضی ہو گئے؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: یہ فضلِ الٰہی ہے وہ جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے۔ ایسے ہی ابوسفیان نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر کہا: کیا تم لوگ راضی ہو گئے کہ یہ امر بنو تیم (سیدنا ابوبکر کے قبیلے) میں چلا جائے؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابوسفیان! اسلام کا معاملہ جاہلیت کے معاملہ کی طرح نہیں ہے۔

جب اُن کا اسلام اچھا ہو گیا اور جذبۂ جاہلیت جاتا رہا تو یہ جفا بھی جاتی رہی، تاہم کبھی کچھ افراد میں تعصب باقی رہ جاتا ہے، پس اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ لوگوں کے سینوں میں کیا چھپا ہوا ہے۔ قریش کے فضائل ومناقب جو احادیث صحیحہ میں آئے ہیں وہ اُن کی بھلائی اور نفوس کی سلامتی کی گواہی دیتے ہیں۔ (۱)

٤۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے۔

٥۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کو تکلیف پہنچانے پر غضب ناک ہونا مستحب ہے، خواہ وہ تھوڑی اور چھوٹی تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کو ایذا پہنچانے والوں کے خلاف اہل بیت کی مدد کرنا واجب ہے، اس لیے کہ اُن کے ساتھ بغض رکھنا اور اُن کی تنقیص کرنا قبیح برائی اور ضعفِ دین کی دلیل ہے۔

---

(۱) مؤلف اِس سے پہلے دسویں حدیث کے گیارھویں مسئلہ میں لکھ چکے ہیں کہ دورِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بعض لوگوں میں ناصبیت پائی جاتی تھی۔ شیخ محمد صالح العثیمین نے بھی لکھا ہے کہ زمانۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی بعض لوگوں کے دلوں میں ناصبیت چلی آ رہی تھی۔ (1)

تفصیل کے لیے دیکھئے راقم کی کتاب "**شرح خصائص علي** رضی اللہ عنہ" صفحہ ١٠٥، **الطبعة الرابعة**)

---

(1) شرح الواسطية للعثيمين ص ٣٨٧، ومترجم اردو ص ٤٩٧، تعليقات استجلاب ارتقاء الغرف ج١ ص ٣٩٧۔

۷۔ اس میں نواصب کا رد ہے کہ وہ اہل بیت سے بغض رکھتے ہیں، وہ جب دنیا میں رسول اللہ ﷺ کے غضب کے مستحق ہیں تو قیامت کے دن آپ کی شفاعت کی آرزو کیسے کر سکتے ہیں!

۸۔ اس میں اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قرابت کو ہر قرابت پر فضیلت ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ "حتى يحبوكم لله ولقرابتي" کے تحت لکھتے ہیں:

"جب اہل بیت مخلوق سے افضل ہیں تو یقیناً اُن کے اعمال بھی اُن سے افضل ہیں، اور اُن سب سے افضل رسول اللہ ﷺ ہیں، کوئی بشر اُن کا ہمسر نہیں ہے، لہٰذا اہل بیت میں فضیلت والا ہر صاحبِ فضیلت سے افضل ہے، قریش کے تمام قبائل، عرب بلکہ بنی اسرائیل وغیرہ سب سے"۔(۱)

۹۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تمام اہل بیت کے تنازعات وغیرہ کا مرجع رسول اللہ ﷺ ہیں، ائمہ اہل بیت میں سے کوئی بھی اس حکم سے ماورا نہیں، خواہ اُس کا مرتبہ کتنا ہی بلند ہو۔ فرض کیجئے اگر سیدنا عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں رجوع نہ کرتے تو اِس مسئلہ میں حق کیسے واضح ہوتا؟ یہ غور کا مقام ہے، سو کُل کی کُل خیر رسول اللہ ﷺ کی حیات میں آپ کی بارگاہ میں رجوع کرنے میں ہے اور آپ کے وصال کے بعد آپ کی سنت و شریعت میں ہے۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ امرِ عظیم کے علاوہ قسم نہیں کھاتے تھے۔

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ امرِ عظیم کے علاوہ غصہ میں نہیں آتے تھے۔

۲۹ویں حدیث

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ قحط کا شکار ہوئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما کے وسیلہ سے بارش کی دعا مانگی، انہوں نے کہا: اے اللہ! ہم تیری بارگاہ میں تیرے نبی کا وسیلہ پیش کرتے تھے تو تو ہمیں سیراب فرماتا تھا، اور اب ہم تیری بارگاہ میں تیرے نبی ﷺ کے چچا کا وسیلہ پیش کرتے ہیں، لہٰذا تو ہمیں بارش عطا فرما۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پس اُنہیں بارش عطا کی گئی۔

---

(۱) رأس الحسين ص ۲۰۰؛ فضل أهل البيت ص ۹؛ مجموعة الفتاوى ج ۲۷ ص ۲۴۸۔

اس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔(١)

٢٩ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

١۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کے صالحین رضی اللہ عنہم کے توسّل سے دعا کی قبولیت کی قوی امید ہوتی ہے۔

٢۔ اس میں دلیل ہے کہ ائمہ اہل بیت کے وسیلہ سے بارش کی دعا کرنا اور دعا کے وقت اُن کا موجود ہونا تاکہ وہ لوگوں کی دعا پر آمین کہیں مستحب ہے، جیسا کہ اس مسئلہ میں فقہاء نے تصریح فرمائی ہے اور جیسا کہ کئی جماعات نے اسی طرف اشارہ کیا ہے، اُن میں سے ایک امام بغوی بھی ہیں۔

٣۔ اس میں خاص و عام ضرورتوں میں زندہ اولیاء کرام خصوصاً اہل بیت رضی اللہ عنہم سے دعا کی درخواست کے مشروع ہونے کی دلیل ہے۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ اکابر اہل بیت کو والد کے مرتبہ پر سمجھنا چاہیئے۔

٥۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم پر اجماع صحابہ ہے، اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جو اہل بیت کی تعظیم کی اس پر بھی اُن کا اجماع ہے اور اُن سب کا اجماع حجت ہے۔ پس اس حدیث میں تین اجماع جمع ہوگئے، غور فرمائیے۔

٦۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا سیدنا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہم کی کرامت کا ثبوت ہے۔

٧۔ اِس میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے، بایں طور کہ انہوں نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے لیے تواضع کی اور اُن کے مرتبہ کو پہچانا، جیسا کہ امیر نے "السُبُل" میں اور حافظ نے "الفتح" میں کہا ہے۔(٢)

٨۔ قولِ عمر: "كنا نتوسل إليك بنبينا" (ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی کا وسیلہ پیش کرتے تھے) علامہ آلوسی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دنیا سے انتقال کرنے کے بعد آپ سے توسّل جائز ہوتا تو

---

(١) بخاري: كتاب الاستسقاء، باب سوال الناس الإمام الاستسقاء إذا قحطوا، حديث ١٠١٠۔

(٢) سبل السلام ج٣ ص٢٢٨؛ فتح الباري ج٣ ص٣٥٢۔

لوگ آپ کے علاوہ اور شخص سے توسّل نہ کرتے، بلکہ وہ کہتے: ''اللھم إنا نتوسل إلیک بنبینا فاسقنا'' (اے اللہ: ہم تیری بارگاہ میں تیرے نبی کا وسیلہ پیش کرتے ہیں سو تو ہمیں بارش عطا فرما) وہ اس مسئلہ میں ادنیٰ سا جواز بھی پالیتے تو کبھی سید الناس ﷺ کے وسیلہ کو چھوڑ کر آپ کے چچا کا وسیلہ پیش نہ کرتے۔ سواُن کا یہ عدول جبکہ وہ السابقون الاولون ہیں اور ہم سے زیادہ اللہ اور اُس کے رسول کے حقوق کی اور اِس بات کی کہ دعا میں کیا مشروع ہے اور کیا مشروع نہیں، سب سے زیادہ معرفت رکھنے والے تھے، وہ ضرورت مند اور بھوکے تھے، مشکلات سے کشادگی کے طالب، تنگی میں آسانی کے خواہاں اور بہرصورت نزولِ باراں کے متمنی تھے۔ اُن کا طرزِ عمل واضح دلیل ہے کہ مشروع طریقہ وہی ہے جس پر وہ چلے، دوسرا کوئی طریقہ جائز نہیں''۔(۱) (۲)

---

(۱) روح المعاني ج۷ص ۱۷۶، ۱۷۷۔

(۲) بعداز وصال توسّل

کتابِ ھٰذا کے مؤلف، علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کا سہارا لے کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ چونکہ نبی کریم ﷺ کی وفات ہوگئی، لہٰذا آپ کے وسیلہ سے دعا کرنا جائز نہیں، بلکہ وہ حیات النبی کے ہی قائل نہیں، جیسا کہ انہوں نے دوسری حدیث کے دسویں مسئلہ میں نبی کریم ﷺ کو ۱۱ ہجری سے لے کر قیامت کے دن تک قبر میں میت قرار دیا ہے، بلکہ خود اِسی حدیث کے تیسرے مسئلہ میں بھی اُنہوں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ سو جہاں تک تعلق ہے بعداز وصال حیات کا تو اس کا انکار تو خود نصوصِ قرآن وسنت ہی کا انکار ہے، جیسا کہ ہم دوسری حدیث کی تشریح میں لکھ چکے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو چھوڑ کر آپ کے چچا کا وسیلہ پیش کیا۔ اس سلسلے میں راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ کیونکر گمان کرلیا گیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کو معاذ اللہ مردہ گمان کرتے ہوئے ایسا کیا ہے؟ ایسا کیوں نہیں سمجھا گیا کہ اُنہوں نے اپنے عمل سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر توسّل کی ایک اور صورت بھی واضح فرمادی، اور وہ یہ کہ جس طرح آپ کے وسیلہ سے دعا قبول ہوتی ہے اسی طرح آپ کے اہل بیت واقارب کے وسیلے سے بھی دعا قبول ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں: بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس =

= ذات بابرکات ﷺ کے طفیل پہلے بارش ہوتی تھی اب بھی اُن ہی کا نام وسیلہ در وسیلہ ہوکر کام آرہا ہے۔ یہاں مولانا اشرف علی تھانوی نے بہت اچھا استدلال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس حدیث سے غیر نبی کے ساتھ بھی توسل جائز نکلا، جبکہ اُس کو نبی سے کوئی تعلق ہو، قربت حسیہ کا یا قربتِ معنویہ کا۔ تو توسّل بالنبی کی ایک صورت یہ بھی نکلی، اور اہل فہم نے کہا ہے کہ اس پر متنبہ کرنے کے لیے حضرت عمر نے حضرت عباس سے توسّل کیا، نہ اس لیے کہ پیغمبر ﷺ کے ساتھ وفات کے بعد توسّل جائز نہ تھا، جبکہ دوسری روایت سے اس کا جواز ثابت ہے''۔(1)

وہ دوسری روایت کونسی ہے؟ اُسے پیش کرنے سے قبل یہاں اہل حدیث مصنف علامہ وحید الزماں کی یہ عبارت بھی پیش نظر رہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس حدیث سے نیک بندوں کا وسیلہ لینا ثابت ہوا، بنی اسرائیل بھی قحط میں اپنے پیغمبر کے اہل بیت کا توسّل کیا کرتے، اللہ تعالیٰ پانی برساتا۔ اس سے یہ نہیں نکلتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک آنحضرت ﷺ کا توسّل آپ کی وفات کے بعد منع تھا، کیونکہ آپ تو اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آنحضرت ﷺ نے ایک صحابی کو دعا سکھائی اُس میں یوں ہے: ''**یا محمد إني أتوسل بک إلی ربي**'' اور اُن صحابی نے آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد یہ دعا دوسروں کو سکھلائی، مگر ہمارے اصحاب میں سے امام ابن تیمیہ اور ابن قیم اس طرف گئے ہیں کہ اموات اور قبور کا توسّل جائز نہیں، نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ اور کسی صحابی نے آپ کی قبر شریف کا توسّل کیا، اور خلاف (اختلاف) کیا اُن کا بہت سے اکابر محدثین اور علماء نے، اور یہ کہا کہ ایک امر کا منقول نہ ہونا اُس کے عدم جواز پر دلالت نہیں کرتا، جبکہ اصل وسیلہ کا جواز شرع سے ثابت ہے''۔(2)

علامہ وحید الزماں کا کلام انصاف پر مبنی ہے اور اُن کی یہ دلیل کتنی معقول اور مضبوط ہے ''کیونکہ آپ تو =

(1) نشر الطیب ص ٣٠٢، ٣٠٣۔

(2) تیسیر الباري ج ٢ ص ٨٤، ٨٥۔

....

= اپنی قبر میں زندہ ہیں''۔لیکن اُن کے یہ الفاظ''ایک امر کا منقول نہ ہونا اُس کے عدم جواز پر دلالت نہیں کرتا'' سے مغالطہ کا شکار نہیں ہونا چاہیے ، کیونکہ بعداز وصالِ نبی بھی توسّل بالنبی ثابت ہے،جیسا کہ خود علامہ وحید الزماں کی عبارت کی پانچویں اور چھٹی سطر میں صراحت ہے کہ وسیلہ کی جو دعا حضور ﷺ نے ایک صحابی کو سکھائی تھی وہی دعا بعد از وصالِ نبوی ﷺ بعض صحابہ نے دوسرے لوگوں کو سکھائی۔

اب ہم پہلے وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس کی طرف مولانا اشرف علی تھانوی نے اشارہ کیا ہے، بعد میں وہ حدیث پیش کریں گے جس کی طرف علامہ وحیدالزماں کی عبارت میں اشارہ ہے۔امام ابن ابی شیبہ لکھتے ہیں:

''ابوصالح مالک الدار جو کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے وزیر خوراک تھے، سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں لوگوں پر قحط آ گیا تو ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کے پاس آکر عرض کیا: یارسول اللہ! اپنی امت کے لیے بارش طلب کیجئے کیونکہ وہ ہلاک ہورہے ہیں، پھر خواب میں ایک شخص (حضرت بلال بن حارث المزنی) کو فرمایا گیا کہ وہ حضرت عمر کو جا کر حضور ﷺ کا سلام پہنچائے ،اُنہیں بارش کی خوش خبری دے اور کہے کہ آپ پر عقل مندی لازم ہے۔اُنہوں نے آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے، پھر کہا: اے میرے رب! میں تو صرف اسی کام کو ترک کرتا ہوں جس سے میں عاجز ہوتا ہوں''۔(1)

حافظ ابن کثیر، حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ سمہودی وغیرہ نے لکھا ہے کہ جو شخص روضہ مقدسہ پر بارش کی درخواست لے کر گیا تھا وہ صحابی رسول حضرت بلال بن حارث المزنی رضی اللہ عنہ تھے،اور انہوں نے کہا ہے: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔(2) =

---

(1) المصنف لابن أبي شيبة ج۱۷ ص۶۳،۶۴ حديث ۳۲۶۶۵ وط: ج۱۲ ص۳۱ وط: ج۱۱ ص ۱۱۸ حديث ۳۲۵۳۸؛ دلائل النبوة للبيهقي ج۷ ص۴۷؛ تاريخ دمشق ج۴۴ ص۳۴۵؛ مختصر تاريخ دمشق ج۱۹ ص۹؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج۳ ص۲۷۳۔

(2) البداية والنهاية ج۱۰ ص۷۳،۷۴؛ فتح الباري ج۳ ص۳۴۹،۳۵۰ حديث ۱۰۱۰؛ وفاء الوفا ج۴ ص۱۹۵، وط: ۴ ص۵۰۵۔

....

= اب پہلے وہ حدیث پڑھیے جو حضور ﷺ نے صحابی کو سکھائی تھی، پھر یہ ملاحظہ فرمانا کہ وہی حدیث آگے دوسرے اہل اسلام کو سکھائی گئی اور اُنہوں نے اس پر عمل کیا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اُن کی آرزو پوری فرمائی۔ امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

''ایک نابینا شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا: آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے عافیت عطا فرمائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو اس دعا کو رہنے دیتے ہیں اور یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اور چاہو تو دعا کر دیتے ہیں؟ اس نے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے اسے حکم فرمایا کہ وہ وضو کرے اور اچھا وضو کرے اور دو رکعت نفل پڑھے اور یہ دعا مانگے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُکَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْکَ بِمُحَمَّدٍ نَّبِيِّ الرَّحْمَةِ. يَا مُحَمَّدُ! إِنِّي قَدْ تَوَجَّهْتُ بِکَ إِلٰى رَبِّي فِي حَاجَتِي هٰذِهِ لِتُقْضٰى. اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ.

''اے اللہ! میں آپ سے سوال کرتا ہوں اور آپ کے نبی جو رحمت کے نبی ہیں، محمد ﷺ کے واسطے سے آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمد (ﷺ) میں آپ کے طفیل اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ میری یہ حاجت پوری ہو جائے۔ اے اللہ! آپ کی سفارش میرے حق میں قبول فرما''۔(1) =

---

(1) سنن ابن ماجه: كتاب الصلاة، باب ماجاء في صلاة الحاجة، حديث ١٣٨٥؛ سنن الترمذي: أبواب الدعوات، باب (١١٨)(127) ج٥ ص٥٣٦، ٥٣٧ حديث ٣٥٧٨؛ مسند أحمد ج٤ ص١٣٨ حديث ١٧٣٧٢، ١٧٣٧٣، ١٧٣٧٤؛ مسند عبد بن حميد ج١ ص٣٠٨ حديث ٣٧٩؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٦ حديث ١٠٤٩٤، ١٠٤٩٦، وط: ج٩ ص٢٤٤، ٢٤٥ حديث ١٠٤١٩، ١٠٤٢٠، ١٠٤٢١؛ صحيح ابن خزيمة ج٢ ص٦٠٣ حديث ١٢١٩؛ المستدرك للحاكم ج١ ص٣١٣، وط: ج١ ص٤٥٨ حديث ١١٨٠؛ تهذيب الكمال ج١٩ ص٣٥٩۔

....

= اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ یہ حدیث فقط حضور اکرم ﷺ کی ظاہری حیات تک ہی قابل عمل نہ سمجھی گئی بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ حدیث بعداز وصال نبوی ﷺ آگے ضرورت مندوں کو سکھائی اور اُنہوں نے اس پر عمل کیا اور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت عثمان بن حُنَیف (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ ایک صاحب حضرت عثمان (غنی رضی اللہ عنہ) کے پاس اپنی کسی ضرورت سے بار بار حاضر ہوتے تھے وہ ان کی طرف التفات نہ فرمارہے تھے نہ ان کی ضرورت کی طرف توجہ فرمارہے تھے۔ ان صاحب نے ابن حنیف سے شکایت کی۔ انہوں نے یہ ترکیب بتائی کہ تم وضوکر کے مسجد نبوی ﷺ میں جاؤ اور دورکعت نفل پڑھ کر یہ دعا پڑھو اور اپنی حاجت کو اللہ جَلَّ شَانُہٗ کے سامنے پیش کرو۔ انہوں نے اس کے موافق کیا، اس کے بعد وہ سیدنا عثمان (غنی رضی اللہ عنہ) کی خدمت میں گئے، وہاں پہنچتے ہی دربان آیا اور ان کو ہاتھوں ہاتھ لے گیا۔ وہاں پہنچے تو حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے بہت اکرام کیا اپنی جگہ بٹھایا اور ان کی ضرورت کو خود دریافت کر کے پورا کیا اور اس کی معذرت فرمائی کہ اس وقت تک تمہاری ضرورت کو پورا نہ کرسکا، اور آئندہ کے لیے ارشاد فرمایا کہ جو ضرورت ہوا کرے بے تکلف کہہ دیا کریں۔ یہ صاحب جب حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) سے واپس آئے تو ابنِ حنیف (رضی اللہ عنہ) سے ملے اور ان کا بہت شکریہ ادا کیا کہ تمہاری سفارش سے میرا کام ہوگیا۔ حق تعالیٰ شَانُہٗ تمہیں اس کی جزائے خیر دے۔ اِبنِ حُنَیف (رضی اللہ عنہ) نے کہا میں نے کوئی سفارش نہیں کی بلکہ بات یہ ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک نابینا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بینائی کی شکایت کی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: صبر کرو اور کہو تو میں دعا کردوں۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! کوئی ہاتھ پکڑنے والا بھی میرے پاس نہیں ہے اس کی بہت تکلیف ہے تو حضور ﷺ نے یہی ترکیب ان کو بتائی تھی کہ وضوکر کے دورکعت نماز پڑھیں پھر اس دعا کو پڑھ کر دعا کریں۔ اِبنِ حُنَیف (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ [**فواللّٰہ ما تفرقنا وطال بنا الحدیث**] تھوڑا عرصہ بھی نہ گزرا (ابھی مجلس برخاست نہ ہوئی اور نہ ہی سلسلۂ کلام دراز ہوا) تھا کہ وہ نابینا

....

= ایسے آئے گویا ان کی آنکھوں کو کوئی نقصان ہی نہ پہنچا تھا‘‘۔(1)
ترجمہ کے الفاظ مولانا زکریا سہارنپوری سے منقول ہیں۔(2)

اس واقعہ کے ساتھ اس حدیث کو امام طبرانی، امام ابونعیم، امام منذری، حافظ ہیثمی، امام سبکی، امام سخاوی، امام سیوطی، امام صالحی شامی، علامہ مرجانی، امام سمہودی، امام نبھانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سرفراز صفدر اور صوفی محمد اقبال مدنی نے بھی ذکر کیا ہے۔(3)

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری حیات تک کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے قابل عمل ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہ وغیرہ سے قبل اور بعد کے علماء ومحدثین کرام روزمرہ اعمال ووظائف وغیرہا کتب میں برابر اس حدیث کو لکھتے چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ امام نسائی، امام ابن السنی، امام بیہقی، امام نووی، خطیب تبریزی، حافظ عبدالغنی المقدسی، امام عسقلانی، امام سیوطی، امام ابن الملقن، امام قسطلانی، علامہ دمیاطی، امام جزری مقری، امام مراغی، امام حصنی، امام ابن حجر مکی، شاہ عبدالعزیز دہلوی، قاضی =

(1) دلائل النبوة للبیهقي ج٦ ص١٦٦، ١٦٨۔

(2) فضائل حج ص١٧٦، ١٧٧۔

(3) المعجم الکبیر ج٩ ص١٧، ١٨ حدیث ٨٣١١؛ الروض الداني إلی المعجم الصغیر ج١ ص ٣٠٦ حدیث ٥٠٨؛ معرفة الصحابة لأبي نعیم ص١٨٥٨، ١٨٥٩ حدیث ٤٩٢٦، ٤٩٢٨؛ الترغیب والترهیب ج١ ص٢٧٢، وط: ٣١٠؛ مجمع البحرین للهیثمي ج١ ص٤١٣ حدیث ١١٢٠؛ مجمع الزوائد ج٢ ص٢٧٩، وط: ج٢ ص٥٦٥ حدیث ٣٦٦٨؛ شفاء السقام ص ١٦٦، ١٦٨، وط: ٣٧١؛ القول البدیع ص٤٣٣، ٤٣٥؛ الخصائص الکبری ج٢ ص٣٤٦؛ سبل الهدی والرشاد ج١٢ ص ٤٠٤، ٤٠٧؛ بهجة النفوس والأسرار ج٢ ص٣٩٦؛ وفاء الوفاء ص١٣٧٢، ١٣٧٣، وط: ج٤ ص ٥٠٢، ٥٠٣؛ حجة الله علی العالمین ص٥٧٩؛ شواهد الحق للنبهاني ص٢٠؛ سعادت الدارین ص ٤٨٦؛ نشر الطیب ص٣٠٠، ٣٠١؛ تسکین الصدور للصفدر ص٤٣٠؛ سماع الموتی للصفدر ص ١٢٣؛ العطور المجموعة للصوفي محمد إقبال ص٢٥١۔

....

= شوکانی اور علامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی وغیرہ نے ایسی حوائج کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی اپنی کتب میں یہ حدیث ذکر کی ہے اور لوگوں کو عمل کی تلقین کی ہے۔(1)

ہمارے دور میں بعض علماءِ عرب نے امام سیوطی کی مشہور کتاب ''الخصائص الکبریٰ'' کی تلخیص کی ہے اور اُنہوں نے ''الخصائص'' سے وہ تمام احادیث نکال دی ہیں جو اُن کے مطابق موضوع یا شدید ضعیف تھیں، لیکن وہ اس حدیث کو نہیں نکال سکے اور اُنہیں ماننا پڑا ہے کہ یہ حدیث مع قصہ صحیح ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس حدیث کی سند صحیح ہے، اس کو اس قصہ کے ساتھ حفاظ کی ایک جماعت نے صحیح کہا ہے، مثلاً امام حاکم، طبرانی، منذری، نووی، ابن تیمیہ، ہیثمی، ابن حجر اور سیوطی وغیرھم۔

لأن سند القصة وأصل الحديث واحد.

اس لیے کہ قصہ کی سند اور اصل حدیث کی سند ایک ہے''۔(2)

علامہ وحید الزماں کی عبارت میں اوپر آ چکا ہے کہ ابن تیمیہ اور ابن قیم سے بہت سے اکابر علماء اور محدثین نے اختلاف کیا ہے۔ اس پر میں کہتا ہوں: جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بعد از وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حدیث کو قابل =

---

(1) عمل اليوم والليلة للنسائي ص٤١٧، ٤١٨ حديث٦٥٨، ٦٥٩، ٦٦٠؛ عمل اليوم والليلة لابن السني ص٢٢٢ حديث٦٢٨؛ الدعوات الكبير للبيهقي ج١ ص ٣٢٥ حديث٢٣٥؛ الأذكار للنووي ص٢١٦؛ مشكاة ص٧٦٨ حديث ٢٤٩٥؛ منتخب النصيحة فى الأدعية الصحيحة ص١٢٦؛ مختصر الترغيب والترهيب للعسقلاني ص٧٢، وط: ص٦١ حديث ١٩٠؛ عمل اليوم والليلة للسيوطي ص٢٩٦ حديث ٦٢٨؛ غاية السول لابن الملقن ص٢٩٧؛ المواهب اللدنية ج٤ ص ٥٩٤؛ المتجر الرابح للدمياطي ص٢٠١؛ حصنِ حصين ص٩٩؛ تحقيق النصرة ص١٥٢؛ دفع شبه من تشبه للحصني ص٧٩، حاشية ابن حجر هيثمي علىٰ مناسك النووي ص٤٩٠؛ فتاوى عزيزي ج١ ص٨٨، ٨٩؛ تحفة الذاكرين للشوكاني ص٦٦ وص٢٣١؛ إعلاء السنن ج٥ ص١٩٠٩۔

(2) تهذيب الخصائص النبوية الكبرىٰ ص٣٦٧۔

....

= عمل سمجھا اور پھر اس حدیث کو اس قصہ کے ساتھ امام طبرانی، امام بیہقی، امام منذری اور دوسرے بہت سے علماء حدیث نے صحیح بھی قرار دیا ہے تو پھر ابن تیمیہ وغیرہ کے افکار کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا اِن کے افکار صحابہ کے فکر و عمل سے زیادہ وزنی ہیں؟ کیا مذکورہ بالا تمام علماء کے مقابلہ میں ابن تیمیہ کا پلڑا زیادہ بھاری ہے؟ کیا اُس نابینا صحابی رضی اللہ عنہ کے عمل کے بعد یہ حدیث قابلِ عمل نہیں رہی اور کیا یہ منسوخ ہوگئی؟ اور اگر منسوخ ہے تو اِس کی ناسخ حدیث کونسی ہے؟

حیرت ہے کہ علامہ ابن تیمیہ متوفیٰ ۷۲۸ھ کے بعد سے اب تک علماء اُن کی موشگافیوں کے جواب دیتے آرہے ہیں، حالانکہ "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ" (ستھرا لے لو اور گدلا چھوڑ دو) اور بقول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما: "کل مأخوذ من قوله ومردود عليه إلا رسول الله ﷺ" (ہر شخص کا قول مقبول بھی ہوتا ہے اور مردود بھی، ماسوا رسول اللہ ﷺ کے قول کے) علامہ ابن تیمیہ کے قول کو مسترد کر دیا جاتا۔ بہر کیف وسیلے میں اِس سخت موقف کے باوجود علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم مؤلف کتابِ ھٰذا کی طرح اس بات کے قائل نہیں کہ ۱۱ھ سے لے کر قیامت تک حضور ﷺ اپنی قبر میں میت ہیں، بلکہ وہ دونوں حیات النبی کے قائل ہیں۔

اس بحث کے آخر میں ہم مؤلف سے عرض کرتے ہیں کہ جہاں انہوں نے علامہ آلوسی کی مذکورہ بالا عبارت نقل کی تھی وہیں اُن کے وہ الفاظ بھی نقل کر دیتے جو اُنہوں نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھے تھے تو بہت اچھا ہوتا! علامہ آلوسی نے لکھا ہے:

> "اور اس مکمل تفصیل کے بعد میں اِس میں بھی حرج نہیں سمجھتا کہ نبی کریم ﷺ کی حیات میں اور آپ کے وصال کے بعد آپ کی تکریم اور وجاہت کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے، اور آپ کی وجاہت سے یہاں اللہ جل جلالہ کی ایک صفت مراد ہے، مثلاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی آپ سے وہ کامل محبت جس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کو مسترد نہ کرے اور آپ کی شفاعت کو قبول فرمائے۔ جب کوئی شخص دعا میں کہتا ہے: "اے اللہ! میں تیرے نبی ﷺ کی وجاہت کے توسل سے دعا کرتا ہوں کہ تو میری حاجت کو پورا فرما" تو اس دعا کا معنیٰ یہ ہے کہ "اے اللہ! میں اپنی اس حاجت کے پورا ہونے میں تیری محبت کو وسیلہ بناتا ہوں" اور اِس دعا میں اور یہ کہنے

۹۔ اس میں دلیل ہے کہ عامۃ الناس کے معاملات کو حاکم کے پاس لے جایا جائے، لوگوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یونہی بارش کی شکایت کی تھی جیسا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی تھی۔ علامہ عینی فرماتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ استسقاء اور اجتماع کے لیے نکلنا امام (حاکم) کی اجازت کے بغیر نہیں ہوگا، اس لیے کہ خروج واجتماع میں سلطان کے لیے اندرونی خطرہ ہوتا ہے، اور یہ گزشتہ امتوں کے طریقوں میں سے بھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ علیہ السلام کی طرف جب پانی طلب کیا اُن سے اُن کی قوم نے﴾[الأعراف: ۱٦۰] (۱)

۳۰ ویں حدیث

مستظل بن حصین بیان کرتے ہیں: سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اُن کی بیٹی کے بارے میں نکاح کا پیغام بھیجا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُس کی صغرسنی کا عذر کیا اور فرمایا: میں نے اسے اپنے بھتیجے ابن جعفر کے لیے رکھا ہوا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! میری نیت میں خواہش نفس نہیں، میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا تھا: قیامت کے دن ہر سبب اور نسب منقطع ہو جائے گا ماسوا میرے سبب اور نسب کے۔

یہ سند حسن ہے، ہم نے ضیاء مقدسی کی ''الأحادیث المختارۃ'' میں اس کو ایسے ہی پایا ہے، اس میں ایک شریک نامی راوی کے حافظہ میں اگرچہ کچھ ضعف تھا مگر یہ بہت سی مرسل اور متصل سندوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے آئی ہے، اور اُن میں مذکور ہے کہ اُنہوں نے اس شادی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مبارک باد دی تھی۔

امام احمد رضی اللہ عنہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس اعزاز میں داخل ہیں کہ انہیں

= میں کوئی فرق نہیں کہ ''اے اللہ! میں تیری رحمت کو وسیلہ بناتا ہوں کہ تو میرا یہ کام کر دے'' بلکہ میں یہ بھی جائز سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص یوں کہے: ''اے اللہ! میں تجھ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجاہت کی قسم دیتا ہوں کہ تو یہ کام کر دے''۔ (روح المعاني ج۷ ص ۱۸۰)

(۱) عمدة القاري ج۷ ص۴۸۔

نبی کریم ﷺ کی نسبی اور سببی فضیلت حاصل ہے۔

اس حدیث میں ''ابنته'' سے سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا مراد ہیں جیسا کہ دوسری روایات میں تصریح ہے، اور نسب سے ولادت کا رشتہ اور سبب سے سسرالی رشتہ مراد ہے۔(۱) (۲)

۱۔ یہ حدیث اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی خصوصیت پر مشتمل ہے کہ قیامت کے دن اُن کے نسب وسبب کے بغیر تمام انساب واسباب غیر مفید ہوں گے۔

۲۔ اس حدیث اور آیت ﴿سو جب صور پھونکا جائے گا تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی اُن کے درمیان اُس روز﴾[المؤمنون: ۱۰۱] کے مابین مطابقت کے معاملہ میں اختلاف واقع ہوا تو بعض نے اس حدیث کو مسترد کردیا اور وہ بھلائی کو نہ پہنچے، اور کہا گیا ہے بلکہ نسب وسبب سے مراد قرآن اور ایمان ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ قیامت کے دن تمام امتوں کو اُن کے نسب نفع نہیں دیں گے ماسوا اِس امت کے، اِس امت کے لوگ آپ ﷺ کے نسب سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث اِن لوگوں کے خلاف ہے، کیونکہ دو راشد خلیفوں اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو فقط اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی خصوصیت سمجھا ہے۔

پھر اگر کہا جائے کہ مسلم شریف کی وہ حدیث جسے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ ''جس شخص کو اُس کے عمل نے روک لیا اُسے اُس کا نسب آگے نہیں لے جائے گا'' مسترد کرتی ہے، اور یہ حدیث سب کے لیے عام ہے۔تو اس کے جواب میں آپ کہیے کہ زیر بحث حدیث (اہل بیت کے لیے) خاص ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ اس حدیث کو نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد بھی مسترد کرتا ہے جو آپ نے بنو ہاشم کو

---

(۱) الأحاديث المختارة ج۱ ص۳۹۸ حديث ۲۸۱۔

(۲) یہاں حضور ﷺ کے ساتھ سسرالی اور نسبی رشتہ کی فضیلت میں فقط حضرت معاویہ کا ذکر ہی کیوں؟ کیا سیدنا ابن عمر، سیدنا عبد الرحمان بن ابی بکر، سیدنا محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہم کو یہ رشتہ داری حاصل نہیں تھی؟ قارئین کرام! اگر آپ اِس تخصیص کی وجہ جاننا چاہیں تو راقم الحروف کی کتاب ''شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ'' **الطبعة الرابعة صفحہ ۹۴۹ تا ۹۵۵** ملاحظہ فرمائیں۔

فرمایا تھا کہ ''ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس اپنے اعمال کے ساتھ اور تم میرے پاس اپنے انساب کے ساتھ آؤ''۔

آپ اس کے جواب میں کہیے: اِن الفاظ کے ساتھ اس حدیث کی ایسی کوئی اصل نہیں جو نبی کریم ﷺ سے صحت کے ساتھ ثابت ہو، اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو یہ فقط نصیحت پر مبنی ہوگی، نہ کہ اس سے اِس خصوصیت کی نفی مقصود ہے، ورنہ دو امیر المومنین اور اُن کے ساتھ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فہم فاسد قرار پائے گی۔

اور اگر کہا جائے کہ پیچھے بخاری اور مسلم کے حوالے سے ایک حدیث گزر چکی ہے کہ: ''اے بنو عبد مناف میں تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے پروا نہیں ہوں''۔

اس کے جواب میں آپ کہیے: آپ ﷺ کا یہ خطاب ابتدائے بعثت میں تھا، جبکہ قریش کو دعوتِ توحید دی جا رہی تھی، مقصود یہ تھا کہ جس نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو اُسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی چیز بچا نہیں سکے گی، جیسا کہ اس پر سیاقِ حدیث دلالت کر رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کے چچا ابولہب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا باوجودیکہ وہ آپ کے نسب شریف میں داخل تھے۔ پس جو شخص دائرۂ توحید میں آ گیا اُسے زیر بحث حدیث فائدہ پہنچائے گی، اور جو اس دائرہ میں نہیں آیا اُسے اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز نہیں بچائے گی۔

۳۔ اس میں اہل بیت کے ساتھ مصاہرت (سسرالی تعلق) کے پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ حقیقت سمجھ آئی تو انہوں نے اہل بیت سے مصاہرت کی، اُن ہی میں سے چار خلفاء راشدین سیدنا ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم ہیں۔

٤۔ ارشادِ نبوی ﷺ ''غیر سببي ونسبي'' میں یہ دلیل نہیں ہے کہ اہل بیت میں سے جو شخص عملاً کوتاہ ہو اُسے عذاب نہیں دیا جائے گا، یہ حدیث ایسے مفہوم کو مستلزم نہیں ہے بلکہ اُسے عذاب دیا جائے گا پھر اُسے شفاعت نصیب ہوگی، اُسے آگ لپیٹ میں لے گی پھر اُسے ارحم الراحمین کی رحمت آغوش میں لے گی، جیسا کہ یہ حقیقت مرنے کے بعد اٹھنے کے احوال سے ظاہر ہے۔

٥۔ یہ حدیث اہل بیت کے اُس شخص کے لیے کوئی دلیل نہیں جو فسق و فجور کمائے، اس لیے کہ ایسا شخص حدیث پر بھروسہ کرتے ہوئے ایسے عمل کا مرتکب ہو سکتا ہے جس کا ابو الأنبیاء [سیدنا ابراہیم] علیہ السلام نے خدشہ

محسوس کیا تو عرض کیا ﴿اور نہ شرمسار کرنا مجھے جس روز لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے ﴾[الشعراء: ۸۷]اور اس سے زیادہ شرمندگی والی بات کون سی ہوگی کہ آخرت میں تمام لوگ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں نیکیوں کے ساتھ پہنچیں اور آپ کے اہل بیت آپ کے پاس برائیوں کے ساتھ پہنچیں۔

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ شادی بیاہ میں اہل بیت دوسروں کے بجائے باہم رشتہ داریاں کرنے میں زیادہ حق رکھتے ہیں، اِلّا یہ کہ کوئی امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کی مانند ہو۔

۷۔ اس میں اشارہ ہے کہ حضور ﷺ کی ازواج امہات المومنین دنیا اور آخرت میں آپ کی ازواج ہیں، اس کی متعدد احادیثِ صحیحہ میں تصریح آئی ہے اور اسی پر صحابہ اور اُن کے بعد کے اہل اسلام کا اجماع ہے رضی اللہ عنہم۔

۸۔ اس میں امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے، بایں وجہ کہ انہوں نے اتباعِ سنت میں نکاح کی رغبت کی اور حالتِ ضعف، بڑھاپے اور سامان کی قلت کے باوجود اہل بیت کے ساتھ مصاہرت چاہی۔

۹۔ ارشادِ مرتضوی "فاعتل بصغرها" میں اشارہ ہے کہ اصحابِ نبی ﷺ کے نزدیک اصول یہ تھا کہ چھوٹی بچی کا نکاح نہ کیا جائے۔(۱)

۱۰۔ اس میں امورِ عظیمہ پر حلف اُٹھانے کے جواز کی دلیل ہے۔

---

(۱) نکاح ام کلثوم کی روایت پر اشکال

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سیدہ ام کلثوم بنت علی کے نکاح کی یہ اور دوسری تمام روایات نہ صرف یہ کہ انتہائی غیر معتبر ہیں بلکہ اگر اِن تمام روایات میں موجود متضاد جملوں کا بغور جائزہ لیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دشمنوں نے یہ روایت گھڑی ہے۔ مثلاً شادی کی تاریخ، بچی کی عمر، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عمر، سیدنا علی کا بچی کی کم عمری کا عذر کرنا، اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اُن پر اعتبار نہ کرنا، پھر بچی کو جانچنے کے لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا جانا، نکاح کو بچی کی رضامندی پر موقوف کرنا، پھر بچی کے راضی نہ ہونے کے باوجود سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بچی کا شوہر قرار دے دینا، قبل از نکاح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا بچی کو اپنے ساتھ چمٹا لینا، اُن کی پنڈلی سے کپڑا ہٹانا، سیدہ ام کلثوم کا اُنہیں طمانچہ مارنے کے لیے آمادہ ہونا، اور یہ کہنا کہ اگر آپ امیر المومنین نہ ہوتے تو میں آپ =

۳۱ویں حدیث

عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد ربیعہ بن حارث اور عباس بن عبد المطلب دونوں نے عبدالمطلب بن ربیعہ اور فضل بن عباس کو کہا: تم دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤ اور عرض کرو، یارسول اللہ! اب ہماری جو عمر ہوگئی ہے اُسے آپ دیکھ رہے ہیں (یعنی ہم بالغ اور شادی کے لائق ہوگئے ہیں) ہم چاہتے ہیں کہ نکاح کرلیں اور اے اللہ کے رسول! آپ سب لوگوں سے بڑھ کر بھلائی

= ناک توڑ دیتی وغیرہ، ایسے اشکالات ہیں جن کے ہوتے ہوئے یہ واقعہ نہیں بلکہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

ہر چند کہ اس نکاح کی بازگشت بخاری وغیرہ میں بھی موجود ہے مگر کیا معتبر راویوں پر موضوع متن چڑھانا بعید ہے؟ ہرگز نہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے، جس میں ہے کہ حضرت ابوسفیان نے بارگاہ نبوی میں تین چیزوں کی درخواست کی اور اُن کی درخواست قبول کی گئی، حالانکہ محدثین کے نزدیک وہ حدیث موضوع ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: **شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ ص ۹۵۲، الطبعة الرابعة.**

میری دانست کے مطابق اس روایت کے موضوع ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تو نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا رشتہ بھی مانگا تھا اور حضور ﷺ نے اُن کی کم عمری کا عذر فرمایا تھا، حالانکہ اُس وقت سیدہ فاطمہ علیہا السلام کی عمر مبارک چودہ برس سے اوپر تھی، لہٰذا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نکاح کی عمر کو نہیں پہنچی تھیں بلکہ یہ مطلب تھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عمر میں اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر میں فرق تھا۔ اُس وقت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً پنتالیس برس تھی، جب پنتالیس سالہ آدمی کو نبی کریم ﷺ نے چودہ سالہ لڑکی دینا مناسب نہ سمجھا تو پھر وہی عمر اُسی سیدہ فاطمہ کی آٹھ سالہ لڑکی کو [۵۷] ستاون سال کی عمر میں کیونکر مانگنے جائیں گے؟ میں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ تصور ہی نہیں کرسکتا کہ اُنہوں نے اِس حد تک منشائے نبوی ﷺ کے خلاف قدم اُٹھایا ہوگا۔

خیال رہے کہ اس نکاح کے سلسلے میں کتبِ اہل سنت میں جس قدر روایات ہیں، سب میرے سامنے ہیں، اُن سب کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اختصاراً یہ چند سطور لکھی ہیں۔ اگر کسی صاحب علم کے سامنے یہ سب روایات ہوں تو وہ اُن میں غور کرے کہ آیا ہمارے پیش کردہ اشکالات کس حد تک درست ہیں، اور کیا ان کے ازالے کی کوئی صورت ہے؟

پہنچانے والے اور صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔ ہمارے باپوں کے پاس مہر دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، لہٰذا آپ ہمیں صدقات کی وصولی پر مامور فرما دیجئے، ہم آپ کو وہی دیں گے جو دوسرے عامل لا کر دیا کرتے ہیں اور اس سے جو فائدہ حاصل ہوگا وہ ہم پائیں گے۔ عبدالمطلب بن ربیعہ کہتے ہیں: ابھی ہم گفتگو کر رہے تھے کہ علی بن ابو طالب ادھر آ نکلے اور انہوں نے کہا: خدا کی قسم! رسول اللہ ﷺ تم میں سے کسی کو بھی صدقات کی وصولی پر مامور نہیں کریں گے۔ ربیعہ نے کہا: تم یہ سب حسد کی بنا پر کہہ رہے ہو۔ تم رسول ﷺ کے داماد بن گئے اور ہم نے تم پر حسد نہیں کیا۔ یہ سن کر علی رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر بچھائی اور اس پر لیٹ گئے اور کہا: میں ابوالحسن ہوں عقل اور تجربہ میں تم سب سے زیادہ ہوں، خدا کی قسم! میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹوں گا جب تک کہ تمہارے بیٹے اُس کام سے ناامید ہو کر واپس نہیں آ جاتے جس کے لیے تم ان کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج رہے ہو۔ عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں اور فضل بن عباس دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے، جب ہم پہنچے تو ظہر کی تکبیر ہوئی اور ہم نے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں اور فضل جلدی کر کے رسول اللہ ﷺ کے حجرے کے دروازے کی طرف چلے۔ آپ اس دن زینب بنت جحش کے پاس تھے، ہم دروازے پر کھڑے رہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے از راہِ شفقت میرا اور فضل کا کان پکڑا اور فرمایا: جو تمہارے دل میں ہے کہو۔ پھر آپ گھر تشریف لے گئے اور ہم دونوں کو اندر آنے کی اجازت دی۔ ہم اندر گئے تو تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو گفتگو شروع کرنے کے لیے کہتے رہے۔ آخر کار میں نے یا فضل نے ''اس میں عبداللہ کا شک ہے'' وہی کہہ دیا جو ہمارے بزرگوں نے ہمیں ہدایت کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ سن کر کچھ دیر خاموش رہے، پھر کافی دیر تک نگاہ اٹھا کر چھت کی طرف دیکھتے رہے، یہاں تک کہ ہمیں خیال ہونے لگا کہ آپ ہمیں کوئی جواب نہیں دیں گے، مگر ہم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ وہ پردے کی اوٹ سے اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہہ رہی تھیں کہ جلدی نہ کرو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ تمہارے ہی معاملہ میں غور فرما رہے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا سر جھکایا اور فرمایا: یہ صدقہ ہے اور یہ لوگوں کے مال کا میل کچیل ہے، جو محمد اور آل محمد ﷺ کے لیے درست نہیں ہے۔ پھر فرمایا: نوفل بن حارث کو بلاؤ، وہ حاضر ہو گئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: تم اپنی بیٹی کا عبدالمطلب

سے نکاح کردو۔ پس نوفل نے اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دیا۔ پھر فرمایا: محمیہ بن جزء کو بلاؤ! وہ بنی زبید کا ایک شخص تھا، جس کو رسول اللہ ﷺ نے خمس وصول کرنے پر مامور کر رکھا تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا: تم اپنی بیٹی کا نکاح فضل سے کر دو۔ پس اس نے اپنی بیٹی کا نکاح فضل سے کر دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اٹھو اور ان دونوں کی طرف سے خمس کے مال میں سے اتنا اور اتنا مہر ادا کرو۔ زہری کہتے ہیں کہ عبداللہ بن حارث نے مجھ سے مہر کی مقدار بیان نہیں کی۔

یہ صحیح سند ہے، اس کو امام ابوداود نے روایت کیا ہے اور اسے مسلم نے از محمد بن شہاب زہری اسی طرح روایت کیا ہے۔(۱)

اس میں لفظ "مِرْفَق" کا معنیٰ ہے منفعت، اور "القَرْم" کی اصل "الفَحل" (جانوروں میں نر) ہے، پھر اس کو استعارۃً معاملات میں ماہر سردار کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ "لَا أَرِیمُ" کا معنی ہے: میں اپنے اس مقام سے نہیں ہٹوں گا۔ "تُصَرِّرَان" میں چھپانے کا معنی موجود ہے، اور "تُلَمِّعُ" میں اشارہ کرنے کا معنیٰ ہے۔

۳۱ ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ کے چچاؤں کی اولاد آپ کے اہل بیت میں داخل ہے۔

۲۔ اس میں بنو ہاشم پر صدقہ کے حرام ہونے کی دلیل ہے، اور وہ آل علی، آل عباس، آل جعفر اور آل عقیل ہے، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

۳۔ امام شافعی اور امام احمد رضی اللہ عنہما نے حرمتِ صدقہ میں بنو ہاشم کے ساتھ بنو مطلب کو بھی شامل کیا ہے، کیونکہ خمس کے حصہ میں وہ بھی شریک ہیں، یقیناً نبی کریم ﷺ نے اُن کے ساتھ اُنہیں بھی عطا فرمایا

---

(۱) سنن أبي داود: کتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في بیان مواضع قسم الخمس وسهم ذوی القربیٰ، حدیث ۲۹۸۵؛ مسلم: کتاب الزکاة، باب ترك استعمال آل النبي ﷺ على الصدقة، حدیث ۱۰۷۲؛ سنن النسائي: کتاب الزکاة، باب استعمال آل النبي ﷺ على الصدقة، حدیث ۲۶۰۹۔

تھا، جیسا کہ بخاری شریف میں ہے۔ ماسوا اُن کے برادران بنوعبد شمس اور بنونوفل کے، کیونکہ بنو ہاشم اور بنو مطلب جاہلیت اور اسلام میں ایک ہی چیز تھے۔(۱) (۲)

---

(۱) بخاري: كتاب فرض الخمس، باب ومن الدليل على أن الخمس للإمام، وأنه يعطي بعض قرابته دون بعض: ماقسم النبي ﷺ لبني المطلب وبني هاشم من خمس خيبر، حديث ٣١٤٠؛ سنن ابن ماجه: كتاب الجهاد، باب قسمة الخمس، حديث ٢٨٨١؛ سنن أبي داود: كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في بيان مواضع قسم الخمس وسهم ذوى القربىٰ، حديث ٢٩٧٨۔

(۲) فقط بنومطلب اور بنو ہاشم ہی ''شيء واحد'' کیوں؟

اِس آخری جملہ میں مؤلف نے بخاری شریف کی جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اُس میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے خمس کی تقسیم میں بنو ہاشم اور بنومطلب کو تو عطا کیا لیکن بنوعبد شمس اور بنونوفل کو نہ دیا۔ اِس پر بنوعبد شمس اور بنونوفل میں سے دو شخص بارگاہ رسالت میں آئے، وہ کون تھے اور اُنہوں نے آ کر کیا عرض کیا؟ یہ مولانا تقی عثمانی کے توضیحی الفاظ میں سنیے، وہ لکھتے ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنوعبد شمس میں سے تھے اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بنونوفل میں سے تھے، یہ دونوں آئے اور آ کر کہا کہ اگر آپ نے صرف بنو ہاشم کو دیا ہوتا اور بنوالمطلب کو نہ دیا ہوتا تو ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا، اس لیے کہ بنو ہاشم کو فضیلت حاصل ہے، کیونکہ آپ بنو ہاشم میں سے ہیں، بنو ہاشم آپ کا خاندان ہے اور اُس نے جو آپ کی نصرت کی ہے وہ عیاں ہے، بنو ہاشم کے ساتھ آپ کو زیادہ قرابت داری حاصل ہے، لیکن آپ نے بنو ہاشم کے ساتھ بنوالمطلب کو بھی دیا اور بنوالمطلب سے آپ کا وہی رشتہ ہے جو بنونوفل اور بنوعبد الشّمس سے ہے، ان کو ہمارے اوپر کوئی مزیت (خصوصیت) حاصل نہیں ہے، اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے اُن کو دیا اور ہمیں چھوڑ دیا، حالانکہ وہ یعنی بنوالمطلب اور ہم آپ کے ایک ہی رشتہ میں ہیں۔ فقال رسول الله .... شيء واحد'' بنوالمطلب اور بنو ہاشم ایک ہی چیز ہیں، یعنی بنوالمطلب کا بنو ہاشم سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ دونوں ایک ہی خاندان بن گئے ہیں اور اُنہوں نے جس طرح قرابت کا حق ادا کیا اور جس طرح نصرت کی وہ بنوعبد الشّمس اور بنونوفل سے بہت زیادہ ہے، چونکہ وہ دونوں =

....

= ایک جیسے ہیں اس لیے میں نے ان دونوں کو دیا، یعنی بنوالمطلب کو بھی دیا اور بنو ہاشم کو بھی دیا، اس پر بنونوفل اور بنوعبدالشّمس کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، نصرت کے معاملہ میں یہ اُس درجہ پر نہیں جس پر بنوالمطلب اور بنو ہاشم ہیں۔

بہرحال معلوم ہوا کہ بنوالمطلب اور بنونوفل وغیرہ سے رشتہ داری کا تعلق ایک جیسا تھا، لیکن آپ ﷺ نے دوسری باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بنوالمطلب کو بنوعبدالشّمس اور بنونوفل پر ترجیح دی۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ استدلال کررہے ہیں کہ اگر بنیاد قرابت ہوتی تو سب کو یکساں طور پر دیتے، لیکن چونکہ سب کو یکساں نہیں دیا، اس لیے معلوم ہوا کہ بنیاد قرابت نہیں ہے''۔(1)

خیال رہے کہ ہاشم، مطلب، نوفل اور عبدالشّمس یہ چاروں حضرت عبدمناف کے بیٹے تھے۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:

''ھاشم، مطلب، عبدشمس کی والدہ کا نام عاتکہ بنت مُرہ ہے اور نوفل کی والدہ کا نام واقدہ بنت صعصعہ ہے''۔(2)

علامہ تقی عثمانی کی مذکورہ عبارت میں ایک جملہ یہ بھی ہے:

''اس لیے معلوم ہوا کہ بنیاد قرابت نہیں ہے''۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُس عطا کی بنیاد قرابت نہیں تو پھر کیا ہے؟ اِس کی توضیح خود اُن کی اپنی عبارت میں موجود ہے، اور وہ یہ الفاظ ہیں:

''اس پر بنونوفل اور بنوعبدالشّمس کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، نصرت کے معاملہ میں یہ اُس درجہ پر نہیں جس پر بنوالمطلب اور بنو ہاشم ہیں''۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیسی حمایت ونصرت تھی جس کی بدولت بنومطلب اور بنو ہاشم ایک ہی چیز ہو =

---

(1) إنعام الباري ج٧ ص٥٧٨۔

(2) جمهرة أنساب العرب ص١٤۔

= گئے؟اس کا جواب یہ ہے کہ بنو مطلب نے ہر طرح بنو ہاشم کی حمایت ونصرت کی تھی، حتیٰ کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''زبیر بن بکار نے ''النسب'' میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ہاشم اور مطلب کو ''البدران'' (چودھویں کے چاند) کہا جاتا تھا اور عبد الشمّس اور نوفل کو ''الأبھران'' (دو رگیں یا دو پٹھیں) کہا جاتا تھا، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سیدنا ہاشم اور مطلب میں ایسی اُلفت تھی جو اُن کے بعد اُن کی اولاد میں بھی سرایت کر گئی، یہی وجہ ہے کہ جب قریش نے اپنے اور بنو ہاشم کے مابین معاہدہ لکھا اور بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا تو بنو ہاشم کے ساتھ بنو مطلب بھی اُس میں شامل ہو گئے، لیکن بنو عبد الشمّس اور بنو نوفل نے ساتھ نہ دیا''۔(1)

بنو ہاشم اور بنو مطلب کی باہمی معیت کو ایک مقام پر یوں بھی بیان فرمایا گیا:

إنا وبنو المطلب لا نفترق في جاهلية ولا إسلام، وإنما نحن وهم شيء واحد، وشبّک بين أصابعه.

''ہم اور بنو مطلب جاہلیت اور اسلام میں جدا نہیں ہوئے، ہم اور وہ ایک ہی چیز ہیں، یہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں داخل فرما دیا''۔(2)

جبکہ دوسری طرف بنو عبد شمس اور بنو نوفل کے ساتھ جاہلیت اور اسلام دونوں میں ایسی معیت کا فقدان رہا، حتیٰ کہ ابن عبد الشمّس یعنی امیہ نے بنو ہاشم سے تو کیا خود اپنے چچا سیدنا ہاشم سے ہی عداوت کا آغاز کیا، جو بعد میں بنو ہاشم اور بنو امیہ (**إلا ما شاء الله**) میں چلتی رہی، حتیٰ کہ سیدنا علی، سیدنا امام حسن مجتبیٰ اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہم کے ساتھ جولڑائیاں ہوئیں، اور کعبہ معظّمہ اور مسجد نبوی پر جو چڑھائی ہوئی، ان ساری باتوں میں وہی افتراق کارفرما=

(1) فتح الباري ج٧ ص ٤٢١۔

(2) سنن أبي داود: كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في بيان مواضع قسم الخمس وسهم ذوى القربى، حديث ٢٩٨٠۔

خمس نہ ہونے کی صورت میں

٤۔ صدقہ کے متعلق پہلے ارشاد فرمایا"إنما لا تحل لمحمد ﷺ ولا لآل محمد" (یہ محمد ﷺ اور آل محمد رضی اللہ عنہم کے لیے حلال نہیں) پھر اُنہیں خمس سے عطا کیا، اس میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے مذہب کی دلیل ہے کہ جب اہل بیت سے خمس روکا جائے گا تو اُن کے لیے زکات حلال ہو جائے گی، اور یہ قوی قول ہے، بعض محققینِ مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور ھادویہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے۔(۱)

٥۔ اس میں اہل بیت کے نفوس کی عظمت کی دلیل ہے، کیونکہ سیدنا فضل بن عباس اور عبدالمطلب بن ربیعہ نے نبی کریم ﷺ سے سوال نہیں کیا بلکہ آپ سے اجرت پر کام مانگا۔

٦۔ ارشادِ نبوی ﷺ"إنما هي أوساخ الناس" (یہ صدقات لوگوں کا میل ہیں) کی تشریح میں امام ابوالعباس قرطبی "المفهم" میں فرماتے ہیں:

"یہ صدقات میل ہیں کہ یہ اُن کے جسموں کو بخل سے اور اُن کے مالوں کو جمع کرنے کے

= رہا، جس کا ذکر صحاح کی مذکور الصدر حدیث میں ہوا۔ اندازہ فرمایئے کہ بر سبیلِ تذکرہ نبی کریم ﷺ کے الفاظ میں کیسی کیسی تلمیحات تھیں اور کتنے بڑے سانحات کی طرف اشارہ تھا، لہٰذا منشائے نبوی ﷺ کی قدر کرتے ہوئے ہر امتی پر فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر معاملہ میں اس لطیف فرق کو ملحوظ رکھے۔ ع:

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

بنو ہاشم سے بنوامیہ کی عداوت کے تسلسل کا کچھ ذکر ہماری کتاب "شرح أسنی المطالب في مناقب علي بن أبي طالب" میں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) ہر چند کہ فاضل مؤلف نے خمس نہ ہونے کی صورت میں بنو ہاشم کے لیے زکات کے جواز کے قول کو قوی قرار دیا ہے، لیکن کتبِ مذاہب میں اِس بحث کو دیکھا جائے تو جواز کے قائلین کم اور عدم جواز کے قائلین زیادہ ہیں۔ شاید مؤلف کو خمس نہ ہونے کی صورت میں عقلاً یہ قول قوی محسوس ہوتا ہوگا، بہر کیف راقم الحروف کی دانست میں بھی یہ بات آتی ہے کہ جب خمس باقی نہیں رہا اور بنو ہاشم باقی ہیں کَثَّرَهُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ، اور اُن میں مفلس وضرورت مند بھی ہوتے ہیں تو اُن کے لیے خمس کا کوئی بدل ضرور ہونا چاہیے۔

گناہ سے پاک کرتے ہیں، پس گویا یہ اُس غسالہ کی طرح ہیں جو معیوب ہوتا ہے"۔(۱)

۷۔ اُن دونوں کو جواب دیتے ہوئے ارشادِ نبوی ﷺ "**إنها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد**" (یہ محمد ﷺ اور آل محمد کے لیے حلال نہیں) میں دلیل ہے" جیسا کہ امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

"یہ صدقہ خواہ کام کی اجرت کی صورت میں ہو یا مسکینی اور فقیری اور اِن دو کے علاوہ آٹھ اسباب میں سے کسی بھی وجہ سے ہو بہرحال حرام ہے، اور یہی ہمارے اصحاب (شافعیہ) کے نزدیک صحیح مذہب ہے، اور ہمارے بعض اصحاب نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے لیے زکاۃ کی وصولی پر عاملین کے حصہ کے مطابق جائز قرار دیا ہے، کیونکہ یہ اجرت ہے، لیکن یہ ضعیف یا باطل مذہب ہے اور اس کی تردید میں یہ حدیث صریح ہے۔(۲) (۳)

۸۔ ربیعہ کا (سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو کہنا) "**هذا من أمرك**" (یہ آپ کے امر سے ہے) سے اُن کا ارادہ تھا کہ یہ آپ کی سوچ، آپ کا استدلال اور آپ کی رائے ہے، اس سے اُن کا مقصد سیدنا علی پر کذب کا الزام نہیں تھا، لیکن ہم نے امام احمد اور ابن خزیمہ کے ہاں یہ الفاظ پائے ہیں "**هذا من حسدك**" (یہ آپ کا حسد ہے) اور ان کے راوی ثقہ ہیں، اور ہم نے اس کو امام ابو عبید کے ہاں اور ابن زنجویہ کی "**الأموال**" میں اور امام طبرانی کے ہاں ان الفاظ میں دیکھا ہے "**هذا من حسدك وبغيك**" (یہ آپ کا حسد اور زیادتی ہے) اس میں ایک راوی عبداللہ بن صالح کاتب اللیث ہے اور وہ کثیر الغلط ہے، گویا یہ دونوں لفظ بالمعنیٰ روایت کیے گئے ہیں، اور اس کی تائید ربیعہ کا بعد والا قول ہے "**فلم نحسدك**" (ہم نے آپ کے ساتھ حسد نہیں کیا تھا) ورنہ یہ دونوں لفظ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں استعمال کرنا مناسب نہیں، تاہم ہم افراد صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں عصمت کا دعویٰ نہیں کرتے، خواہ وہ اہل بیت سے ہوں یا غیر اہل بیت سے، جیسا کہ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں خطا نہیں کرتے تھے، بلاشبہ وہ تمام لوگوں کی

---

(۱) المفهم ج۳ ص۱۲۸۔

(۲) شرح صحيح مسلم للنووي ج۷ ص۲۵۰، ۲۵۱۔

(۳) اس عبارت میں جن آٹھ اسباب کا ذکر ہے وہ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۶۰ میں مذکور ہیں۔

طرح بشر تھے، رضی اللہ عنہم اجمعین۔(۱)

۹۔ اس میں دلیل ہے کہ استطاعت کی صورت میں باپ کا بیٹے کی شادی کرنا نفقہ کی جنس سے ہے نہ کہ ہبہ اور عطیہ کی جنس سے، جس میں ساری اولاد کے درمیان مساوات لازم ہوتی ہے، ماسوا غربت کے۔ پس باپ پر بیٹے کی شادی کرنا لازم نہیں۔

۱۰۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت فضل اور عبدالمطلب بن ربیعہ نے نبی کریم ﷺ سے ایک کام مانگا لیکن آپ نے اُنہیں وہ چیز عطا فرمائی جو اس سے بہتر تھی۔ علامہ ابن قیم "إعلام الموقعين" میں لکھتے ہیں:

"اس میں رب تبارک وتعالیٰ کی اقتدا ہے، کیونکہ بندہ اُس سے اپنی حاجت کا سوال کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اُس حاجت کو روک کر اُسے وہ چیز عطا فرماتا ہے جو بندے کے لیے زیادہ مناسب اور زیادہ مفید ہوتی ہے، اور یہ کرم وحکمت کی انتہا ہے"۔(۲)

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ مفتی جب سائل کو کسی حرام چیز سے منع کرے تو اُس کے سامنے مناسب طریقے سے دلیل بھی پیش کرے۔

۳۲ ویں حدیث

ابن ابی رافع اپنے والد ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو مخزوم کے ایک شخص کو زکاۃ کی وصولی کے لیے بھیجا تو اُس نے ابو رافع کو کہا: آپ بھی میرے ساتھ چلیں تا کہ آپ کو بھی اس سے حصہ ملے۔ اس پر اُنہوں نے اٹھ کر کہا: جب تک میں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اجازت نہ لے لوں نہیں جا سکتا۔ پھر اُنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اجازت لینا چاہی تو آپ

---

(۱) كتاب الأموال لأبي عبيد ج۱ ص ٤٥٥ حديث ۸۳۲؛ مسند أحمد [شاكر] ج۱۳ ص ۳۹۸، ۳۹۹ حديث ۱۷٤٤۷؛ صحيح ابن خزيمة ج۲ ص ۱۱۲٤، ۱۱۲۵ حديث ۲۳٤۲؛ المعجم الكبير ج۵ ص ۵٤، ۵۵ حديث ٤۵٦٦۔

(۲) إعلام الموقعين ج٦ ص ٤٧۔

نے فرمایا: یہ زکاۃ ہمارے لیے حلال نہیں ہے اور قوم کا غلام بھی اُن ہی میں سے ہوتا ہے۔

یہ سند صحیح ہے، ہمیں یہ محاملی کی ''أمالي'' میں اسی طرح ملی ہے، اور اس کو امام احمد، امام ابوداود، امام ترمذی اور امام نسائی نے شعبہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔(۱)

۳۲ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت ہے کہ اُن کے غلاموں پر بھی زکاۃ حرام ہے۔

۲۔ اس میں اہل بیت رضی اللہ عنہم کے خدام کی فضیلت ہے کہ وہ بھی لوگوں کے مال کی میل سے پاک ہیں۔

۳۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کی خدمت کرنا شرف وفضیلت ہے۔

٤۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

''رہی صدقہ کی حرمت تو اُسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود پر اور اپنے اہل بیت پر تکمیلِ طہارت اور اپنی ذات سے تہمت کو دور رکھنے کے لیے حرام کیا تھا، جیسا کہ آپ نے کوئی وارث نہیں بنایا تھا، پس آپ کے ورثاء نے درہم و دینار نہیں لیے بلکہ آپ کے لیے اور آپ کے زیرِ کفالت لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فقط اتنا مال تھا جو روزمرہ خرچ میں پورا ہوتا تھا اور باقی سارا مال اللہ اور اُس کے رسول کی رضا میں صرف ہوتا تھا، اور آپ کے اقارب کو خمس اور مال فئ میں سے مناسب طریقے سے اتنا دیا جاتا جتنا باقی اہل اسلام کے لیے ہوتا، صدقات کی طرح اُن کے لیے مخصوص حصے مقرر نہیں تھے۔(۲)

---

(۱) الأمالي للمحاملي ص ٣٣٤ حديث ٣٦٣؛ مسند أحمد [أحمد شاكر] ج ١٧ ص ١٥٢ حديث ٢٣٧٥٣، وص ١٥٥ حديث ٢٣٧٦٢؛ سنن الترمذي: أبواب الزكاة، باب ماجاء في كراهية الصدقة للنبي ﷺ وأهل بيته ومواليه، حديث ٦٥٧؛ سنن أبي داود: كتاب الزكاة، باب الصدقة علىٰ بني هاشم، حديث ١٦٥٠؛ سنن النسائي: كتاب الزكاة، باب مولى القوم من أنفسهم، حديث ٢٦١٢۔

(۲) مجموع فتاوى ابن تيمية ج ١٩ ص ٣٠، ٣١۔

۵۔ ظاہر یہی ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اہل بیت کے خدام کو صدقہ ممنوع ہونا گویا کمالِ تطہیر کے لیے تھا، اور یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف شیخ الاسلام نے اشارہ فرمایا کہ اس سے آپ کا خود سے اور اُن سے الزام کا دفاع بھی مقصود تھا، کیونکہ عادتِ جاریہ، یہ ہے کہ بہت سے بادشاہ بیت المال سے اپنے خانوادے، اقارب اور خدام کی وساطت سے مال حاصل کرتے ہیں، سو شریعتِ مقدسہ نے وہ تمام طریقے اور واسطے ہی مسدود کر دیے جن کے ذریعے مال حاصل کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ مال براہِ راست آپ ﷺ کے لیے ہو، آپ کی ذریت کے لیے ہو، آپ کے خاندان کے لیے ہو یا آپ کے ماتحت ہونے کی وجہ سے ازواج مطہرات اور غلاموں کے لیے ہو۔(١)

٦۔ اس میں اُس ادب کا ذکر ہے جس پر نبی کریم ﷺ کے خدام گامزن تھے، اور وہ یہ کہ وہ ہر معاملے کو حضور ﷺ کی بارگاہ میں لے جاتے تھے۔

٧۔ اس میں اُس لطف وکرم کا ذکر ہے جو اصحابِ نبی ﷺ ایک دوسرے پر کرتے تھے، بالخصوص حاجت وقلّت کے وقت، رضی اللہ عنہم۔

٨۔ اِس میں اہل بیت کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت کا ذکر ہے، حتیٰ کہ اُن کی یہ محبت اُن کے پیروکار، خدام اور غلاموں کو بھی شامل تھی۔

٩۔ اس میں دلیل ہے کہ دینی مناصب میں تمام لوگوں سے زیادہ حق دار اہل بیت اور وہ صالحین ہیں جو اُن سے وابستہ ہوں۔

---

(١) اہل بیت کے غلاموں پر زکاۃ حرام، کیوں؟

نمبر۴، ۵ یہ دونوں لطیف نکتے ہیں، یہاں اگر علامہ ابن قیم کا وہ نکتہ مدنظر رکھا جائے جو انہوں نے ''بدائع الفوائد'' میں لکھا ہے تو اسلام کی حقانیت وحقیت آفتابِ نیمروز سے بھی زیادہ واضح ہو جائے گی۔ اُنہوں نے سوال قائم کیا ہے کہ اِس میں کیا راز تھا کہ وصال نبوی ﷺ کے فوراً بعد خلافت اہل بیت کی بجائے دوسروں کی طرف گئی؟ جو حضرات یہ لطیف نکتہ جاننا چاہیں تو وہ ''**شرح خصائص علی** رضی اللہ عنہ'' صفحہ ۳۴۹، ۳۵۱، **الطبعة الرابعة** کا مطالعہ فرمائیں، اور اگر اُن کے پاس سابقہ طبعات ہوں تو حدیث نمبر ۶۱ کے تحت دیکھیں۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ تمام اہل بیت کے غلاموں پر صدقہ حرام ہے، ماسوا امہات المومنین کے غلاموں کے، اس میں ایک صریح حدیث آئی ہے، اور وہ اُن لوگوں کے خلاف ہے جو اُن (بنو ہاشم کے غلاموں) پر صدقہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اگر اس پر حضرت بریرہ کی حدیث سے اعتراض کیا جائے تو اس کا جواب پیچھے پانچویں حدیث میں آچکا ہے۔

لیکن یہاں حدیث بریرہ کی روشنی میں ایک باریک نکتہ ہے، اور وہ یہ کہ امہات المومنین پر صدقہ کی حرمت حضور ﷺ کے تابع ہونے کی وجہ سے ہے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اور امہات کے غلاموں پر صدقہ حرام نہیں ہے، سو اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کے غلاموں کے آزاد ہونے کے بعد اُن کے غلاموں پر صدقہ حرام نہیں ہوگا، کیونکہ وہ تابع (کے غلام) ہیں، بلکہ وہ امہات المومنین کے غلاموں سے زیادہ جواز کا حق رکھتے ہیں، رضی اللہ عنہم اجمعین۔(۱)

۳۳ویں حدیث

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کے فدیے بھیجے تو (حضور اکرم ﷺ کی صاحبزادی) حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر ابو العاص کے فدیہ میں مال بھیجا، جس میں ان کا وہ ہار بھی تھا جو اُن کو ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ملا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: جب حضور ﷺ نے وہ ہار دیکھا تو آپ پر شدید رقت طاری ہوگئی اور آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: اگر تم مناسب سمجھو تو زینب کی دل داری کی خاطر اس کے قیدی کو چھوڑ دو اور جو اُس کا مال ہے اس کو لوٹا دو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے اتفاق کیا اور آپ ﷺ نے ابو العاص کو چھوڑتے وقت ان سے عہد لیا کہ وہ زینب کو ان کے پاس آنے سے نہیں روکیں گے۔ (کیونکہ اس وقت سیدہ زینب مکہ میں تھیں اور ان کے شوہر ایمان نہیں لائے تھے) اور پھر رسول اکرم ﷺ نے زید بن حارثہ اور ایک انصاری صحابی کو زینب کو لانے کے لیے مکہ روانہ کیا اور ان سے فرمایا: جب تک تمہارے

---

(۱) مؤلف نے یہ توضیح پانچویں حدیث کے پہلے مسئلہ میں بیان کی ہے، وہاں دوبارہ ملاحظہ فرمالیجئے۔

پاس زینب نہ پہنچ جائیں تم بطن یـاجَجْ میں ٹھہرے رہنا اور جب وہ آجائیں تو ان کے ساتھ رہنا اور ان کو یہاں لے کر آنا۔(۱)

۳۳ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں جگر گوشۂ نبی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی متعدد وجوہ سے فضیلت ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُن سے عظیم محبت
- اُن کی اپنے شوہر سے وفاداری
- اُن کا حُسنِ خلق
- اُن کا اپنے شوہر کے لیے ایثار اور بہتر نبھا
- اُن کا اپنے شوہر کے فدیہ میں اُس ہار کا دے دینا جو اُنھیں اُن کی امّی خدیجہ نے جہیز میں دیا تھا
- اُن کا اپنے شوہر کو اُس سے محبت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر چھوڑ دینا

۲۔ اس میں دلیل ہے کہ ہر مومن کو چاہیے کہ جب وہ بعض اہل بیت کو اس حال میں دیکھے جو اسے ناگوار گزرے تو وہ حال اُسے دو امور پر ابھار دے۔ ایک تو اُس پر رقت طاری ہونی چاہیے، اور دوسرا یہ کہ وہ حتی الامکان اُس حالت کو بہتری میں تبدیل کرے۔

۳۔ اس میں جگر گوشۂ نبی کی عمدہ تربیت، نسبی شرافت اور اپنے ماں باپ سے دوری کے باوجود اُن کی اسلامی خوبی کا ذکر ہے۔

٤۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے داماد حضرت ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے اور جن اخلاقی

---

(۱) سنن أبي داود: كتاب الجهاد، باب في فداء الأسير بالمال، حديث ۲٦۹۲؛ السيرة النبوية لابن هشام ج۲ ص۳۰۷، ۳۰۸؛ مسند أحمد [شاكر] ج۱۸ ص۲۰٤ حديث ۲٦۲٤۰؛ غوث المكدود بتخريج منتقى ابن الجارود ج۳ ص۳٤۳ حديث ۱۰۹۰؛ المستدرك ج٤ ص٤۳، ٤٤، ٤٥ وط: ج٤ ص٤۸ حديث ٦۸٤۰۔

خوبیوں پر وہ قائم تھے اُس کا ذکر ہے۔

۵۔ اس حدیث میں اُس روایت کے منکَر ہونے کی دلیل ہے جس میں ہے کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے بابا ﷺ کے ساتھ ہجرت کی تھی، جیسا کہ اس کی طرف واقدی وغیرہ نے اشارہ کیا ہے۔

٦۔ اگر کہا جائے کہ لختِ جگر نبی نے کسی محرم کے بغیر کیوں سفر کیا؟

تو جواب یہ ہے کہ حافظ نے فتح الباری میں کہا ہے: امام بغوی نے فرمایا: اس میں اختلاف نہیں کہ عورت فرض سفر کے علاوہ کوئی سفر اپنے شوہر یا محرم کے بغیر نہیں کر سکتی، الا یہ کہ کوئی کافرہ عورت دار الحرب میں اسلام قبول کرے یا قیدی خاتون رہائی پائے تو وہ بغیر محرم سفر کر سکتی ہے۔ بعض علماء نے یہ اضافہ کیا کہ یا کوئی عورت اپنے ہم سفروں سے جدا ہو جائے، پھر وہ کسی معتمد شخص کو پالے تو جائز ہے کہ وہ اس کے ساتھ سفر کرے، یہاں تک کہ وہ شخص اُسے اُس کے ساتھیوں تک پہنچا دے۔(۱)

امام نووی ''شرح مسلم'' میں لکھتے ہیں: علماء کا اتفاق ہے کہ عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ حج اور عمرہ کے علاوہ کوئی سفر بغیر محرم کرے، ماسوا دار الحرب سے ہجرت کے۔ اس پر اُن کا اتفاق ہے کہ وہ وہاں سے کوچ کر کے دار الاسلام میں آجائے، اگرچہ اُس کے ساتھ محرم نہ ہو۔ ان دونوں سفروں میں فرق یہ ہے کہ جب عورت دار الحرب میں اظہارِ دین کی استطاعت نہ رکھتی ہو اور اُسے اپنی ذات اور دین کے معاملہ میں خطرہ ہو تو وہاں اُس کا قیام حرام ہے، اور حج کے سفر میں تاخیر کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔(۲)

سیدہ زینب بنت رسول کا دار الکفر میں قیام بہت سی خرابیوں کا سبب ہوسکتا تھا، بنسبت اُن کے بلا محرم سفر کرنے کے، اور خصوصاً نبی کریم ﷺ نے اُن کی طرف ایک نہیں بلکہ دو شخصوں کو بھیجا تھا، پس اِس تمام تفصیل نے اشکال کو رفع کر دیا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلیٰ إِحْسَانِهٖ۔(۳)

۷۔ اس میں صحابہ کرام ﷺ کی اہل بیت سے محبت اور حالات کی تنگی کے باوجود اُن کے لیے اپنے حقوق

---

(۱) فتح الباري ج۵ ص ١٦٥۔

(۲) شرح مسلم للنووي ج۹ ص ١٤٨۔

(۳) فقہاء احناف کے نزدیک بغیر محرم سفر حج جائز نہیں ہے۔

قربان کرنے کا ذکر ہے، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

۸۔ اس میں کمزوروں خصوصاً اہل بیت کے لیے نبی کریم ﷺ کی رقت کا ذکر ہے۔

۹۔ اس میں جنگی قیدیوں کو بغیر فدیہ کے احسان کے طور پر رہا کرنے کے جواز کی دلیل ہے، جبکہ امام اُس میں مصلحت سمجھے، جیسا کہ امام شافعی، امام احمد، امام اوزاعی اور امام ثوری کا مذہب ہے۔ اور ابوالعاص کی رہائی کی بدولت خیر کثیر حاصل ہوئی، کیونکہ جگر گوشۂ نبی اپنے بابا ﷺ کی طرف لوٹ آئیں اور اُس کے بعد ابوالعاص کے اسلام قبول کرنے کا قصہ پیش آیا، جو بہت مبسوط و مفصل ہے۔ (۱)

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ امور دینیہ میں سفارش کرنا حسین ترین سفارشوں میں سے ہے، کیونکہ اس کے نتائج اچھے برآمد ہوتے ہیں۔

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کو چاہیے کہ وہ اپنی بچیوں کا نکاح شرافت والے کفو میں کیا کریں اگرچہ وہ اہل بیت سے نہ بھی ہوں۔

۱۲۔ اس میں اہل بیت و صحابہ کی اُس باہمی حمایت، نصرت اور الفت کا ذکر ہے جس پر وہ قائم تھے، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

۳۴ ویں حدیث

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ افضل الشہداء ہیں، پھر وہ شخص افضل الشہداء ہے جو ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو کر اُسے حق بات کا حکم کرے اور برائی سے منع کرے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔

یہ سند حسن ہے، ہمیں اسی طرح خطیب کی ''تاریخ بغداد'' میں ملی ہے، اور ازدی کا حکیم بن زید اشعری کے بارے میں کہنا کہ وہ متروک ہے محلِ نظر قول ہے، تاہم اس کے باوجود اس کے متابع موجود ہیں اور اسی طرح اس کے شواہد بھی ہیں، اس کو ایک جماعت نے صحیح کہا ہے، اُن ہی میں سے ایک حافظ ابن

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ج۱ ص ۳۳۰؛ الإصابة ج۱۲ ص۴۰۷۔

حجر عسقلانی ہیں، انہوں نے ''فتح الباري'' میں کہا ہے: ''یہ الفاظ حدیث مرفوع سے ثابت ہیں اور بعض روایات میں ''سید الشھداء '' کے الفاظ ہیں۔(١)

٣٤ ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

١۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے چچا اور آپ کے رضاعی بھائی سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے کہ اُنہیں شہداء کے اعلیٰ مراتب پر منتخب فرمایا گیا۔

٢۔ اس میں اہل بیت کی فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن ہی میں سے سید الشہداء کو منتخب فرمایا، پس اس خصوصیت میں اعلیٰ خاندانوں میں سے کوئی خاندان اُن کا شریک نہیں ہے۔

٣۔ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف دعوت دینے کی فضیلت ہے۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔

٥۔ اس حدیث میں تنبیہ ہے کہ شہداء ایک درجہ میں نہیں ہوں گے بلکہ وہ اپنی اپنی نیتوں، امام کی پیروی ، قیمتی اعضاء خرچ کرنے، شریک کار کے ساتھ نرمی اور فساد سے اجتناب کرنے کے مطابق مرتبہ پر ہوں گے، جیسا کہ اس پر حضور ﷺ کا ارشاد ''أَفْضَلُ'' دلالت کر رہا ہے۔

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ جابر بادشاہوں کو نصیحت کرنا دوسروں کو نصیحت کرنے سے افضل ہے، کیونکہ اس نصیحت میں ناصح کی، جسے نصیحت کی جائے اُس کی اور امت کی بھلائی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس پر اتنا بڑا ارتبہ

---

(١) تاریخ بغداد ج٦ ص ٣٧٤؛ مسند أبي حنیفة ص١٨٧؛ مسند الإمام الأعظم اردو ص ٤٣٠؛ المستدرك ج٣ ص ١٩٥، وط: ج٣ ص ٢١٥ حدیث ٤٨٨٤؛ المعجم الأوسط ج٤ ص٢٣٨ حدیث ٤٠٧٩؛ مجمع البحرین ج٦ ص ٣١٤ حدیث ٣٧٦٢، وج٧ ص ٢٣٥ حدیث ٤٣٧٥؛ مجمع الزوائد ج٧ ص ٢٦٦، وط: ج٧ ص ٥٢٤ حدیث ١٢١٣٠، وج٩ ص ٢٦٨، وط: ج٩ ص ٤٣٤، ٤٣٥ حدیث ١٥٤٦٦، وط: ج١٩ ص ١١ حدیث ١٥٤٥٥؛ فتح الباري ج٩ ص ١٤٤؛ موسوعة الحافظ ابن حجر ج٦ ص ١٣١، وج٤ ص ٥٠؛ تاریخ دمشق ج٣٥ ص ٤١٦؛ السلسلة الأحادیث الصحیحة ج١ ص ٧١٦، ٧١٨ حدیث ٣٧٤۔

دیا گیا۔

۷۔ اس میں تنبیہ ہے کہ جابر بادشاہوں کے خلاف خروج کرنا خطا ہے، اگر خروج شریعت میں پسندیدہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ اس مقام پر واضح فرماتے۔ پس جب آپ نے فقط ایک شخص کی طرف سے نصیحت کرنے پر اکتفا کیا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نصیحت سے تجاوز کرنا شریعت نہیں ہے، ورنہ آپ ﷺ اس کا حکم فرماتے اور خروج کرنے والے کی تعریف فرماتے، جیسا کہ یہاں نصیحت کرنے والے کی تعریف فرمائی ہے۔(۱)

۸۔ اس میں اشارہ ہے کہ جابر بادشاہ کو نصیحت کرنے سے قبل اُس کی برائی کا ثبوت ضروری ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے اپنے ارشاد ''فأمره ونهاه'' میں اس کو امر اور نہی کے لوازم میں سے فرمایا ہے، پس جب ثبوت نہیں ہوگا تو ناصح کا عمل برائی ہوگا۔

۹۔ اس میں اُس شخص کی عظیم فضیلت ہے جو ظالم بادشاہوں کو نصیحت کرے تو وہ اُسے قتل کر دیں۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ جو کسی ظالم بادشاہ کو نصیحت کرے، جس پر وہ اُسے قتل کر دے تو وہ (اپنے دور کا) سید الشہداء ہے۔

۱۱۔ محققین کے قول کے مطابق اس میں دلیل ہے کہ جو شخص ظلماً قتل کیا گیا تو وہ شہید ہے، اس کی تائید میں متعدد احادیث ہیں جن میں سے ایک وہ ہے جسے ہم نے موطأ میں دیکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا مانگا کرتے تھے:

''اے اللہ! میں تجھ سے تیری راہ میں شہادت کا اور تیرے رسول ﷺ کے شہر میں وفات کا

---

(۱) مؤلف کے اس استدلال میں کلام کی گنجائش ہے، کیونکہ اگرچہ جابر بادشاہوں کے خلاف خروج کرنے سے بہت سی جانوں اور املاک کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے شریعت نے اُس وقت تک ایسے اقدام سے منع کیا ہے جب تک کہ جابر بادشاہ کی سطوت وقوت میں کمی نہ آجائے، لیکن اگر کچھ اربابِ عزیمت خلوصِ دل سے ایسے ظالم لوگوں کے خلاف کھڑے ہو جائیں تو اُن کا اقدام نگاہِ شریعت میں پسندیدہ ہے اور اس پر متعدد احادیث صحیحہ اور حسنہ موجود ہیں۔

سوال کرتا ہوں''۔(۱)

امام ابوالولید الباجی رحمۃ اللہ علیہ ''المنتقی'' میں فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ دعا مقبول ہوئی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، اور یہ امر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جو شخص بھی اس طریقہ پر قتل کیا جائے، اگرچہ وہ جنگ اور مزاحمت نہ کرے تب بھی وہ شہید ہے''۔(۲) (۳)

۳۵ویں حدیث

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ماہِ ذوالقعدۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرہ کا ارادہ فرمایا تو اہلِ مکہ نے انکار کیا کہ وہ آپ کا راستہ چھوڑیں اور آپ مکہ میں داخل ہوں، حتیٰ کہ آپ نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا کہ آپ مکۃ المکرّمہ میں تین روز قیام کریں گے۔ پس جب انہوں نے معاہدہ لکھنا چاہا تو لکھا ''**ھٰذا ماقضی علیه محمد رسول اللّٰه**''، تو مشرکین مکہ نے کہا: ہم تسلیم نہیں کرتے۔ اگر ہم جانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو نہ روکتے، لیکن آپ محمد بن عبد اللہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں محمد رسول اللہ بھی ہوں اور محمد بن عبد اللہ بھی۔ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا ''**رسول اللّٰه**'' کے الفاظ مٹا دو۔ انہوں نے عرض کیا: اللہ کی قسم میں آپ (کے نام) کو کبھی نہیں مٹاؤں گا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ تحریر لی تو آپ نے لکھا: یہ معاہدہ ہے محمد بن عبد اللہ کی طرف سے، وہ اسلحہ کے ساتھ مکہ میں داخل نہیں ہوں گے، ماسوا تلوار کے جو میان میں ہوگی، اور یہ کہ اگر کسی مکی شخص نے اُن کی پیروی کر لی تو وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر نہیں جائیں گے اور اگر اُن کے صحابہ میں سے کسی نے مکہ میں رہنے کا ارادہ کیا تو وہ اس کو منع نہیں کریں گے۔ پھر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکۃ المکرّمہ میں داخل ہوئے اور میعاد (تین یوم) پوری ہوگئی تو قریشِ مکہ سیدنا علی

---

(۱) الموطأ بتحقیق بشار عواد ج۱ ص ۵۹۵ حدیث ۱۳۳۱۔

(۲) المنتقیٰ شرح موطأ لأبی الولید الباجي ج۴ ص۴۱۷ حدیث ۱۰۴۲۔

(۳) امام ابوالولید الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ بھی لکھا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مذہب تھا کہ مدینہ منورہ مکہ معظّمہ سے افضل ہے، اسی لیے وہ مدینہ میں شہید ہونا پسند کرتے تھے۔

رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر کہنے لگے: اپنے آقا سے کہو کہ وہ یہاں سے چلے جائیں، مدت پوری ہو چکی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جانے لگے تو آپ کے پیچھے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی چچا چچا پکارتی ہوئی آئی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر سیدہ فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا: کہ اپنے چچا کی بیٹی کو سنبھالو۔ پھر اس معاملہ میں سیدنا علی حضرت زید اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہم کے درمیان تنازع کھڑا ہو گیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اس بچی کو میں لوں گا، کیونکہ یہ میری چچا زاد ہے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: میری چچا زاد بھی ہے اور اس کی خالہ میری زوجہ ہے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ میری بھتیجی ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بچی کو اس کی خالہ کے سپرد کیا اور فرمایا: خالہ ماں کی طرح ہوتی ہے۔ پھر آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں، اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم صورت اور سیرت میں میرے مشابہ ہو اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تم ہمارے بھائی اور ہمارے غلام ہو۔

اس حدیث کو اسی طرح امام بخاری نے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے فقط حدیبیہ کا واقعہ روایت کیا ہے، اور جن لوگوں نے امام مسلم کے حوالے سے یوں ہی روایت کیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا تو اُسے وہم ہوا ہے۔(۱)

۳۵ ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں اہل بیت رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کی فضیلت ہے: سیدنا علی، سیدنا حمزہ، سیدنا جعفر اور محبوب غلام سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم۔

۲۔ اس میں ذوالجناحین سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے، جس انداز سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی تعریف فرمائی وہ ثناء عظیم ہے۔ فرمایا: ''تم صورت وسیرت میں میرے مشابہ ہو''۔ ایسا ارشاد دوسرے کسی شخص کے بارے میں نہیں آیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿اور یقیناً آپ عظیم خُلق پر

---

(۱) بخاري: كتاب الصلح، باب كيف يكتب: هذاماصالح فلان بن فلان، وفلان بن فلان، وإن لم ينسبه إلى قبيلته أونسبه حديث ٢٦٩٩؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص٤٨٢ حديث ٨٥٢٥ وط: ج٥ص١٦٨ حديث ٨٥٧٨، صحيح ابن حبان ج١١ص٢٢٩ حديث ٤٨٧٣۔

پیدا ہوئے﴾[القلم:٤]

۳۔ اس میں سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کی ایک اور فضیلت بھی ہے، کیونکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ سے قبل حق کو پہنچ گئے تھے۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ جب حاکم کے پاس ایک جماعت مقدمہ لے آئے اور وہ سب اہل بیت سے ہوں تو حاکم کو چاہیے کہ پہلے وہ اُن کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرے پھر آل رسول کی تکریم اور اتباع سنت میں باقیوں کو بھی خوش کرے، بخلاف دوسرے لوگوں کے، اُن کے بارے میں اُس پر کوئی تاکید نہیں۔

٥۔ اس میں اُن لوگوں کی تردید ہے جو بعض اہل بیت کے بارے میں عصمت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا جعفر کو صورت وسیرت میں اپنے مشابہ فرمایا لیکن اتنی بڑی تشبیہ کے باوجود صحابہ، تابعین اور اہل بیت طاہرین میں سے کسی نے سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کو معصوم نہیں سمجھا۔

٦۔ اس میں بنت حمزہ رضی اللہ عنہما کی متعدد وجوہ سے فضیلت ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُن سے محبت
- اُن کے حق میں فیصلہ دینے میں آپ کی شفقت
- سیدنا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما کی اُن سے محبت، اور اُن کے معاملہ میں اُن کا اہتمام کرنا اور اُن کا مکہ سے مدینہ تک اپنے ساتھ رکھنا
- بنت حمزہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت سے محبت
- اِس واقعہ میں اُن کا بہت سے شرعی احکام میں سببِ تشریع ہونا۔

۷۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی سپردگی کا فیصلہ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں کیا، کیونکہ اُن کی زوجہ سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا بنت حمزہ رضی اللہ عنہا کی خالہ تھیں، اور وہ میلان وشفقت میں ماں کی طرح تھیں، اور یہ سیدنا جعفر اور اُن کی اہلیہ رضی اللہ عنہما کی فضیلت ہے۔

۸۔ اس میں دلیل ہے کہ جب حاضنہ (پرورش کرنے والی) محضونہ (زیرِ پرورش بچی) کے قریبی رشتہ دار سے نکاح کر لے تو اُس کا حقِ حضانت ساقط نہیں ہوتا، جیسا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، اور یہ قوی

قول ہے، اس قول میں انہوں نے اِس حدیث کو اور حدیث ''أنتِ أحق به ما لم تنكحي'' (١) [تم ہی اُس کی زیادہ حق دار ہو جب تک کہ تم نکاح نہ کرلو] کو جمع کیا ہے۔(٢)

٩۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شان میں ارشادِ نبوی ﷺ ''أنت مني و أنا منك'' (تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں) کے بارے میں حافظ نے ''الفتح'' میں فرمایا ہے:

''اس سے مراد نسب، دامادی، سبقت اسلامی، محبت اور دوسرے خصائص میں، اور اِس سے محض قرابت مراد نہیں، ورنہ اُس میں تو سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی اُن کے شریک ہیں''۔(٣)

١٠۔ حضرت زید بن حارثہ کا کہنا ''ابنة أخي'' (میرے بھائی کی بیٹی ہے) سے اُن کی مراد مواسات اور حقوق کی مواخات ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے قبل از ہجرت سیدنا حمزہ اور سیدنا زید رضی اللہ عنہما کے مابین اخوت قائم فرمائی تھی اور جب وہ مدینہ میں آئے تھے تب بھی، جیسا کہ علامہ ابن القیم نے ''الهدي'' میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔(٤)

میں کہتا ہوں: اس قصہ میں مواخات کی تصریح آئی ہے، جیسا کہ مسند وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

١١۔ نبی کریم ﷺ کو بنت حمزہ کا چچا کہنے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اُنہوں نے حضور ﷺ کی تعظیم میں ایسا کہا تھا، ورنہ آپ ﷺ اُن کے چچازاد تھے۔ یہ بعض کا قول ہے، لیکن یہ محلِ نظر ہے اور تحقیق یہ ہے کہ اُنہوں نے آپ ﷺ کو اس لیے چچا کہا کہ آپ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی ہیں اور بنت حمزہ کے

---

(١) مسند أحمد بتحقيق الشاكر ج٦ ص ٢٥٤ حديث ٦٧٠٧۔

(٢) بنت حمزہ رضی اللہ عنہما کا نام عُمارہ تھا اور وہ سیدہ سلمٰی بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی بیٹی تھیں۔(الإصابة ج ١٣ ص ٤٨٤)

(٣) فتح الباري ج٩ ص ٣٦٢ حديث ٤٢٥١۔

(٤) زاد المعاد ج٣ ص ٣٣٣۔

چچا ہیں اور متعدد روایات میں اس کی صراحت آئی ہے کہ جب آپ ﷺ کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ بنتِ حمزہ سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے تو آپ نے فرمایا: یہ رضاعی طور پر میری بھتیجی ہے۔

۱۲۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ جنگی حالت صلح کی حالت کی طرح اور کمزوری کی حالت طاقت کی حالت کی طرح نہیں ہوتی، لہٰذا حاکم کو چاہیے کہ وہ کفار کے ساتھ صلح میں اُن باتوں پر صلح نہ کرے جو مسلمانوں کی قوت کے زمانہ میں جائز نہیں، اور یہ بات جس طرح شریعتِ مطہرہ کے تقاضے کے مطابق ہے اسی طرح تقاضائے حکمت کے مطابق بھی ہے، اور مملکت وامت کی حفاظت بھی اسی میں ہے۔

۱۳۔ راوی کا قول کہ "سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُن کے ہاتھ سے پکڑا" یہ اس لیے کہ وہ چھوٹی تھیں اور دوسری حدیثوں میں تصریح آئی ہے کہ وہ بچی تھیں، ورنہ یہ مخفی نہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اُن کے چچازاد تھے اور اُن کے محرم نہیں تھے، باقی رہا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا حضور ﷺ کو عرض کرنا آپ بنتِ حمزہ سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے تو یہ راویوں کے اختصار کی وجہ سے ہے، کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ اُن کی بلوغت کے بعد دیا تھا، جیسا کہ دوسری روایت میں آیا ہے۔

۳۶ ویں حدیث

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنی خالہ اور نبی کریم ﷺ کی زوجہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تھا کہ رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے بیت الخلاء میں گئے تو میں آپ کے لیے پانی لایا۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ میمونہ سے پوچھا: یہ کس نے کیا ہے؟ اُنہوں نے عرض کیا: عبداللہ بن عباس نے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ اس کو دین کی فقہ عطا فرما اور قرآن کی تاویل سکھا۔

یہ سند صحیح ہے، ہمیں اس کی عالی سند مسند اسحاق بن راھویہ میں ملی ہے، اور اس کو امام احمد اور دوسرے محدثین نے حماد سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

جن لوگوں نے اس حدیث کو مکمل بخاری اور مسلم کی طرف منسوب کیا ہے اُنہیں وہم ہوا ہے، اُن میں فقط "فَقِّهْه" تک ہے، بخاری نے "في الدين" کا لفظ زیادہ کیا ہے، اور بخاری کے بعض الفاظ ہیں: "عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ" اور "عَلِّمْهُ الْكِتَابَ" اور بخاری نے کہا: "الحكمة" کا معنی ہے: نبوت کے علاوہ

امور میں بھلائی کو پہنچنا، اور امام طبری کی ''تھذیب الآثار'' میں اور ''مسند البزار'' میں ''تأویل القرآن'' کے الفاظ ہیں۔(١)

٣٦ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

١۔ اس میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عظیم منقبت ہے کہ اُن کے حق میں دعائے نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقبول ہوئی تو وہ امت میں کتاب وسنت کے سب سے بڑے عالم ثابت ہوئے۔

٢۔ اس میں دلیل ہے کہ حق اور تاویل میں صحیح رسائی فقط کمال استعداد کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ یہ استعداد کے ساتھ ساتھ توفیقِ الٰہی اور عنایت سے بھی ہوتی ہے۔

٣۔ اس میں اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی تکریم میں مبالغہ کے مستحب ہونے کی دلیل ہے، جب اُن کی طرف سے ہمیں بھلائی پہنچے۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کو اکابر علماء کی صحبت، اُن کے آداب کو اپنانے اور اُن کی سیرت وعادت پر چلنے پر ابھارنا مستحب ہے، خصوصاً جبکہ وہ اکابر علماء اہل بیت سے ہوں۔

٥۔ اس میں اس بات کے مستحب ہونے کی دلیل ہے کہ عالم دین طالب علم کے لیے نیک دعائیں کرے، جبکہ وہ اُس میں دانائی دیکھے۔

٦۔ اس میں ہے کہ قرآن میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر دوسروں کی بنسبت بوجوہ حق کے زیادہ قریب ہے، جیسا کہ امام سید محمد بن ابراہیم الوزیر نے ''الإیثار'' میں فرمایا ہے۔ اُن میں سے بعض یہ ہیں:

- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُن کے حق میں دعا فرمانا
- اُن سے منقول تاویل اس انداز سے کامل تفسیر کی صورت میں آئی ہے جو اُن کے علاوہ صدر اول میں کسی سے نہیں آئی، پس جب اُن سے صحیح سند سے تفسیر منقول ہو تو وہ صحیح ترین تفسیر ہوگی اور کثیر ائمہ اور جماہیر

---

(١) مسند أحمد [شاکر] ج٣ ص٣٤٥ حدیث٣١٠٢؛ بخاري: کتاب الوضوء، باب وضع الماء عند الخلاء، حدیث١٤٣؛ تھذیب الآثار ج٢ ص١٦٨، ١٧٠ حدیث٢٦٢، ٢٦٦؛ کشف الأستار ج٣ ص٢٤٧ حدیث٢٦٧٤؛ مجمع الزوائد ج١٩ ص٣٨، ٣٩ حدیث١٥٤٩٩۔

کی تفسیر پر مقدم ہوگی۔

❁ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا علم میں بالعموم اور تفسیر میں بالخصوص اُن کی علمی عظمت پر متفق ہونا اور اُنہیں بڑا عالم اور سمندر قرار دینا، اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ مشہور ہے کہ اُنہوں نے اُنہیں اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شامل کیا تھا۔

❁ اُن کا اہل بیت نبوت اور معدنِ رسالت سے ہونا۔

❁ اور اُن میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ وہ تاویل کو رائے سے بیان کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، حتیٰ کہ انہوں نے فرمایا: ''جس نے اپنی رائے سے قرآن میں کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''۔(۱)

۷۔ امام ابن قیم نے کہا ہے: فقہ اور تاویل میں فرق ہے۔ معنی اور مراد کی فہم فقہ ہے، اور تاویل حقیقت کا ایسا ادراک ہے جس کی طرف وہ معنی لے جائے جو اُس کی اصل ہے۔ دین کی سمجھ رکھنے والا ہر شخص تاویل کی معرفت نہیں رکھتا، تاویل کی معرفت میں راسخین فی العلم مخصوص ہیں، اس سے مراد تحریفی تاویل اور معنیٰ کی تبدیلی نہیں، جو کہ اللہ تعالیٰ اور راسخین فی العلم کے نزدیک باطل ہے۔(۲)

۸۔ اس میں دلیل ہے کہ یہ بات اکابر کی مروت سے ہے کہ اُن کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا جائے اُس سے اُنہیں آگاہ کیا جائے تاکہ ہر بھلائی کی نوعیت کے مطابق اُس کی جزا دی جائے۔

۹۔ اس میں دلیل ہے کہ اکابر اہل علم کی صحبت دین کی فقہ اور تاویل سیکھنے کا سبب بنتی ہے۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ علماء کی خدمت اور اُن کی تعظیم سے صالحیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور اُن کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۱۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''الحکمة'' میں دلیل ہے کہ ہر فقیہ اہل حکمت سے نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعا میں ابن عباس کے لیے حکمت کو خصوصاً مانگا، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿عطا فرماتا ہے وہ حکمت جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی حکمت تو یقیناً اُسے خیر کثیر دی گئی﴾[البقرة: ٢٦٩] اور اظہارِ

---

(١) إيثار الحق على الخلق في رد الخلافات إلى المذهب الحق ص١٤٦، ١٤٧۔

(٢) إعلام الموقعين ج٣ص٩١۔

حکمت فتنوں اور مصائب کے زمانہ میں ہی ہوتا ہے۔

۱۲۔ ارشادِ نبوی "**علمہ الحکمة**" میں دلیل ہے کہ حکمت سیکھنے سے حاصل ہوتی ہے اور سمجھ دار شخص اہل علم سے اُسے دوسروں کی بنسبت بہت جلد سیکھ لیتا ہے، اور واللہ اعلم یہی وجہ مناسبت ہے کہ دوسری دعاؤں کے ساتھ حکمت بھی مانگی گئی۔(۱)

۳۷ویں حدیث

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ نے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہما سے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سنی، اس میں کمزوری تھی، میں اُس آواز سے بھوک محسوس کرتا ہوں، تمہارے پاس (کھانے کی) کوئی چیز ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! پھر اُنہوں نے جو کی چند روٹیاں نکالیں، پھر اپنا دوپٹہ لیا اور اس میں کچھ روٹیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لپیٹ دیا اور اس دوپٹے کے دوسرے حصہ کو میرے ہاتھ کے نیچے دبا دیا اور اس کو موڑا نہ، پھر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔ میں اس کو لے گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تھے، آپ کے ساتھ (اور) لوگ بھی تھے، میں وہاں جا کر کھڑا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: تم کو ابوطلحہ نے بھیجا ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں! فرمایا: کھانے کے لیے؟ میں نے کہا: جی ہاں! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین سے فرمایا: اٹھو! پھر آپ چل پڑے اور میں ان کے آگے آگے (تیز قدموں سے) چلا، حتیٰ کہ میں حضرت ابوطلحہ کے پاس پہنچا اور اُنہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ حضرت ابوطلحہ نے کہا: اے ام سلیم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو ساتھ لے کر آ رہے ہیں اور ہمارے پاس اتنا کھانا نہیں ہے جو اُن سب کو کھلا سکیں۔ حضرت ام سلیم نے کہا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جاننے والے ہیں۔ پھر حضرت ابوطلحہ چل پڑے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی، پھر حضرت ابوطلحہ گھر آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ساتھ تھے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ام سلیم! جو کچھ تمہارے پاس ہے لے آؤ! تو وہ اُن روٹیوں کو لے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان روٹیوں کو چورا کرنے کا حکم دیا اور حضرت ام سلیم نے

---

(۱) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مرتبۂ تفسیر کی مزید معلومات کے لیے راقم الحروف کی کتاب "**أنوار العرفان في أسماء القرآن**" ملاحظہ فرمائیں۔

(گھی کی) کپی کو نچوڑا تو وہ سالن بن گیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے اُس طعام پر وہ کچھ پڑھا جو اللہ نے چاہا، پھر فرمایا: دس آدمیوں کو آنے کی اجازت دو، اُنہیں اجازت دی گئی، اُنہوں نے کھایا تو وہ سیر ہو گئے، پھر وہ چلے گئے، پھر آپ نے فرمایا: دس (اور) آدمیوں کو اجازت دو، اُنہوں نے کھایا حتیٰ کہ سیر ہو گئے اور چلے گئے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: دس (مزید) آدمیوں کو اجازت دو، انہیں اجازت دی گئی تو انہوں نے کھایا حتیٰ کہ سیر ہو گئے اور باہر نکل گئے۔ پھر آپ نے فرمایا: دس (اور) آدمیوں کو اجازت دو، پس تمام لوگوں نے کھانا کھایا اور سیر ہو گئے اور وہ لوگ ستر (۷۰) یا اسی (۸۰) افراد تھے۔

یہ سند صحیح ہے، ہمیں امام دار الہجرۃ کی موطأ میں عالی سند سے ملی ہے، اور اِسی اور دوسری عالی سندوں سے ہم نے از اول تا آخر سماعاً بھی روایت کیا ہے، اور اسے امام بخاری اور مسلم نے بھی اسی طرح امام مالک سے روایت کیا ہے۔

''فَـفُـتَّ'' کا معنیٰ ہے چورا چورا کیا، ''عُـكَّة'' چمڑے کا برتن ہوتا ہے جس میں گھی وغیرہ ڈالا جاتا ہے، ''فَآدَمَتْه'' کا معنی ہے کہ جو کچھ گھی نکلا ام سلیم نے اُسے سالن بنا دیا۔ (۱)

۳۷ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں اہل بیت کی گزر بسر کی تنگی کا ذکر ہے، اگر وہ وسعت میں ہوتے تو آپ ﷺ پر اتنی شدید بھوک ظاہر نہ ہوتی کہ جسے لوگ بھی پہچان لیتے۔

۲۔ اس میں سخت حالات میں صبر کرنے پر اہل بیت کی فضیلت ہے۔

۳۔ اس میں تاکید ہے کہ جو شخص اہل بیت کو حاجت یا کمزری میں دیکھے تو وہ اُن کی بھوک کا مداوا کرے اور اُن کی ضرورت کو پورا کرے۔

---

(۱) موطأ للإمام مالك: كتاب صفة النبي ﷺ، باب ماجاء في الطعام والشراب، ج٤ ص٣٤٩ حديث١٨٤٨؛ موطأ إمام محمد [لكنوي] ج٣ ص٣٩٦ حديث٨٨٨؛ بخاري: كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام، حديث٣٥٧٨؛ مسلم: كتاب الأشربة، باب جواز استتباعه غيره إلىٰ دار من يثق برضاه بذلك، حديث٢٠٤٠۔

٤۔ اس میں دلیل ہے کہ جو شخص اہل بیت کی بھوک کا تدارک کرے تو اُسے جزا کے طور پر رزق میں وسعت اور برکت دی جاتی ہے۔

٥۔ اس میں اُس حال کا ذکر ہے جس پر سید الاولین والآخرین ﷺ اور اُن کے اہل بیت طاہرین رضی اللہ عنہم ثواب کے ارادے سے قائم تھے اور تنگی کے باوجود لوگوں سے شکوہ نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ اپنا یہ حال لوگوں کے پاس نہیں لے گئے اور نہ ہی کسی کو اس سے آگاہ کیا، اور نہ ہی اس حال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ سے رک بیٹھے۔

٦۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اُس احساس کا ذکر ہے جو وہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی حاجت کے بارے میں رکھتے اور اُن کی باریک بینی کی بھی دلیل ہے اور ایسا احساس کمال محبت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

٧۔ اس میں سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کی فضیلت، اُن کی دینی متانت اور معاملہ کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے سپرد کرنے کا ذکر ہے۔

٨۔ اس میں نبوت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔

٩۔ اس میں نبی کریم ﷺ کے صدقِ نبوت کی دلیل ہے، کیونکہ ایسی زندگی سلاطین و بادشاہوں کی نہیں ہوتی اور نہ ہی اُن کا یہ حال ہوتا ہے، پس آپ ﷺ کے کمزور احوال کے باوجود آپ کے افعال کی سلامتی آپ کے اقوال کی صحت کی دلیل ہے۔

١٠۔ اس میں دلیل ہے کہ تنگی کے بعد آسانی ہوتی ہے اور تنگی کے بعد کشادگی کا آنا یقینی اور ناگزیر ہے۔

١١۔ اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والوں پر ضرور خوف، بھوک، مالوں کے نقصان، جانوں کے نقصان اور اولاد کے نقصان میں سے کچھ ایسے حالات آتے ہیں جیسے انبیاء کرام علیہم السلام پر آئے، لہٰذا نفوسِ مومنین کا اس کے لیے تیار ہونا لازم ہے، بیشک مدد صبر کے ساتھ اور فراخی تنگی کے ساتھ ہوتی ہے۔

١٢۔ اس میں دلیل ہے کہ جو شخص اہل بیت کو ہدیہ بھیجے تو اُسے چاہیئے کہ وہ اُن تین باتوں کا خیال رکھے جو اِس حدیث میں مذکور ہیں اور چوتھی اُس بات کا خیال رکھے جو ایک اور حدیث میں آئی ہے، اور یہ چاروں

باتیں اسی جلیل القدر صحابیہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کا اسوہ ہیں۔

الف: ھدیہ کا اچھا ہونا، سو یقیناً گھی کے ساتھ روٹی مفید ترین کھانا ہے۔

ب: ہدیہ حسین طریقہ سے بھیجنا، سیدہ ام سلیم نے ھدیہ کو لپیٹا اور اُس پر کپڑا ڈالا تاکہ لوگوں کو اُس کا شعور نہ ہو اور قلت کے وقت اُن کی خواہش اُس کی طرف مائل نہ ہو۔

ج: ہدیہ لے جانے والے کے انتخاب میں احتیاط کو ملحوظ رکھنا، سیدہ ام سلیم نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کو بھیجا جو اُن کے بیٹے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رازوں کے امین اور آپ کے بابرکت خادم تھے۔

د: رہی چوتھی بات تو وہ بھی اسی طرح سیدہ ام سلیم کا ہی ایک واقعہ ہے جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، اور وہ یہ ہے:

> ''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو سیدہ ام سلیم نے حیس (کھجور، گھی اور ستو سے حلوہ) تیار کیا، پھر اُسے ایک برتن میں ڈال کر سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: انس! اِسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤ اور عرض کرو کہ میری امی آپ کو سلام عرض کرتی ہیں اور اُنہوں نے آپ کے لیے یہ ھدیہ بھیجا ہے اور عرض کیا ہے: ''یارسول اللہ! یہ آپ کی بارگاہ میں ہماری طرف سے معمولی سا ھدیہ ہے''۔(۱)

سیدہ ام سلیم کا یہ کہنا ''یہ آپ کی بارگاہ میں ہماری طرف سے معمولی سا ھدیہ ہے'' اِس میں اُس ہستی کے بلندئ رتبہ کی طرف اشارہ ہے جنہیں ہدیہ پیش کیا گیا۔ معنیٰ یہ ہے کہ یہ آپ کے مقام و مرتبہ کے لائق نہیں ہے، یہ چوتھا ادب ہے۔ مستحب ہے کہ مہمان کی دل جوئی اور اُس کی عزت و تکریم میں میزبان ایسے الفاظ ادا کرے، کیونکہ سیدہ ام سلیم کا حیس کا کھانا بھیجنا ضیافت کے طور پر تھا۔

پس یہ وہ چار آداب ہیں جنہیں وہ صالحہ خاتون بجالائیں اور یہ آداب اُن کی سچی محبت اور بھرپور دانائی پر دلالت کرتے ہیں۔

---

(۱) مسلم: کتاب النکاح، باب زواج زینب بنت جحش، ونزول الحجاب، وإثبات ولیمة العرس، ص ٦٤٩ حدیث ١٤٢٨۔

۱۳۔ اس میں دلیل ہے کہ جب بندہ کمزور ہو جائے اور رب ﷻ سے اُس کے کمال تعلق کے باوجود زمین پر اُس کے اسباب، امکانات اور جملہ وسائل دم توڑ جائیں تو وہ ﷻ ہی بندے کو اُس کے حال پر قائم رکھتا ہے، اپنے کرم سے اُس کی نگہبانی فرماتا ہے، اپنی عنایت سے اُس کی حفاظت فرماتا ہے اور ایسی شان وقوت اور تیاری کے ساتھ اُس کی مدد کو آتا ہے کہ بندے کا ادھر گمان بھی نہیں ہوتا۔ غزوۂ احزاب میں ایسی ہی مدد آئی تھی جیسا کہ متعدد روایات میں آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں ایک سورت نازل فرمائی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور اُس نے اُس میں عجائبِ احوال کی گردش اور ملائکہ کی تحویل اور اموال کا ذکر کیا ہے۔

۱٤۔ صحیح مسلم کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں ابوطلحہ کے پاس گیا جو کہ ام سلیم بنت ملحان کے شوہر تھے، میں نے کہا: ''ابا جان! میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے آپ کا شکم مبارک بھوک سے چپکا ہوا ہے''۔(۱)

اس میں ماں کے شوہر کو ابا کہنے کے جواز کی اور اہل بیت کے لیے سمجھ دار انسان کو خادم بنانے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے۔

۳۸ ویں حدیث

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، جو شخص بھی ہم اہل بیت سے بغض رکھے گا اللہ تعالیٰ اُسے جہنم میں داخل فرمائے گا۔

یہ سند جید ہے، ہمیں اسی طرح صحیح ابن حبان میں ملی ہے اور اس کو اُنہوں نے، امام حاکم اور دوسرے محدثین نے صحیح قرار دیا ہے، اور اس کے متابع اور شواہد بھی موجود ہیں۔(۲)

---

(۱) صحيح مسلم: كتاب الأشربة، باب جواز استتباعه غيره إلىٰ دار من يثق برضاه بذلك، ص ۹۸۱ حديث ۲۰٤۰۔

(۲) صحيح ابن حبان ج۱۵ ص ٤۳۵ حديث ٦۹۷۸؛ المستدرك: كتاب معرفة الصحابة، ومن مناقب أهل بيت رسول الله ﷺ ج۳ ص ۱۵۰ وط: ج۳ ص ۱٦۲ حديث ٤۷۱۷؛ كشف الأستار ج٤ ص ۱۲۲ حديث ۳۳٤۸؛ مجمع الزوائد ج۷ ص ۲۹٦ وط: ج۷ ص ۵۸۰ حديث ۱۲۳۳۰۔

۳۸ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں اہل بیت سے بُغض رکھنے والے شخص کے لیے سخت سزا کا ذکر ہے۔

۲۔ اس میں محبّ اہل بیت کے لیے عظیم ثواب کی دلیل ہے، کیونکہ جب اُن سے بغض کی سزا آگ ہے تو اُن کے محبّ کے لیے جنت کے سوا کوئی اور ثواب نہیں۔

۳۔ اس میں دلیل ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں بعض منافقین میں بغض اہل بیت موجود تھا، جیسا کہ متعدد واقعات میں اس کی طرف اشارے ملتے ہیں، اُن ہی میں سے ایک واقعۂ اِفک (ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کا واقعہ) بھی ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ پس اس وعید سے بعض مسلمانوں کو متنبہ کر دیا تا کہ وہ اس ہلاکت خیز وادی میں قدم رکھنے سے باز رہیں۔

٤۔ اس میں مذکور ہے کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والا مستحق جہنم ہے، حالانکہ بُغض اعمالِ قلوب سے ہے، لہٰذا وہ شخص بدرجۂ اولیٰ اس عذاب کا مستحق ہے جس نے اُنہیں واقعتاً ایذاء پہنچائی اور قتل کیا۔

٥۔ اس میں نواصب (اہل بیت سے بغض رکھنے والوں) کے لیے شدید وعید ہے۔

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ کبھی بعض اہل اسلام سے اہل بیت کے لیے کچھ بغض صادر ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ کی اِس آگاہی کا کوئی فائدہ نہ ہوتا، کیونکہ مشرکین سے تو ہمیشہ بغض واقع ہوتا ہے۔

۷۔ مغلول (تاتاریوں) کے بعض وزراء نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے پوچھا: جو شخص اہل بیت سے بغض رکھے آپ اُس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: جو اُن سے بغض رکھے اُس پر اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اُس کے فرض قبول ہیں اور نہ ہی نوافل۔

۸۔ ہم نے امام ابن ابی شیبہ کی ''المُصنَّف'' میں دیکھا ہے، انہوں نے کہا: اسحاق بن منصور نے از سلیمان بن قرم، از عاصم، از زِر بن حبیش روایت کیا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: منافق ہم سے محبت نہیں کرے گا اور مومن ہم سے بغض نہیں رکھے گا۔(۱)

اور ہم نے ''صحیح مسلم'' میں حضرت زِر سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اُس

---

(۱) المصنف لابن أبي شيبة ج١٧ ص١٢٦، ١٢٧ حديث ٣٢٧٧٩۔

ذات کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور جاندار کو پیدا فرمایا، بیشک نبی اُمّی ﷺ نے قطعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ مجھ (علی) سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن اور میرے ساتھ بغض نہیں رکھے گا مگر منافق۔(۱)

۹۔ اس میں دلیل ہے کہ یہ بات اہل بیت کے بغض سے ہے کہ اُن سے اظہار تو محبت کا کیا جائے اور اپنے باطن میں اُنہیں ناپسندیدہ سمجھا جائے، اور یہ منافقت کی قبیح ترین قسم ہے۔اس کی متعدد علامات ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں: اُن کے اچھے افعال کی اقتدا ترک کر دینا، مثلاً اخلاص، صدق، ایثار، مخلوق سے محبت، دائمی ذکر، عبادت پر مداومت، سابقین کے لیے استغفار، مسلمانوں کے لیے دعائے خیر، دشمنانِ دین کا سد باب کرنے کے لیے شجاعت، وحدتِ امت کے لیے کوشش، مومنین کو تکلیف پہنچانے سے رکنا، مسلمانوں کے معاملہ میں دل کو صاف رکھنا، لوگوں کی تکریم کرنا خصوصاً کمزوروں کی، اللہ کی کتاب مبین کی حفاظت کرنا اور سید الاولین والآخرین ﷺ کی پیروی کرنا۔

پس جب تم یہ امور نہ پاؤ اور اہل بیت سے محبت کے دعوی کے ساتھ فقط پرچموں کو بلند دیکھو تو جان لو کہ یہ چیز اسلام میں گھسیڑ دی گئی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿کہی تھی یہی بات اُن لوگوں نے جو اُن سے پہلے تھے تو نہ فائدہ پہنچایا اُنہیں جو وہ کمایا کرتے تھے﴾ [الزمر: ۵۰]

۱۰۔ امام ابن حبان نے اس حدیث پر باب قائم کیا ہے: ''اہلِ بیتِ مصطفیٰ ﷺ سے بغض رکھنے والے

---

(۱) صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب الدليل على حب الأنصار وعلي رضي الله عنه من الإيمان وعلاماته، وبغضهم من علامات النفاق، حديث ۱۳۱؛ السنن الكبرى للنسائي: كتاب المناقب، باب فضائل علي رضي الله عنه ج۷ ص۳۱۲ حديث ۸۰۹۷ وباب: الفرق بين المؤمن والمنافق، ص ٤٤٥ حديث ۸٤۳۱؛ مسند أحمد ج۱ ص ۸٤ حديث ٦٤۲ و ص ۹۵ حديث ۷۳۱ و ص ۱۲۸ حديث ۱۰٦۲ و ج٦ ص ۲۹۲ حديث ۲۷۰٤۰ عن سلمة؛ فضائل الصحابة ج۲ ص ٦۹٦ حديث ٤۹۸ و ص ۷۰٤ حديث ۹٦۱؛ سنن الترمذي: أبواب المناقب، باب مناقب علي بن أبي طالب رضي الله عنه حديث ۳۷۳٦؛ سنن النسائي: كتاب الإيمان، باب علامة الإيمان ج۸ ص ۱۱٦، وط: ج٤ ص ٤۹۰ حديث ۵۰۳۳؛ سنن ابن ماجه: المقدمة، باب فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه حديث ۱۱٤۔

کے جہنم میں ہمیشہ رہنے کا وجوب''۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں ہمیشہ جہنم میں رہنے کا ذکر نہیں، جہنم میں دخول اُس میں ہیشگی کو لازم نہیں کرتا، اور اس پر کتاب وسنت کی نصوص اور سلف کا اجماع ہے، اور ابن حبان نے بھی دوسرے مقامات پر اس کی تصریح کی ہے۔ یہ حدیث وعید کی نصوص سے ہے، اسلاف کا اجماع ہے کہ یہ مشیتِ ایزدی پر موقوف ہے، وہ چاہے تو بخش دے اور چاہے تو عذاب دے، جیسا کہ ارشاد ہے ﴿اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اِس بات کو کہ شرک کیا جائے اُس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے﴾[النساء: ٤٨] اور اسی طرح مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ توبہ کے ساتھ مشروط ہے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اگر وہ باز آجائیں تو بخش دیا جائے گا اُنہیں جو ہو چکا﴾[الأنفال: ٣٨]

امام ابن حبان نے مبغضِ اہل بیت کے لیے جہنم میں ہیشگی کا قول، واللہ اعلم فقط اس لیے کیا ہے کہ یہ بغض منافق سے ہی صادر ہوتا ہے جو درحقیقت اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر یقین نہیں رکھتا، کیونکہ اہل بیت کے ساتھ ایسی خیر، برکت اور دین کی نصرت وابستہ ہے جو عالمین میں سے کسی بھی اعلیٰ گھرانے سے وابستہ نہیں، لہٰذا ایسی خیر و برکت کا مبغض مومنین کی جنس سے نہیں ہوسکتا بلکہ وہ اعدائے دین کی جنس سے ہے، اگرچہ وہ دین کا اظہار کرتا پھرے۔ ایسے اشارے دوسری احادیث میں بھی آئے ہیں لیکن اُن میں سے کوئی بھی صحیح نہیں، اور اِس حدیث کی مانند وہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے جو انصار کے حق میں آیا ہے، جیسا کہ صحیحین میں ہے: ''اُن سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن اور اُن سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق'' شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کا ''**الصارم المسلول**'' میں اس معنیٰ میں مدلل کلام موجود ہے۔(١)

---

(١) مؤلف کا یہ تبصرہ اُس شخص کے بارے میں تو درست تسلیم کیا جاسکتا ہے جو اہل بیت کے کسی فرد سے کسی دنیوی معاملہ کی وجہ سے بغض رکھتا ہو، یا دینی معاملہ میں کسی غلط تاویل کا شکار ہو چکا ہو اور لاشعوری طور پر اُسے درست سمجھتا ہو اور بایں وجہ کسی فردِ اہل بیت سے بغض رکھتا ہو، لیکن اگر کسی کو مطلقاً اہل بیت ہی اچھے نہ لگتے ہوں تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، ایسے شخص کے قلب میں ایمان داخل ہی نہیں ہوسکتا، جیسا کہ مؤلف کی درج کردہ حدیث نمبر ٢٨ میں تصریح ہے۔

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ امر عظیم کے علاوہ قسم نہیں اٹھاتے تھے۔

۳۹ ویں حدیث

حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے باآواز بلند ارشاد فرمایا: لوگو! قریش اہل امانت ہیں جو شخص اُن کی لغزشوں کی کھوج میں لگا اللہ تعالیٰ اُسے ناک کے بل اوندھا کرے گا، یہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔

یہ سند حسن ہے، اس کو ہم نے امام شافعی کی مسند میں پایا ہے، اور اِس سے اور دوسری سندوں سے ہم نے از اول تا آخر سماعاً پوری مسند روایت کی ہے۔

اور اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے، امام بخاری نے "الأدب المفرد" میں روایت کیا ہے، امام ابن ابی شیبہ، ابن ابی عاصم نے "السنة" میں، امام طبرانی، امام حاکم اور انہوں نے صحیح قرار دیا ہے، اور بزار نے حسن قرار دیا ہے، اور امام بیہقی اور دوسرے محدثین نے از ابن خثیم اسی طرح مختصر بھی اور طویل بھی روایت کی ہے، اور اس کے شواہد بھی ہیں۔

بعض مقامات میں "أهل صدق و أمانة" (اہل صدق وامانت ہیں) کے الفاظ ہیں اور بعض میں "كبه الله على وجهه" (اللہ اُسے منہ کے بل لٹکائے گا) کے الفاظ ہیں اور بعض میں "في النار" (دوزخ میں) کے الفاظ بھی ہیں۔(۱)

ارشادِ نبوی ﷺ "بغاها العواثر" کا معنی ہے لغزشوں کو ڈھونڈنا۔

---

(۱) مسند الإمام الشافعي مع شرح الرافعي ج۳ ص ٤٢٤ حديث ۱۳۳۲؛ مسند أحمد [شاكر] ج٤ ص ۳٤۰، وط: ج١٤ ص ٣٤٦ حديث ١٨٨٩٤؛ المصنف لابن أبي شيبة ج١٢ ص ١٦٧ وط: ج ١١ ص ٢١٠ حديث ٣٢٩٢٣؛ السنة لابن أبي عاصم ج٢ ص ٩٩٩ حديث ١٥٥٠؛ المعجم الكبير ج ٥ ص ٤٤، ٤٥ حديث ٤٥٤٤، ٤٥٤٥، ٤٥٤٧؛ المستدرك ج٤ ص ٧٣ وط: ج٤ ص ٨٢ حديث ٦٩٥٢؛ الأدب المفرد ج١ ص ٤٣، ٤٤ حديث ٧٥؛ كشف الأستار ج٣ ص ٢٩٤، ٢٩٥ حديث ٢٧٨٠۔

٣٩ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

١۔ اس میں دلیل ہے کہ جو شخص قریش کی لغزشوں کی ٹوہ میں لگ جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے منہ کے بل جہنم میں ڈال دے گا، چہ جائے کہ کوئی اُنہیں اذیت اور تکلیف پہنچائے۔

٢۔ جب یہ سزا اُس شخص کے لیے ہے جو قریش کی لغزشوں کی جستجو کرے تو پھر اُس شخص کی سزا کیا ہوگی جو قریش کے خواص یعنی اہل بیت کی لغزشوں کی جستجو کرے، پھر اُس شخص کی سزا کا عالم کیا ہوگا جو اُنہیں اذیت پہنچائے، اُن پر حالات تنگ کرے، اُنہیں عذاب دے اور اُن کے حقوق پامال کرے۔

٣۔ اس میں دلیل ہے کہ قرشی میں اصل خوبی یہ ہے کہ وہ صدق وامانت والا ہوتا ہے، حتیٰ کہ کسی ثبوت سے واضح ہو کہ وہ اس کے برخلاف ہے۔

٤۔ اس حدیث میں اور اس جیسی دوسری احادیث میں اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کا تحفظ ہے، چنانچہ قریش اہل بیت کے لیے برزخ اور رکاوٹ کی حیثیت رکھتے ہیں تاکہ وہ ایذا سے محفوظ رہیں۔

٥۔ اس میں قریش اور اہل بیت کرام کے نسب کو محفوظ رکھنے کی ترغیب کی طرف اشارہ ہے۔

٦۔ اس میں قریش کی خواتین وحضرات کو مناصب پر مقرر کرنے کے استحباب کی دلیل ہے، کیونکہ اُن میں قوت وامانت ہے، اور یہ دونوں باتیں مناصب اور ذمہ داریوں کی بنیادی شرط ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿کام اُسے سونپا جائے جو قوی اور امین ہو﴾ [القصص: ٢٦]

٧۔ اس میں عیوب کی تلاش اور لغزشوں کی ٹوہ میں رہنے کی حرمت کا ذکر ہے، بلاشبہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، کیونکہ یہ اہل دوزخ کا شیوہ ہے۔

٨۔ اس میں اشارہ ہے کہ عیبوں کا متلاشی اور لغزشوں کی ٹوہ میں رہنے والے کی نگاہ ناکام ہو کر اُسی کی طرف پلٹ آتی ہے اور وہ تھکا ماندہ رہ جاتا ہے، کیونکہ الفاظِ نبوی ہیں "أکبه اللّٰه لِمَنخِرَیه" (اللہ اُسے ناک کے بل گراتا ہے)۔

٩۔ اس میں قریش کی فضیلت اور دوسرے قبائل پر اُن کی پوری طرح برتری کا ذکر ہے۔

١٠۔ اس میں دلیل ہے کہ قریش میں کذب وخیانت دوسرے لوگوں کی بنسبت انتہائی کم ہوگی۔

۱۱۔ اس میں اشارہ ہے کہ صدق وامانت مخلوق کی بڑی خوبیوں میں سے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی نبی ان دونوں خوبیوں سے خالی نہیں تھا، لہٰذا دوسرے لوگوں میں بھی یہ دونوں خوبیاں تلاش کرنا بنیادی بات ہے، جس میں کوتاہی کرنا مناسب نہیں (کیونکہ Merit [معیار] اسی پر موقوف ہے)۔

۱۲۔ اس میں دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ فقط اُسی چیز کو بار بار دہراتے جو عظیم اور اہم ہوتی۔

۱۳۔ اس میں دلیل ہے کہ جو شخص کسی عظیم امر کی طرف متوجہ کرنا چاہے تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اُسے لوگوں میں پھیلائے اور اُس کی طرف بلائے تاکہ اُس امر عظیم کو لیا جائے اور اُسے کما حقہ نبھایا جائے۔

۴۰ ویں حدیث

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا تاکہ وہ خمس کو قبضہ میں لیں، پس اُنہوں نے خمس سے ایک لڑکی کو لیا، پھر انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ اُن کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ حضرت خالد نے سیدنا بریدہ سے کہا: کیا تم نے اُنہیں دیکھا، انہوں نے یہ کیا کیا ہے؟ حضرت بریدہ نے کہا: میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا، پھر میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی تو آپ نے فرمایا: اے بریدہ! کیا تم علی سے بغض رکھتے ہو؟ وہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: جی ہاں! فرمایا: تم ان سے محبت کرو، کیونکہ ان کا خمس میں اس سے بہت زیادہ حصہ ہے۔

یہ سند صحیح ہے، اس کو امام بیہقی نے ''السنن'' میں روایت کیا ہے اور امام بخاری نے اسے روح بن عبادہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔(۱)

اور یہ حدیث ''المسند'' میں اس سے زیادہ عمدہ الفاظ میں ہے:

''(نبی کریم ﷺ نے فرمایا) پس اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیهقي: کتاب قسم الفيء والغنیمة، باب سهم ذی القربیٰ من الخمس، ج ٦ ص ٣٤٢، وط: ج ١٣ ص ٢٦٦ حدیث ١٣٠٨٩؛ بخاري: کتاب المغازي، باب بعث علي بن أبي طالب علیه السلام، وخالد بن ولید رضی اللہ عنہ إلی الیمن قبل حجة الوداع، ص ٥٩١ حدیث ٤٣٥٠۔

ہے: خمس میں آل علی کا حصہ اُس باندی سے افضل ہے۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے بعد مجھے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبوب کوئی نہیں تھا۔ (۱)
راوی کے لفظ ''یقطر'' کا مطلب ہے کہ باندی سے مباشرت کے بعد غسل کی وجہ سے سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔
یہ ''الأربعین'' کی آخری حدیث ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

وَصَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّمَ عَلىٰ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلىٰ آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَالتَّابِعِيْنَ.

۴۰ ویں حدیث سے ماخوذ مسائل

۱۔ اس میں اہل بیت اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اُن کا دفاع کیا اُس کا ذکر ہے۔

۲۔ اس میں دلیل ہے کہ ہر مسلمان پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنا، اُن کی محبت کا حکم کرنا اور اُن کے صحیح فضائل کے اظہار کے ساتھ اُن پر جھوٹ باندھنے اور جھوٹ منسوب کرنے کو دفع کرنا فرض ہے۔

۳۔ (وطئ سے قبل) حیض سے باندی کی طہارت کے عدم انتظار میں امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی فہم کی رسائی میں اُن کی فضیلت ہے۔ علماء کے دو اقوال میں سے امام مالک کے نزدیک جب عورت کا رحم صاف ہو تو

(۱) مسند أحمد ج٥ ص ٣٥١ حديث ٢٣٣٥٥، وط: [شاكر] ج١٦ ص ٤٨٣، ٤٨٤ حديث ٢٢٨٦٣، وط: ج٣٨ ص ٦٥، ٦٦، ٦٧ حديث ٢٢٩٦٧؛ فضائل الصحابة ج٢ ص ٨٦٠ حديث ١١٨٠؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص ٤٤٣ حديث ٨٤٢٨ وط: ج٥ ص ١٣٥ حديث ٨٤٨٢؛ شرح مشكل الآثار ج٨ ص ٥٨، ٥٩ حديث ٣٠٥١؛ تحفة الأخيار ج٥ ص ٤٩٦ حديث ٣٥٨٩؛ خصائص علي ص ١١٦ حديث ٩٧، وبتحقيق الحويني ص ٩٩ حديث ٩٤؛ البداية والنهاية ج١١ ص ٦٠؛ مجمع الزوائد ج٩ ص ١٢٧ وط: ج٩ ص ١٧١ حديث ١٤٧٣١، وط: ج١٨ ص ٢٩٠، ٢٩١، حديث ١٤٧٣٢، وص ٢٩٥، ٢٩٦ حديث ١٤٧٣٥؛ در السحابة للشوكاني ص ٢٢٣۔

استبراء کی ضرورت نہیں۔ اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی دقیق فقہ، صحتِ فکر اور ایسے صائب اجتہاد کی دلیل ہے جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی تائید فرمائی۔

٤۔ اس میں اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حسنِ ظن کی دلیل ہے، خصوصاً جبکہ وہ اہل بیت کے ائمہ سے ہو یا امیر مقرر ہو۔

٥۔ اس میں دلیل ہے کہ اہل بیت کے کسی صالح شخص سے اختلاف یا اُس کے ساتھ بغض رکھنا جیسا کہ بعض افعال کی وجہ سے لوگوں کے مابین واقع ہو جاتا ہے تو یہ بندے کو اسلام سے خارج نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بریدہ اور خالد کی تکفیر نہیں فرمائی بلکہ آپ نے بغض کو محبت میں بدلنے کا حکم فرمایا ہے۔(۱)

---

(۱) تنبیہ: یہاں تک تو درست ہے کہ اہل بیت کے کسی فرد سے بعض امور کے صدور پر کوئی شخص اُن سے بغض رکھے تو وہ خارج از اسلام نہیں ہوتا، لیکن یہ بغض طویل ہو جائے تو پھر خارج از اسلام ہونے کا اندیشہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے، اور روحانی برکات کا انقطاع تو ہر حال میں شروع ہو جاتا ہے، اگرچہ بغض رکھنے والا کتنا ہی نیکوکار اور اہل بیت کا فرد کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو۔ چنانچہ صلحاء امت کے کتنے ہی سچے واقعات اور مبشرات مشہور ہیں کہ اُنہوں نے کسی سید کو اُس کی گھناؤنی زندگی کے باعث ناپسندیدہ سمجھا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اُن سے رُخِ انور پھیر لیا۔ امام ابن عساکر، امام مقریزی، امام سخاوی اور دوسرے علماء کرام نے ایسے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں۔ اُن میں سے بعض واقعات ہماری کتاب ''مناقب الزہراء'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

بعض لوگوں کے دلوں میں اہل بیت کی کسی واقعی غلطی کے بغیر بھی اہل بیت کے لیے بغض پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً کسی کی تقریر اور تحریر سے متاثر ہو کر یا فریقِ مخالف کے پروپیگنڈا کا شکار ہو کر، جیسا کہ بعض صحابہ نے خود اعتراف کیا کہ کچھ لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر سبّ و شتم کر رہے تھے تو وہ بھی اُن میں شامل ہو گئے، اُن سے پوچھا گیا کہ فلاں پارٹی تو ہے ہی اہل بیت سے بغض رکھنے والی، مگر تم کیوں سبّ و شتم کرنے میں شریک ہو گئے؟ کہنے لگے: وہ لوگ سبّ و شتم کر رہے تھے تو میں بھی شریک ہو گیا۔ میں کہتا ہوں: بلکہ اب تک جو لوگ سیدنا علی اور امام حسین رضی اللہ عنہما کا اُن کے مدمقابل لوگوں سے موازنہ کرنے لگ جاتے ہیں اور اُن کے مقابلہ میں اِن مقدس ہستیوں کے اقدام پر لب کشائی کرتے ہیں، اور اُن کے مخالفین کو مرتبۂ اجتہاد پر دکھلانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، وہ ایسے ہی قدیم =

٦۔ اس میں دلیل ہے کہ خمس کا استحقاق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل بیت کا شرعی اور دینی فریضہ ہے، مخلوق کی جانب سے ہدیہ اور احسان نہیں۔

٧۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اُس فضیلت کی دلیل ہے جس پر وہ قائم تھے، مثلاً رب عزوجل کی ہر ایک پر برتری، نفاق کا نہ ہونا، شجاعت، شریعتِ مطہرہ پر عمل میں ثبات، اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طاعت کی طرف جلدی اور حق کی طرف رجوع کرنا۔

٨۔ اس میں مُنکَر (برائی) کے مرتکب پر نکیر کرنے کی دلیل ہے، اگرچہ وہ ائمۂ اہل بیت سے ہی ہو۔

٩۔ اس میں سبق ہے کہ عالم کو چاہیئے کہ وہ اُس شخص پر اعتراض نہ کرے جو علم اور دیانت میں اُس سے بڑا ہو، جب تک کہ مسئلہ اُس پر پوری طرح واضح نہ ہو جائے، وہ اُس کی مکمل تحقیق نہ کر لے اور اس کے معنیٰ کی حقیقت تک نہ پہنچ جائے۔ پس حضرت خالد اور بریدہ نے لونڈی سے وطیٔ پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا، حالانکہ وہ اُن دونوں سے بڑے عالم تھے، اللہ تعالیٰ سب پر راضی ہو، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید سے حق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ظاہر ہوا۔ پس قیدی لونڈی سے اُس وقت تک وطیٔ جائز نہیں جب تک کہ وہ حیض سے پاک نہ ہو جائے، اور چونکہ مسئلہ کی نوعیت یہ تھی، اس لیے اُنہوں نے یہ سمجھے بغیر کہ حکم کا سبب کیا ہے اُن پر اعتراض کر دیا، اور سبب رحم کا صاف ہونا ہے، اور متعدد امور کی روشنی میں اس کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ پس جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اُس کے رحم کے صاف ہونے کا یقین حاصل ہو گیا تو انہوں نے اُس سے وطیٔ فرمائی۔ میں سمجھتا ہوں گویا کہ اُن کی یہ فہم اور اس جیسی دوسری باریک بینیوں کی وجہ سے اُن سے حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے لیے کوئی علم مخصوص فرمایا ہے؟ جیسا کہ بخاری میں ہے، تو انہوں نے فرمایا: نہیں، ماسوا اللہ کی کتاب اور اُس فہم کے جو مسلم شخص کو عطا کی جاتی ہے۔

= وجدید تحریری وتقریری پروپیگنڈا کا شکار ہو کر بغضِ اہل بیت کے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر ایسا مریض نام نہاد اجتہاد و تحقیق میں مبتلا ہو جائے تو وہ "أنا" کا مریض بھی ہو جاتا ہے اور شب و روز اُس کے یہ دونوں مرض بڑھتے چلے جاتے ہیں اور مصیبت یہ کہ اُسے شعور بھی نہیں ہوتا، حتیٰ کہ وہ لاعلاج اسٹیج پر جا پہنچتا ہے۔ سو ایسے مریض کا خاتمہ ایمان پر ہو، بہت ہی بعید ہے، اللہ تعالیٰ سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

۱۰۔ اس میں دلیل ہے کہ جب کسی اہل علم اور فاضل سے اہل بیت کی شان میں کوئی کوتاہی ہو جائے تو سنت یہ ہے کہ اُسے رازداری سے سمجھایا جائے نہ کہ اُسے علانیہ رسوا کیا جائے، چنانچہ مسند کی ایک روایت میں آیا ہے: حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: کیا تم علی سے بغض رکھتے ہو؟

۱۱۔ اس میں دلیل ہے کہ جب اکابر اہل علم تنازع کا شکار ہو جائیں تو واجب ہے کہ وہ اپنے تنازع کو کتاب وسنت کی طرف لوٹائیں، اگر چہ وہ قرابت یا منصب کے جس درجہ کو بھی پہنچ چکے ہوں۔

۱۲۔ علامہ شوکانی "النیل" میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے، کیونکہ اُنہیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو گئے اور صحیح حدیث میں ہے کہ اُن سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن اور اُن سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق۔ جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے"۔(۱)(۲)

(۱) نیل الأوطار ج٦ ص ١٨٥ وط: ج١٢ ص ٢١٣۔

(۲) محبِّ علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت

قاضی شوکانی کا یہ اِستدلال بہت عمدہ ہے، انہوں نے جس بات کو سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کی منقبت قرار دیا ہے وہ اُن کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ محبت کرنا ہے۔ اگر یہ بات سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت اور اُن کے کمال ایمان کی دلیل ہے، اور یقیناً ہے تو پھر یہ ہر اُس شخص کی بھی منقبت وفضیلت اور کمالِ ایمان کی دلیل ہونی چاہیئے جو دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بنسبت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت رکھتا ہو۔

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ جس بات کو قاضی شوکانی اور ایک سعودی عالم فضیلت اور ایمان کی دلیل قرار دے رہے ہیں، اُسی بات کو ہمارے ہاں کے نام نہاد سنی "کمینگی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ سائیں غلام رسول قاسمی سرگودھوی لکھتے ہیں:

"جس نے کہا کہ مجھے علی سب سے زیادہ پیارے ہیں تو وہ شخص نہایت کمینہ ہے"۔(1)=

(1) ضربِ حیدری ٢٣٦۔

۱۳۔ اس میں دلیل ہے کہ جو اسلام میں سابق ہوں، جن کی کثیر خوبیاں ہوں اور جن کا مرتبہ بلند ہو تو چاہیئے کہ اُن کی نیکیاں قبول کی جائیں اور اُن کی لغزشوں سے درگزر کیا جائے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں یہی راز ہے جو آپ نے حضرت بریدہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: تم ان سے محبت کرو کیونکہ خمس میں اُن کا حصہ بہت زیادہ ہے، اور اسی طرح آپ کے اہل بیت کے فضائل بھی اس سے زیادہ ہیں کہ ذکر کیے جائیں اور اِس سے وافر ہیں کہ تالیف کیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ علیین میں ہمیں اُن کے ساتھ جمع فرمائے۔ آمین، آمین۔ (۱)

= تعجب ہے کہ جس کتاب ''ضربِ حیدري'' میں ایسے سفیہانہ اقوال موجود ہیں، اُس پر دورِ حاضر کے کئی مشہور علماء کی تقریظات درج ہیں۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. ہم نے متعدد احادیث، آثار اور اقوال علماء سے اس قول کا بطلان واضح کیا ہے، تفصیل کے لیے ہماری کتاب ''شرح أسنی المطالب في مناقب علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ ص ۱۲۴ تا ۱۴۵، الطبعة الأولیٰ ملاحظہ ہو۔

(۱) قدیم صحابہ کا اعزاز

مؤلف کے تیرھویں فائدے کی ابتدائی سطور میں بایں الفاظ ایک شرعی اصول کا ذکر ہے ''جو اسلام میں سابق ہوں، جن کی کثیر خوبیاں ہوں اور جن کا مرتبہ بلند ہو تو چاہیئے کہ اُن کی نیکیاں قبول کی جائیں اور اُن کی لغزشوں سے درگزر کیا جائے''۔ یہ اصول متعدد احادیث کے علاوہ درجِ ذیل حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے:

أنزِلوا الناس منازلهم.

''لوگوں کو اُن کی حیثیت کے مطابق مقام دیا کرو''۔ (1)

مؤلف کی درجِ بالا سطور میں یہ تین باتیں مذکور ہیں:

الف: جو اسلام میں سابق ہوں

ب: جن کی کثیر خوبیاں ہوں =

---

(1) سنن أبي داود: کتاب الأدب، باب في تنزیل الناس منازلهم، حدیث ٤٨٤٢؛ مسلم: مقدمة، ص٣؛ الجامع الصغیر للسیوطي حدیث ٢٧٣٥۔

= ج: اور جن کا مرتبہ بلند ہو تو چاہیئے کہ اُن کی نیکیاں قبول کی جائیں اور اُن کی لغزشوں سے درگزر کیا جائے۔

یقیناً جس صحابی میں یہ تین باتیں پائی جاتیں، پھر اُس سے واقعتاً کوئی لغزش سرزد ہو بھی جاتی تو اُس سے درگزر کیا جاتا تھا، جیسا کہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ۔ اِس کے برعکس جو اِن تین خوبیوں سے محروم تھے اُنہیں یہ استثناء حاصل نہیں تھا، بلکہ یہ اصول خود اُنہیں پابند کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ چنانچہ صحاح کی مشہور حدیث ''لا تسبوا أصحابي'' (میرے صحابہ کو برا نہ کہا کرو) کا روئے سخن ایسے ہی متأخرین صحابہ کی طرف ہے جو تاخیر سے اسلام لانے کے باعث مذکورہ خوبیوں کو نہ پاسکے، اُنہیں تنبیہ کی گئی کہ وہ سابقین صحابہ کرام ﷺ کے بارے میں احتیاط کو ملحوظ رکھا کریں۔ چنانچہ ''لا تسبوا أصحابي'' میں حضرت خالد بن ولید اور اُن کی مانند متأخرین لوگوں کو مخاطب کیا گیا۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

هذا خطاب منه لخالد بن الوليد وأقرانه من مسلمة الفتح والحديبية.

''حضور ﷺ کا یہ خطاب حضرت خالد بن ولید اور اُن کے ہمسر حدیبیہ اور فتح مکہ کے دور کے مسلمانوں سے ہے''۔(1)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے سامنے نامناسب کلام کیا تھا تو اُنہیں حضور ﷺ نے تنبیہ فرمائی تھی۔ چنانچہ امام صدرالدین علی بن علی بن محمد بن ابی العز حنفی متوفّٰی ۷۹۲ھ لکھتے ہیں:

يعني عبد الرحمان وأمثاله، لأن عبد الرحمان ونحوه هم السابقون الأولون، وهم الذين أسلموا من قبل الفتح وقاتلوا، وهم أهل بيعة الرضوان، فهم أفضل وأخص بصحبته ممن أسلم بعد بيعة الرضوان، وهم الذين أسلموا بعد الحديبية، وبعد مصالحة النبي ﷺ أهل مكة، ومنهم خالد بن وليد، وهؤلاء أسبق ممن تأخر إسلامهم إلى فتح مكة، وسموا الطلقاء، منهم أبوسفيان وابناه يزيد ومعاوية.

والمقصود أنه نهىٰ من له صحبة أخرى أن يسب من له صحبة أولىٰ، =

(1) إعلام الموقعين ج٥ ص٤٧٨۔

....

لامتيازهم عنهم من الصحبة بما لا يمكن أن يشركوهم فيه.

''اس سے سیدنا عبدالرحمان اوراُن کی مثل دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں، کیونکہ سیدنا عبدالرحمان اوراُن کی مثل صحابہ کرام سابقون اولون میں سے ہیں، اور یہ وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ سے قبل اسلام لائے اور جہاد کیا، اور یہی بیعت رضوان والے ہیں، لہٰذا یہ اُن سب سے افضل اور خاص ہیں جو بیعتِ رضوان کے بعد اسلام لائے، اور وہ (بیعتِ رضوان سے بعد والے) وہ ہیں جو صلح حدیبیہ اور اہل مکہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مصالحت کے بعد اسلام لائے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی اُنہیں میں سے ہیں، اور یہ (صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لانے والے) اُن لوگوں سے سابق ہیں جن کا اسلام فتح مکہ تک مؤخر رہا اور وہ طلقاء کہلائے، ابوسفیان اور اُن کے بیٹے یزید اور معاویہ اُنہیں طلقاء میں سے ہیں۔

فی الجملہ یہ کہ جن کی صحابیت مؤخر ہے اُنہیں کہا گیا کہ وہ اُن حضرات کو برا نہ کہا کریں جن کی صحابیت مقدم ہے، کیونکہ وہ صحابیت میں اُن سے اس قدر ممتاز ہیں کہ اُن کے شرف میں ان کی شرکت ممکن ہی نہیں''۔(1)

اس سے وہ لوگ عبرت حاصل کریں جو طلقاء قسم کے لوگوں کی اغلاط، خطائیں اور کبائر کو اجتہاد قرار دینے کی ناکام کوشش میں نہ صرف یہ کہ السابقون الاولون صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حق تلفی کرتے ہیں بلکہ وہ السابقون الاولون کی شان میں واردشدہ تمام احادیث کو طلقاء پر فٹ کرنے کی جسارت بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ جن طلقاء کی شان میں کوئی ایک صحیح حدیث نبوی بھی نہیں آئی، اُن کے دفاع میں جب کوئی لکھاری لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ ایسی ساری احادیث اُن پر فٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو متقدمین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں وارد ہوئیں۔ خود اسی مشہور =

---

(1) شرح العقيدة الطحاوية، لابن أبي العز، بتحقيق محمد أحمد شاكر ص٤٧٧؛ شرح العقيدة الطحاوية بتخريج الألباني ص٤٦٨؛ التعليقات البازية، للشيخ عبدالعزيز بن عبدالله بن الباز ج٢ ص١١١٢؛ الرياض الندية لعبدالله الجبرين ج٤ ص٥٤٢؛ شرح العقيدة الطحاوية، بتحقيق الدكتور عبدالله بن عبدالمحسن التركي، وشعيب الأرنؤوط ص٦٩٢۔

....

= حدیث "لا تسبوا أصحابي" کو بھی لکھاری لوگ بعض طلقاء کی شان میں لکھ دیتے ہیں، حالانکہ صحیح مسلم کے متن میں ہے کہ اِس میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مخاطب کیا گیا تھا، اور حدیث کے اگلے الفاظ حضرت خالد بن ولید اور متقدمین صحابہ کرام میں جو فرق ہے، اُسے کھول کھول بیان کررہے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

"اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد پہاڑ کے برابر سونا خیرات کرے تو وہ اُن کے ایک مُد (کلوگرام) اور اُس کے نصف کے برابر بھی نہیں ہوسکتا"۔(1)

سو جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایسے حضرات کا اُحد پہاڑ کے برابر سونا خیرات کرنا، قدیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آدھے کلوگرام کے برابر بھی نہیں ہوسکتا، یعنی متقدمین و متأخرین صحابہ کی فضیلت میں اس قدر فرق ہے تو پھر جو لوگ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بھی بعد میں مسلمان ہوئے، اور طلقاء کہلائے اُن کا کیا حکم ہوگا؟

کیا اُحد پہاڑ اور نصف کلو کا کوئی مقابلہ ہے؟

اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ جس طرح سابقین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نصف کلو کے سامنے متأخرین صحابہ رضی اللہ عنہم کے اُحد پہاڑ کی بھی کوئی حیثیت نہیں، ایسے ہی اِن دونوں طبقات کی شانوں کا معاملہ ہے، سابقین اپنے فضائل، شان اور منقبت میں پہاڑوں کی مانند ہیں جبکہ متأخرین اُن کے سامنے نصف کلو کی حیثیت بھی نہیں رکھتے، دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سابقین جلیل القدر اور متأخرین قلیل القدر ہیں۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ بعض لوگ صلح حدیبیہ سے بعد اسلام لانے والوں کو تو کجا فتح مکہ کے موقعہ پر مجبوراً اسلام قبول کرنے والے طلقاء کو جلیل القدر کہہ دیتے ہیں۔ اُن سے پوچھا جائے کہ تمہارے جلیل القدر کہنے سے کوئی جلیل القدر ہو جائے گا؟ اللہ جل جلالہ نے جنہیں جلیل القدر بنادیا بس وہی جلیل القدر ہیں، کسی دوسرے کا اُن کے رتبے کو پہنچنا ممکن ہی نہیں، جیسا کہ امام ابن ابی العز حنفی نے فرمایا "لایمکن أن یشرکوهم فیه"۔

بات چلی تھی فاضل مؤلف کے اِن الفاظ سے "جن کی کثیر خوبیاں ہوں اور جن کا مرتبہ بلند ہو تو چاہیئے کہ اُن کی نیکیاں قبول کی جائیں اور اُن کی لغزشوں سے درگزر کیا جائے" چونکہ یہ شرعی اصول ہے، اسی لیے جب کسی

---

(1) مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب تحريم سبّ الصحابة رضی اللہ عنہم، حديث ٢٥٤٠۔

سائل نے مولانا محمد قاسم نانوتوی سے حضرت معاویہ کے بعض خلاف شرع معاملات کے متعلق سوال کیا تو اُنہوں نے کسی قسم کی تاویل سے گریز کیا اور اُس کی وجہ یہ بیان کی:

''ہم امیر معاویہ کو جلیل القدر صحابہ میں شمار نہیں کرتے ہیں''۔(1)

خود انصاف فرمائیے کہ مکمل حدیث ''لا تسبوا أصحابي'' کو طلقاء کی شان میں لانا کتنی بڑی جسارت ہے؟ جب حدیبیہ کے بعد طوعاً اسلام قبول کرنے والے حضرات قدیم صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں آدھے کلو کے برابر بھی نہیں تو پھر ایک عرصہ بعد ہی نہیں بلکہ فتح مکہ کے وقت کرھاً اسلام قبول کرنے والوں کا کیا وزن ہوگا؟ وہ لکھاری لوگ جو شرعی حدود پھلانگتے ہوئے قدیم اور جلیل القدر صحابہ کی شان میں وارد ہونے والی احادیث کو طلقاء پر فٹ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، وہ بتلائیں! کیا اُن کے نزدیک قدیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد محض مبالغہ ہے، اور اِس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں؟ اور کیا حدیث ''أنزلوا الناس منازلهم'' کی کوئی حیثیت نہیں؟

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سامنے اُن کی حقیقت کو واضح کرنا ضروری سمجھا، تاکہ اُن پر بھی اور دوسروں پر بھی فرقِ مراتب قائم رہے تو پھر اُن کے بعد والے لوگوں کے بارے میں یہ فرق ملحوظ نہ رکھنا کہاں کی علمیت اور کہاں کی سنیت ہے؟ یہ علمیت اور سنیت نہیں، بلکہ یہ کھلم کھلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تقدّم اور آپ کی آواز پر آواز بلند کرنے کے مترادف ہے۔

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

جہاں تک اس حدیث کے پہلے جملے ''لا تسبوا أصحابي'' (میرے صحابہ کو برا نہ کہا کرو) کا تعلق ہے تو ہر چند کہ اُس کے اوّلین مخاطَب حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد والے صحابہ ہیں، تاہم متقدمین ہوں یا متأخرین کسی بھی صحابی کو سب وشتم کرنا اہل اسلام کا شیوہ نہیں، لیکن یاد رہے کہ سبّ وشتم کرنے اور دلائل کی روشنی میں کسی صحابی کے بارے میں خطا، بغاوت، کبائر اور فسق عملی اور اعتقادی کی حقیقت کو بالضرورت واضح کرنے میں بڑا فرق ہے۔

نیز یہاں یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ کسی صحابی پر سبّ وشتم کرنے کا جتنا گناہ کسی عام شخص کے بارے میں احادیث میں آیا ہے، اُس گناہ سے وہ بعض متأخرین صحابہ ہرگز مستثنیٰ نہیں جو اہل بیت اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر اُن کی زندگی میں بھی اور اُن کی شہادت کے بعد بھی سبّ وشتم کرتے اور کراتے رہے۔

---

(1) أنوار النجوم ترجمه مکتوبات قاسم العلوم ص ١٧٤۔

اختتام اور دعا

اِن چالیس احادیث اور اِن کی تشریح سے فراغت ۱۴۳۰ھ، ربیع الثانی کے آغاز میں ہوئی، اس پر کئی مجالس میں کام ہوا، آخری مجلس شہر ریاض (اللہ اُسے محفوظ رکھے) کی جامع مسجد میں ہوئی۔

اِس فقیر فیضی نے کتابِ ھٰذا کے اُردو ترجمہ اور شرح سے ۲۹ شوال المکرّم ۱۴۳۶ھ، بمطابق 14 اگست 2015ء کو شہر لاہور میں فراغت پائی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اِس شہر اور ہمارے پورے ملک کو بطفیلِ حرمین شریفین محفوظ اور قائم ودائم رکھے۔ آمین ثم آمین بِجَاہِ طٰہٰ وَیٰسٓ ،وَصَلَّی اللّٰہُ وَسَلَّمَ عَلیٰ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ آلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَأَصْحَابِہِ الْھَادِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ، وَمَنْ تَبِعَھُمْ بِإِحْسَانٍ إِلیٰ یَوْمِ الدِّیْنِ.

كِتَابُ الأَرْبَعِين

في فَضَائِلِ آلِ الْبَيْتِ الطَّاهِرِيْنَ

تأليف

عبدالله بن صالح بن محمد العبيد

دار البشائر الإسلامية

كتاب

الأربعين

في فضائل آل البيت الطاهرين

المقدّمة

الحمدُ لله الذي شرَّف الأمة بآل البيت الطاهرين، وزادها شرفاً باصطفائه منهم سيد الأولين والآخرين، أحمده حمد القانتين، وأشكره شكر المخبتين، لا أَوَّل لوجوده، ولا آخر لكرمه وجوده.

وصلَّى الله وسلَّم على صفوته من بَرِيَّته، وعلى خيرته من صحابته وذُرِّيَّته.

أمَّا بعد:

فإنَّ محبَّة آل البيت فارِقٌ بين الحيّ والمَيْت، ودلالة على صدق السيرة، وأمارة على خلوص السريرة. وما زال المسلمون والسلف الماضون يُعَظِّمونهم، ويتواصون بهم في أنفسهم وعيالهم، ويتنادون بهم في أقوالهم وأفعالهم، ويتناقلون فضائلهم في حِلِّهم وَتَرْحالهم.

روّينا في الصحيحين في قِصَّة عَلِيٍّ أنه قال لأبي بكر في خبر البَيْعَة: «. . . وكُنَّا نرى لقرابتنا من رسول الله ﷺ نصيباً. حتى فاضت عَيْنا أبي بكر، فلما تكلَّم أبو بكر قال: والذي نفسي بيده، لقرابة رسول الله ﷺ أحبّ إليَّ أن أَصل من قرابتي. . .».

وقال أيضاً كما في الصحيح: «ارقبوا محمداً ﷺ في أهل بيته».

وروّينا بسند صحيح في السيرة وغيرها أن عمر قال للعباس: «والله لإسلامك يوم أسلمتَ كان أحبَّ إليَّ من إسلام الخطَّاب لو أسلم، وما بي إلَّا أنِّي قد عرفتُ أن إسلامك كان أحبَّ إلى رسول الله ﷺ من إسلام الخطَّاب لو أسلم...».

وكان أميرا المؤمنين عمر وعثمان إذا مَرَّا بالعباس رضي الله عنهم ـ وهما راكبان ـ نزلا حتى يجاوزهما؛ إجلالاً لِعَمِّ رسول الله ﷺ.

وفي الصحيح: عن عروة بن الزبير قال: ذهب عبد الله بن الزبير مع أناسٍ من بني زُهْرَة إلى عائشة، وكانت أَرَقَّ شيءٍ عليهم؛ لقرابتهم من رسول الله ﷺ.

وروِّينا في الطبقات لابن سعد بسندٍ صحيح: أن فاطمة بنت علي بن أبي طالب ذكرتْ عمر بن عبد العزيز فأكثرتِ الترحُّم عليه وقالت: دخلتُ عليه ـ وهو أمير المدينة يومئذٍ ـ فَأَخْرَجَ عنِّي كُلَّ خَصِيٍّ وحَرَسِيٍّ حتى لم يبقَ في البيت أحدٌ غيري وغيره، ثم قال: يا ابنةَ عليّ، والله ما على ظهر الأرض أهلُ بيتٍ أحبّ إليَّ منكم، ولأنتم أحبّ إليَّ من أهل بيتي».

والأخبار في ذلك يصعب إحصاؤها، ويشق استقصاؤها.

وسنَّة الله ماضِيَة في آل البيت أنَّ من أحبَّهم بصدقٍ نصره الله، ومن أعزَّهم بإخلاص رفعه الله، ومن أهانهم بِعَمْدٍ أذلَّه الله، فقد روّينا من طرقٍ جَمَّة عند ابن أبي الدنيا وغيره أنَّ رجلاً نال من أمير المؤمنين عليٍّ فنهاه سعد بن أبي وقاص فلم يَنْتَهِ، فَدَعا عليه، فما بَرِحَ حتى جاء بَعِيْرٌ نادٌّ فَخَبَطه حتى مات.

وما زال أئمة الإسلام والتابعون لهم بإحسانٍ لا يصنِّفون كتاباً في

العقائد أو السُّنن أو السِّيَر إلَّا ويروون فيه فضائلهم، ويتخذون ذلك عقيدةً وشريعةً يَلْقَون بها الله ورسوله.

والمحبّ الصادق في محبتهم من سار على مِنْهاجهم منهاج النبوة، بالتزام الكتاب المبين، واتباع سيِّد المرسلين، والاقتداء بالصحابة والتابعين، وَمَنْ تَخلَّق بأسلافهم في التعبُّد والتألُّه وكثرة الأذكار، والبِرِّ والرحمة والإحسان والإيثار.

ومع تواتر فضائل آل البيت فقد كانوا يُشَدِّدون على أخذها مأخذ الاعتدال، وينهون عن الغلوِّ فيهم، لأن كثرة الفضائل مَظِنَّةٌ لِغُلوّ الجاهل، وتوسط العادل. وإمامهم وسيِّدهم ﷺ أوَّلهم تحذيراً من ذلك، فقد قال ـ كما في الصحيح ـ: «لا تطروني كما أَطْرَتِ النصارى ابن مريم، فإنما أنا عَبْدُهُ، فقولوا: عبد الله ورسوله».

وروّينا في الطبقات لابن سعد بسندٍ صحيح: عن الحسن بن الحسن بن عليّ رضي الله عنهم أنه قال لرجلٍ ممن يغلو فيهم: وَيْحَكُم أَحِبُّونا لله، فإن أطعنا الله فأحبونا، وإن عصينا الله فأبغضونا. فقال له رجلٌ: إنكم قرابة رسول الله ﷺ وأهل بيته! فقال: وَيحَكَ، لو كان الله مانعاً بقرابةٍ من رسول الله أحداً بغير طاعة الله لنفع بذلك مَنْ هو أقرب إليه مِنَّا أَباً وأُمًّا، والله إني لأَخافُ أن يُضاعف للعاصي مِنَّا العذاب ضِعْفَين، وإني لأرجو أن يؤتى المحسن مِنَّا أجره مرتين؛ وَيْلَكُم اتَّقوا الله وقولوا فينا الحق، فإنه أبلغ فيما تريدون، ونحن نرضى به منكم. ثم قال: لقد أساء بِنَا آباؤنا إن كان هذا الذي تقولون من دين الله ثم لم يطلعونا عليه ولم يرغبونا فيه...».

وفيه كذلك بسندٍ صحيحٍ: أن عليَّ بن الحسين رضي الله عنهما قال: «يا أيها الناس أحبُّونا حبَّ الإسلام، فما برح بِنَا حُبّكم حتى ضار علينا عاراً».

هـذا:

وَدُوْنَكَ هذه الأربعين مسلسلاً غالبها بالقراءة والإسماع، انتخبتُها مما وقع لي جميعه بالسماع، ولم أقصد فيها إلى علو الإسنادِ، اكتفاءً بِعُلُوِّ أهل المنزل والنَّادِ، وانتقيتُ جملة من أحاديثه من الصحيحين ـ لجلالتهما ـ وإن كان أرباب الصَّنْعة لا يعتادونه، طلباً منهم للعلوّ من غير طريقهم.

ثم ألحقتُ بها فوائد مستنبطة، وغرائب مُسْتَلْطَفَة، خصصتُ بها آل رسول الله، وإنْ شَرَكَهم غيرهم من الجادّ واللاّه، فإن خطاب الشرع يتناول الجميع، وإنْ كانوا هم سبب نزول التشريع، غير أنهم أوَّلُ الناس دخولاً لكونهم سَبَبَه، وأولى الخلق عملاً به لكونهم أعلاهم مرتبة.

رضي الله عنهم أجمعين، ونفع بالآخِرين كما نفع بالأولين، وجَعَل هذه الأربعين قربةً لكاتبها والقارئين؛ للحشر في زمرتهم ووفدهم مع النبيين والصدِّيقين والشهداء والصالحين، آمين آمين.

وهذا أوان ابتداء المقصود:

❑❑❑

الحديث الأول

أخبرني الفقيه الصالح السيد سليمان بن محمد الأهدل الزَّبيدي الشافعي بقراءتي عليه بزبيد، أخبرنا محمد بن صدِّيق البطَّاح، أخبرنا مفتي الشافعية محمد بن عبد الباقي الأهدل، أخبرنا والدي عبد الباقي، أخبرنا والدي الوجيه عبد الرحمن بن سليمان الأهدل، أخبرنا والدي، أخبرنا أحمد بن محمد مقبول الأهدل، أخبرني خالي يحيى بن عمر مقبول الأهدل، أخبرني أبو بكر بن علي البطاح، أخبرني يوسف بن محمد البطاح، أخبرني الطاهر بن حسين الأهدل، أخبرني الحافظ عبد الرحمن بن علي الدَّيْبَع، أخبرني أبو العبَّاس أحمد بن عبد اللطيف الشَّرَجي، أخبرنا أبو الفتح محمد بن أبي بكر الحسين المَرَاغي، أخبرنا والدي، أخبرنا أبو الفرج عبد الرحمن بن محمد بن عبد الحميد بن عبد الهادي المقدسي، أخبرنا أحمد بن عبد الدائم المقدسي، أخبرنا محمد بن علي بن صدقة الحرَّاني، أخبرنا فقيه الحَرَم محمد بن الفضل الفَرَاوي، أخبرنا عبد الغافر بن محمد الفارسي، أخبرنا محمد بن عيسى الجُلُودي الثوري المذهب، أخبرنا أبو إسحاق إبراهيم بن محمد بن سفيان الزاهد، **أخبرنا الإمام أبو الحسين مسلم بن الحجَّاج القُشيري قال:**

حدثنا محمد بن مِهْران الرازي ومحمد بن عبد الرحمن بن سَهْم

جميعاً عن الوليد، قال ابن مهران: حدثنا الوليد بن مسلم، حدثنا الأوزاعي عن أبي عَمَّارٍ شَدَّاد: أنه سمع واثلة بن الأسقع يقول: سمعت رسول الله ﷺ يقول:

«إنَّ الله اصطفى كنانة من ولد إسماعيل، واصطفى قريشاً من كنانة، واصطفى من قريش بني هاشم، واصطفاني من بني هاشم».

وقع لنا هكذا مسلسلاً بالسماع في الصحيح لمسلم، ووهم من نسبه للبخاري.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فضيلة ولد إسماعيل على العالمين، وقد جاء التصريح بذلك في عدة أخبار.

الثانية: فضيلة كنانة كذلك.

الثالثة: فضيلة قريش كذلك.

الرابعة: فضيلة بني هاشم كذلك.

الخامسة: فضيلة النبي ﷺ على الخلق أجمعين.

السادسة: أن الاصطفاء من أفعال الرب تبارك وتعالى المتعلِّقة بمشيئته، فليس لأحدٍ أن يعترض على أفعاله سبحانه، قال تعالى: ﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ سُبْحَٰنَ ٱللَّهِ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾.

السابعة: من تفضيل الله تعالى لرسوله ﷺ تفضيله لآل بيته، وجعله سبحانه ذلك شريعةً وديناً يلقى به المكلفُ ربه تبارك وتعالى.

الثامنة: من مقتضيات الاصطفاء وجوب محبة المصطفى، لأن الاصطفاء فعل الرب عزَّ وجلّ ومحبَّته، وهذا هو الشرف العظيم.

التاسعة: أن أهل السنَّة والجماعة يؤمنون بأن أشرف الأنساب كافةً مَنْ

....

كان مِنْ بني هاشم؛ وعليه، فلهم مزيد المحبة والإجلال على سائر بطون قريش، ولقريش من ذلك ما ليس لغيرهم من قبائل العرب.

العاشرة: وطَّأ الله تعالى لهذه الشريعة ـ وهي فضل قريش ـ بمحبة العرب لها في الجاهلية، إذ كانوا يعظمونها ويرون لها التقدُّم في خصال الخير، وكثرة الفضائل، ورعاية الحَرَم. فلما جاء الإسلام وأخبر النبي ﷺ العرب بذلك لم ينازعهم أحد في دعوى الشَّرَف والتقدُّم.

الحادية عشر: فيه إشارة إلى طهارة نسبه الشريف، وأنه من نكاحٍ لا سفاح.

الثانية عشر: فيه إشارة إلى أن طِيْب العُنْصُر له أثرٌ في صلاح الباطن والظاهر.

الثالثة عشر: قوله «واصطفاني»؛ دليل على عظم محبة الله تعالى لرسوله ﷺ، وهذا هو الفخر الذي ليس فوقه مفخر.

الرابعة عشر: فيه فضل العرب على سائر الأمم.

الحديث الثاني

اخبرنا الشيخ المحدِّث الصالح محمد إسرائيل بن إبراهيم السَّلَفي قراءةً عليه ببيت العجمي[1] بالجهراء بالكويت، أخبرنا عبد الحكيم الجِيْوَرِي، أخبرنا شيخ الهند نذير حسين الدِّهْلَوي، أخبرنا محمد إسحاق الدهلوي، أخبرنا الشاهْ عبد العزيز بن ولي الله أحمد بن عبد الرحيم الدهلوي، أخبرنا والدي، أخبرنا أبو طاهر بن البرهان إبراهيم الكوراني ثم المدني، أخبرنا الحسن بن علي العُجَيمي، أخبرنا الشمس محمد بن علاء الدين البابلي عن سالم بن محمد السَّنْهُوْري، أخبرنا النجم محمد بن أحمد الغيطي، أخبرنا شيخ الإسلام زكريا بن محمد الأنصاري، أخبرنا أبو النَّعِيم رُضوان بن محمد العُقْبي، أخبرنا أبو الطاهر محمد بن محمد بن الكُوَيْك، أخبرنا أبو الفرج بن عبد الهادي بإسناده المتقدِّم إلى الإمام مسلم قال:

حدثني الحكم بن موسى أبو صالح، حدثنا هِقْل ـ يعني ابنَ زياد ـ، عن الأوزاعي، حدثني أبو عمَّار، حدثني عبد الله بن فَرُّوخ، حدثني أبو هريرة قال: قال رسول الله ﷺ:

---

(١) هو فضيلة الشيخ البحَّاثة المتفنِّن محمد بن ناصر الصالحي العجمي، صاحب التصانيف النافعة، وقد جمعتني به الرحلة في عدة بلدان، نفعنا الله والمسلمين بعلومه.

«أنا سيِّد ولد آدم يوم القيامة، وأوَّل من يَنْشَقُّ عنه القبر، وأوَّل شافع، وأوَّل مُشَفَّع».

رواه مسلم.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فضيلة النبي ﷺ على العالمين.

الثانية: قوله: «أول شافع»؛ فيه أن آل بيته ﷺ أولى الناس بشفاعته، ولذا قال في رواية جابر بن عبد الله عند الطبراني في الأوسط: «أنا سيد ولد آدم... ما بال أقوام يزعمون أن رحمي لا تنفع، ليس كما زعموا، إني لأَشْفَع وأُشَفَّع، حتى إن من أشفع له ليشفع فَيُشَفَّع، حتى إن إبليس ليتطاول في الشفاعة». ويؤيد ذلك كذلك الحديث الثلاثون «كل سبب ونسب».

الثالثة: فيه إشارة إلى استحباب الشفاعة في الدنيا، فإن الشفاعة في الآخرة من أعظم المعروف، وأهل المعروف في الآخرة هم أهله في الدنيا، وآل البيت أولى الناس في الاقتداء بسيِّدهم ﷺ في ذلك.

الرابعة: فيه دلالة على أن الفَخْر إن كان بحق، ولا يؤدي إلى العصبية أو البغضاء جاز، وقد جاء التصريح بذلك في رواية إذ قال: «ولا فخر».

الخامسة: جواز قول الرجل «أنا».

السادسة: فائدة تخصيص «يوم القيامة» بالذكر ليشمل سائر الخلق في الآخرة، إذ هو يوم الجمع الأكبر، ولئلا يُتوهم أن ذلك في الدنيا باعتبار أهل زمانه فقط.

السابعة: فيه دلالة على تعظيم النبي ﷺ وتعظيم ما جاء به، وأن التحاكم إليه لا إلى غيره، لأن ذلك مقتضى السيادة على الخلق.

....

الثامنة: فيه جواز إطلاق لفظ «السيِّد» على النبي ﷺ، وأمَّا قوله في الحديث الصحيح «السيِّد الله» فإنه ﷺ قاله لقوم حُدَثاء عهد بجاهلية لما بالغوا في مدحه. فَمَنَعَهم مما ليس فيه بأس حذراً من الوقوع فيما فيه بأس، ولينبِّه الخلق وينصح لهم بأن من يستحق المبالغة في المدح هو الله عزَّ جاهه، وتقدست أسماؤه، لأنه السيِّد الذي ما فوقه سيِّد تبارك وتعالى.

التاسعة: فيه استحباب الإحسان بإحكام دفن الميِّت في القبر، لقوله: «ينشق».

العاشرة: فيه دلالة على أنه ﷺ ميِّت منذ قَبْضِ روحه الطاهرة سنة إحدى عشرة إلى يوم البعث، لقوله: «ينشق عنه القبر».

❑❑❑

الحديث الثالث

أخبرنا العلَّامة المعمر عبد القادر بن كرامة الله البخاري الحنفي بقراءتي عليه بالجحفة، أخبرنا عمر بن حمدان المَحْرِسي قراءة عليه بالمسجد الحرام، أخبرنا أحمد بن إسماعيل بن زين العابدين البَرْزنجي، أخبرنا والدي عن صالح بن محمد الفُلَّاني، أخبرنا محمد سعيد سَفَر، أخبرنا تاج الدين القلعي، عن الحسن بن علي العجيمي بإسناده[1] إلى الإمام مسلم قال:

حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة ومحمد بن عبد الله بن نُمير ـ واللفظ لأبي بكر ـ قالا: حدثنا محمد بن بشر عن زكريا، عن مصعب بن شيبة، عن صفية بنت شيبة قالت:

قالت عائشة: خرج النبي ﷺ غداةً وعليه مِرْطٌ مُرَحَّل من شَعَر أسود، فجاء الحسن بن عليّ فأدخله، ثم جاء الحسين فدخل معه، ثم جاءت فاطمة فأدخلها، ثم جاء عليٌّ فأدخله، ثم قال: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ ٱللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ ٱلرِّجْسَ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾.

رواه مسلم.

---

(١) في الحديث الثاني.

وبهذا الإسناد وغيره نروي الصحيح سماعاً من فاتحته إلى خاتمته.

«مرط مرحل»، أي: كساء عليه صور رِحال الإبل. والرَّحْل: ما يوضع على ظهور الإبل للركوب عليه كالسَّرْج.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه المنقبة العظيمة لأصحاب الكساء، باصطفاء الله تعالى لهم وتطهيرهم.

الثانية: فيه إشارة إلى أن آل البيت في عُرْف الشرع لهم ثلاث إطلاقات:

الأول: أصحاب الكساء، ويدل عليهم هذا الخبر وأشباهه.

الثاني: أزواجه أمهات المؤمنين كما نصَّ عليه الكتاب العزيز. فإن الله تعالى ذكر نساءه ﷺ ثم ذكر قوله: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ ٱللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ ٱلرِّجْسَ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾، ثم قال: ﴿وَٱذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِى بُيُوتِكُنَّ مِنْ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ وَٱلْحِكْمَةِ﴾، وبيَّنت السنَّة دخول أصحاب الكساء مع أمهات المؤمنين، كما في هذا الخبر.

الثالث: من حُرِّمت عليهم الصدقة كما سيأتي في الحديث الخامس، فقد سمَّاهم النبي ﷺ أهل بيته.

الثالثة: قوله: «يريد الله»؛ هذا من الإرادة الشرعية، كأنه سبحانه وتعالى قال: إنما أَمَرَكم يا أهل البيت بشريعته المطهَّرة ليطهركم تطهيراً تامًّا خالصاً من الأرجاس والأنجاس.

الرابعة: فيه أن الرجل الصالح قد يكون سبباً في فضل الله تعالى وإنعامه على أهل بيته وذريته، فَكُنْهُ.

....

الخامسة: فيه أنه كلما زاد العبد في التذلل والتعبُّد والتألُّه وترك أرجاس المعاصي طهرت نفسه وكملت، والعكس كذلك.

السادسة: فيه التنبيه على استحباب الإحسان في الطهارة في البدن والثوب والمكان وغير ذلك.

السابعة: فيه الرد على من زعم أن الصحابة رضي الله عنهم يكتمون فضائل آل البيت؛ ففي هذا الحديث وسائر ما سنذكر في الأربعين نَقْلُهم فضائِلَهم رضي الله عنهم أجمعين، وهي غيض من فيض.

الثامنة: فيه جواز لبس السواد.

التاسعة: فيه جواز الاقتباس من الكتاب والسنَّة إذا كان الاستشهاد في موضعه اللائق

❑❑❑

الحديث الرابع

أخبرنا العلامة المعمر السيد عبد القادر بن عبد الله بن عبد القادر شرف الدين الصنعاني بقراءتي عليه بصنعاء، أخبرني والدي، أخبرني محمد بن محمد بن علي العَمْراني، حدثنا الوجيه الأهدل، أخبرنا والدي، أخبرنا أحمد بن محمد مقبول الأهدل، أخبرنا يحيى بن عمر الأهدل، أخبرنا أبو بكر بن علي البطاح، أخبرني يوسف بن محمد البطاح، أخبرنا الطاهر بن حسين الأهدل، أخبرني ابن الدَّيْبَع، أخبرنا الشَّرَجي، أخبرنا نفيس الدين سليمان بن إبراهيم العَلَوي، أخبرنا الموفق علي بن أبي بكر بن شدَّاد، أخبرنا أحمد بن أبي الخير بن منصور الشَّمَّاخي، أخبرنا والدي، أخبرنا أبو بكر بن أحمد بن محمد الشَّرَاحي، أخبرنا مكين الدين زاهر بن رستم بن أبي الرجاء الأصبهاني، أخبرنا أبو الفتح عبد الملك بن عبد الله الكروخي، أخبرنا أحمد بن عبد الصمد الغُوْرَجي، أخبرنا أبو محمد عبد الجبار بن محمد الجَرَّاحي، أخبرنا أبو العباس محمد بن أحمد المحبوبي، **أخبرنا الإمام أبو عيسى محمد بن عيسى السلمي الترمذي قال:**

حدثنا قتيبة، حدثنا حاتم بن إسماعيل عن بُكَير بن مسمار ـ هو مدني ثقة ـ عن عامر بن سعد بن أبي وقَّاص، عن أبيه قال:

لـمَّا أنزل الله هذه الآية ﴿نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ﴾ دعا رسول الله ﷺ عليًّا وفاطمة وحسناً وحسيناً فقال: «اللهمَّ هؤلاء أهلي».

هذا إسناد صحيح، رواه الترمذي وصحَّحه. ورواه مسلم عن قتيبة به مطوّلًا.

وبهذا الإسناد وغيره نروي جامع الترمذي من فاتحته إلى خاتمته عاليًا متصل السماع.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه التأكيد على فضل آل البيت رضي الله عنهم.

الثانية: فيه الإشارة إلى أن أصحاب الكساء هم أخص آل البيت.

الثالثة: فيه عِظَم محبته ﷺ لأصحاب الكساء، ويدل على ذلك مباهَلَتُه بهم.

الرابعة: فيه إشارة إلى أن على آل البيت الاعتزاز بجميع ما جاء به النبي ﷺ من الدين، والدعوة إليه، والصبر على الأذى فيه.

الخامسة: فيه دلالة على أن آل البيت يجب عليهم من تحقيق شريعته، وتحرير مِلَّته، وتنقيح سنَّته من تحريف الغالين، وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين، ما لا يجب على مَنْ سواهم، وهذا ـ والله أعلم ـ سرُّ مباهلته ﷺ بأخص آل بيته.

السادسة: فيه أن الأصل في الدعوة إلى الإسلام الدعوة بالحكمة والموعظة الحسنة، لكن إذا احتيج إلى المباهلة كان ذلك استثناءً، وذلك مع الكاذبين والمعاندين والظالمين.

السابعة: فيه أن آل البيت قد يحتاجون إلى القوة في ذات الله تعالى، وفي دينه ونصر شريعته، وإن كان أصل سَمْتِهم ودَلِّهم الحلم والأناة، والسكينة والوقار.

....

الثامنة: فيه أن آل البيت يجب عليهم بذل الجهد في تتبع الحق مِنْ أخلص طرقه وأصحها، حتى يثبت عندهم يقيناً صحة ما توصلوا إليه من الشرع المطهر، وهذا من لوازم فعل المباهلة، وإلَّا لم يباهل النبي ﷺ نصارى نجران، ولو فُرِض أنَّ مَنْ باهَلَهم كان معه الحق، ولم يكن مع آل البيت، لكان هذا من الفواجع، وقد حفظ الله أوَّلهم، فليتَّق الله آخرهم.

التاسعة: فيه أنه إذا احتيج إلى المباهلة فينبغي أن لا يباهل إلَّا مَنْ يكون مِنْ صالحي آل البيت، أو صالحي أكابر أهل العلم.

العاشرة: فيه أن الأصل في المباهلة أن تكون في الأمور العظام.

الحديث الخامس

أخبرنا الشيخ الصالح المعمر سالم بن علي السُّرْدُحي الشافعي قراءة عليه بالمُراوَعَة في تهامة، أخبرنا محمد بن عبد الرحمن بن عبد الباري الأهدل، أخبرنا جدي إجازةً عن الوجيه الأهدل، عن المرتضى الزبيدي، عن الشهاب أحمد بن شعبان بن عزَّام الزَّعبلي الشهير بالسابق، عن الشمس البابلي[1]، عن البرهان إبراهيم اللَّقَاني، عن الشمس الرملي، عن شيخ الإسلام زكريا الأنصاري، عن الحافظ ابن حجر قال: أخبرني العماد أبو بكر بن إبراهيم بن محمد بن قدامة المقدسي المعروف بالفرائضي، أنبأنا محمد بن أحمد بن أبي الهيجاء بن الزَّرَّاد، أخبرنا الحسن بن محمد البكري، أخبرنا أبو رَوْح عبد المُعِزّ بن محمد الهَرَوي، أخبرنا زاهر بن طاهر الشحَّامي، أخبرنا أبو المظفر سعيد بن منصور القُشيري، حدثنا أبو طاهر محمد بن الفضل بن محمد النيسابوري، حدثنا جدي الإمام أبو بكر محمد بن إسحاق بن خزيمة السُّلَمي النيسابوري قال:

---

(١) ذكرت في «الإمتاع بذكر بعض كتب السماع» رواية البابلي عن الرملي. والتحقيق أن بينهما واسطة، وهي جماعة، منهم: اللقاني، وسيف الدين الفَضَالي، وقد بسطهم المرتضى الزبيدي في «المربَّى الكابُلي» ص١٨٤، بتحقيق فضيلة الشيخ محمد بن ناصر العجمي حفظه الله تعالى.

حدثنا يوسف بن موسى، حدثنا جرير ومحمد بن فُضيل، عن أبي حيَّان التَّيْمي وهو يحيى بن سعيد التيمي الرَّبَاب، عن يزيد بن حيَّان قال:

«انطلقتُ أنا وحُصَين بن سَبْرَة وعُمَر بن مسلم إلى زيد بن أرقم فجلسنا إليه.

فقال له حصين: يا زيد، رأيتَ رسول الله ﷺ وصليتَ خلفه، وسمعتَ حديثه، وغزوتَ معه، لقد أصبتَ يا زيدُ خيراً كثيراً، حَدِّثنا يا زيد حديثاً سمعتَ رسول الله ﷺ وما شهدتَ معه.

قال: بَلَى، ابنَ أخي، لقد قَدُم عهدي، وكَبِرَتْ سِنِّي، ونسيتُ بعضَ الذي كنتُ أَعِيْ من رسول الله ﷺ، وما حدثتكموه فاقبلوه، وما لم أحدِّثْكموه فلا تكلِّفوني.

قال: قام فينا رسول الله ﷺ يوماً خطيباً بماءٍ يُدْعى «خُمّ» فحمد الله وأثنى عليه، ووعظ وذكَّر، ثم قال: «أما بعد، أيها الناس فإنما أنا بَشَرٌ، يوشك أن يأتيني رسول ربي فأجيبه، وإني تارك فيكم الثَّقَلَين؛ أولهما: كتابُ الله، فيه الهُدى والنور، من استمسك به وأخذ به كان على الهدى، ومَنْ تركه وأخطأه كان على الضلالة. وأهلُ بيتي: أذكركم الله في أهل بيتي، أذكركم الله في أهل بيتي، أذكركم الله في أهل بيتي».

قال حصين: فَمَنْ أهلُ بيته يا زيد؟ أليست نساؤه من أهل بيته؟

قال: بلى، نساؤه من أهل بيته، ولكن أهل بيته مَنْ حُرِمِ الصدقة.

قال: مَنْ هم؟

قال: آل علي وآل عَقِيل وآل جعفر وآل العباس.

قال حصين: وكل هؤلاء حُرِم الصدقة؟

قال: نعم».

هذا إسناد صحيح، وقع لنا هكذا عالياً في الصحيح لابن خزيمة. ورواه مسلم عن جرير ومحمد بن فضيل به نحوه.

وبهذا الإسناد وغيره نروي الصحيح لابن خزيمة سماعاً من أوله إلى آخر الموجود منه.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه دخول نساء النبي ﷺ أمهات المؤمنين في آل بيته، لكن على وجه التبع لا الأصالة، فإنَّ آلَ كلِّ أحدٍ أصلُه وعَصَبَتُه، وهذا معنى قول زيد: «بَلى... ولكن...»، ولذا فإن الآل حُرموا الصدقة ومواليهم، وأما نساؤه فَحُرِمْنَ الصدقة لا مواليهن، كما دلَّ على هذا حديث بَريرة مولاة عائشة في الصحيحين: «هو لها صدقة ولنا هدية».

الثانية: قَرْنه ﷺ الوصية بآل البيت بالوصية بكتاب الله تعالى دالٌّ على أنهم في أشرف المنازل.

الثالثة: تكرار وصية النبي ﷺ بآل بيته ثلاثاً تأكيدٌ على إخلاص المحبة لهم، والحدب عليهم، ولئلا يكون لأحدٍ العذرُ في التخلف عن ذلك.

الرابعة: وفي تكراره ﷺ إشارة إلى الصبر عليهم، واحتمال الأذى منهم لو وقع.

....

الخامسة: فيه بشارة لأهل السنَّة والجماعة حيث قبلوا وصية رسول الله ﷺ وتمسَّكوا بالعمل بكتاب الله تعالى، وتعظيم آل البيت وإكرامهم، والاحتفاء بفقههم وسِيَرهم، خلافاً لمن رفع دعوى العمل بكتاب الله تعالى وكفَّر المسلمين وقَتَلهم، أو زَعَمَ محبَّة آل البيت فافترى عليهم، وغيَّر دينهم، وعاداهم بتبديل اعتقادهم وعملهم وهديهم.

السادسة: فيه عَلَمٌ من أعلام النبوة، إذ حثَّ ﷺ على الثقلين، الكتابِ ــ والسنَّةُ تَبَعٌ له ــ، وأهلِ بيته، وأنَّ مَنْ أخطأهما ضَلَّ، فكان كما أَخْبَر.

السابعة: استحباب إظهار فضائل آل البيت وإشهارها، ولا سيما في الخطبة وأشباهها.

الثامنة: فيه التنبيه على عدم الغلو في آل البيت، فإن النبي ﷺ أشار إلى ذلك بقوله: «إنما أنا بشر»، وإذا كان هذا في الأصل ففي الفرع أولى.

التاسعة: فيه التصريح بدخول سائر بني هاشم في مسمى «الآل»، وقول زيدٍ هذا له حكم الرفع، ويؤكد هذا عدة أخبار[1] كقوله ﷺ الآتي: «أما شعرتَ أنَّا أهلُ بيتٍ لا نأكل الصدقة؟!»[2]

العاشرة: فيه التصريح بتحريم الصدقة على بني هاشم. وقول زيد لا يقال مثله بالرأي، والأحاديث في هذا معلومة معروفة، وسيأتي شيء منها بعدُ.

الحادية عشر: فيه استحباب الوعظ في السفر إذا وُجد المقتضي لذلك، وإلَّا فالأصل في السفر التخفف من ذلك وغيره

---

(١) كالحديث الواحد والثلاثين

(٢) الحديث الخامس عشر.

الحديث السادس

أخبرنا الشيخ الصالح الشريف عبد الرحمن بن عبد الحي بن عبد الكبير الكتاني الفاسي المالكي قراءة عليه بفاس، أخبرنا والدي، أخبرنا والدي عبد الكبير، أخبرنا علي بن ظاهر الوِتْري، أخبرنا عبد الغني بن أبي سعيد الدِّهْلوي، عن عابد السندي، عن صالح بن محمد الفُلَّاني، أخبرني محمد بن سِنَّة الفُلَّاني، عن محمد بن عبد الله الولاتي، عن محمد بن أركماش الحنفي، عن الحافظ ابن حجر قال: أخبرني أبو علي محمد بن أحمد الفاضلي المعروف بابن المُطَرِّز، أخبرنا يوسف بن عمر الخُتَني، أخبرنا الحافظ أبو محمد عبد العظيم بن عبد القوي المنذري، أخبرنا أبو حفص عمر بن محمد بن طَبَرْزَد، أخبرنا إبراهيم بن محمد الكَرْخي، أخبرنا الحافظ أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي، أخبرنا أبو عمر القاسم بن جعفر الهاشمي، أخبرنا أبو علي محمد بن أحمد اللؤلؤي، أخبرنا الإمام أبو داود سليمان بن الأشعث الأزدي السجستاني قال:

حدثنا موسى بن إسماعيل، حدثنا حِبَّان بن يَسَار الكِلابي، حدثنا أبو مُطَرِّف عبيد الله بن طلحة بن عبيد الله بن كَرِيْز، حدثني محمد بن علي الهاشمي، عن المُجْمِر، عن أبي هريرة، عن النبي ﷺ قال:

«مَنْ سَرَّه أن يكتال بالمكيال الأوفى إذا صلَّى علينا أهل البيت فليقل: اللهمَّ صَلِّ على محمد النبي وأزواجِهِ أمهاتِ المؤمنين وذرِّيته وأهلِ بيته كما صلَّيت على آل إبراهيم إنَّك حميد مجيد».

هذا حديث حسن، رواه أبو داود، وله شواهد، منها: عند عبد الرزاق وأحمد: عن رجل من أصحاب النبي ﷺ، وزاد: «وبارك على محمد وعلى أهل بيته وأزواجه وذرِّيته...»، وعند أحمد: عن أبي طلحة القاص. وأصله في الصحيحين عن أبي حميد الساعدي.

*** فيه مسائل:**

الأولى: هذا الخبر من أجمع الأخبار في ذِكْر آل بيت النبوة.

الثانية: قال ابن القيم في «جِلاء الأفهام»: «...فجمع بين الأزواج والذرية والأهل، وإنما نصَّ عليهم بتعيينهم ليبيِّن أنهم حقيقون بالدخول في الآل، وأنهم ليسوا بخارجين منه، بل هم أحق من دَخَل فيه، وهذا كنظائره من عطف الخاص على العام وعكسه، تنبيهاً على شَرَفه، وتخصيصاً له بالذكر من بين النوع، لأنه من أحق أفراد النوع... اهـ.

الثالثة: فيه خصيصة لآل البيت في هذه الأمة، حيث خُصُّوا من بين سائر الناس بالصلاة عليهم في سائر الصلوات، وهو فرض في أصح قولي العلماء، كما ذهب إليه الإمامان الشافعي وأحمد وغيرهما.

الرابعة: فيه دليل على عظم حرمة أزواجه وذريته مِنْ بعده، فإنه ﷺ جعل أكمل الصلاة على آل البيت، وأوفاها الصلاة على جميع من ذُكِر، وهذا تشريع عام للأمة حتى يرث الله الأرض ومن عليها.

الخامسة: فيه أستحباب إدخال السرور على آل البيت، والمَسَرَّة بما يسرُّهم.

السادسة: قال العلَّامة الشوكاني في «النيل»: فيه دليل على أن هذه الصلاة أعظم أجراً من غيرها، وأوفرها ثواباً. اهـ.

....

السابعة: قوله: «المكيال الأوفى»؛ ردٌّ على من اخترع صلواتٍ على آل البيت وزعم أنَّها أفضل الصلوات، لأن ذلك من التقدُّم بين يدي الله ورسوله ﷺ.

الثامنة: قوله: «الأوفى»؛ فيه دليل على أن صِيَغ الصلاة على النبي ﷺ وآله يفضل بعضها بعضاً.

التاسعة: فيه جواز إفراد الواحد من الآل بالصلاة، لكن هل يكون هذا شعاراً لهم؟ فيه مناقشة، والأظهر عدمه، لأنه لم يكن في الصدر الأول ولا القرون المفضلة، حتى قال الإمام مالك: «لم يكن ذلك مِنْ عَمَل مَنْ مَضَى».

العاشرة: فيه استحباب المبالغة في مكافأة آل البيت إذا صنعوا إلينا معروفاً، ولا سيما إن كان دينيًّا.

الحادية عشر: إن قيل: لِمَ فَصَّل في ذكر آل محمد، فَذَكَرَ نفسه وأزواجه وذريته وسائر آل بيته؟

فقل: لِشَرَف محمدٍ على إبراهيم، وشرف آل محمد على آل إبراهيم.

فإن قيل: هذا مُعْتَرَض بالتشبيه، فإنه شبَّه آل محمد بآل إبراهيم، والمُشَبَّه به أقوى من المُشَبَّه.

فقل: على فرض تسليم هذا الإطلاق يقال: محمد من آل إبراهيم كما قال ابن عباس، فَدَخَلَ ﷺ في المشبَّه به عموماً، ثم انفرد بالمشبَّه خصوصاً، فصار له على ذلك أوفر الصلاة، وآل بيته تَبَعٌ له في ذلك.

فإن قيل: فلم شَبَّه بآل إبراهيم؟

فقل: لفضلهم واشتهارهم بذلك في العالمين.

الثانية عشر: قوله: «أهلَ البيت... أزواجه أمهات المؤمنين وذرِّيته وأهل بيته»، فيه التنبيه على لفظ «الآل» المطلق؛ ففيه الرد على من قال إن النصوص الواردة في فضل آل البيت يُراد بها أتباع مِلَّته كلهم، واحتجَّ بالحديث المشهور

....

لمَّا سئل النبي ﷺ: مَنْ آل محمد؟ قال: «**كل مؤمن تقي**». أمَّا هذا الحديث فرواه العقيلي وهو منكر، بل كذبٌ لا أصل له كما قال شيخ الإسلام ابن تيمية، ويلزم عليه أنْ لا معنى لقوله ﷺ: «**أذكركم الله في أهل بيتي**»، ولا لقوله للحسن: «**أما شَعَرْتَ أنَّا أهل بيت لا نأكل الصدقة**»، وكذلك قد ذبح كبشين أحدهما عن أمة محمد والآخر عن محمد وآل محمد.

قال البيهقي في «الشُّعَب»: وفي هذا دلالة على أن اسم الآل للقرابة الخاصة لا لعامة المؤمنين. اهـ.

وأما مطلق لفظ «الآل» فقد يطلق على الصحابة والأمَّة، كحديث واثلة لما قال النبي ﷺ: «هؤلاء أهلي». قال: قلت: يا رسول الله وأنا من أهلك؟ قال: «أنت من أهلي». قال واثلة: إنها لمن أرجى ما أرجو. وكذا ما رواه البيهقي وأبو الشيخ في طبقات المحدثين بسندٍ صحيح عن جابر بن عبد الله قال: «آل محمد ﷺ أمَّته» فَفَرْقٌ بين لفظ «الآل» المطلق، ومطلق اللفظ. ولهذا نظائر كثيرة في نصوص الكتاب والسنَّة.

الثالثة عشر: قوله: «وبارك على محمد وأهل بيته...»، فيه بشارة بأن آل البيت سيكثرون، لأن البركة هي النماء والزيادة كما قال الخليل بن أحمد.

الرابعة عشر: قوله «وبارك...» أيضاً؛ فيه أن آل البيت فيهم من البركة والخير والفضائل في الجملة ما ليس في آل بيت من بيوتات العالمين، وقد ظهر بسببهم من بركات الدنيا والآخرة، ومن دينه وإعلاء كلمته ما لم يظهر على يَدَي أهل بيت غيرهم. فصلَّى الله على سيد الأولين والآخرين، وعلى آل بيته الطيبين الطاهرين، وسلم تسليماً مزيداً إلى يوم الدين.

الحديث السابع

أخبرنا العلامة القاضي السيد زيد بن علي بن أحمد السُّدمي بقراءتي عليه بالروضة قرب صنعاء، أخبرنا والدي، أخبرنا محمد بن محمد بن علي العَمْراني، أخبرني والدي، أخبرنا أحمد بن محمد قاطِن الصنعاني، أخبرنا يحيى بن عمر مقبول الأهدل، أخبرنا أبو بكر البطَّاح، أخبرنا يوسف بن محمد البطاح، أخبرنا الطاهر بن حسين الأهدل، أخبرنا الحافظ ابن الدَّيْبَع، أخبرنا الحافظ محمد بن عبد الرحمن السخاوي، أخبرنا الحافظ ابن حجر، أخبرنا البرهان أبو إسحاق إبراهيم بن أحمد التَّنُوخي، أخبرنا المسند المعمر أبو العباس أحمد بن أبي طالب الحجَّار، أخبرنا الحسين بن المبارك الزَّبيدي، أخبرنا أبو الوقت عبد الأول بن عيسى السِّجْزي، أخبرنا أبو الحسن عبد الرحمن بن محمد الداوُدي، أخبرنا عبد الله بن محمد بن حَمُّوَيه السَّرَخْسي، أخبرنا محمد بن يوسف الفِرَبْري، **أخبرنا الإمام أبو عبد الله محمد بن إسماعيل البخاري الجُعْفي مولاهم قال:**

حدثنا سعيد بن محمد الجَرْمي، حدثنا يعقوب بن إبراهيم، حدثنا أبي: أن الوليد بن كثير حدَّثه، عن محمد بن عمرو بن حَلْحَلَة الدُّؤَلي حدَّثه: أن ابن شهاب حدَّثه:

أن علي بن حسين حدَّثه: أنهم حين قدموا المدينة مِنْ عند يزيد بن معاوية مَقْتَلَ حسين بن عليّ رحمة الله عليه، لَقِيَه المِسْوَر بن مَخْرَمة فقال له: هل لك إليَّ من حاجة تأمرني بها؟ فقلت: لا. فقال له: فهل أنتَ مُعْطِيَّ سيفَ رسول الله ﷺ فإنِّي أخاف أن يَغلِبَك القوم عليه، وايْم الله لئن أعطيتنيه لا يُخْلَص إليه أبداً حتى تُبْلَغ نفسي، إن علي بن أبي طالب خطب ابنة أبي جهل على فاطمة عليها السلام فسمعتُ رسول الله ﷺ يخطب الناس في ذلك على مِنْبَره هذا وأنا يومئذٍ محتلم فقال:

«إنَّ فاطمة مِنِّي، وأنا أتخوَّف أن تُفْتَن في دينها، ثم ذكر صِهْراً له من بني عبد شمس فأثنى عليه في مصاهرته إيَّاه. قال: حَدَّثني فَصَدقني، ووعدني فَوَفى لي، وإني لستُ أُحَرِّمُ حلالاً ولا أُحِلُّ حراماً، ولكن والله لا تجتمع بنتُ رسول الله ﷺ وبنتُ عدوّ الله أبداً».

هكذا وقع لنا في الصحيح. وبهذا الإسناد وغيره نروي الصحيح عالياً جدًّا مسلسلاً بالسماع من فاتحته إلى خاتمته.

ورواه مسلم فقال: حدثني أحمد بن حنبل، أخبرنا يعقوب به مثله. وفي لفظٍ له: «فاطمةُ بَضْعَة منِّي يؤذيني ما آذاها».

*** فيه مسائل:**

الأولى: تعظيم قدر النبي ﷺ في قلوب أصحابه رضي الله عنهم.

الثانية: فضل السيدة الطاهرة فاطمة رضي الله عنها، حيث أخبر ﷺ أنها «بَضْعة»، أي: قطعة منه.

....

الثالثة: قوله: «فاطمة مني»، فيه دليل على أن من سبَّها أو تنقَّصها فقد آذى رسول الله ﷺ.

الرابعة: فيه أن الآل لا ينبغي لهم أن يُصاهروا مَنْ حَوْلَه القيل والقال، لئلا يتطرَّق إلى البيت الطاهر ما يُدَنِّسه.

الخامسة: فيه إشارة إلى أنَّ من آذى أهل البيت في أعراضهم فقد آذى رسول الله ﷺ، ولذا قال في الحديث الثامن والثلاثين: «**إلَّا أدخله الله النار**».

السادسة: فيه منقبة لأبي العاص بن الربيع زوج ابنة رسول الله ﷺ زينب بِثَنائه عليه.

السابعة: فيه عِظَم قدر مَنْ صاهر آل البيت فأحسن مصاهرتهم وَوَفَى لهم.

الثامنة: **إن قيل**: إذا كان هذا الحَدَث أمراً خاصًّا بآل البيت فلم خَطَب به ﷺ على المنبر؟

والجواب: ما ثبت في روايةٍ عند الشيخين أن فاطمة قالت له: «إنَّ قومَك يتحدثون أنك لا تغضب لبناتك» فأراد ﷺ إزالة هذا التوهُّم.

التاسعة: قوله: «فاطمة مني»، فيه دلالة كما قال الإمام الشافعي على أن شهادة الوالد لولده لا تجوز لأنه منه.

العاشرة: قوله: «حتى تُبْلَغ نفسي»، فيه تعظيم الصحابة لِتَرِكَة النبي ﷺ وآثاره. وَبَوَّب عليه البخاري فقال: «باب ما ذُكِر مِنْ دِرْع النبي ﷺ وعصاه وسيفه وقَدَحه وخاتمه، وما استعمل الخلفاء من ذلك مما لم يُذْكَر قِسْمَتُه، ومن شَعَره ونَعْله وآنيته مما يتبرك أصحابه وغيرهم بعد وفاته».

الحادية عشر: قوله: «أنا أتخوَّف»، فيه دلالة على أنه يُطْلَب مِنْ آل البيت ما لا يُطلب من غيرهم من الاحتياط والصيانة لأمر الدين، ولذا قال الله تعالى: ﴿يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِيِّ لَسۡتُنَّ كَأَحَدٖ مِّنَ ٱلنِّسَآءِ . . .﴾ الآية.

....

الثانية عشر: قال الإمام ابن القيم في الهدي: . . . وفي مَنْع عليٍّ من الجمع بين فاطمة رضي الله عنها وبين بنت أبي جهلٍ حكمةٌ بديعة، وهي أن المرأة مع زوجها في درجته تَبَعٌ له، فإن كانت في نفسها ذات درجة عالية وزوجها كذلك كانت في درجة عالية بنفسها وبزوجها، وهذا شأن فاطمة وعليّ رضي الله عنهما، ولم يكن الله عزَّ وجلّ ليجعل ابنة أبي جهل مع فاطمة رضي الله عنها في درجة واحدة، لا بنفسها ولا تبعاً، وبينهما من الفرق ما بينهما، فلم يكن نكاحها على سيدة نساء العالمين مستحسناً، لا شرعاً ولا قَدَراً، وقد أشار ﷺ إلى هذا بقوله: **«والله لا تجتمع بنت رسول وبنت عدو الله في مكانٍ واحدٍ أبداً»**. اهـ.

❑❑❑

الحديث الثامن

أخبرنى العلَّامة الصالح واصِف بن رِضَى الخطيب الشافعي قراءةً عليه بالجَبَل قرب بيروت، أخبرنا بدر الدين الحَسَني قراءةً عليه بالجامع الأموي بدمشق، عن البرهان إبراهيم السَّقَّا، عن محمد الأمير الصغير، عن والده محمد بن محمد الشهير بالأمير الكبير، أخبرنا علي بن أحمد الصعيدي، عن الشمس محمد بن أحمد بن عَقِيْلَة، عن الحسن العجيمي، أخبرنا الشمس البابلي عن سالم بن محمد السَّنْهوري، أخبرنا النجم الغيطي، أخبرنا شيخ الإسلام زكريا الأنصاري، أخبرني أبو إسحاق إبراهيم بن صدقة الحرَّاني الحنبلي، أخبرنا عبد الرحيم بن عبد الوهاب الحَمَوي، أخبرنا أبو العباس الحجَّار، أخبرنا الزَّبيدي، أخبرنا أبو الوقت السجزي، أخبرنا أبو الحسن الداوُدي، أخبرنا ابن حَمُّوَيه، **أخبرنا الفربري، أخبرنا الإمام أبو عبد الله محمد بن إسماعيل البخاري قال:**

حدثني موسى عن أبي عَوَانة، حدثنا فِراس عن عامر، عن مسروق، حدثتني عائشة أم المؤمنين قالت:

إنَّا كنَّا أزواجَ النبي ﷺ عنده جميعاً لم تُغادر منَّا واحدة، فأقبلت فاطمة عليها السلام تمشي، لا والله ما تخفى مِشْيَتها من مِشْيَة

رسول الله ﷺ، فلما رآها رحَّب، قال: «**مرحباً بابنتي**»، ثم أجلسها عن يمينه أو عن شماله، ثم سارَّها فبكت بكاءً شديداً، فلما رأى حزنها سارَّها الثانية فإذا هي تضحك. فقلت لها أنا مِنْ بين نسائه: خَصَّكِ رسول الله ﷺ بالسِّرِّ مِنْ بيننا ثم أنتِ تبكين!!

فلما قام رسول الله ﷺ سألتُها: عمَّا سارَّكِ؟ قالت: ما كنتُ لأفشي على رسول الله ﷺ سِرَّه. فلمَّا توفي قلتُ لها: عَزَمْتُ عليك بما لي عليكِ من الحق لَمَّا أَخْبَرْتِنِي. قالت: أمَّا الآن فنعم.

فأخبرتني، قالت: أمَّا حين سارَّني في الأمر الأول، فإنه أخبرني: «**أن جبريل كان يعارضه بالقرآن كلَّ سنةٍ مَرَّةً، وإنه قد عارضني به العامَ مرتين، ولا أُرى الأجلَ إلا قد اقترب، فاتقي الله واصبري، فإنِّي نِعْمَ السَّلَفُ أنا لَكِ**». قالت: فبكيتُ بكائي الذي رأيتِ، فلما رأى جَزَعي سارَّني الثانية، قال: «**يا فاطمة ألا ترضين أن تكوني سيِّدة نساء المؤمنين، أو سيِّدة نساء هذه الأُمَّة**».

رواه البخاري. ورواه مسلم عن أبي عَوَانة مثله.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فضل البضعة النبوية رضي الله عنها على نساء العالمين.

الثانية: عِظَم صبرها؛ فإن ما رُزِئت به أعظم مصاب، وهو وفاته ﷺ.

الثالثة: عظم أجرها؛ فإنه ﷺ قد مات سائر أولاده في حياته فكانوا في صحيفة أعماله، ومات هو في حياتها فكان في صحيفتها، ولذا جوزيت ـ والله أعلم ـ بهذه المنقبة المذكورة في الحديث، وقد جاء التصريح بمعنى ذلك في رواية الطبري لكنها ضعيفة.

....

الرابعة: فيه إيثار سادات آل البيت الآخرة على الدنيا.

الخامسة: قوله: «سيدة نساء هذه الأمة»، فيه دليل لمن فضَّل فاطمة على أُمَّيْها خديجة وعائشة رضي الله عنهن.

السادسة: فيه أن من الأدب مع آل البيت المبادرة إليهم بالسلام؛ لقوله: «فلمَّا رآها رَحَّب...».

السابعة: فيه أن آل البيت لهم مزيد في التحية والاستقبال.

الثامنة: قوله: «ثم أجلسها عن يمينه...»، فيه أن آل البيت ينبغى أن يُصَدَّروا في المجالس.

التاسعة: فيه أن آل البيت لا ينبغي لهم أن يُخْلُوا رمضان من ختمتين للقرآن.

العاشرة: فيه أن إفشاء سِرّ المُسِرّ بعد موته جائز بشرط أن لا يترتب عليه مفسدة.

الحادية عشر: قال الحافظ السيوطي في «الشمائل»: كان كثيراً ما يُقَبِّل عُرْف ابنته فاطمة الزهراء، وكان كثيراً ما يُقَبِّلها في فَمِها أيضاً، زاد أبو داود بسند ضعيف «ويَمَصُّ لسانها» اهـ.

وتابعه المناوي في «فيض القدير»!!

وهذا وَهْمٌ منهما رحمهما الله، فلم يُقَبِّل ﷺ ابنته في فمها ولا مَصَّ لسانها قَطّ، وحاشاه، ولا أصل لذلك، وإنما ورد هذا في حق عائشة.

وَوَرَد في حديث الباب عند الترمذي وحسَّنه أنه ﷺ «قَبَّل ابنته»، لكن بين عينيها على عادة العرب.

وقوله هنا: «فلما... ثم أجلسها...»، فيه إشارة إلى بطلان ما ذُكِر ولا سيما أن هذا كان قبيل وفاته ﷺ.

....

الثانية عشر: قوله: «ألا ترضين»، كالصريح في أن أعظم منقبة أن تكون ابنته الطاهرة سيدة نساء العالمين، فما فوق ذلك مَفْخَر، إذ هو من آثار محبة الله لها ورضاه، فلا حاجة إلى الكذب لها بفضائل هي افتراء على الله تعالى ورسوله ﷺ، وقد قال سبحانه: ﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ ٱفْتَرَىٰ عَلَى ٱللَّهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ ٱلنَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ﴾.

الثالثة عشر: قوله: «سيدة نساء هذه الأمة»، فيه دليل على نكارة ما رواه الطحاوي عن قول النبي ﷺ في بنته زينب «هي أفضل».

الرابعة عشر: قوله: «سيدة نساء المؤمنين»، جاء في رواية هنا، وفي غيره: «إلَّا مريم بنت عمران»، ولا يلزم من الاستثناء التفضيل، فإن قواعد العربية لا تقتضيه، فقد يكون للتساوي، وقد يكون لتفضيل المستثنى على المستثنى منه، والعكس، لكن بقرينة متَّصلة أو منفصلة.

وأمَّا قوله تعالى: ﴿وَإِذْ قَالَتِ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ يَـٰمَرْيَمُ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰكِ وَطَهَّرَكِ وَٱصْطَفَىٰكِ عَلَىٰ نِسَآءِ ٱلْعَـٰلَمِينَ﴾، فقد بينت السنَّة أن «ال» للعهد لا الجنس، والمراد نساء زمانها كما في الصحيحين: «خير نسائها مريم، وخير نسائها خديجة».

وأما ما رواه ابن عساكر عن ابن عباس مرفوعاً: «سيدة نساء أهل الجنة مريم بنت عمران ثم فاطمة»؛ فإسناده واهٍ، وآفته محمد بن الحسن بن زَبَالة، وهو متهم بالكذب.

الخامسة عشر: قوله لها: «فاتقي الله واصبري»، فيه دليل على أن الواحد من آل البيت ربما احتيج إلى تذكيره بالله تعالى، ولا ينقص ذلك من قدره.

السادسة عشر: قوله: «تكوني سيدة»، فيه جواز إطلاق لفظ السيدة على فاطمة رضي الله عنها.

❑❑❑

الحديث التاسع

أخبرنا الشيخ الصالح القاضي عبد الرحمن بن محمد بن فارس النجدي الحنبلي قراءة عليه بالرياض، أخبرني الشيخ حمد بن فارس قراءة عليه، أخبرنا الشيخ عبد الرحمن بن حسن بن الإمام المجدد محمد بن عبد الوهاب، أخبرنا جدي، أخبرنا محمد حياة السندي، عن الحسن العجيمي بإسناده[1] **إلى الإمام البخاري قال:**

حدثنا أبو اليمان، أخبرنا شعيب عن الزهري، أخبرني سعيد بن المسيب وأبو سلمة بن عبد الرحمن أن أبا هريرة رضي الله عنه قال:

قام رسول الله ﷺ حين أنزل الله عزَّ وجلّ: ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ ٱلْأَقْرَبِينَ﴾، قال: «**يا معشر قريش ـ أو كلمة نحوها ـ، اشتروا أنفسكم؛ لا أغني عنكم من الله شيئاً، يا بني عبد مناف لا أغني عنكم من الله شيئاً، يا عباسُ بنَ عبد المطلب لا أغني عنك من الله شيئاً، ويا صفيةُ عَمَّةَ رسول الله ﷺ لا أغني عنكِ من الله شيئاً، ويا فاطمةُ بنتَ محمدٍ سليني ما شئتِ من مالي لا أغني عنكِ من الله شيئاً**».

رواه البخاري. ورواه مسلم عن يونس عن الزهري به مثله.

---

(١) في الحديث الثامن.

وفي لفظٍ لهما عن ابن عباس «قال أبو لَهَب: تَبًّا لك، ألهذا جمعتنا؟! فنزلت: ﴿تَبَّتۡ يَدَآ أَبِي لَهَبٖ وَتَبَّ﴾ إلى آخرها.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه فضيلة فاطمة رضي الله عنها، حيث خصَّها ﷺ بالذكر في أول مقام للدعوة في تاريخ الإسلام.

الثانية: فيه فضيلة صفية عمة رسول الله ﷺ كذلك.

الثالثة: فيه فضيلة العباس عم رسول الله ﷺ كذلك.

الرابعة: فيه فضيلة بني عبد مناف كذلك.

الخامسة: فيه فضيلة قريش كذلك.

السادسة: فيه التحذير لآل البيت من الاتكاء على انتسابهم إليه ﷺ، فإذا كان قد حَذَّر سادات آل البيت رضي الله عنهم كفاطمة والعباس وصفية، فغيرهم بالتحذير أولى.

السابعة: فيه حثّ آل البيت على القيام بأمر الدين، ولا سيما رأسه وهو التوحيد، لأن الإنذار حاصل به، فإذا كان بعض سادة آله ﷺ كفاطمة والعباس وصفية خالفوا المُنْذَر به وهو التوحيد ـ وحاشاهم ـ فقد صرَّح بأنه لن يغني عنهم من الله شيئاً، وصار مآلهم كأبي لهب.

الثامنة: مِنْ حِكَم تَعداده ﷺ لبعض كبار آل بيته: التنبيه بالأعلى على غيره ـ وكلهم عالٍ ـ في أن لا يأتي الناس بالدِّين، ويأتي آله بالدنيا يحملونها على رؤوسهم، فهذا من أقبح القبيح.

التاسعة: فيه كمال شفقته ﷺ ونصحه لآل بيته وأمته في تحذيرهم من الشرك.

العاشرة: فيه أن الشفاعة لا تنفع مع الشرك، ولو كان الشافع سيد المرسلين والمشفوع له سيدة نساء العالمين، ولذا قال أولاً: «اشتروا أنفسكم»، وقال آخراً لفاطمة وهي قطعة منه: «لا أغني عنك...».

....

الحادية عشر: إن قيل: فما الجمع بين هذا الخبر وقوله ﷺ: «**كل سبب ونسب منقطع يوم القيامة غير سببي ونسبي**»؟

فالجواب: أنه سيأتي البحث فيه في الحديث الثلاثين.

الثانية عشر: قوله: «اشتروا أنفسكم»، فيه دلالة على أن الأصل في آل البيت طلب الآخرة لا طلب الدنيا.

الثالثة عشر: قوله: «لا أغني عنكِ من الله شيئاً»، فيه عظم التوحيد في قلب سيد الأولين والآخرين، حيث عَلَّق البضعة النبوية بالرب جلَّ وعلا، فَمَنْ دون سيدة نساء العالمين من الآل أولى، ومَنْ دونَها ودونهم أولى وأولى.

الرابعة عشر: قوله: «لا أغني...»، فيه التصريح بأن الذي بيده الأمر كله هو الله تبارك وتعالى، فإذا نفى ﷺ أن يكون له أدنى شيء مع الله تعالى فلا شك أن غيره من سادات الأولياء أولى. وإزالة هذا التوهم له نظائر كثيرة في الكتاب والسنَّة، ومن ذلك ما رويناه في الصحيحين عن أبي هريرة أن النبي ﷺ قال: «**لن ينجيَ أحداً منكم عَمَلُه**»، قالوا: ولا أنت يا رسول الله؟ قال: «**ولا أنا إلَّا أن يتغمدني الله برحمةٍ...**».

❑ ❑ ❑

الحديث العاشر

أخبرني السيد الصالح محمد طاهر ـ ثلاثاً ـ بن عبد الرحمن بن محمد بن عبد الباري الأهدل الشافعي قراءةً عليه قُرْبَ الحُدَيْدَة، أخبرنا جدي إجازةً، أخبرنا محمد بن أحمد بن عبد الباري الأهدل، أخبرنا الحسن بن عبد الباري الأهدل، أخبرنا الوجيه الأهدل، أخبرنا والدي، أخبرنا أحمد بن محمد مقبول الأهدل، أخبرني يحيى بن عمر مقبول الأهدل بإسناده[1] **إلى الإمام البخاري قال:**

حدثنا مسدد، حدثنا يحيى، عن شعبة، عن الحكم، عن مصعب ابن سعد، عن أبيه: أنَّ رسول الله ﷺ خرج إلى تبوك، واستخلف عليًّا، فقال: أَتُخَلِّفُني في الصبيان والنساء؟ قال: «**ألا ترضى أن تكون مني بمنزلة هارون من موسى، إلَّا أنه لا نبيَّ بعدي**».

رواه البخاري. ورواه مسلم عن شعبة به مثله.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه عظم منزلة أمير المؤمنين عليّ رضي الله عنه، حيث شَبَّهه ﷺ بهارون عليه السلام إلَّا في النبوة.

---

(١) في الحديث السابع.

....

الثانية: أن آل البيت قد يَقْرُب بعضهم من منازل أشرف الأنبياء إلَّا في النبوة.

الثالثة: أن النبوة لا تُكْتَسب، بل هي متعلِّقة بأفعال الرب جلَّ وعلا ومشيئته واختياره، فلا يقول قائل ولا يَتَمَنَّى مُتَمَنٍّ.

الرابعة: فيه أن آل البيت لا ينبغي لهم أن يَتَمَنَّعُوا من العمل الصالح وإن قلَّ.

الخامسة: فيه استحباب الاقتداء بأمير المؤمنين رضي الله عنه في هديه وَدَلِّه وسمته، لأنه مقتضى التشبيه به ﷺ، وقد أكَّد ذلك عدَّة أخبار، منها قوله ﷺ - في الحديث الصحيح -: «**عليكم بسنَّتي وسنَّة الخلفاء الراشدين...**» الحديث.

السادسة: فيه دليل على عدم عصمة أمير المؤمنين رضي الله عنه، كما دلَّ عليه قوله: «تكون... لا نبي بعدي».

السابعة: فيه عِظَم همة عليّ رضي الله عنه في إيثاره الجهاد وبذل النفس في سبيل الله على القعود عنه، حتى صَحَّ في عدة روايات أنه بَكَى، ولا يبكي في هذه المواطن إلَّا من هانت عليه نفسه في ذات الله تبارك وتعالى.

الثامنة: فيه استحباب استخلاف الإمام عند سفره رجلاً من صالحي آل البيت.

التاسعة: فيه أن تَخَلُّف الرجل الصالح عن الجهاد في سبيل الله إذا كان لحاجة لا يُنقص منزلته ومقامه.

العاشرة: قوله: «بمنزلة هارون من موسى»، استُدِلَّ به على أن الخليفة بعد النبي ﷺ هو عليٌّ رضي الله عنه. **وفيه نظر**، لأنه قال ذلك له مستخلفاً على المدينة في غزوة تبوك. ويقوِّيه أن المشبَّه به وهو هارون لم يكن خليفة بعد موسى عليهما السلام، بل توفي في حياة موسى كما هو معلوم عند المسلمين وأهل الكتاب. فَدَلَّ على أنه أراد عظم المقام والاستخلاف في إمارة المدينة، لا الاستخلاف بعده، والخلافة الجزئية لا تستلزم الخلافة الكلِّيَّة، وإلَّا لزم ذلك

....

في غيره رضي الله عنه، فقد استخلف جماعة على المدينة، ولم يَدَّعِ أحدٌ فيهم الخلافة بعد النبي ﷺ.

الحادية عشر: فيه دفاع الصحابة عن سادات آل البيت رضي الله عنهم، وذلك أن النواصب لمَّا أبغضوا أمير المؤمنين عليًّا رضي الله عنه قام الصحابة بنشر فضائله، ومن ذلك خالُ رسول الله ﷺ سَعْدٌ رضي الله عنه، فإنه قال هذه المنقبة وغيرها زَمَنَ الاختلاف على أمير المؤمنين رضي الله عنه.

قال الحافظ في الفتح: قال أحمد وإسماعيل القاضي والنسائي وأبو علي النيسابوري: «لم يَرِد في حقِّ أحدٍ من الصحابة بالأسانيد الجياد أكثر مما جاء في عليّ»، وكأن السبب في ذلك أنه تأخَّر ووقع الاختلاف في زمانه، وخروج مَن خرج عليه، فكان ذلك سبباً لانتشار مناقبه مِنْ كثرة مَنْ كان بَيَّنها من الصحابة ردًّا على من خالفه... اهـ.

الثانية عشر: فيه أن على أهل العلم والحكمة والصلاح زَمَن الفتنة أن ينشروا فضائل ولي الأمر، وسوابق أياديه على الناس، وأن يُحَبِّبوا الناس فيه، ويعطفوا قلوب الخلق عليه، جمعاً للكلمة، وصيانة للأمة مِنْ أن يُفني بعضها بعضاً.

الثالثة عشر: فيه أن على الإمام أن يُؤَمِّن جبهته الداخلية بمن يراه أكثر كفاءة وقوة وأمانة، فإن كان من قرابته فهو أحفظ لِظَهره. فإن الروم أكبر دولة خرج النبي ﷺ لغزوها، فكان الأنسب لذلك رجلاً من أعظم العرب سياسة وشجاعة وكفاءة، وهو أمير المؤمنين رضي الله عنه.

الرابعة عشر: فيه دلالة على أن الصبيان والنساء لا مدخل لهم في الحروب على أيّ وجهٍ كان.

❑❑❑

الحديث الحادي عشر

أخبرني الشيخ الصالح المعمر عبد العزيز بن صالح بن مَرْشَد النجدي الحنبلي قراءة عليه بالرياض، أخبرنا سعد بن حمد بن عتيق، أخبرنا والدي، أخبرنا الشيخ عبد الرحمن بن حسن بن الإمام المجدد محمد بن عبد الوهاب، أخبرنا جدي بإسناده[1] **إلى الإمام البخاري قال:**

حدثنا قتيبة بن سعيد، حدثنا يعقوب بن عبد الرحمن عن أبي حازم، أخبرني سهل بن سعد رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال يوم خيبر:

«لَأُعْطِيَنَّ الراية غداً رجلاً يفتح الله على يديه، يحب الله ورسوله، ويحبُّه الله ورسوله». قال: فبات الناس يَدُوْكُوْن لَيْلَتهم أَيُّهُم يُعْطاها، فلما أصبح الناس غَدَوا على رسول الله ﷺ كُلُّهم يرجو أن يُعْطاها، فقال: **«أين عَليُّ بن أبي طالب؟»** فقيل: هو يشتكي عينيه. قال: فأرسَلوا إليه، فأُتي به، فَبَصَقَ رسول الله ﷺ في عينيه، ودعا له، فَبَرَأ حتى كأن لم يكن به وَجَعٌ، فأعطاه الراية، فقال عليٌّ: يا رسول الله أقاتلهم حتى يكونوا مثلنا؟ فقال: **«انْفُذ على رِسْلِك حتى تنزل**

---

(١) في الحديث التاسع.

بساحتهم، ثم ادعهم إلى الإسلام، وأخبرهم بما يجب عليهم من حق الله فيه، فوالله لَأن يهدي الله بك رجلاً واحداً خيرٌ لك من حُمْر النَّعَم».

رواه البخاري. ورواه مسلم عن قتيبة به مثله.

«يَدُوْكُوْن»: يخوضون.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه المنقبة العظيمة لِعَلِيٍّ رضي الله عنه، وهي الإخبار بمحبة الله تعالى ورسوله ﷺ له.

الثانية: فيه أن آل البيت هم أولى الناس بدعوة الخلق إلى الإسلام.

الثالثة: فيه أن الله تعالى قد يَدْخَر لبعض آل البيت من النصر والفتح والهداية ما لا يذخر لغيرهم.

الرابعة: فيه أن آل البيت يجب عليهم الحلم والأناة في أمر الدين كله، لقوله: «على رِسْلك...».

الخامسة: فيه أن آل البيت يجب أن يكون أول ما يرعونه من أمر الدين، الإخلاص، والتوحيد، وتجريد العبادة لله تعالى.

السادسة: فيه صبر عليٍّ رضي الله عنه واحتسابه فيما جرى عليه من المرض في سبيل الله.

السابعة: فيه الأمر العجيب، وهو أن الله جَلَّتْ قدرته يُخْرِج لهذا الدين من عبادِهِ الأتقياء الأغنياء الأخفياء مَنْ يقوم له ممن لم يَسْعَ لِوِلايةٍ أو منافسة، وحَجْب ذلك عَمَّن تنافس وسعى.

الثامنة: فيه أن الدعوة إلى الله تعالى من أشرف أعمال الصالحين، حتى إن النبي ﷺ أكَّد ذلك بالحَلِف عليها.

....

التاسعة: فيه أن من إكرام آل البيت المبادرة إلى الدعاء لهم، ولا سيما حال المرض.

العاشرة: فيه جواز أن يشتري آل البيت النفائس كَحُمْرِ النَّعَم، وهي الإبل الحمر، لأنها من أنفس الأموال عند العرب.

الحادية عشر: فيه أن عليًّا رضي الله عنه وهو من أجلِّ سادة آل البيت قد يخفى عليه بعضُ الشريعة، لأنه لمَّا قال: «أقاتلهم حتى يكونوا مثلنا؟» قال له ﷺ: «انفذ على رسلك. . .» فَغَيْره من أئمة آل البيت أولى.

الثانية عشر: فيه الرد على النواصب المعادين لعليٍّ رضي الله عنه، لأن من يحبه الله ورسوله وَصْفٌ لا يقال إلَّا على مَنْ مات على أحسن حال وأطهر فِعَال.

الثالثة عشر: فيه أن على الإمام أن يُوَلِّي في حربه مع أشرس أعدائه أكثر رجاله معرفة بالحرب والسياسة، وأثبتهم قوةً وبأساً.

الرابعة عشر: فيه أنه سبحانه وتعالى يُحِبُّ ويُحَبُّ، محبةً تليق به عزَّ وجلَّ، ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ﴾، ففيه إشارة إلى أن اللائق بالواحد من آل البيت أن يُحِبّ وَيُحَبّ.

الخامسة عشر: ما كان عليه الصحابة رضي الله عنهم من صفاء القلوب، إذ لم يحسدوا عليًّا رضي الله عنه على هذا الفضل العظيم، ولا أصابوه بِعَيْنٍ، بل نقلوا هذه المنقبة وربَّوا الأمة عليها.

السادسة عشر: فيه أنَّ مِنْ محبة الله ورسوله حُبُّ أمير المؤمنين عليٍّ رضي الله عنه.

السابعة عشر: فيه أنَّ مَنْ أُصيب بمرضٍ أو مصيبة مِنْ آل البيت فلا ينبغي أن يشكو ذلك إلى أحدٍ، لقوله ﷺ: «أين عَليٌّ؟»، بل يحتسب ذلك عند الله تعالى، ففيه تفويض أئمة آل البيت شكواهم إلى الله وحده.

....

الثامنة عشر: فيه أنَّ هذا الدين رحمةٌ للعالمين، فإنه لم يبتدىء الناس بالقتال، بل بالدعوة، وأنه دين جاء لإخراج العباد من عبادة العِباد إلى عبادة ربِّ العِباد، ولم ينهب خيرات الأمم التي دانتْ له والتي لم تَدِنْ، كما فَعَلَتْه الأمم الكافرة، أو الطوائف الضالة وإنِ انتسبتْ إلى الإسلام.

التاسعة عشر: فيه أن آل البيت يجب أن يكونوا رحمةً للعالمين، لا عذاباً على الخلق أجمعين.

العشرون: فيه أن الرجل الكامل في السياسة قد يخطىء لِعارضٍ، ولا يُنقص هذا مِنْ جلالته، لقوله: «أُقَاتِلُهم...».

❑❑❑

الحديث الثاني عشر

أخبرني الشيخ الصالح المعمَّر محمد بن علي الفقيه الشافعي قراءة عليه بالمراوعة، أخبرنا محمد بن عبد الرحمن بن الحسن بن عبد الباري الأهدل، أخبرنا جدي إجازةً عن الوجيه الأهدل بإسناده[1] إلى الحافظ ابن حجر قال: أخبرني أبو طاهر محمد بن أبي اليُمْن الرَّبَعي عن عثمان بن المُرابِط، أخبرنا أبو جعفر أحمد بن إبراهيم بن الزبير، أخبرنا أبو الحسن علي بن محمد الشَّارِّي، أخبرنا عبد الله بن محمد الحَجْري، أخبرنا أبو جعفر أحمد بن عبد الرحمن البِطْرَوْجي، أخبرنا محمد بن فَرَج مَوْلى ابن الطَّلَّاع، أخبرنا يونس بن عبد الله بن مُغِيث الصفَّار، أخبرنا محمد بن معاوية بن الأحمر، أخبرنا **الإمام أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي قال:**

أخبرني هارون بن عبد الله، حدثنا مُصْعَب بن المِقْدام، حدثنا فطر بن خليفة عن أبي الطفيل.

وأخبرنا أبو داود، حدثنا محمد بن سليمان، حدثنا فِطْر عن أبي الطفيل عامر بن واثلة قال:

---

(١) في الحديث الخامس.

جَمَع عَلِيٌّ الناس في الرحبة فقال: أَنْشُد بالله كلَّ امرئٍ سمع رسول الله ﷺ يقول يوم غدير «خُمٍّ» ما سمع.

فقام أناس فشهدوا أن رسول الله ﷺ، قال يوم غدير «خُمّ»:

«ألستم تعلمون أنِّي أولى بالمؤمنين من أنفسهم؟ ـ وهو قائم ـ. ثم أخذ بِيَد عليٍّ فقال: **من كنتُ مولاه فَعَلِيٌّ مولاه، اللَّهمَّ والِ من والاه وعاد من عاداه».**

قال أبو الطفيل: فخرجتُ وفي نفسي منه شيء، فلقيتُ زيد بن أرقم فأخبرته فقال: وما تُنْكِرُ! أنا سمعته من رسول الله ﷺ.

واللفظ لأبي داود.

هذا إسناد قوي، رواه النسائي في الكبرى، وله متابعات وشواهد كثيرة.

*** فيه مسائل:**

الأولى: معنى الخبر: «مَنْ كنتُ مُحِبَّه وناصره فَعَلِيٌّ مُحِبُّه وناصره، فَمَنْ أَحَبَّني وتولَّاني فَلْيَتَوَلَّه. ولذا أكَّده بقوله: «اللَّهمَّ...»، أي: أَحِبَّ مَنْ يُحِبّه، وانْصُر مَنْ ينصره، وعادِ مَنْ يعاديه.

الثانية: فيه منقبة عظيمة لأمير المؤمنين عليٍّ رضي الله عنه، وهو التنصيص عليه في القرب الديني من النبي ﷺ والولاية، وإنْ كان غيره قد شَرَكَه في مثل ذلك، كقوله ﷺ لِجُلَيْبِيب: **«هذا مِنِّي وأنا منه»**، وقوله لزيد بن حارثة في الحديث الخامس والثلاثين: **«أنت أخونا ومولانا»**، إلَّا أنه رضي الله عنه زاد عليهم بتأكيد الدعاء له.

الثالثة: فيه عَلَم من أعلام النبوة، وهو استجابة الله دعاءه ﷺ في عليٍّ

....

رضي الله عنه، فإن مَنْ عاداه ـ أي لأمرِ الدين لا الدنيا ـ لم يُرْفَع له لواء الإسلام إلى اليوم، بل عاش مخذولاً مرذولاً في تاريخ الإسلام، ومَنْ والاه من سادات الصحابة والتابعين رفع الله لواءهم ففتحوا البلاد مشرقاً ومغرباً من الصين إلى الأندلس، وصارت الأمم التي أدخلوا إليها الإسلام في صحائف حسناتهم.

الرابعة: إن قيل: فهؤلاء جماعة من الصحابة قاتلوا عَلِيًّا فلم يحصل لهم عقوبة من الله كما يشير إليه قوله ﷺ: **«اللَّهمَّ عادِ مَنْ عاداه»**، بل كانوا على هدي صالح، وانتفع الناس بعلمهم، وحَصَل بهم نصر للدين كما حصل به؟!.

قلتُ: هذا الذي دعا جمعاً من الحفاظ من آخرهم شيخ الإسلام ابن تيمية إلى إنكار هذه الزيادة «اللَّهمَّ...». وفي ذلك مناقشة، لأنها قد جاءت عن جمع من الصحابة، وصحَّحها جمع من الحفاظ. **وجواب هذا الإشكال** ـ والله أعلم ـ: أنهم رضي الله عنهم جميعاً كانوا متأوِّلين، وكلٌّ منهم اجتهد في الأخذ بالشرع والعمل به. وقاعدة الشريعة أن المتأوِّل لا يؤاخذ، كحديث الصحيحين: «إذا أنا مِتُّ فأحرقوني... الحديث»، ولذا كان المستقرّ عند أئمة السلف الصالح هو السكوت عمَّا شجر بين الصحابة، لأنهم كانوا مجتهدين متأولين.

الخامسة: فيه أن على صالحي آل البيت ـ إذا وجدوا مِن بعض العامة جفاءً ـ أن يعلنوا بفضائلهم، لئلا يُعاقَب هؤلاء وغيرهم بترك وصية رسول الله ﷺ.

السادسة: فيه أن ولي الأمر إذا اختلف الناس عليه فَعَلَيه أن يذكرهم بفضله وإحسانه وبذله، ولا يُعَدّ هذا من تزكية النفس ولا المِنَّة، بل هو من الحفاظ على الأمَّة.

....

السابعة: فيه استحباب المنافحة عن آل البيت، وإن لم يَسْألوها.

الثامنة: فيه مشروعية جمع الناس على ذكر فضائل آل البيت، ويتأكد ذلك عند الحاجة.

التاسعة: فيه الحرص على بَثِّ العلم في السفر.

العاشرة: فيه التغليظ على من رَدَّ حديث رسول الله ﷺ.

الحادية عشر: فيه الإنكار على مَنْ أساء الظنّ بآل البيت.

❑ ❑ ❑

الحديث الثالث عشر

حدثني العلَّامة المحدِّث حماد بن محمد الأنصاري قراءةً وإجازةً بالمدينة، عن عمر بن حمدان المَحْرِسي، عن فالح بن محمد الظاهري، عن محمد بن علي السنوسي، عن حَمْدون بن عبد الرحمن بن الحاج السُّلَمي، عن صالح بن محمد الفُلَّاني، عن محمد سعيد سفر، عن محمد حياة السندي، عن عبد الله بن سالم البصري، عن أبي الحسن علي بن عبد القادر الطبري، عن الخطيب عبد الواحد بن إبراهيم الحَصَّاري، عن الشمس محمد بن أحمد الغَمْري، عن الحافظ ابن حجر قال: أخبرنا أبو إسحاق التنوخي، عن أبي عبد الله محمد بن أحمد بن أبي الهيجاء بن الزَّرَّاد، أخبرنا الحافظ أبو علي الحسن بن محمد البكري، أخبرنا أبو رَوْح عبد المُعِزِّ بن محمد الهَرَوي، أخبرنا تميم بن أبي سعيد الجُرْجاني، أخبرنا علي بن محمد البَحَّاثي، أخبرنا محمد بن أحمد بن هارون الزَّوْزَني، أخبرنا **الإمام أبو حاتم محمد بن حِبَّان التميمي البُسْتي قال**:

أخبرنا أحمد بن يحيى بن زُهيرِ بِتُسْتَر، حدثنا زياد بن يحيى الحسَّاني، حدثنا أزهر السمَّان، عن ابن عون، عن ابن سيرين، عن عَبِيْدَة، **عن عليّ قال**:

شَكَتْ لي فاطمة من الطحين، فقلتُ: لو أتيتِ أباك فسألتيه خادماً،

قال: فأتتِ النبي ﷺ فَلَمْ تُصادفه فَرَجَعَتْ مكانها، فلمَّا جاء أُخْبِر، فأتانا وعلينا قطيفة إذا لبسناها طولاً خَرَجَتْ منها جنوبنا، وإذا لبسناها عَرْضاً خرجت منها أقدامنا ورؤوسنا. قال: «**يا فاطمة أُخْبِرتُ أنَّكِ جئتِ، فهل كانتْ لكِ حاجة؟**» قالت: لا. قلتُ: بلى، شَكَتْ إليَّ من الطحين، فقلتُ: لو أتيتِ أباكِ فسألتيه خادماً. فقال: «**أفلا أَدُلُّكما على ما هو خيرٌ لكما مِنْ خادم؟ إذا أخذتما مَضَاجعكما تقولان ثلاثاً وثلاثين، وثلاثاً وثلاثين، وأربعاً وثلاثين، تسبيحة وتحميدة وتكبيرة**».

هذا إسناد صحيح، رواه ابن حبان في صحيحه، ورواه الشيخان عن عبد الرحمن بن أبي ليلى عن عليٍّ نحوه.

وفي لفظٍ له ولهما قال عليّ: فلم أدعها منذ سمعتها من النبي ﷺ. قالوا: ولا ليلة صفين؟ قال: ولا ليلة صفين».

وقوله: «من الطحين» أي: من طَحْن الحَبّ.

*** فيه مسائل:**

الأولى: ما كان عليه آل البيت من القِلَّة والعِفَّة.

الثانية: أن خدمة المرأة في بيت زوجها حق عليها، ولو كان لا يلزمها لما سَكَت ﷺ عن ذلك، بل إنه لم يُشْكِها، ودَلَّها على ما تستعين به على الخدمة.

الثالثة: وإذا كان هذا حال سيدة نساء أهل الجنة فغيرها من النساء أولى.

الرابعة: فيه أن آل البيت إذا نَزَلَتْ بهم حاجة فالأولى لهم أن لا يسألوا إلَّا صالحيهم، ولا يسألوا الناس شيئاً.

الخامسة: فيه صَبْر آل البيت على ضيق الحال، فَلِذُرِّيَّاتهم بهم أسوة.

السادسة: قوله: «خير لكما من خادم»، قال العلَّامة ابن القيم في «الوابل الصيِّب»: قال شيخ الإسلام ابن تيمية قدَّس الله روحه: بَلَغَنا أنه مَنْ حافظ على

....

هذه الكلمات لم يأخذه إعياء فيما يعانيه مِنْ شُغْلٍ ومن غيره اهـ.

ومقتضى الخبر يدل على هذا، فإن الخادم يكفي المرء التعب في الليل والنهار، وهذا الذكر خير من الخادم، وأصل ذلك في الكتاب العزيز في قول هودٍ عليه السلام: ﴿وَيَٰقَوْمِ ٱسْتَغْفِرُوا۟ رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوٓا۟ إِلَيْهِ يُرْسِلِ ٱلسَّمَآءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ﴾.

السابعة: فيه أن ما يحصل بالانكفاف عن المسألة والاحتياج إلى الخلق مِنَ القُرْب وَمَعِيَّة الرب تبارك وتعالى أكثر مما يحصل بسؤالهم والحاجة إليهم ـ هذا مع صحة السؤال والحاجة ـ.

الثامنة: فيه أن مَنْ تَعَلَّق بذكر الله تعالى في الرخاء كان الله له في الشدَّة.

التاسعة: فيه حماية الله تعالى لآل بيت رسوله ﷺ الدنيا، تكميلاً لصيانتهم مِنْ تَبِعاتها.

العاشرة: إيثار آل البيت الفقراء وأهل الحاجة على أنفسهم مع حاجتهم وخصاصتهم، فإنه قد جاء في روايةٍ أنه ﷺ باع سَبْي الخُمُس ـ الذي جاءت فاطمة تطلب منه خادماً ـ لِيُنْفِق على أهل الصفة لِضِيْقٍ كان بهم.

الحادية عشر: فيه أن الرجل من صالحي آل البيت ينبغي له أن يُمَحِّضَ النصيحة لولده، وإن كان في مقتضاها ما يخالف هواه وهواهم.

الثانية عشر: استحباب قضاء حوائج آل البيت، وتحسس مخمصتهم على أكمل الوجوه.

الثالثة عشر: فيه أن السنَّة التواضع لآل البيت وزيارتهم في مَحِلَّاتهم.

الرابعة عشر: فيه أن الواحد من أئمة آل البيت قد يسعى في الحاجة من أمور الدنيا فلا يُيَسِّرُها الله له.

الحديث الرابع عشر

أخبرني مفتي بيتِ الفقيه بِتِهامَة العلَّامة إسماعيل بن عبد الله بن يحيى المَخَايِي الشافعي قراءةً عليه بها، عن الطاهر بن موسى بن محمد الأهدل، أخبرنا عَمِّي المُسَاوَى بن محمد الأهدل إجازةً، عن محمد بن حسن بن فَرَج القُضاعي، عن رزق بن رزق العَلَوِي، عن محمد بن المُسَاوَى الأهدل، عن الوجيه الأهدل عن المرتضى الزَّبيدي بإسناده الآتي إلى الحافظ ابن حجر، قال: أخبرتنا فاطمة بنت المُنَجَّا، عن التقي سليمان بن حمزة المقدسي، أخبرنا الضياء المقدسي، أخبرنا أبو جعفر محمد بن أحمد الصَّيْدَلاني، أخبرتنا فاطمة بنت عبد الله الجَوْزْدَانِيَّة، أخبرنا أبو بكر محمد بن عبد الله بن رِيْذَة الأصبهاني، أخبرنا **الإمام أبو القاسم سليمان بن أحمد اللخمي الطبراني قال**:

حدثنا محمد بن حَيَّان المازني، حدثنا كثير بن يحيى، حدثنا سعيد بن عبد الكريم بن سَلِيْط وأبو عوانة، عن داود بن أبي الجَحَّاف، عن عبد الرحمن بن أبي زياد: أنه سمع عبد الله بن الحارث بن نوفل يقول:

حدثنا أبو سعيد الخدري: أن رسول الله ﷺ دخل على فاطمة ذاتَ يومٍ وعَلِيٌّ نائمٌ وهي مضطجعة، وأبناؤها إلى جنبها، فاستسقى

الحسن، فقام رسول الله ﷺ إلى لِقْحَة فَحَلَب لهم، فأَتَى به، فاستيقظ الحسين، فَجَعَل يُعالِجُ أنْ يشرب قبله حتى بكى، فقال رسول الله ﷺ: **إنَّ أخاك استسقى قبلك»**، فقالت فاطمة: كأنَّ الحسنَ آثَرُ عندكَ!! **قال: «ما هو بآثَرَ عندي منه، وإنما هما عندي بمنزلة واحدة، إنِّي وإياكِ وهما وهذا النَّائم لفي مكان واحدٍ يوم القيامة»**.

هذا إسناد لا بأس به، رواه الطبراني في معجمه الكبير، وقد رُوِّيناه من عدة وجوه عند الإمام أحمد وغيره، هذا أمثلها.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه أن من أعظم فضائل أصحاب الكساء رضي الله عنهم أنهم مع سيد الأولين والآخرين في الجنة.

الثانية: فيه أن المرء مهما بلغت منزلته، فإنَّ من القُرَبِ القيامُ على خدمة آل البيت.

الثالثة: الأصل في إصلاح ما تنازع فيه آل البيت أن لا يُفَضَّل بعضهم على بعض، بل يكونون في منزلة واحدة.

الرابعة: إذا تنازع آل البيت في شيء وَجَبَ رَدُّ تنازعهم إلى الشرع، وإن تباينتْ مذاهبهم، وتفاوتت منازلهم، فغيرهم آكد.

الخامسة: قوله: «بمنزلة واحدة» و«مكان واحد»، يدل على عدم تفضيل الحَسَنَيْن أحدهما على الآخر، ويؤيد هذا أخبار عِدَّة، منها: الخبر الآتي: **«إن الحسن والحسين سَيِّدا شباب أهل الجنَّة»**، غير أن الأخبار الصحيحة أشهر وأكثر في فضل الحسن، ولذا حكى شيخ الإسلام ابن تيمية في «المنهاج» أنه أفضل من الحسين، قال: «باتفاق أهل السنَّة والشيعة» اهـ. والمسألة لا يترتب عليها عمل. والله أعلم.

....

السادسة: فيه أنَّ من استسقى من آل البيت، فالسنَّة القيام لسقياه وإن كان طفلاً.

السابعة: فيه الرد على النواصب، حيث كفَّروا أمير المؤمنين عليًّا رضي الله عنه، والنبي ﷺ يحكي أنه معه في الجنة، فأيُّ ضلالٍ بعد هذا!! نسأل الله العافية.

الثامنة: فيه أنه ينبغي لأئمة آل البيت أن لا يفضِّلوا بين الآل، ولا سيما ذُرِّياتهم، لقوله: «ما هو بآثر عندي...».

التاسعة: وينبغي أن يستثنى من ذلك تفضيل بعض الآل بالوَصْف الشرعي، فإن التفضيل بالوصف الشرعي اطَّردت النصوص في تأصيله، وله ضوابط معلومة، ومن ذلك أن من استسقى بُدِىء به أولاً، لقوله: **«إنَّ أخاك استسقى قبلك»**.

العاشرة: فيه ما كان عليه الآل من الانبساط وقِلَّة الكُلْفة، حتى نام عليٌّ رضي الله عنه بين يدي رسول الله ﷺ ولم يوقظوه.

الحادية عشر: فيه أنَّ على من استشكل شيئاً من أمر آل البيت أن يسأل عنه أهلَ العلم العالِمين بأحوالهم، أو أئمة آل البيت، ولا يبادر بالإنكار أو المخالفة، لقول البضعة النبوية رضي الله عنها: «كأن الحسن... إلخ».

الثانية عشرة: فيه أنَّ مِنْ أئمَّة آل البيت مَنْ يخفى عليه الشرع أحياناً، لقولها رضي الله عنها: «كأن الحسن... إلخ».

الحديث الخامس عشر

أخبرني العلَّامة النحوي عبد الغني بن علي الدَّقْر الدمشقي الشافعي قراءة ومشافهة بِسَفْح قاسْيُوْن، أخبرنا بدر الدين الحَسَني، عن محمود بن حمزة الحمزاوي، عن الوجيه عبد الرحمن بن محمد الكُزْبَري، عن المرتضى الزبيدي، عن عمر بن عَقيل السقَّاف عن عبد الله بن سالم البصري، عن أبي الحسن الطبري، عن الخطيب الحَصَّاري، عن الشمس الغَمْري، عن الحافظ ابن حجر قال: أخبرني أبو المعالي عبد الله بن عمر بن علي الأزهري السُّعودي، أخبرنا أبو العباس أحمد بن محمد الحلبي المعروف بِحَفَنْجَلَة، أخبرنا النجيب أبو الفَرَج عبد اللطيف بن عبد المنعم الحَرَّاني، أخبرنا عبد الله بن أحمد بن أبي المجد الحربي، أخبرنا هبة الله بن محمد بن الحُصَين، أخبرنا أبو علي الحسن بن علي التميمي المُذْهِب، أخبرنا أبو بكر أحمد بن جعفر بن حَمْدان القَطِيعي، **حدثنا عبد الله بن** الإمام أبي عبد الله أحمد بن محمد **بن** حنبل الشيباني، **حدثنا أبي قال:**

حدثنا محمد بن جعفر، حدثنا شعبة، عن محمد بن زياد، **عن أبي هريرة**: أن الحسن أخذ تمرةً مِنْ تَمْر الصدقة فجعلها في فيه، **فقال له رسول الله ﷺ: «كَخْ كخْ، أَلْقِها، أمَا شعرتَ أنَّا أهلُ بيتٍ لا نأكل الصدقة».**

هذا إسناد صحيح، رواه الإمام أحمد. ورواه مسلم عن محمد بن جعفر. ورواه البخاري عن شعبة به نحوه.

*** فيه مسائل:**

الأولى: أنه ينبغي تنزيه أطفال آل البيت وتطهيرهم عن الأوساخ والأقذار الحسِّية والمعنوية.

الثانية: فيه فضيلة الحسن رضي الله عنه من خمسة وجوه:

الأول: تنزيهه عن الصدقة التي هي أوساخ الناس.

والثاني: نسبته إلى النبي ﷺ نَسَباً وأُبُوَّةً حيث قال: «إنَّا أهل بيت»، وفي رواية: «يا بني ألقها»، بخلاف الناس فإن أولاد بناتهم يُنْسَبون إلى آبائهم كما قاله الجمهور، كذا قالوا.

والثالث: فضله رضي الله عنه على أطفال آل البيت حيث كان سبباً في تشريع هذا الحكم الفَرْد لهم.

والرابع: فضله عليهم من جهة أخرى، إذ يدل على أن الأصل عدم ضرب صغار الآل، لأنه شَرَع في التلبس بأوساخ الناس فلم يضربه بل أرشده.

والخامس: فضله على سائرالآل في تأكيد محافظة الآل على أموال بيت مال المسلمين، مع أن المأخوذ منه في غاية الصغر، والآخذ محتاج، والأخذ لا يضرّ بالمسلمين.

الثالثة: فيه تعليم الصبيان الأحكام الشرعية بأسمائها.

الرابعة: فيه المسألة المهمة وهي تحريم الصدقة ـ وهي الفرض على الصحيح ـ على آل البيت.

الخامسة: قوله: «أخذ تمرة»، فيه أن تحريم الصدقة على الآل يشمل القليل، والكثير من باب أولى.

السادسة: قوله: «الصدقة»، فيه دليل على تحريم الصدقة على بني هاشم،

....

سواء كانت من غيرهم أو منهم، لإطلاق النبي ﷺ لفظ الصدقة عليها ولم يفرِّق.

فإن قيل: فهذا الإطلاق يدل على تحريم صدقة التطوع كذلك.

والجواب: أن التطوع لا تُراد في النص أصلاً، ولذا قال تعالى: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾، فهذه صورة صدقة الفريضة لا التطوع: «خُذْ» و«صدقة» و«تطهرهم» و«تزكيهم بها» و«صل عليهم»، والتطوع يقال لها «هدية» و«تبرع» و«صلة» و«وصية» و«وقف» وأشباه ذلك، فَهُم يعطونها، وأما الفريضة فتؤخذ منهم.

قال الحافظ أبو عمر بن عبد البر في «التمهيد»: ومما يدل على صحة ذلك؛ أن عليًّا والعباس وفاطمة رضي الله عنهم وغيرهم تصدقوا وأوقفوا على جماعة من بني هاشم، وصدقاتهم الموقوفة معروفة مشهورة... اهـ.

السابعة: وأما ما روي من حديث العباس بن عبد المطلب في حِلِّها من بعض بني هاشم لبعضٍ؛ فهو خبر واهٍ كذَّبه غير واحد من الحفاظ. وقد أجاد العلَّامة الشوكاني في «شرح المنتقى» في تحريره.

الثامنة: استثنى كثير من الفقهاء للهاشمي جواز أكل الصدقة حال الاضطرار، وهذا صحيح، فليست الميتة على قبحها وعفونتها بأحل من الصدقة، بل ينبغي أن تنزل الحاجة منزلة الضرورة، فكم رأينا من صالحي آل بيت رسول الله ﷺ مَنْ لا يجد إلَّا الزكاة أو السؤال والاستجداء، ولا يخفى ما في السؤال من الأخبار المستفيضة في الوعيد عليه، هذا مع قبح السؤال وإذلال البيت الطاهر. أمَّا إن قُلْنا بأنهم عُوِّضوا عن الزكاة بِخُمْس الخُمْس، فلهم أخذها عند انعدامه فهو قوي كما ذهب إليه جماعة.

التاسعة: فيه أن التَّنزُّه عن قليل الحرام دأب الأنبياء والأولياء.

....

العاشرة: فيه أن على آل البيت المبالغة في النصيحة لذراريهم، فإنه ﷺ قال للحسن: «كخ كخ» فكَرَّر ثم قال: «ألقها»، ثم قال: «أما شعرتَ».

الحادية عشر: فيه القيام على الرعية من أهل البيت وإن كانوا أحفاداً، بتربيتهم وتعليمهم.

الثانية عشر: فيه تدريب الصبي على الربط بين الأحكام وعللها، فإنه أزيد في نباهته.

الثالثة عشر: فيه أن الشروع في المنكَر لا يقتضي السكوت عنه بحجَّة استهلاكه إن كان مطعوماً.

الرابعة عشر: فيه أن التعليل في منع الصبيان من شيء ـ إذا أمكن فهمه للعلل والأسباب ـ أصح في تربيته من المنع بلا تعليل.

الخامسة عشر: فيه أن ولاة أمور المسلمين سيحاسبهم الله تعالى حتى على التَّمْرَة من بيت المال.

❑❑❑

الحديث السادس عشر

أخبرني الشيخ الصالح إبراهيم بن إسماعيل بن يوسف الغَمْنِيّ الشافعي قراءة عليه بِقَرْيَته الغَمْنِيَة بِتهامة، أخبرنا المَنْصِب حسن بن أحمد بن عبد الباري الأهدل، أخبرنا محمد طاهر بن عبد الرحمن الأهدل، أخبرنا محمد بن أحمد بن عبد الباري الأهدل، أخبرنا الحسن بن عبد الباري الأهدل، أخبرنا الوجيه الأهدل بإسناده[1] **إلى الإمام البخاري قال:**

حدثنا عبد الله بن محمد، حدثنا سفيان، عن أبي موسى قال: سمعت الحسن يقول: استقبل ـ واللهِ ـ الحسنُ بن عليّ معاويةَ بكتائبَ أمثال الجبال، فقال عمرو بن العاص: إني لأَرَى كتائب لا تُوَلِّي حتى تقتل أقرانها.

فقال له معاوية ـ وكان واللهِ خَيْرَ الرجلين ـ: أيْ عمرو، إنْ قَتَلَ هؤلاء هؤلاء وهؤلاء هؤلاء مَنْ لي بأمور الناس؟! مَنْ لي بنسائهم؟! مَنْ لي بَضَيْعَتهم؟!

فبعث إليه رجلين من قريش من بني عبد شمس ـ عبد الرحمن بن

(١) في الحديث العاشر.

سمرة، وعبد الله بن عامر بن كُرَيْز ـ، فقال: اذهبا إلى هذا الرجل فاعرضا عليه، وقولا له، واطلبا إليه.

فَأَتَيَاه فَدَخلا عليه فتكلَّما، وقالا له، فَطَلَبا إليه.

فقال لهما الحسن بن علي: إنَّا بنو عبد المطلب قد أَصَبْنا من هذا المال، وإن هذه الأمة قد عاثَتْ في دمائها. قالا: فإنه يَعْرِض عليك كذا وكذا، ويَطْلُب إليك ويَسْأَلك. قال: فمن لي بهذا؟ قالا: نحن لك به. فما سألهما شيئاً إلَّا قالا: نحن لك به. فصالَحَه.

فقال الحسن: ولقد سمعتُ أبا بكرة يقول: «رأيت رسول الله ﷺ على المنبر والحسن بن علي إلى جنبه، وهو يُقْبِل على الناس مرةً وعليه أخرى ويقول: «**إن ابني هذا سيِّد، ولعلَّ الله أنْ يُصْلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين**» ».

انفرد بإخراجه البخاري. واستدركه الحاكم فتعقَّبه الذهبي.

وقول الحسن البصري: «وكان والله...» يريد أن معاوية خير من عمرو بن العاص.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه المنقبة العظيمة للحسن رضي الله عنه حيث أثنى عليه النبي ﷺ بالإصلاح بين المختصمين على الخلافة، وهذا أصل عظيم في الاجتماع والحث عليه، بخلاف شقّ عصا المسلمين، أو تفريق كلمتهم، أو الخروج على الأئمة، فإن ذلك كله لم ينقل في الكتاب والسنَّة الثناءُ على أهله.

الثانية: قال الإمام أبو حفص بن شاهين: تَفَرُّد الحسن بهذه الفضيلة لم يشاركه فيها أحد، ولم يُطْلِق النبي ﷺ السؤدد في الصحابة إلَّا للحسن عليه السلام اهـ.

....

وأمَّا ذِكْر السؤدد مُقَيَّداً؛ ففي عدة أخبار، كقوله في الصحيحين لسعد بن معاذ: «قوموا إلى سَيِّدكم».

الثالثة: قال الحافظ أبو بكر البيهقي في «الاعتقاد»: قال سفيان: «قوله: «فئتين من المسلمين»: يُعْجِبُنا جدًّا».

قال الشيخ: وإنما أعجبهم لأن النبي ﷺ سمَّاهم جميعاً مسلمين. وهذا خبر من رسول الله ﷺ بما كان من الحسن بن علي بعد وفاة عليٍّ في تسليمه الأمر إلى معاوية بن أبي سفيان اهـ.

الرابعة: فيه أنه كلَّما كان العفو عن الحق أكبر كان الجزاء أعظم، فإن الحسن رضي الله عنه لمَّا عفا عن حقِّه في الدنيا سوَّدَه الله فيها، وصار في الآخرة سيِّداً لشباب أهل الجنة، والجزاء من جنس العمل.

الخامسة: فيه ذِكْر مآثر آل البيت ومناقبهم في الخطبة.

السادسة: فيه عَلَمٌ من أعلام النبوة، حيث أخبر ﷺ عن هذه المنقبة وأنها سَتَقَع، فوقعت كما أخبر بعد ثلاثين سنة.

السابعة: قوله: «عاثَتْ في دمائها»، أي: قَتَل بعضها بعضاً، فينبغي أن تُطَيَّب خواطرهم بالعطايا، وهذا دالٌّ على السؤدد والحكمة من الحسن رضي الله عنه، لأن من أنفع ما تُسَكَّن به الفتن هو بذل المال.

الثامنة: فيه الصورة العظيمة من صور جمال تاريخ الإسلام وهي الاجتماع على قلب رجل واحد، ولذا سمي عام الجماعة، فقد انطلق المسلمون بعده لفتح البلاد ونشر الإسلام، بعد أن مكثوا عدَّة سنين يفني بعضهم بعضاً.

التاسعة: فيه جواز ولاية المفضول مع وجود الفاضل.

العاشرة: قال الحافظ في الفتح: فيه إطلاق الابن على ابن البنت،

....

وقد انعقد الإجماع على أن امرأة الجدّ والد الأم محرمة على ابن بنته، وأنَّ امرأة ابن البنت محرمة على جدِّه، وإن اختلفوا في التوارث اهـ.

الحادية عشر: زاد أبو داود في روايةٍ: أن المهدي الذي يخرج في آخر الزمان من ذريّة الحسن. لكن في هذه الرواية ضعف، ولو صحت ففيها نكتة لطيفة كما قال العلماء، وهي أن الحسن رضي الله عنه ترك الخلافة لله عزَّ وجلّ، فعوَّضه الله في ذريته، فجعل مِنْ وَلَده من يقوم بخلافة الأرض كلها، ليملأها قسطاً وعدلاً كما ملئتْ ظلماً وجوراً.

الثانية عشر: فيه أن من هدي آل البيت البدء بالصلح عند الخصومات، وأنهم أهل إصلاح لا أهل إفساد.

❑❑❑

الحديث السابع عشر

أخبرني العلَّامة المحدِّث محمد الأنصاري بن عبد العلي بن عبد الله الأعظمي قراءةً عليه بِبَنَارِس في الهند، أخبرنا أبو القاسم البنارسي، أخبرنا نذير حسين الدهلوي، أخبرنا محمد إسحاق الدهلوي، أخبرنا عبد العزيز بن الولي الدهلوي، أخبرنا أبي، أخبرنا الكوراني، أخبرنا العُجَيمي بإسناده[1] **إلى الإمام البخاري قال:**

حدثني محمد بن الحسين بن إبراهيم، حدثني حسين بن محمد، حدثنا جرير، عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: أُتي عبيد الله بن زياد برأس الحسين عليه السلام فَجُعل في طَسْت، فَجَعَلَ يَنْكُتُ، وقال في حُسْنه شيئاً، فقال أنس: **«كان أشبَهَهُم برسول الله ﷺ»، وكان مخضوباً بالوَسْمة.**

رواه البخاري هكذا.

ورُوِّينا في مسند أبي يعلى وغيره عن حماد بن سلمة عن علي بن زيد بن جُدْعان عن أنس قال: «جَعَل ينكت بقضيبه على ثناياه وقال:

---

(١) في الحديث الثامن

إن كان لَحَسَن الثَّغْر. فقلت: أَمَا والله لأَسُوْءَنَّك، فقال: «لقد رأيتُ رسول الله ﷺ يُقَبِّل موضع قضيبك مِنْ فِيْه».

ولهذا شاهد عند الطبراني عن زيد بن أرقم.

قوله: «وكان» أي الحسين. و«مخضوباً» مصبوغاً. و«بالوَسْمَة» نَبْتٌ يُصْبَغُ به أسود.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه فضيلة الحسين رضي الله عنه إذ كان مِنْ أشْبَه الناس برسول الله ﷺ.

والأخبار في شَبَه الحسن بالنبي ﷺ أشهر منها في الحسين، بل إن أنساً نفسه قال: «لم يكن أحدٌ أشبه برسول الله ﷺ من الحسن بن علي»، ولذا حَمَله جماعة على أن الحسن أشبه به فيما بين الرأس إلى الصدر، والحسين أشبه به ما كان أسفل من ذلك، وذكروا قولَ عليٍّ رضي الله عنه بهذا. وقد رَوَى هذا الترمذي وصحَّحه وفيه نظر. وحمله آخرون على أن الحسن لم يكن أحدٌ وهو حيّ أشبه بالنبي ﷺ منه، فلما كان زَمَن الحسين لم يكن أحد أشبه به منه. ويؤيد هذا أنه جاء في بعض طرق هذا الحديث عند الترمذي وغيره في الحسين عن أنس «. . . كان مِنْ أشبههم برسول الله. . .». وفيه دلالة أيضاً على أن الحسن أكثر شبهاً بالنبي ﷺ من الحسين رضي الله عنهما.

الثانية: فيه المنقبة العظيمة للحسين، إذ قُتِل مظلوماً لم يتدنَّس بدم امرىء مسلم، بل كان كَخَيْر ابنَيْ آدم.

الثالثة: فيه منقبة له بتقبيل رسول الله ﷺ له.

الرابعة: ما كان عليه أئمة السلف الصالح من تعظيم قدر آل البيت.

....

الخامسة: فيه بيان قدر آل البيت عند أهل الفجور، ولا سيما من كانت أصوله مجوسيَّة.

السادسة: فيه أن من آذى آل البيت عوقب بجنس ما فعل، بل أشد، فإن عبيد الله هذا قد قتله إبراهيم بن الأَشْتَر، كما جاءت بذلك الآثار، وقَتَل أصحابه معه، وحَمَل رؤوسهم جميعاً وطَرَحها بين يدي المختار الثقفي، ثم حُملتْ جُثثُهم إلى مكة فأحرقتْ.

وفي الترمذي وصحَّحه: أنَّ حَيَّةً دخلتْ في منخري عبيد الله بن زياد في الرَّحْبة بعدما قُطِع رأسه.

السابعة: هذا آخر ما انتهى إلينا من الأخبار الصحاح في شأن رأس الحسين رضي الله عنه، فلا يُعْلم بعدها أين مكانه، وما يقال في تعيين محله فلا أصل له، بل كذب، لا إسناد له قائم.

على أن الأمة ليس محتَّماً عليها معرفة مكان جسده الطاهر، أو رأسه الشريف، بل المشروع الدعاء له، والترضِّي عنه، رضي الله عنه.

الثامنة: في إنكار أنس رضي الله عنه على عبيد الله بن زياد، وكذا إنكار أبي بَرْزَة وزيد بن أرقم ما يدل على نكارة ما نُقِل في بعض كتب التواريخ أن هذه الحادثة وقعت عند يزيد بن معاوية بالشام، فإن هؤلاء الصحابة لم يكونوا بالشام، بل كانوا بالعراق، ومع هذا فإن جرائم عبيد الله في صحيفة يزيد يوم القيامة، لأنه الإمام، وهم رعيته، وكان الواجب عليه حفظُ ابنِ رسول الله ﷺ، فإنه لم يرتكب حدًّا، ولا ما يوجب قتلاً، ولا كان خارجيًّا، فبأي ذنبٍ استحلُّوا دمه؟! فإنَّا لله وإنَّا إليه راجعون.

التاسعة: قال شيخ الإسلام ابن تيمية في «منهاج أهل السنَّة»: أمَّا ما ذُكر من سبي نسائه والذراري، والدوران بهم في البلاد، وحملهم على الجِمال

....

بغير أَقْتاب، فهذا كذب وباطل، ما سَبَى المسلمون ولله الحمد هاشميةً قَطّ، ولا استحلَّت أمة محمد ﷺ سبي بني هاشم قَطّ، ولكن أهل الهوى والجهل يكذبون كثيراً. . . اهـ.

العاشرة: فيه اتباع الحسين رضي الله عنه السنَّة في تغيير الشيب بالخضاب، وفي تغييره بالسواد خلاف معروف بين أصحاب النبي ﷺ ومَنْ بعدهم.

❑ ❑ ❑

الحديث الثامن عشر

أخبرنا العلَّامة المشارك عبد الله بن عبد العزيز بن عَقِيل النجدي الحنبلي بقراءتي عليه بالرياض، عن علي بن ناصر أبو وادي، عن نذير حسين، عن محمد إسحاق، عن عبد العزيز بن الولي الدهلوي، عن أبيه، عن الكوراني، أخبرنا عبد الله بن سالم البصري بإسناده[١] **إلى الإمام أحمد في المسند قال:**

حدثنا محمد بن عُبيد، حدثنا شُرَحْبِيل بن مُدْرِك، عن عبد الله بن نُجَيٍّ، عن أبيه، أنه سار مع عليٍّ ـ وكان صاحب مِطْهَرَته ـ، فلما حاذى نِيْنَوَى وهو مُنْطَلِق إلى صِفِّين، فنادَى عليٌّ: اصْبِرْ أبا عبد الله، اصبر أبا عبد الله بِشَطِّ الفرات. قلتُ: وما ذا؟ قال: دخلتُ على النبي ﷺ ذاتَ يومٍ وعيناه تَفيضان، قلتُ: يا نبي الله، أَغْضَبَك أحدٌ؟! ما شأن عينيك تَفيضان؟! قال: **«بل قام من عندي جبريل قَبْلُ فَحَدَّثني أن الحسين يُقْتَل بِشَطِّ الفُرات. قال: هل لك أنْ أُشِمَّك مِنْ تُرْبَته؟ قال: قلتُ: نعم. فَمَدَّ يده، فَقَبَض قبضة من تراب فأعطانيها، فلم أمْلِك عَيْنَيَّ أنْ فاضَتا»**.

---

(١) في الحديث الخامس عشر.

رواه الإمام أحمد بإسناد حسن في الشواهد. وقوّاه غير واحد من الحفاظ.

***فيه مسائل:**

الأولى: فيه منقبة عظيمة، وهي بكاؤه ﷺ على مقتل الحسين رضي الله عنه، وهذا دالٌّ على أنه يُقْتَل ظلماً.

الثانية: فيه أن الحسين قُتل بكربلاء من أرض العراق.

الثالثة: فيه علم من أعلام النبوة، حيث أخبر ﷺ عن مقتل الحسين؛ فوقع كما أخبر.

الرابعة: فيه علم من أعلام النبوة أيضاً، وهو الإشارة إلى فتح العراق.

الخامسة: مقتل ابن رسول الله ﷺ إحدى الفواجع في تاريخ الإسلام، والزيادة على ما فعله النبي ﷺ في هذه الفاجعة ابتداع في الدين لم يأذن به الله، كالنِّياحة واللطم، ومعاداة المسلمين وكراهيتهم وتكفيرهم أو تفسيقهم، فإنه ﷺ لم يزد على: «**فلم أملك عينيَّ أن فاضتا**».

السادسة: العمل في هذه المصيبة وأمثالها ما جاء في التنزيل والأخبار: من الصبر والصلاة والاسترجاع، ومن ذلك: ما رواه الإمام أحمد وغيره عن فاطمة بنت الحسين ـ وكانت قد شَهِدتْ مقتل أبيها ـ، عن أبيها الحسين بن علي، عن النبي ﷺ قال: «**ما من مسلم ولا مسلمة يصاب بمصيبة فيذكرها وإن طال عهدها، فَيُحْدِثُ لذلك استرجاعاً إلّا جدَّد الله له عند ذلك، فأعطاه مثل أجرها يوم أصيب**». ومعناه عند مسلم عن أم سلمة.

وما رواه محمد بن نصر المروزي في تعظيم قدر الصلاة عن الإمام الجليل زيد بن علي بن الحسين عن أبيه قال: نُعي إلى ابن عباسٍ ابنٌ له وهو في سفر، فقال: إنَّا لله وإنَّا إليه راجعون. ثم نزل فصلَّى ركعتين. ثم قال: فَعَلْنا ما أمر الله به، وتلا هذه الآية: ﴿وَٱسْتَعِينُواْ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ﴾.

....

السابعة: قوله: «هل لك أن أُشِمَّك من تربته»، أي: أُرِيَك من تربته وأُقَرِّبَها لك. وقد جاء التصريح بذلك في عدَّة روايات، وفيها: «هل تُحِبُّ أن أُرِيَك من تربته؟».

ولم يصح أن النبي ﷺ شمَّ تربته، بل قد رواه الطبراني وإسناده واهٍ ومتنه منكر، ولو صحَّ؛ فإن السياق لا يساعد مَنْ عَظَّمها، فإنه قال في الخبر: فَشَمَّها رسول الله ﷺ وقال: «وَيْحَ كَرْبٌ وبَلاءٌ» وهذا ذم لا مدح.

الثامنة: قوله: «هل لك أن أُشِمَّك من تربته»، لا دليل فيه على فضل ما يُسَمَّى «التربة الحسينية» من أوجه كثيرة، منها:

أولاً: أن الخبر ليس فيه إلَّا أنه أعطاها إياه كما تقدَّم، وغاية هذا التأكيد، لا التقديس.

ثانياً: ليس في سنَّته ﷺ حرف واحد يشير إلى أنه صلَّى عليها أو عَظَّمها أو استشفى بها.

ثالثاً: لو كانت التربة مقدسة لأمر بها أهل بيته وأصحابه والأمة بعده، وإلَّا فقد نَقَص من الدين، وحاشاه ﷺ.

رابعاً: أن آل بيته لم يعظموا هذه التربة، ولم ينقل عنهم إسناد قائم في ذلك.

خامساً: يقال لهؤلاء لا بدَّ من تعيين التربة، فإن قوله: «تربته» يدل على أنها التربة التي قُتل عليها، وهي محدودة محصورة، ودون تعيينها خرط القتاد، فإذا كانت المقدمة باطلة فالنتيجة أكثر بطلاناً.

التاسعة: **إن قيل:** فإذا كان الصحابة قد عاصروا مقتل الحسين فهلَّا منعوا ذلك.

فالجواب: أن الصحابة قد كانوا على قسمين: أمَّا مَنْ كان بمكة كابن عباس وابن عمر فقد حذَّروه من الخروج إلى العراق خوفاً عليه، ولم يستجب

....

لهم. وأما من كان بالعراق كأنس وزيد بن أرقم فليس عنهم حرف واحد أنهم رَضُوا بقتله، بل لم يفجأهم الأمر إلَّا ورأسه الشريف بين يدي عبيد الله بن زياد، ومع ذلك فقد أنكر عليه أنس وزيد بن أرقم، ومعلوم أن عبيد الله ظالم غاشم، قد قتل من الصحابة والتابعين ما هو معلوم، وما كان أحد يقدر على منعه، حتى آل البيت لم يكن لهم قدرة على منعه لبطشه وفتكه، وهم كانوا أولى بالاعتراض عليهم من الصحابة.

بل يقال ما هو أكبر من ذلك: وهو أن النبي ﷺ كما في حديث الباب قد كان يَعْلم بقتله فهلَّا دفع عنه؟ أو دَعا الله تعالى أن يَصْرِف عنه القتل؟

والجواب: أن من سنن الله تعالى الكونية القدرية أنه أمضى الخلق على قَدَر كائنٍ قبل أن يخلقهم بخمسين ألف سنة. وإذا أراد إمضاء قَدَرٍ فلا رادَّ له، ومن ذلك: أن مَنِيَّةَ ابنِ رسول الله ﷺ ستكون في بَلَدٍ ما وزَمَنٍ ما، لا يستأخر ساعة ولا يستقدم، فالاعتراض على ذلك اعتراضٌ على الله عزَّ وجلّ.

بل الفقه: النظرُ إلى حكمة الله تعالى في ذلك كما هو سبيل أهل الإيمان، ومن ذلك: أن الله سبحانه يبتلي أولياءه ليعظم أجرهم ويرفع منازلهم، وإذا كان ليس من الموت بُدٌّ، ففي الشهادة أعلى الميتات، كما قال تعالى: ﴿وَلِيَعْلَمَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾.

وإذا كان سيِّد الأولين والآخرين لم يدفع عن ابنه، ولم يتكلَّم بحرف واحد بعد علمه بقتله، ولا قال تشريعاً فيه؛ دلَّ على أنه القَدَرُ المحتوم، فلا يُطْلَب ممن دونه كأمير المؤمنين عليٍّ ـ وهو يَعْلَم بقتل ابنه ـ ولا مَنْ دونَه من الناس.

قال شيخ الإسلام ابن تيمية في «المنهاج»: أما قتل الحسين رضي الله عنه فلا ريب أنه قُتل مظلوماً شهيداً، كما قُتل أشباهه من المظلومين الشهداء،

....

وقَتْل الحسين معصية لله ورسوله ممن قتله أو أعان على قتله أو رضي بذلك، وهو مصيبة أصيب بها المسلمون من أهله وغير أهله، وهو في حقِّه شهادة له، ورَفْع درجة، وعُلُوّ منزلة، فإنه وأخاه سبقت لهما من الله السعادة التي لا تُنال إلَّا بنوع من البلاء، ولم يكن لهما من السوابق ما لأهل بَيْتِهِما، فإنهما تَرَبَّيا في حجر الإسلام في عِزٍّ وأمان، فمات هذا مسموماً وهذا مقتولاً، لينالا بذلك منازل السعداء وعيش الشهداء. . . اهـ.

العاشرة: فيه عظم صبر أمير المؤمنين علي رضي الله عنه، فإن خبر مقتل ابنه الحسين قد حَمَله في صدره صابراً محتسباً إلى أن قُتل رضي الله عنهما.

الحادية عشر: فيه أنَّ مَنْ لازَم أكابر العلماء ـ لا سيما إن كان من أئمة آل البيت ـ بورك له في علمه، وظَفِر منهم بدقائق الكتاب والحكمة.

❑ ❑ ❑

الحديث التاسع عشر

أخبرني العلَّامة الفقيه السيِّد عبد الرحمن بن إسماعيل الوَشَلِي الشافعي قراءة عليه بالزيديَّة بتهامة، أخبرنا حسين بن محمد الزَّوَّاك، أخبرنا عبد الرحمن بن عبد الله القُدَيمي، أخبرنا عبد الرحمن بن عبد الله بن أبي الغَيْث، أخبرنا الوجيه الأهدل بإسناده[1] إلى الإمام البخاري قال:

حدثنا موسى بن إسماعيل، حدثنا مهدي، حدثنا ابن أبي يعقوب عن ابن أبي نُعْم قال:

كنت شاهداً لابن عمر، وسأله رجل عن دم البعوض، فقال: ممن أنت؟ فقال: من أهل العراق. قال: انظروا إلى هذا! يسألني عن دم البعوض وقد قتلوا ابنَ النبي ﷺ، وسمعت النبي ﷺ يقول: «هما ريحانتاي من الدنيا».

انفرد بإخراجه البخاري، وفي رواية الترمذي: «عن دم البعوض يصيب الثوب»

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه فضيلة الحسين رضي الله عنه حيث نُسب إلى النبي ﷺ.

---

(١) في الحديث العاشر والسابع.

....

الثانية: استحباب شمّ آل البيت ذرِّيتهم، وقد جاء هذا صريحاً في عدة أخبار عن النبي ﷺ.

الثالثة: قوله: «ريحانتاي»، فيه إشارة إلى فضيلة آل البيت، فإن طيب الفرع دال على طيب الأصل، والريحان إذا كان له رائحة ذكيَّة دلَّ على طيب أرضه، كما قال الله تعالى: ﴿وَٱلْبَلَدُ ٱلطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُۥ بِإِذْنِ رَبِّهِۦ ۖ وَٱلَّذِى خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا﴾.

الرابعة: فيه كما قال الحافظ ابن رجب في «جامع العلوم والحكم»: أن التدقيق في التوقف عن الشبهات إنما يَصْلُح لمن استقامت أحواله كلها، وتشابهت أعماله في التقوى والورع، فأما من يقع في انتهاك المحرمات الظاهرة، ثم يريد أن يتورع عن شيء من دقائق الشُّبَه، فإنه لا يحتمل له ذلك، بل يُنْكَر عليه كما قال ابن عمر... اهـ.

الخامسة: فيه استحباب اتخاذ آل البيت أزكى الطيب.

السادسة: فيه إشارة إلى طهارة ما لا نفس له سائله، لكن ينبغي أن يقيد هذا بما لم يكن متولِّداً من النجاسات.

السابعة: فيه أن الأصل عند الصحابة رضي الله عنهم أنهم لا يَلْعَنون الفاسق المعيَّن، ويقوي هذا عدة أخبار في الصحيحين وغيرهما في نهي النبي ﷺ عن لعن من أقيم عليه الحد وغيره.

الثامنة: فيه أنه إذا تواطأ جمهور أهل بلدٍ على التسبب في دَمٍ نُسِب ذلك إليهم.

التاسعة: فيه أن خفَّة العقول والبعد عن أهل العلم والحكمة من أكبر أسباب الفتن والبلايا التي جَرَتْ في تاريخ الإسلام.

العاشرة: فيه أن المسارعة إلى الفتن دأب الشعوب الأصاغر لا الأكابر، وهو نذير شؤم عليهم ما لم يَسْتَدْرِكوا، فإن الطبائع تَتَغَيَّر بقوة الوارد.

الحادية عشر: فيه أن الفتن لا يَذْهَبُ فيها ولا تفني إلَّا الأبرياء وخيار الأمَّة.

الحديث العشرون

أخبرني العلَّامة الصالح إسماعيل بن محمد الأنصاري قراءةً عليه بالرياض، أخبرني عبد الحق بن محمد الهاشمي، أخبرني أحمد بن عبد الله بن سالم البغدادي، عن عبد الرحمن بن عباس بن عبد الرحمن، عن القاضي محمد بن علي الشوكاني، أخبرنا عبد القادر بن أحمد الكوكباني، عن محمد حياة السندي، عن البصري بإسناده[1] **إلى الإمام أحمد في مسنده قال:**

حدثنا حسين بن محمد، حدثنا إسرائيل، عن ميسرة بن حبيب، عن المنهال بن عمرو، عن زرّ بن حبيش، عن حذيفة قال: سألتني أمِّي منذ متى عَهْدُك بالنبي ﷺ؟ فقلت لها: منذ كذا وكذا. قال: فنالتْ منِّي وسَبَّتْني، قال: فقلت لها: دعيني فإني آتي النبي ﷺ فأصلي معه المغرب، ثم لا أدعه حتى يستغفر لي ولكِ، قال: فأتيت النبي ﷺ فَصَلَّيتُ معه المغرب، فصلَّى النبي ﷺ إلى العشاء ثم انْفَتَل فَتَبِعْتُه، فَعَرَض له عارض فناجاه، ثم ذَهَب، فاتَّبَعْتُه فسمع صوتي، فقال: **«من هذا؟»** فقلتُ: حذيفة، قال: **«ما لَكَ؟»**، فَحَدَّثْته بالأمر، فقال: **«غفر الله لك ولأُمِّكَ»**، ثم قال: **«أما رأيتَ العارض الذي عَرَض لي قُبَيْلُ؟»**

---

(١) في الحديث الخامس عشر.

قال: قلتُ: بلى. قال: «فَهُوَ مَلَكٌ من الملائكة لم يَهْبِط الأرضَ قَطّ قبل هذه الليلة، استأذن ربَّه أن يُسَلِّم عليَّ ويُبَشِّرني أن الحسن والحسين سيِّدا شباب أهل الجنة، وأن فاطمة سيدة نساء أهل الجنة».

هذا إسناد صحيح. رواه الإمام أحمد وغيره من غير وجهٍ عن حذيفة وغيره.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه التصريح بأن الحسن والحسين سيِّدا شباب أهل الجنة، وهذا من أعظم فضائل آل البيت.

الثانية: فيه دليل لمن قال: إن خير نساء العالمين فاطمة؛ لهذا الخبر وأشباهه، ولكونها البضعة النبوية.

الثالثة: قوله: «سيدة نساء أهل الجنة»، رَدٌّ على من قال بِنُبُوَّةِ النساء، لأن مرتبة النبي فوق مرتبة الولي بإجماع.

الرابعة: فيه استحباب المبادرة إلى بشارة آل البيت.

الخامسة: فيه فضيلة مَنْ أدخل السرور على آل البيت.

السادسة: فيه أن من إكرام آل البيت ابتداؤهم بالسلام على كل حال.

لكن يظهر لي ـ والله أعلم ـ أنه يستثنى من ذلك ما إذا تهاجر الواحد من الآل مع غيره، فإن الأولى أن يبتدىء آلُ البيت غَيْرَهم بالسلام، لما في ذلك من السُّمُوّ والفضل، كما في الصحيحين عن النبي ﷺ من قوله: «... وخيرهما الذي يبدأ بالسلام»، ولما تقدَّم في الحديث السادس عشر في فضل الحسن بن علي: «إن ابني هذا سيِّد، ولعل الله أن يصلح به بين فئتين...».

السابعة: فيه عَلَم من أعلام النبوة، إذ كان الحسن والحسين عند وفاته ﷺ صِبْيَةً، فأخبر أنهما سَيَشِبَّان، ويكونا سيِّدا شباب أهل الجنة.

....

الثامنة: فيه شِدَّة محبة الملائكة لآل البيت، وتنافسهم في ذلك.

التاسعة: فيه حُسْن تربية الصحابة رضي الله عنهم أبناءهم على محبة النبي ﷺ، فكأنه ـ والله أعلم ـ لمَّا علم ذلك منهم أشار إليهم إشارة لطيفة بأن مِنْ حُبِّه ﷺ حُبُّ آل بيته، وهو سِرُّ ذِكْرِه لحذيفةَ بشارةَ المَلَكِ عليه السلام، فهذا من ألطف الإشارات والبشارات.

العاشرة: فيه أنه ﷺ بَشَرٌ قد يخفى عليه ما يخفى على الناس، لقوله: «من هذا؟» فأئمة آل البيت أولى.

الحادية عشر: فيه المنقبة العظيمة لأمير المؤمنين عليٍّ رضي الله عنه التي لم يَشْرَكه فيها أحد، فَزَوْجُه فاطمة سيدة نساء أهل الجنة، وابناه الحسن والحسين سيِّدا شباب أهل الجنة.

الثانية عشر: رُوِّينا هذا الخبر مختصراً في سنن النسائي الكبرى وغيرها من حديث أبي سعيد مرفوعاً: «**الحسن والحسين سيِّدا شباب أهل الجنة إلَّا ابنَيْ الخالَة عيسى بن مريم ويحيى بن زكريا**»، وفيه الحكم بن عبد الرحمن وهو سيِّئ الحفظ. فهذا وإن كان ضعيفاً إلَّا أنه قد انعقد الإجماع على أن الأنبياء فوق درجة الأولياء.

❑❑❑

الحديث الواحد والعشرون

حدثنا العلَّامة المشارك المتفنِّن القاضي محمد بن إسماعيل بن محمد بن محمد بن على العَمْراني بقراءتي عليه بصنعاء، أخبرنا القاضي عبد الله بن عبد الكريم الجِرافي، أخبرنا الحسين بن علي العَمْري، عن محمد بن إسماعيل الكِبْسِي، عن القاضي محمد بن علي الشوكاني، أخبرنا عبد القادر بن أحمد الكَوْكَباني، عن محمد بن إسماعيل الأمير الصنعاني، عن يحيى بن عمر الأهدل، عن الشهاب النخلي، عن الشمس البابلي، عن السنهوري، عن النجم الغيطي، عن زكريا الأنصاري، عن الحافظ ابن حجر بإسناده[1] **إلى الإمام أحمد قال:**

حدثنا أسود بن عامر، حدثنا كامل.

وأبو المنذر، حدثنا كامل.

ـ قال: أسود قال: أخبرنا، المَعْنَى ـ عن أبي صالح، عن أبي هريرة قال: كنَّا نصلِّي مع رسول الله ﷺ العشاء، فإذا سجد وَثَب الحسن والحسين على ظهره، فإذا رفع رأسه أخذهما بيده مِنْ

(١) في الحديث الخامس عشر.

خَلْفِهِ أخذاً رفيقاً، فيضعهما على الأرض، فإذا عاد عادا، حتى إذا قضى صلاته أَقْعَدَهما على فخذيه، قال: فقمتُ إليه فقلتُ: يا رسول الله أرُدُّهما؟ فَبَرَقَتْ بَرْقَةٌ، فقال لهما: «**الْحَقا بِأُمِّكُما**»، قال: فَمَكَث ضوؤها حتى دخلا».

هذا إسناد حسن من زوائد المسند على الكتب الستَّة، وقوله: «فَبَرَقَتْ»، أي: أضاءت.

وبالإسناد إلى الحاكم: «فما زالا يمشيان في ضوئها حتى دخلا».

*** فيه مسائل:**

الأولى: عناية الله تعالى بآل البيت حال الصِّغَر، وإذا سَبَقَت العناية في البداية ظهرت الولاية في النهاية.

الثانية: إثبات الكرامة للحسن والحسين وهما قبل التكليف.

الثالثة: في حصول هذه الكرامة أمام الصحابة رضي الله عنهم مع حداثة سِنّ الحسنين رضي الله عنهما إشارة إلى حَثِّهم على إكرام آل البيت والعناية بهم.

الرابعة: فيه رحمة آل البيت والشفقة عليهم.

الخامسة: فيه استحباب المبادرة إلى خدمة آل البيت وإن لم يسألوها.

السادسة: فيه جواز حمل الصبيان في الصلاة.

السابعة: فيه استحباب عدم ضرب الأطفال عند الخطأ وإن تكرر.

الثامنة: فيه أن الحركة في الصلاة إذا احتيج إليها جازت بلا كراهة وإن تكررت.

....

التاسعة: فيه فضيلة راوية الإسلام أبي هريرة رضي الله عنه في مباشرته هذه الكرامة، ونقله هذه المنقبة، ولو كان في قلبه بُغْضٌ لآل البيت ـ وحاشاه ـ ما نقل إلينا فضائلهم التي منها هذا الخبر العظيم.

العاشرة: فيه جواز إدخال الصبيان المساجد، وشهودهم الصلوات، وقد صحَّ هذا في عدَّة أخبار في الصحيحين وغيرهما، وهذا دالٌّ على نكارة ما روي مرفوعاً «جنبوا مساجدكم صبيانكم»، ولو صحَّ فينبغي حمله على من كان في طبعه الإيذاء والإزعاج، لكن لا ينبغي وضعهم في صف الصلاة، بل يُجعل لهم صَفٌّ مؤخَّر ـ ولا سيما ممن لا يعقل منهم ـ، وأمَّا النبي ﷺ فما كان في صفٍّ مع غيره، فلا يَرِد ما جاء من حَمْلِه الحسن والحسين وأُمامة وجعلهم بجانبه.

❏❏❏

الحديث الثاني والعشرون

أخبرنا العلَّامة الفقيه الربَّاني حَمِيْد بن قاسم بن عَقيل المُلَيْكي بقراءتي عليه في جِبْلَة، أخبرنا محمد بن علي بن تُرْكي النجدي، ثم المدني الحنبلي، عن أحمد بن إبراهيم بن عيسى، عن الشيخ عبد الرحمن بن حسن، عن جده الإمام محمد بن عبد الوهاب بإسناده[1] **إلى الإمام البخاري قال:**

حدثنا قتيبة بن سعيد، حدثنا محمد بن فضيل، عن عُمارة، عن أبي زرعة، عن أبي هريرة رضي الله عنه قال:

«أتى جبريل النبي ﷺ فقال: يا رسول الله هذه خديجة قد أتتْ، معها إناءٌ فيه إدام أو طعام أو شراب، فإذا هي أَتَتْك فاقرأ عليها السلام من ربِّها وَمِنِّي، وبَشِّرْها بِبَيْتٍ في الجنة مِنْ قَصَب، لا صَخَبَ فيه ولا نَصَب».

رواه البخاري. ورواه مسلم عن ابن فُضَيل به مثله سواء.

وأخبرني شيخنا عبد الرحمن بن عبد الله المُلَّا قراءةً عليه بالأحساء بإسناده إلى النسائي في الكبرى عن أنس: أنها رَدَّت السلام

---

(١) في الحديث التاسع.

فقالت: «إنَّ الله هو السلام، وعلى جبريل السلام، وعليك السلام ورحمة الله وبركاته».

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه منقبة عظيمة لأم المؤمنين خديجة رضي الله عنها بتسليم الرب تبارك وتعالى عليها خاصة.

قال الحافظ ابن كثير في تفسيره: من خصائصها أن الله سبحانه بعث إليها السلام مع جبريل، فَبَلَّغها رسول الله ﷺ ذلك، وهذه لعمر الله خاصة لم تكن لسواها اهـ.

الثانية: فيه إشارة إلى أن الأصل في الأدب مع نساء آل البيت في السلام وغيره يكون بالإبلاغ لا المواجهة، وأصل ذلك في الكتاب العزيز، قال تعالى: ﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَٰعًا فَسْـَٔلُوهُنَّ مِن وَرَآءِ حِجَابٍ﴾، إكراماً لرسول الله ﷺ.

الثالثة: فيه فضيلة أم المؤمنين حيث قامت برعيتها وخدمة زوجها، حتى إنها لم تُحْوِجه ﷺ إلى امرأةٍ أخرى، ولذا لم يتزوج ولم يُعَدِّد إلَّا بعد وفاتها رضي الله عنها.

الرابعة: قال الحافظ في الفتح: قال العلماء: في هذه القصة دليل على وفور فقهها، لأنها لم تقل «وعليه السلام»، كما وقع لبعض الصحابة، حيث كانوا يقولون في التشهد «السلام على الله» فنهاهم النبي ﷺ وقال: «**إن الله هو السلام فقولوا: التحيات لله**»؛ فَعَرَفَتْ خديجة لِصِحَّة فهمها أن الله لا يُرَدُّ عليه السلام كما يردّ على المخلوقين، لأن السلام اسم من أسماء الله، وهو أيضاً دعاء بالسلامة، وكلاهما لا يَصْلُح أن يردَّ به على الله؛ فكأنَّها قالت: كيف أقول عليه السلام، والسلام اسمه، ومنه يُطْلَب، ومنه يحصل. فيستفاد منه أنه لا يليق بالله إلَّا الثناء عليه، فَجَعَلَتْ مكان ردِّ السلام عليه الثناء عليه، ثم غايَرَتْ بين ما يليق بالله وما يليق بغيره فقالت: «وعلى جبريل السلام» اهـ.

....

قلت: ولا غرو أن قال فيها النبي ﷺ: «كَمَلَ من الرجال كثير، ولم يَكْمُل من النساء إلَّا . . . وخديجة بنت خويلد». وفي هذا اللفظ نظر كما سيأتي في الحديث الرابع والعشرين، ولا يضرُّ؛ فقد صحَّ عنه ﷺ ما يقتضي كمالها، كما في الحديث الآتي.

الخامسة: قال الحافظ ابن كثير في تفسيره: من خواص خديجة رضي الله عنها أنها لم تسؤه قط، ولم تغاضبه، ولم يَنَلْها منه إيلاء، ولا عَتَب قط، ولا هجر، وكفى بهذه منقبة وفضيلة اهـ.

قلت: فكأنها ـ والله أعلم ـ جوزيت على ذلك بهذا البيت العظيم في الجنة، الذي لا صَخَب فيه ولا نَصَب. والجزاء من جنس العمل.

السادسة: استدلَّ بعض العلماء بالخبر على تفضيل خديجة، مِنْ حيثُ إنَّ جبريل سلَّم على عائشة مِنْ قِبَل نَفْسِه، وخديجة أَبْلَغَها السلام من ربها. كذا قيل، وفيه مناقشة، لأن التخصيص لا يقتضي التفضيل المطلق، إذ التفضيل المطلق له أدواته.

السابعة: قوله: «بِبَيْتٍ من قَصَب»، أي: قَصْرٌ من لؤلؤة مُجَوَّفة، وقد وقعت الإشارة إلى هذا المعنى في بعض الروايات.

الثامنة: قال الحافظ في الفتح: قال السهيلي: النكتة في قوله: «من قصب»، ولم يقل من «لؤلؤ»: أنَّ في لفظ القصب مناسبة لكونها أحرزت قصب السبق بمبادرتها إلى الإيمان دون غيرها، ولذا وقعت هذه المناسبة في جميع هذا الحديث، انتهى.

وفي القصب مناسبة أخرى من جهة استواء أكثر أنابيبه، وكذا كان لخديجة من الاستواء ما ليس لغيرها، إذ كانت حريصة على رضاه بكل ممكن، ولم يصدر منها ما يغضبه قط كما وقع لغيرها اهـ.

....

التاسعة: في مناسبة بشارتها بِبَيْتٍ في الجنة ـ والله أعلم ـ أن بيت هذه السيِّدة الطاهرة رضي الله عنها كان أول بيت في الإسلام، حيث أحسنَتِ القيام بأمر بيتها، فكافأها الله ببيت خير منه عنده في الجنة، والجزاء من جنس العمل.

العاشرة: وفي السلام عليها من الله تعالى بنفسه إشارة إلى سلامة نفسها لله تعالى ولرسوله ﷺ، وهذا أصل عظيم في الدين، أنه على قدر الاستسلام لله تعالى ولرسوله ﷺ يكون قدر السلامة للعبد.

الحادية عشر: قوله: «لا صَخَبَ فيه ولا نَصَبَ»، الصَّخَب: الصياح وكثرة اللَّغَط. والنَّصَب: التعب. وفي ذلك إشارة إلى شدَّة تعبها وقيامها بأمور بيتها، ولكلّ امرأة ـ سيَّما من الآل ـ إن كانت كذلك نصيبٌ من هذه البشارة.

الثانية عشر: نبَّه الحافظ في الفتح إلى أنه وقع عند الطبراني من رواية يونس عن عائشة أنها وقع لها نظير ما وقع لخديجة من السلام؛ إلَّا أنها رواية شاذَّة، فتنبَّه لذلك.

❑ ❑ ❑

الحديث الثالث والعشرون

أخبرنا مفتي باجِل الشيخ الفقيه أُمْحُمَّد بن العِزِّي بن أُمْحُمَّد الناشري الشافعي بقراءتي عليه بها، عن حسن بن أحمد بن عبد الباري الأهدل ـ مَنْصِبُ المراوعة ـ، عن محمد بن عبد الرحمن بن الحسن بن عبد الباري الأهدل، عن جده، عن الوجيه الأهدل، عن المرتضى الزَّبِيدي بإسناده[1] إلى الحافظ ابن حجر قال: أخبرني أبو إسحاق التنوخي، أخبرنا أبو العباس الحجَّار، أخبرنا أبو المُنَجَّا عبد الله بن عمر اللَّتِّي، أخبرنا أبو الوقت السجزي، أخبرنا أبو الحسن الداوُدي، أخبرنا أبو محمد السَّرَخْسي، أخبرنا إبراهيم بن خُزَيم الشاشي، حدثنا الحافظ **أبو محمد عَبْدُ بن حُمَيْد قال:**

حدثنا محمد بن الفضل، حدثنا داود بن أبي الفرات، عن علباء بن أَحْمَر، عن عكرمة، عن ابن عباس قال:

خَطَّ رسول الله ﷺ أربعة خطوط، ثم قال: **«أتدرون ما هذا؟»** قالوا: الله ورسوله أعلم، فقال رسول الله ﷺ: **«أفضل نساء أهل الجنة: خديجة بنت خويلد، وفاطمة ابنة محمد، ومريم بنت عمران، وآسية ابنة مزاحم امرأة فرعون».**

---

(١) في الحديث الخامس عشر.

هذا إسناد صحيح، رواه عَبْد بن حميد في مسنده. ورواه الإمام أحمد والنسائي وغيرهما عن داود به مثله سواء، وله شواهدُ عِدَّة.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه منقبة عظيمة للبضعة النبوية وأُمّها رضي الله عنهما بكونهما مع مريم وآسية أفضل نساء العالمين.

الثانية: قوله: «أفضل» فيه دليل لمن قَدَّم فاطمة وخديجة على عائشة في الفضل، كما ذهب إليه جماعة.

وأيَّد الحافظ ذلك في الفتح برواية البزار والطبراني من حديث عمار بن ياسر رَفَعَه: «لقد فُضِّلَتْ خديجة على نساء أمَّتي كما فُضِّلَتْ مريم على نساء العالمين»، وهو حديث حسن الإسناد اهـ. كذا قال رحمه الله، وفيه مناقشة، فالصواب أن الخبر عند الطبري ـ فهو إما تصحيف أو سبق قلم ـ. وقوله: «عمار بن ياسر»، المحفوظ أنه عمار بن سعد القَرَظ، ووهم مَنْ عَدَّه في الصحابة، وقد اضطرب فيه ابن لهيعة، والراوي عن عمارٍ هذا هو أبو يزيد الحميري مصري عِدَادُه في المجهولين، فأنَّى له الحُسْن؟! ولا حاجة لهذا الحديث، فإن حديث الباب صريح في التفضيل؛ لقوله: «أفضل» و«أربعة خطوط»، وفي المسألة خلاف قديم معروف بين أهل السنَّة على ثلاثة أقوال: هذا، وعكسه، وعدم التفضيل لأن لكلٍّ منهن فضلٌ من جهة، وهو قول قوي. ولا يترتب على المسألة عمل.

الثالثة: احتج بعض العلماء على تفضيل مريم على «فاطمة وخديجة» بما رواه الزبير بن بكَّار في «أزواج النبي» عن محمد بن حسن، عن عبد العزيز بن محمد، عن موسى بن عقبة، عن كريب، عن ابن عباس مرفوعاً: «سيدة نساء أهل الجنة مريم بنت عمران ثم فاطمة ثم خديجة ثم آسية امرأة فرعون». وهذا اللفظ يرفع الخلاف لو كان صحيحاً، غير أنه كَذِبٌ، وآفته محمد بن حسن وهو ابن زَبَالَة، وقد اتهمه غير واحد من الأئمة بالكذب، ولا يُلامُون؛ فقد روى

....

الخبر أبو داود وغيره عن عبد العزيز بن محمد عن إبراهيم بن عقبة عن كريب عن ابن عباس كحديث الباب بالواو وليس بـ«ثم»، وهذا هو المحفوظ في سنده ومتنه.

ومما يُتَنَبَّه له أن هذا الخبر قد أورده أبو العباس القرطبي في المُفْهِم عن ابن عبد البر في الاستيعاب عن الزبير بن بكار عن محمد بن حسين. وهذا تصحيف، وصوابه: محمد بن حسن، وهو ابن زَبَالة كما تقدم. وتَرَتَّب على هذا أن القرطبي حسَّنَه، وأن ابن عبد البر بيَّن شذوذه، وأن المحفوظ رواية أبي داود.

وقال الحافظ في الفتح: «الحديث ليس بثابت». وفي هذا التعبير لِيْنٌ، والتحقيق أنه باطل، فإن ابن زبالة متَّهم بالكذب، وقد عَبَث بالسند والمتن كما ترى، فرحم الله أئمة الحديث في القديم والحديث.

الرابعة: **فإن قيل**: فأيّ فائدة في الخطّ الذي خطَّه النبي ﷺ؟!

فالجواب ـ والله أعلم ـ ما ثبت بالاستقراء من هديه ﷺ، وهو أنه إذا أراد أن يؤكِّد أمراً ويحفظ عنه أكَّد القول بالفعل.

الخامسة: فيه منقبة عظيمة لمريم وآسية رضي الله عنهما حيث جُعِلَتا من أفضل سيدات أهل الجنة.

السادسة: فيه الرد على من قال بنبوة مريم، إذ لو كانت نَبِيَّةً ما جُمِعَتْ في الذكر والفضل إلى غيرها من الأولياء، لأنَّ مقام النبي فوق مقام الولي بإجماع.

فإن قيل: فما تصنع بقوله تعالى: ﴿وَإِذْ قَالَتِ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ يَـٰمَرْيَمُ﴾.

فالجواب: أنْ لا تلازم بين قول الملائكة وبين النبوَّة، وإلَّا لزم ما هو أكثر صراحةً من القول وهو الوحي كما في قوله: ﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى ٱلنَّحْلِ﴾، وقد كانت الملائكة، تُسَلِّم على بعض أصحاب النبي ﷺ وغير ذلك من الكرامات، بل اعتبرْ بقوله: ﴿مَّا ٱلْمَسِيحُ ٱبْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ

....

ٱلرُّسُلُ وَأُمُّهُۥ صِدِّيقَةٌ﴾، كيف فرّق بين مقام النبوة والولاية، واعتبر بصيغة العموم والحصر في قوله: ﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ إِلَّا رِجَالٗا نُّوحِيٓ إِلَيۡهِم﴾، حتى قال الإمام النووي في شرح مسلم «القول بنبوتهما ـ يعني مريم وآسية ـ غريب ضعيف، وقد نقل جماعة الإجماع على عدمها».

السابعة: فيه فضيلة هذه الأمة، حيث كان منها اثنتان من سيدات أهل الجنة، وهما فاطمة وخديجة، واشتركت الأمم في السيدتين الباقيتين، وهما مريم وآسية رضي الله عنهن.

الثامنة: وفيه منقبة عظيمة، حيث اختص آل البيت بأن سيِّدتين من سيداته هنَّ من أعظم سيدات أهل الجنة، وهذه خصيصة لم تكن في بيت من بيوتات العالمين.

❑❑❑

الحديث الرابع والعشرون

أخبرني العلَّامة الأثري المعمر أحمد بن نَصْر النعماني قراءةً عليه بالمدينة، أخبرنا إبراهيم بن عبد الله يارْشَاهْ الكُتُبي إجازة، عن الوجيه الكُزْبَري، عن صالح بن محمد الفُلَّاني، عن محمد بن سِنَّة الفلاني، عن الشريف محمد بن عبد الله الولاتي، عن محمد بن أركماش الحنفي، عن الحافظ ابن حجر قال: أخبرني أبو العباس أحمد بن عمر البغدادي، أخبرنا الحافظ أبو الحجاج يوسف بن عبد الرحمن المِزِّي، أخبرنا شمس الدين عبد الرحمن بن أبي عمر المقدسي، أخبرنا الإمام أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن قدامة المقدسي، أخبرنا أبو زرعة طاهر بن أبي الفضل المقدسي، أخبرنا أبو منصور محمد بن الحسين المُقَوِّمي، أخبرنا القاسم بن أبي المنذر الخطيب، أخبرنا أبو الحسن علي بن إبراهيم القطَّان، أخبرنا **الإمام أبو عبد الله محمد بن يزيد بن ماجَهْ** قال:

حدثنا محمد بن بشار، حدثنا محمد بن جعفر، حدثنا شعبة، عن عمرو بن مُرَّة عن مُرَّة الهَمْدَاني، عن أبي موسى الأشعري عن النبي ﷺ قال: **«كَمَل من الرجال كثير، ولم يَكْمُل من النساء إلَّا مريم بنت عمران وآسية امرأة فرعون، وإن فَضْل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام»**.

هذا إسناد صحيحٌ عالٍ جدًّا، رواه ابن ماجهْ. ورواه الشيخان عن محمد بن بشار به مثله.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه المنقبة العظيمة لأم المؤمنين عائشة رضي الله عنها، حيث فضَّلها النبي ﷺ على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام.

الثانية: فيه فضيلة مريم وآسية رضي الله عنهما على النساء بالشهادة لهما بالكمال.

الثالثة: قال الإمام ابن القيم في الهدي: الثريد مركَّب من خبز ولحم، فالخبز أفضل الأقوات، واللحم سيد الإدام، فإذا اجتمعا لم يكن بعدهما غاية اهـ. ففيه دلالة على عظم نفعهما وفضلهما.

الرابعة: قال الإمام النووي في شرح مسلم: لفظة «الكمال» تطلق على تمام الشيء وتناهيه في بابه، والمراد هنا التناهي في الفضائل وخصال البر والتقوى اهـ.

الخامسة: قوله: «ولم يكمل...»، قال العلماء: إنما خصَّهما بالكمال في زمانهما، وليس حصر الكمال في نساء العالمين فيهما فقط.

قلت: ويؤيد ذلك ما صح في مناقب فاطمة وخديجة من كونهما أفضل نساء أهل الجنة، وأما اللفظ الذي في حديث الباب وهو: «ولم يكمل من النساء إلَّا آسية امرأة فرعون ومريم ابنة عمران وخديجة بنت خويلد»، فقد عزاه الحافظ ابن كثير في تفسيره إلى الصحيحين، وتابعه على ذلك جماعة من المتأخرين، وهو سَهْوٌ منهم رحمهم الله، فلا ذكر لخديجة هنا البتة في الصحيحين. وإنما رواه ابن جرير في تفسيره: عن المثنى بن إبراهيم الآملي، عن آدم بن أبي إياس، عن شعبة به، وزاد: «وخديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد»، وقد رواه جماعة عن آدم وعن شعبة بدون الزيادة. والمثنى مجهول، لكن تابعه أبو أسامة

....

حماد بن أسامة عن شعبة به نحوه، كما رواه الثعلبي في تفسيره، وذكره الحافظ ابن كثير في البداية والنهاية عن ابن مَرْدَوَيه في تفسيره: عن شعبة عن معاوية بن قُرَّة عن أبيه قرة بن إياس مرفوعاً بلفظ: «. . .إلَّا ثلاث: مريم بنت عمران وآسية امرأة فرعون وخديجة بنت خويلد. . .»، وقال: هذا إسناد صحيح إلى شعبة اهـ. وفيه غرابة، فإن كانت هذه الزيادة محفوظة فذاك، وإلَّا فمقتضى التفضيل على نساء العالمين الكمال. والله أعلم.

السادسة: في اقتران مريم وآسية رضي الله عنهما بالكمال نكتة لطيفة أشار إليها جماعة من المحققين منهم الحافظ ابن كثير، وهو أن كلتيهما قد كَفَلَتْ نبيًّا في حال صغره، وأحاطته بالعناية.

السابعة: فيه أن من أعظم أجور العالمين رعاية الدعوة إلى الله تعالى ومناصرتها، وهذا ـ والله أعلم ـ وجه اقتران هؤلاء السيدات الكريمات رضي الله عنهن بالتفضيل في هذا الخبر.

الثامنة: قال الحافظ ابن كثير في البداية والنهاية: يحتمل قوله: «وفضل عائشة على النساء» أن يكون محفوظاً، فيعم النساء المذكورات وغيرهن، ويحتمل أن يكون عامًّا فيما عداهن، ويبقى الكلام فيها وفيهن موقوف يحتمل التسوية بينهن، فيحتاج من رجَّح واحدة منهن على غيرها إلى دليل خارج اهـ.

التاسعة: إن قيل: فما وجه تشبيه أم المؤمنين رضي الله عنها بالثريد؟

فالجواب: أن الثريد من أفخم الطعام عند العرب، لعظم فائدته وغَنَائه للآكل، فأراد ﷺ بذلك التنبيه إلى ما سيحصل بها من الغَنَاء في العلم والدين. وقد وقع كما أخبر، فإنها أدَّت إلينا علماً غزيراً، وانفردت برواية أحكام كثيرة، وسننٍ وأحوال خَفِيَّة في بيت النبوة، حتى احتاج الصحابة إلى علمها، وهذه الخصيصة ما شاركها فيها أحد من نساء العالمين.

....

العاشرة: فيه أنَّ من أشرف خصال المرأة توسُّعها في علوم الكتاب والسنَّة، فإن عائشة رضي الله عنها قد كان علمها أبرز صفاتها ـ بعد تزوج النبي ﷺ بها ـ؛ ولذا شُبِّهت بالثريد لنفعه، حتى قال أبو موسى الأشعري: ما أشكل علينا أصحاب رسول الله ﷺ حديث قَطّ فسألنا عائشة إلَّا وجدنا عندها منه علم. رواه الترمذي بسندٍ صحيح.

❑❑❑

الحديث الخامس والعشرون

أخبرني العلَّامة النحوي الصالح القاضي محمد بن علي نَشْر الآنِسِي قراءةً عليه بصنعاء، أخبرني والدي إجازةً، عن أحمد بن أحمد الجرافي، عن عبد الله بن محمد العَيْزَري، عن الإمام محمد بن علي الشوكاني بإسناده[1] إلى الحافظ ابن حجر قال: أخبرنا أبو علي الفاضلي إجازة عن يونس بن إبراهيم، عن أبي الحسن ابن المُقَيَّر، عن أبي الفضل بن ناصر، عن أبي القاسم بن أبي عبد الله بن مَنْدَة، أخبرنا أبو الفضل محمد بن عمر الكَوْكَبي، أخبرنا أبو القاسم الطبراني، حدثنا إسحاق بن إبراهيم الدَّبَري، **أخبرنا الإمام عبد الرزاق بن هَمَّام الحِمْيري مولاهم الصنعاني، عن معمر، عن الزهري قال:**

أخبرني سعيد بن المسيَّب وعروة بن الزبير وعلقمة بن وقَّاص وعبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود **عن حديث عائشة زوج النبي ﷺ حين قال لها أهل الإفك ما قالوا، قال: فبرَّأها الله،** وكلُّهم حدَّثني بطائفة من حديثها، وبعضهم كان أوعى لحديثها من بعض، وأثبت اقتصاصاً، وقد وعيت عن كل واحد منهم الحديث الذي حدثني، وبعض حديثهم يُصَدِّق بعضاً.

(١) في الحديث الواحد والعشرين.

ذكروا أن عائشة زوج النبي ﷺ قالت: **كان رسول الله ﷺ إذا أراد أن يَخْرج سفراً[1] أقرع بين نسائه، فأيتهنّ خرج سهمها خرج بها رسول الله ﷺ معه.**

قالت عائشة: فأقرع بيننا في غزاة غزاها، فخرج فيها سهمي، فخرجت مع رسول الله ﷺ، وذلك بعد ما أنزل الله علينا الحجاب، وأنا أُحْمَلُ في هودجي، وأُنْزَلُ فيه، فسرنا حتى إذا فرغ رسول الله ﷺ من غزوه قفل، ودنونا من المدينة، آذن ليلةً بالرحيل، فقمتُ حين آذنوا بالرحيل، فمشيت، حتى جاوزت الجيش، فلما قضيت شأْني، أقبلت إلى رحلي، فإذا عقد لي من جَزْعِ ظَفَار[2] قد انقطع، فالتمست عِقدي، فحَبَسَني ابتغاؤه، وأقبل الرهط الذين كانوا يَرْحَلون بي، فحملوا الهودج، فَرَحَلُوه على بعيري الذي كنت أركب، وهم يحسبون أني فيه ـ قال: وكانت النساءُ إذ ذاك خِفافاً، فلم يَهْبِلن[3]، ولم يَغْشَهُنَّ اللحمُ، إنما يأْكُلنَ العُلْقة[4] من الطعام ـ، فلم يستنكر القوم ثقل الهودج حين رَحَلوه، ورفعوه، وكنتُ جارية حديثة السن، فبعثوا الجمل وساروا به، ووجدت عقدي بهما بعدما استمرَّ الجيش، فجئت منازلهم، وليس بها داعٍ ولا مجيب، فتيمَّمت منزلي الذي كنت فيه، وظننت أن القوم سيفقدوني فيرجعون إليَّ، فبينا أنا جالسة في منزلي غلبتني عيناي، فنمت، حتى أصبحت، وكان صفوان بن المعطَّل

(١) أي في سفر. وإنما نصب «سفراً» بنزع الخافض.

(٢) خرز معروف في سواده عروق بيض يؤتى به من ظفار في اليمن.

(٣) أي يثقلن.

(٤) أي القليل.

السُّلمي ثم الذكواني قد عَرَّس من وراء الجيش، فادَّلج[١]، فأصبح عندي، فرأى سواد إنسان نائم، فأتاني، فعرفني حين رآني، وقد كان رآني قبل أن يُضْرَب عليَّ الحجاب، فما استيقظت إلَّا باسترجاعه حين عرفني، فخَمَّرْتُ وجهي بجلبابي، ووالله ما كلَّمني كلمة غير استرجاعه، حتى أناخ راحلته، فوطىء على يديها، فَرَكِبْتُها، فانطلق يقود بي الراحلة، حتى أَتينا الجيش بعدما نزلوا موغرين في نحر الظهيرة، فَهَلك من هلك في شأني، وكان الذي تولَّى كبره عبد الله بن أُبيّ ابن سلول. فقدمتُ المدينة فتشكَّيْت[٢] حين قدمتها شهراً، والناس يخوضون في قول أَهل الإفك، ولا أَشعر بشيءٍ من ذلك، وهو يَرِيْبُني في وجعي أني لا أعرف من رسول الله ﷺ اللُّطف الذي كنت أرى منه حين أشتكي، إنما يدخل رسول الله ﷺ فيسلِّم ويقول: «كيف تِيْكُم؟»[٣]، فذلك الذي يَريبني ولا أَشعرُ، حتى خرجت بعدما نَقِهْتُ[٤]، وخرجتْ معي أُمُّ مِسْطَح قِبَلَ المَنَاصِع[٥]، وهو مُتَبَرَّزُنا، ولا نخرج إلَّا ليلاً إلى ليلٍ، وذلك قبل أن تُتَّخذ الكُنُف[٦] قريباً من بيوتنا، فانطلقت أنا وأُم مسطح، وهي ابنة أبي رُهْم بن عبد المطلب بن عبد مناف، وأُمّها أُمّ صَخْر بن عامر، خالةُ أبي بكر الصدِّيق، وابنها

---

(١) أي سار من آخر الليل.
(٢) أي مرضت.
(٣) أي هذه. وتي: اسم إشارة للأنثى.
(٤) أي شفيت.
(٥) اسم موضع في المدينة تقضى فيه الحاجة.
(٦) جمع كَنيف وهو مكان قضاء الحاجة.

مسطح بن أُثاثة بن عَبّاد بن عبد المطلب بن عبد مناف، فأقبلتُ أنا وابنة أبي رُهْم قِبَل بيتي، حين فرغنا من شأننا، فعثرت أم مسطح في مِرْطِها[1] فقالت: تَعِس مسطح، . قلت لها: بئس ما قلت، أتسُبِّين رجلاً شهد بدراً؟! قالت: أي هَنْتاه[2] أو لم تسمعي ما قال؟ قالت: وماذا قال؟ قالت: فأخبرتني بقول أهل الإفك؛ فازددت مرضاً إلى مرضي، **فلمَّا رجعت إلى بيتي دخل عليَّ رسول الله ﷺ، فسلَّم، ثم قال: «كيف تيكم؟»** قلت: أتأذن لي أن آتي أبَوَيّ؟ قالت: وأنا حينئذٍ أريد أن أتيقن الخبر من قِبَلِهما، **فأذن لي رسول الله ﷺ،** فجئت أَبَوَيَّ، فقلت لأُمِّي: يا أُمَّه! ما يتحدَّث الناس؟ فقالت: أي بُنَيَّةُ هَوِّني عليك، فوالله لَقَلَّما كانت امرأة قط وَضِيئةٌ عند رجل يُحِبّها ولها ضرائر، إلَّا أكثرن عليها، قلت: سُبْحان الله!! أوَ قد تحدَّث الناس بهذا؟! قالت: نعم، قالت: فبكيت تلك الليلة لا يرقأُ لي دمع، ولا أكتحل بنوم، ثم أصبحت أبكي. **ودعا رسول الله ﷺ عليَّ بن أبي طالب، وأُسامة بن زيد، حين استلبث[3] الوحي، يستشيرهُما في فراق أهله،** قالت: فأمَّا أُسامة فأشار على رسول الله ﷺ بالذي يعلم من براءة أهله، وبالذي يعلم في نفسه من الوُدّ لهم، فقال: يا رسول الله!، هم أهلُك، ولا نعلم إلَّا خيراً. وأمَّا علي فقال: لم يضيِّق الله عليك، والنساءُ سواها كثير، وإن تسأل الجارية تَصْدُقك، قالت: **فدعا رسول الله ﷺ بريرة، فقال: «أيْ بريرة! هل رأيتِ من**

(١) المرط: كساء يؤتزر به وتتلفع به المرأة.

(٢) أي يا هذه.

(٣) أي تأخر.

شيءٍ يَرِيْبُكِ من أمر عائشة؟» فقالت له بريرة: والذي بعثك بالحق إنْ رأيتُ عليها أمراً قَطُّ أَغْمِصُه[١] عليها أكثر من أنها جارية حديثة السن، تنام عن عجين أهلها فتأتي الداجِن[٢] فتأكله. قالت: فقام رسول الله ﷺ فاستعذر من عبد الله بن أُبَيّ ابن سلول، قالت: فقال رسول الله ﷺ وهو على المنبر: **«يا معشر المسلمين! من يَعْذِرُني مِنْ رجل قد بلغ أذاه في أهل بيتي؟! فوالله ما علمت على أهل بيتي إلَّا خيراً، ولقد ذكروا رجلاً ما علمت عليه إلَّا خيراً، وما كان يدخل على أهلي إلَّا معي»**. فقام سعد بن معاذ الأنصاري فقال: أَعْذِرُك منه يا رسول الله! إنْ كان من الأوس ضربنا عنقه، وإن كان من إخواننا من الخزرج أَمرتنا ففعلنا أمرك. قالت: فقام سعد بن عبادة، وهو سيد الخزرج، وكان رجلاً صالحاً، ولكنه حملته الجاهلية، فقال لسعد بن معاذ: لَعَمْرُ الله لا تقتلنه، ولا تقدر على قتله. فقام أُسيد بن حضير وهو ابن عم سعد بن معاذ، فقال لسعد بن عبادة: كذبتَ لعمر الله، لنقتلَنَّه، فإنَّك منافق، تجادل عن المنافقين. قالت: فثار الحيَّان الأوس والخزرج، حتى هَمُّوا أن يقتتلوا، ورسول الله ﷺ قائم على المنبر، فلم يزل يُخَفِّضهم حتى سكتوا، وسكت النبي ﷺ، قالت: ومكثت يومي ذلك لا يَرْقَأُ لي دمعٌ، ولا أكتحل بنوم، وأَبواي يَظُنَّان أن البكاء فالق كبدي، قالت: فبينا هما جالسان عندي وأنا أبكي استأْذَنَتْ عليَّ امرأة، فأذنتُ لها، فجلست تبكي معي، فبينما نحن على ذلك دخل علينا رسول الله ﷺ، ثم جلس، قالت: ولم يجلس عندي منذ ما قيل،

---

(١) أي أعيبه.

(٢) أي الشاة.

وقد لبث شهراً لا يُوحىٰ إليه، قالت: فتشهد رسول الله ﷺ حين جلس، ثم قال: «**أمَّا بعد يا عائشة! فإنه قد بلغني عنك كذا وكذا، فإن كنتِ بريئةً فسيبرِّئك الله، وإن كنتِ أَلْمَمْتِ بذنب، فاستغفري الله وتوبي إليه، فإن العبد إذا اعترف بذنبه، ثم تاب، تاب الله عليه**».

قالت: فلما قضى رسول الله ﷺ مقالته، قَلَصَ دمعي، حتى ما أُحِسُّ منه قَطْرَةً، فقلت لأبي: أَجِبْ عنِّي رسولَ الله ﷺ فيما قال. فقال: والله ما أدري ما أقول لرسول الله ﷺ. فقلت لأُمِّي: أجيبي عنِّي رسول الله ﷺ. قالت: والله ما أدري ما أقول لرسول الله ﷺ. فقلت ـ وأنا جارية حديثة السن، لا أَقرأُ من القرآن كثيراً ـ: إني والله لقد عَرَفْتُ أنكم قد سمعتم بهذا الأمر حتى استقرَّ في أنفسكم، وصدَّقتم به، فَلَئِن قلتُ لكم: إني بريئة، والله يعلم براءتي؛ لا تصدِّقوني بذلك، ولئن اعترفت لكم بذنب، والله يعلم أني بريئة؛ لَتُصَدِّقُوني، وإني والله ما أجد لي ولكم مثلاً إلَّا كما قال أبو يوسف: ﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَٱللَّهُ ٱلْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ﴾. قالت: ثمَّ تحولتُ، فاضطجعت على فراشي، وأنا والله حينئذٍ أعلم أني بريئة، وأن الله مبرِّئي ببراءتي، ولكن والله ما كنتُ أظن أن يُنْزَل في شأني وحيٌ يُتلى، ولَشأني كان أحقر في نفسي من أن يتكلَّم الله فِيَّ بأمر يُتلى، ولكن كنتُ أرجو أن يرى رسول الله ﷺ في المنام رؤيا يُبَرِّئني الله بها، قالت: فوالله ما رام رسول الله ﷺ مجلسه، ولا خرج من أهل البيت أحدٌ، حتى أَنزل الله على نبيِّه ﷺ، فأخذه ما كان يأْخذه من البُرَحاءِ[1] عند الوحي،

---

(١) أي شدَّة الكَرْب.

حتى إنه ليتحدَّر منه مثل الجُمان[1] في اليوم الشاتِ من ثقل الوحي الذي أُنزل عليه، قالت: فلمَّا سُرِّي عن رسول الله ﷺ سُرِّي عنه وهو يضحك، وكان أولُ كلمة تكلَّم بها أن قال: «**أبشري يا عائشة! أما والله قد أبرأَك الله**»، فقالت لي أُمِّي: قومي إليه. فقلت: لا والله لا أقوم إليه، ولا أحمد إلَّا الله، هو الذي أنزل براءتي. قالت: فأنزل الله تبارك وتعالى: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ جَآءُو بِٱلْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ﴾ عشر آيات، فأنزل الله هذه الآيات في براءتي، قالت: فقال أبو بكر ـ وكان يُنفق على مِسْطح لقرابته منه، وفقره ـ: والله لا أُنفق عليه شيئاً أبداً، بعد الذي قال لعائشة، فأنزل الله: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُوْلُواْ ٱلْفَضْلِ مِنكُمْ وَٱلسَّعَةِ﴾ إلى قوله: ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ ٱللَّهُ لَكُمْ﴾، فقال أبو بكر: والله إني لأُحبُّ أن يغفر الله لي، فرجع إلى مِسطح النفقة التي كان ينفق عليه، وقال: والله لا أنزعها أبداً، قالت عائشة: وكان رسول الله ﷺ سأل زينب ابنة جحش زوج النبي ﷺ عن أمري: ما علمتِ؟ أو ما رأيتِ؟ فقالت: يا رسول الله! أحمي سمعي وبصري، والله ما علمتُ إلَّا خيراً، قالت عائشة: وهي التي كانت تُساميني من أزواج النبي ﷺ، فعصمها الله بالورع، وطفقتْ أختها حمنة ابنة جحش تُحارب لها، فهلكَتْ فيمن هلك، قال الزهري: فهذا ما انتهى إلينا من أمر هؤلاء الرهط.

---

(١) أي اللؤلؤ، والمراد تشبيه عرقه ﷺ بحبَّات اللؤلؤ في الصفاء والحُسْن.

هذا إسناد صحيح، رواه عبد الرزاق في المصنَّف. ومن طريقه رواه مسلم. ورواه البخاري عن الزهري به نحوه.

ووقع في نسب مِسْطح وأُمّه «عبد المطلب» والصواب حذف «عبد».

*** فيه مسائل كثيرة جدًا، منها**

الأولى: فيه المنقبة العظيمة للصديقة بنت الصديق حبيبة خليل الله تعالى بِتَوَلِّي الله تعالى بنفسه براءتها، وتكلُّمه سبحانه في ذلك بآيات تتلوها الأمم بعد الأمم في مشرق الأرض ومغربها إلى قيام الناس لرب العالمين.

الثانية: فيه وجوب حسن الظن بالنبي ﷺ وآل بيته وأصحابه رضي الله عنهم.

الثالثة: فيه أن سوء الظن يفتح أبواب الفتن وظلم الخلق، وأنه وبال على أصحابه في الدنيا والآخرة.

الرابعة: فيه أن العاقبة للمتقين، فقد وقع ظلم على النبي ﷺ وعلى آل بيته، فصبروا واحتسبوا فكفاهم الله شرّ هذا الإفك، وأعزَّهم بآيات فيها ذِكْرهم ورفع شأنهم، ففيه دلالة على أن الكفاية على قدر الولاية.

الخامسة: فيه أن من أعظم الذنوب وأربى الربا استطالة الرجل في عرض أخيه المسلم، ولا سيما إن كان في النبي ﷺ وآل بيته، وانظر كيف كانت عقوبة من دخل في الإفك واعتبر بها.

السادسة: فيه أن الأصل في ورود الخبر بالسوء عن المؤمنين هو حسن الظن لا سوء الظن، وهذا خلاف ما اعتاد الناس، وخلاف العادة هذا أراد الله سبحانه أن يربي عليه الأمة الصالحة، ولذا قال: ﴿لَّوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ ٱلْمُؤْمِنُونَ وَٱلْمُؤْمِنَـٰتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا۟ هَـٰذَآ إِفْكٌ مُّبِينٌ﴾.

....

السابعة: فيه أن أكثر ما يُنْقَل عن المؤمنين من السوء لو أردت البيِّنَة الصحيحة عليه من الناقل لم تجده، ولذا قال سبحانه عن هذه الحادثة بعد الآية السابقة: ﴿لَّوْلَا جَآءُو عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا۟ بِٱلشُّهَدَآءِ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ عِندَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلْكَـٰذِبُونَ﴾.

الثامنة: فيه أن لا يَكُفّ عن الخوض في أعراض المؤمنين إلَّا أهل الورع؛ لقول عائشة عن زينب «... فَعَصَمها الله بالورع»، وأنَّ مَنْ لم يكفّ هَلَك؛ لقولها: «... وطفقت أختها حمنة ابنة جحش تحارب لها فهلكت فيمن هَلَك» فهذا أحد موازين الورع.

التاسعة: فيه أن العفو عِزٌّ لأهله في الدنيا، ومغفرة عظيمة في الآخرة، لقوله سبحانه: ﴿وَلْيَعْفُوا۟ وَلْيَصْفَحُوٓا۟ ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ ٱللَّهُ لَكُمْ ۗ﴾، وهو دأب الأكابر من الصِّدِّيقين والصالحين، ولذا قال أبو بكر رضي الله عنه: «والله إني لأحب أن يغفر الله لي...».

العاشرة: فيه أن الشائعات من أكبر أسباب الفتن وموجبات العقوبة.

الحادية عشر: فيه عِظَم الرب جل وعلا في قلوب آل البيت وأصحاب النبي ﷺ وتجريد التوحيد لله عزَّ وجلّ، فإن عائشة رضي الله عنها قالت: «والله لا أقوم إليه، ولا أحمد إلَّا الله، هو الذي أنزل براءتي» فقد صَحَّحَتْ لأمّها حين قالت: «قومي إليه»، وأَقَرَّها النبي ﷺ ووافقها أبو بكر رضي الله عنها. وقد رُوِّينا في المعرفة للحاكم عن حبَّان بن موسى المروزي ـ صاحب ابن المبارك ـ أنه قال: قلت لعبد الله بن المبارك: قول عائشة رضي الله عنها للنبي ﷺ حين نزل براءتها من السماء: «بحمد الله لا بحمدك» إني لأستعظم هذا القول!! فردَّ عليه ابن المبارك بقوله: «وَلَّتِ الحَمْدَ أَهْلَهُ».

الثانية عشر: فيه أن من آذى آل البيت رضي الله عنهم في أعراضهم، أو مكر بهم، ففيه شَبَهٌ بالمنافقين، وسينقلب مكره عليه، ولذا قال سبحانه:

....

﴿لِكُلِّ ٱمْرِيٍٕ مِّنْهُم مَّا ٱكْتَسَبَ مِنَ ٱلْإِثْمِ وَٱلَّذِى تَوَلَّىٰ كِبْرَهُۥ مِنْهُمْ لَهُۥ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾، وقال: ﴿وَلَا يَحِيقُ ٱلْمَكْرُ ٱلسَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِۦ﴾.

الثالثة عشر: فيه أن الابتلاء في الأنفس والأعراض سُنَّةٌ من السنن الكونية، والشأن ليس فيها، وإنما بالعمل فيها على وفق محبوب الله تعالى بالعدل والحكمة.

الرابعة عشر: فيه أن من يخدم المرأة من آل البيت في الركوب لا ينبغي له أن يكَلِّمها إلَّا عند الحاجة إكراماً لنساء الآل، وصيانة لهن.

الخامسة عشر: فضيلة من رعى آل البيت وصانهم ولا سيما وقت الحاجة، وقال الإمام النووي في شرح مسلم: فيه فضائل ظاهرة لصفوان بن المعطَّل رضي الله عنه بشهادة النبي ﷺ له بما شهد، وبفعله الجميل في إركاب عائشة رضي الله عنها، وحُسْن أدبه في جملة القضية اهـ.

السادسة عشر: فيه أن الفتن لا يحل أن يتكلم فيها إلَّا أهل العلم والحكمة، ومن ذلك أن التوجيه فيها للأكابر لا للأصاغر.

السابعة عشر: قال الإمام النووي: براءة عائشة رضي الله عنها من الإفك، وهي براءة قطعية بنص القرآن العزيز، فلو تَشكَّكَ فيها إنسان ـ والعياذ بالله ـ صار كافراً مرتداً بإجماع المسلمين، قال ابن عباس وغيره: لم تَزْنِ امرأةُ نبي من الأنبياء صلوات الله وسلامه عليهم أجمعين، وهذا إكرام من الله تعالى لهم اهـ.

الثامنة عشر: فيه أن نساء آل البيت لَسْنَ كأحدٍ من النساء، فإنه يطلب منهن من الصيانة والتستر والحجاب ما لا يطلب من غيرهن، لأنهنَّ ذروة سنام الاقتداء.

التاسعة عشر: فيه التواضع العظيم لآل البيت، وذلك في قول أم المؤمنين، والله ما كنتُ أظن أن ينزل في شأني وَحْي يُتْلى، ولشأني كان أحقر

....

في نفسي من أن يتكلم الله فيَّ بأمرٍ يتلى...»، قال الحافظ ابن كثير في تفسيره: «...وهذا كان احتقارها لنفسها، وتصغيرها لشأنها، فما ظنّك بمن صام يوماً أو يومين، أو قام ليلة أو ليلتين، فظهر عليهم شيء من الأحوال، ولاحظوا أنفسهم بعين استحقاق الكرامات، وأنهم ممن يُتَبرَّك بلقائهم، ويُغْتَنم بصالح دعائهم، وأنهم يجب على الناس احترامهم وتعظيمهم، ويُتَمسَّح بأثوابهم، ويُقَبَّل ثرى أعتابهم، وأنهم من الله بالمكانة التي ينتقم لهم لأجلها مَنْ تَنقَّصهم في الحال، وأن يؤخذ من أساء الأدب عليهم من غير إمهال، وأن إساءة الأدب عليهم ذنب لا يكفِّره شيء إلَّا رضاهم، ولو كان هذا من وراء كفاية لهان، ولكن من وراء تخلُّف، وهذه الحماقات والرعونات نتاج الجهل الصميم، والعقل غير المستقيم. اهـ.

العشرون: فيه أن آل البيت ربما وقعتْ بينهم الغيرة، لكن يجب أن لا تكون الغيرة حاملةً على الظلم.

❑❑❑

الحديث السادس والعشرون

أخبرنا الشيخ المعمَّر السيِّد محمد بن عبد الهادي البَقَّالي المالكي بقراءتي عليه بطنجة، أخبرني أحمد بن الصدِّيق الغُماري، أخبرنا محمد بن جعفر الكتاني، أخبرنا أبو جِيْدَة بن عبد الكبير الفاسي، أخبرنا عبد الغني بن أبي سعيد الدهلوي، أخبرنا عابد السندي، أخبرنا الوجيه الأهدل، أخبرنا أَمْرُ الله بن عبد الخالق المِزْجاجي، أخبرنا محمد بن أحمد المعروف بابن عَقِيْلَة.

ح. وعالياً بدرجتين، أخبرني ملحق الأحفاد بالأجداد العلامة الأثري أحمد بن نصر النُّعْماني قراءةً عليه بالمدينة، أخبرني عبد الباقي الأيوبي اللكنوي بالمدينة، عن أبي الخير أحمد بن عبد الله مِيْرْداد المكي، عن السيد عبد الله بن محمد كُوْجَك البخاري، عن عابد السندي، أخبرني أحمد بن سليمان الهَجَّام، أخبرنا أحمد بن محمد مقبول الأهدل.

قالا: أخبرنا أحمد بن محمد النَّخْلي، عن البرهان إبراهيم الكوراني، عن أحمد بن محمد القشاشي، عن أحمد بن علي الشِّنَّاوي، عن الوجيه عبد الرحمن بن فَهْد، عن الشيخ جار الله بن فهد، عن أحمد بن أبي القاسم محمد العَقِيلي النويري، أخبرنا قاضي

القضاة أحمد بن إبراهيم شهابُ الدين المقدسي إجازةً، أخبرنا رحلة الدنيا أبو الحسن علي بن أحمد بن البخاري إذناً إن لم يكن سماعاً، أخبرنا أبو المكارِم أحمد بن محمد اللَّبَّان كتابةً من أصبهان عن أبي علي الحسن بن أحمد الحدَّاد، أخبرنا أبو نصر أحمد بن الحسين الكَسَّار.

ح. ورواه الكوراني وساقه، عن القشاشي، عن الشنَّاوي، عن قطب الدين محمد بن أحمد بن محمد النَّهْروالي، عن والده، عن جلال الدين أحمد بن عبد الله الطاووسي، عن محمد بن أحمد الأنصاري، عن الضياء أحمد بن محمد القرشي العدوي، عن الضياء أحمد بن عبد الرحمن المقدسي الصالحي، عن أبي العباس أحمد بن شيبان بن تَغْلِب الشيباني الصالحي، عن أبي عبد الله أحمد بن منصور الجويني، عن أبي طاهر أحمد بن محمد السِّلَفي، عن أبي بكر أحمد بن علي بن عبد الله بن خلف الشيرازي، عن أبي نصر الكَسَّار، أخبرنا الحافظ أبو بكر أحمد بن إسحاق بن السُّنِّي، **أخبرنا أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي الحافظ قال:**

أخبرني أحمد بن يحيى الصوفي، حدثنا أبو نعيم، حدثنا عيسى بن طهمان أبو بكر قال: سمعت أنس بن مالك يقول:

«كانت زينب بنت جحش تفتخر على نساء النبي ﷺ تقول: **«إن الله عزَّ وجلّ أنكحني من السماء»، وفيها نزلت آية الحجاب»**.

رواه النسائي بإسناد صحيح، وهو مسلسل كما ترى في أغلبه بالأَحْمَدِين. ورواه البخاري عن عيسى به نحوه وزاد: «وأطعم عليها

يومئذٍ خبزاً ولحماً»، وفي لفظٍ له: «جاء زيد بن حارثة يشكو، فجعل النبي ﷺ يقول: «**اتَّق الله وأمسك عليك زوجك**»، قال أنس: لو كان رسول الله ﷺ كاتماً شيئاً لكتم هذه».

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه المنقبة العظيمة لأم المؤمنين زينب، حيث زُوِّجت من غير وليٍّ ولا شهود ولا كاتب، فلم يكن ذلك لامرأة في تاريخ الإسلام غيرها.

الثانية: وفيه خصيصة لآل البيت، حيث تولَّى الرب سبحانه إنكاح أم المؤمنين من فوق سبع سماوات، ولم يكن ذلك في بيتٍ غيرهم.

الثالثة: فيه إثبات صفة العلو لله تبارك وتعالى، كما يليق به سبحانه: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ﴾.

الرابعة: فيه وجوب الحجاب، حتى أنزله الله في كتابه العزيز، وحتى كان الصحابة يؤرخون به كما قالت عائشة في حادثة الإفك: «وكان رآني قبل الحجاب».

الخامسة: فيه جواز حديث المرء من آل البيت عن نفسه إذا تَضَمَّن ذلك علماً، أو كان ثَمَّ حاجة إليه.

السادسة: فيه أن أعراس آل البيت فيها الدعوة والإعلان لا السِّر والكتمان.

السابعة: فيه أن طعام الوليمة في أعراس آل البيت قد كان يسيراً، لأنهم كانوا يَرْجُون بركة النكاح بقلَّة المؤونة فيه، ولم يولم النبي ﷺ على إحدى نسائه مثل ما أولم على زينب؛ أولم بِشَاة.

الثامنة: فيه تواضع النبي ﷺ في زواجه من زينب بعد مولاه زيد بن حارثة.

التاسعة: روى هذا الخبر مسلم عن ثابت عن أنس، وذكر صفة الخطبة قال: «لمَّا انقضت عدة زينب قال رسول الله ﷺ لزيد: «**فاذكرها عَلَيّ**»، فانطلق زيد حتى أتاها وهي تُخَمِّر عجينها، قال: فلما رأيتها عَظُمَتْ في صدري حتى

....

ما أستطيع أنْ أنظر إليها أنَّ رسول الله ﷺ ذكرها، فولَّيتها ظهري، ونكصت على عَقِبيْ، فقلت: يا زينب أرسل رسول الله ﷺ يذكُرُكِ، قالت: ما أنا بصانعة شيئاً حتى أُوَامِرَ ربي. فقامت إلى مسجدها، ونزل القرآن، وجاء رسول الله ﷺ فدخل عليها بغير إذن».

وفيه ما كان عليه الصحابة من تعظيم آل البيت، خصوصاً زيد بن حارثة.

وفيه صفة زواجه ﷺ ودخوله بزينب كما تقدَّم وهذا من خصائصه ﷺ.

وفيه من اللطائف أن الرسول بينهما في الخطبة هو زوجها الأول.

العاشرة: فيه كما قال الحافظ في الفتح أنَّ من وَكَل أمره إلى الله عزَّ وجلّ يسَّر الله له ما هو الأحظّ له والأنفع، دُنْيا وأخرى.

الحادية عشر: فيه ما كان عليه النبي ﷺ من حسن السيرة والسريرة، فما تَرَكَ دقيقة ولا جليلة من النصح إلَّا دلَّ الأمة عليه، ولو كان كاتماً شيئاً من الوحي لكتم هذه الآية: ﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِىٓ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَٱتَّقِ ٱللَّهَ. . .﴾ الآية، وأئمة آل البيت أولى الناس بالاقتداء به في ذلك رضي الله عنهم.

الثانية عشر: قوله: «وفيها نزلت آية الحجاب»، يريد قوله تعالى: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَدْخُلُواْ بُيُوتَ ٱلنَّبِىِّ إِلَّآ أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَٰظِرِينَ إِنَىٰهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَٱدْخُلُواْ فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَٱنتَشِرُواْ وَلَا مُسْتَـْٔنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى ٱلنَّبِىَّ فَيَسْتَحْىِۦ مِنكُمْ وَٱللَّهُ لَا يَسْتَحْىِۦ مِنَ ٱلْحَقِّ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَٰعًا فَسْـَٔلُوهُنَّ مِن وَرَآءِ حِجَابٍ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ. . .﴾ الآية، فقول أنس: «وفيها» أي أنها كانت سبباً في نزول الآية كما يُعلم هذا من الأخبار والتفاسير بالآثار.

❑❑❑

الحديث السابع والعشرون

أخبرني العلامة المتفنن النبيل محمد بن القاضي عبد الله بن عبد الكريم الجرافي قراءةً عليه بصنعاء، أخبرني والدي بإسناده[١] إلى الحافظ ابن حجر قال: أنبأنا أبو علي الفاضلي، عن يونس بن إبراهيم، عن عبد الرحمن بن مَكِّي، عن أبي القاسم بن بَشْكُوَال، أخبرنا عبد الرحمن بن محمد بن عتَّاب، أخبرنا أبو عمر بن عبد البر، أخبرنا أبو عمر أحمد بن عبد الله الباجي، عن أبيه، عن عبد الله بن يونس القبري، عن بقي بن مَخْلَد، عن **الحافظ أبي بكر بن أبي شيبة العبسي قال:**

حدثنا زيد بن الحُبَاب، حدثني أبو معشر، حدثني عمر مولى غُفْرَة وغيرُه قال:

لمَّا توفي رسول الله ﷺ جاءه مال من البحرين فقال أبو بكر: من كان له على رسول الله ﷺ شيء أو عِدَة فليقم فليأخذ، فقام جابر فقال: إن رسول الله ﷺ قال: «**إن جاءني مال من البحرين لأعطيتك هكذا وهكذا**» ثلاث مرار، وحثى بيده، فقال له أبو بكر: قم فخذ بيدك؛ فأخذ، فإذا هي خمسمائة درهم، فقال: عُدّوا له ألفاً،

(١) في الحديث الواحد والعشرين.

وقسم بين الناس عشرة دراهم عشرة دراهم، وقال: إنما هذه مواعيد وعدها رسول الله ﷺ. حتى إذا كان عامٌ مُقْبِلٌ، جاءه مال أكثر من ذلك المال، فقسم بين الناس عشرين درهماً عشرين درهماً، وَفَضَلَتْ منه فَضْلة، فقسم للخدم خمسة دراهم خمسة دراهم، وقال: إن لكم خُدّاماً يَخْدُمُوْنَكم ويعالجون لكم، فرضخنا لهم. فقالوا: لو فضَّلت المهاجرين والأنصار؛ لسابقتهم، ولمكانهم من رسول الله ﷺ؟!! فقال: أجر أولئك على الله، إنَّ هذا المعاش الأسوة فيه خير من الأَثَرة، قال: فعمل بهذا ولايته؛ حتى إذا كانت سنة ثلاث عشرة في جمادى الآخرة من ليالٍ بَقِيْنَ منه، مات رضي الله عنه، فعمل عمر بن الخطاب ففتح الفتوح وجاءته الأموال، فقال: إنَّ أبا بكر رأى في هذا الأمر رأياً، ولي فيه رأي آخر، لا أجعل من قاتل رسول الله ﷺ كمن قاتل معه، ففرض للمهاجرين والأنصار وممن شهد بدراً خمسة آلاف خمسة آلاف، وفرض لمن كان له إسلام كإسلام أهل بدر ولم يشهد بدراً أربعة آلاف أربعة آلاف، وفرض لأزواج النبيِّ ﷺ اثني عشر ألفاً اثني عشر ألفاً إلَّا صفية وجويرية، فرض لهما ستة آلاف ستة آلاف، فأبتا أن تقبلا، فقال لهما: إنما فرضت لهن للهجرة، فقالتا: إنما فرضت لهن لمكانهن من رسول الله ﷺ، وكان لنا مثله؛ فعرف ذلك عمر، ففرض لهما اثني عشر ألفاً اثني عشر ألفاً، وفرض للعباس اثني عشر ألفاً، وفرض لأُسامة بن زيد أربعة آلاف، وفرض لعبد الله ابن عمر ثلاثة آلاف، فقال: يا أَبَةِ، لم زدته عليَّ ألفاً؟ ما كان لأبيه من الفضل ما لم يكن لأبي، وما كان له ما لم يكن لي، فقال: إن أبا أُسامة كان أحب إلى رسول الله ﷺ من أبيك، وكان أسامة

أحب إلى رسول الله ﷺ منك. وفرض لحسنٍ وحسينٍ خمسة آلاف خمسة آلاف، ألحقهما بأبيهما، ولمكانهما من رسول الله ﷺ، وفرض لأبناء المهاجرين والأنصار ألفين ألفين، فمرَّ به عمر بن أبي سَلَمة فقال: زيدوه ألفاً، فقال له محمد بن عبد الله بن جحش: ما كان لأبيه ما لم يكن لأبينا وما كان له ما لم يكن لنا؟! فقال: إني فرضت له بأبيه أبي سَلَمة ألفين، وزدته بأمه أم سلمة ألفاً، فإن كانت لكم أُمٌّ مِثْلُ أُمِّه زدتكم ألفاً، وفرض لأهل مكة وللناس ثمانمائة ثمانمائة، فجاءه طلحة بن عبيد الله بأخيه عثمان، ففرض له ثمانمائة، فمرَّ به النضر بن أنس فقال عمر: افرضوا له في ألفين، فقال طلحة: جئتك بمثله ففرضت له ثمانمائة درهم، وفرضت لهذا ألفين؟! فقال: إن أبا هذا لَقِيَني يومَ أُحُدٍ فقال لي: ما فعل رسول الله ﷺ؟ فقلت: ما أُراه إلَّا قد قُتِل، فسلَّ سيفه فكسر غمده وقال: إن كان رسول الله ﷺ قد قتل فإن الله حيٌّ لا يموت، فقاتل حتى قُتِل، وهذا يرعى الشاء في مكان كذا وكذا.

فعمل عمر بدء خلافته حتى كانت سنة ثلاث وعشرين حَجَّ تلك السنة فبلغه أن الناس يقولون: لو مات أمير المؤمنين قمنا إلى فلان فبايعناه، وإن كانت بيعة أبي بكر فَلْتَة. فأراد أن يتكلم في أوسط أيام التشريق، فقال له عبد الرحمن بن عوف: يا أمير المؤمنين، إن هذا مكان يغلب عليه غوغاء الناس وَدَهْمُهم ومن لا يحمل كلامك مَحْمَلَه، فارجع إلى دار الهجرة والإيمان، فَتَكَلَّمْ فَيُسْمَعْ كلامُك. فَأَسْرَعَ فقدم المدينة فخطب الناس وقال: يا أيها الناس، أما بعد، فقد بلغني ما قاله قائلكم: لو مات أمير المؤمنين قمنا إلى فلان فبايعناه وإن كانت بيعة

أبي بكر فلتة، وايم الله إن كانت لفلتة وقانا الله شَرَّها، فمن أين لنا مثل أبي بكر نَمُدُّ أعناقنا إليه كَمَدِّنا إلى أبي بكر، إنما ذاك تَغِرَّةَ لِيُقْتَلَ[١]، من أَمَرَ[٢] أمور المسلمين من غير مشورة فلا بيعة له، ألا وإني رأيت رؤيا ولا أظن ذاك إلَّا عند اقتراب أجلي، رأيت ديكاً نَزَا إليَّ فنقرني ثلاث نَقَرات، فتأولتْ لي أسماء بنت عُميس، قالت: يقتلك رجل من أهل هذه الحمراء، فإن أمت فأمركم إلى هؤلاء الستَّة الذين توفي رسول الله ﷺ وهو عنهم راضٍ: إلى عثمان وعلي وطلحة والزبير وعبد الرحمن بن عوف وسعد بن أبي وقاص، فإن اختلفوا فأمرهم إلى عليٍّ، وإن أعش فسأوصي، ونظرتُ في العمة وبنت الأخ ما لهما يُوْرَثان ولا يَرِثان، وإن أَعِشْ فسأفتح لكم أمراً تأخذون به، وإن أمت فسترون رأيكم، والله خليفتي فيكم، وقد دونت لكم دواوين، ومَصَّرت لكم الأمصار، وأجريت لكم الطعام إلى الجار[٣]، وتركتكم على واضحة، وإنما أتخوف عليكم رجلين: رجلاً قاتل على تأويل هذا القرآن يُقْتل، ورجلاً رأى أنه أحق بهذا المال من أخيه فقاتل عليه حتى قتل.

فخطب نهار الجمعة، وطُعِن يوم الأربعاء.

---

(١) وقع في مطبوعات المصنف «تفرة ليفتل» وهو تصحيف، والصواب ما أثبت، فالخبر في البخاري وغيره بهذا المعنى، والمراد: أن من فعل ذلك فقد غرَّر بنفسه وعَرَّضها للقتل. ووقع في البخاري «تغرة أن يُقتلا»، أي غرر بنفسه وبصاحبه وعرضهما للقتل. وهذا أشبه.

(٢) وقع في مطبوعات المصنف «أمير»، والصواب: «أَمَرَ»، أي صار أميراً.

(٣) الجار: اسم ميناء على ساحل البحر الأحمر يبعد عن المدينة نحو ٢٠٠كلم، اندثر وقام مكانه بلدة «الرايس». ومراد عمر: أنه حمل الطعام حتى أوصله هذا الميناء ومنه إلى المدينة، كما بسط هذا في أنساب الأشراف.

هذا إسناد حسن، رواه ابن أبي شيبة في المصنَّف.

وأبو معشر هو نَجيح بن عبد الرحمن مولى بني هاشم، صدوق تُكُلِّم في حفظه، وغالب حديثه متابع عليه، وكذلك له شواهد. ثم إن في الحديث قصة، وقد قال الإمام أحمد: إذا كان في الحديث قصَّة دلَّ على أن راويه حَفِظَه.

لكن قوله «فإن اختلفوا فأمرهم إلى عليّ» فيه نظر.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه ما كان عليه عمر وأصحاب النبي ﷺ من تعظيم النبي ﷺ وتعظيم آل بيته.

الثانية: ينبغي للحاكم الاجتهاد في إعطاء آل البيت حقهم من بيت المال، وتقديمهم على غيرهم.

الثالثة: فيه التأكيد على أئمة آل البيت الذين عرفوا بصحة النسب وسلامة الدين أن يبادروا إلى ضبط ما تفرَّع من أنسابهم لئلا يقول قائل ويتمنَّى مُتَمَنٍّ، فقد كثر في الأعصار المتأخرة دعوى النسب الشريف، وقد ثبت في الصحيحين أن النبي ﷺ قال: «**من ادَّعى إلى غير أبيه وهو يعلم فالجنة عليه حرام**».

الرابعة: فيه إجماع الصحابة والأمة بعدهم على عدالة الصحابة رضي الله عنهم، فإن أبا بكر لم يطلب البَيِّنة من أحدٍ منهم على العِدة أو صحة النقل عن النبي ﷺ، وأقرَّه الصحابة في هذا المحفل فكان إجماعاً.

الخامسة: فيه عمق علم أمير المؤمنين عمر رضي الله عنه حيث قَدَّم محبوب رسول الله ﷺ بعد مماته، وعَظَّم آل بيته، وحفظ فيهم وصيَّته. وتَأَمَّلْ وجه ذلك في عطائه أزواجه ﷺ وعمَّه العباس وزيداً وابنَه والنضر بن أنس، وجعل الحسن والحسين على صغر سِنِّهما كأكابر المهاجرين والأنصار.

....

السادسة: فيه اختلاف الشيخين في تقدير العطاء، والتحقيق أنه اجتهادي، ومرجعه ولي الأمر، ويعمل فيه بالأصلح زماناً ومكاناً وحالاً.

السابعة: فيه أن طريق ثبوت الولاية العامة تكون بالتعيين من الإمام المُسْتَخْلِف أو بيعة أهل الحل والعقد.

الثامنة: فيه أن من أمور السياسة والرعية ما لا يصلح أن يُخْطَب به في العامة والعلن، بل الحكمة الحديث فيه بين الخاصة وأهل العلم والحكمة.

التاسعة: فيه أن أكبر واق للفتن هو الاجتماع والائتلاف، لا التفرق والاختلاف.

العاشرة: فيه أن العالم الحكيم هو الذي يجمع الأمة ولا يفرِّقها، وأن فتح أسباب الفتن هو سبيل غوغاء الناس ودهمهم، لا العلماء المصلحين.

الحادية عشر: فيه أن من العلل الشرعية والحِكَم ما لا يدركه أكابر الأئمة، وهذا أدعى إلى الإخلاص والتجريد والتسليم لله تعالى، الذي له الحكمة البالغة.

الثانية عشر: فيه أن من أخطر ما يهدِّد وحدة الأمة الطاغوت الأكبر وهو التأويل، يفهم الحَدَثُ الغِرُّ فهماً من الكتاب والسنَّة، ثم يقاتل الأمة عليه، ويفهم نصف الفقيه فهماً ويُلزم الأمة به، ويفهم الحاكم الجاهل فهماً أو شذوذاً من الأقوال فيعذِّب الخلق فيه.

الثالثة عشر: فيه فضيلة أمير المؤمنين عليّ، ومنزلته عند الصحابة وعمر رضي الله عنهم.

الرابعة عشر: فيه الرد على من زعم أن أمير المؤمنين عمر رضي الله عنه أخذ مال فَدَك حرماناً لآل البيت، لأنه رضي الله عنه قدَّمهم على الناس في كثرة العطاء.

....

قال شيخ الإسلام ابن تيمية بعد ذكره هذا الخبر: تفضيله لهم أمر مشهور عند جميع العلماء بالسير، لم يختلف فيه اثنان، فمن تكون هذه مراعاته لأقارب الرسول ﷺ وعترته؛ أَيَظْلِمُ أقرب الناس إليه وسيدة نساء أهل الجنة - وهي مصابة به - في يسير المال، وهو يعطي أولادها أضعاف ذلك المال!! ويعطي من هو أبعد عن النبي ﷺ منها ويعطي عليًّا!! اهـ.

الخامسة عشر: فيه أن عليًّا وغيره من آل البيت بايعوا أمير المؤمنين عمر بيعة شرعية، وإلَّا فلو كان كافراً ما حَلَّ لهم أخذ الخمس والعطاء منه، لأنه والحال هذه مالٌ أُخِذ على غير وجهه، وآل البيت منزَّهون عن الصدقة، لأنها أوساخ الناس، فكيف يأخذونها من الكفار الأنجاس، حاشاهم جميعاً رضي الله عنهم.

الحديث الثامن والعشرون

أخبرني العلامة الصالح الشريف إدريس بن محمد بن جعفر بن إدريس الكتَّاني المالكي قراءةً عليه بطنجة، أخبرنا والدي إجازةً إن لم يكن سماعاً، أخبرنا والدي جعفر، عن أبي محمد الوليد بن العربي العراقي، عن حمدون بن الحاج، عن أحمد بن المبارك السِّجِلْماسي، عن أبي الحسن الحريشي، عن عبد القادر الفاسي، عن أبي العباس المَقَّرِي، عن عمِّه سعيد بن أحمد المَقَّري مفتي تِلْمِسان ستين سنة، عن محمد بن محمد بن عبد الله بن عبد الجليل التَّنَسي، عن والده، عن محمد بن مرزوق الحفيد، عن جدِّه محمد بن أحمد بن مرزوق الخطيب، عن الحافظ محمد بن جابر الوادي آشي قال: حدثني جمال الدين المِزِّي، أخبرنا أبو الغنائم المُسَلَّم بن عَلَّان، أخبرنا حنبل بن عبد الله الرصافي، أخبرنا ابن الحُصَين، أخبرنا المُذْهب، أخبرنا القطيعي، حدثنا عبد الله بن الإمام أحمد بن حنبل، **حدثنا أبي قال:**

حدثنا جرير بن عبد الحميد أبو عبد الله، عن يزيد بن أبي زياد، عن عبد الله بن الحارث، عن عبد المطلب بن ربيعة قال:

دخل العباس على رسول الله ﷺ فقال: يا رسول الله إنَّا لنخرج

فَنَرى قريشاً تَحَدَّثُ، فإذا رأونا سكتوا! فغضب رسول الله ﷺ وَدَرَّ عِرْقٌ بين عينيه، ثم قال: «والله لا يَدْخُل قَلْبَ امرئٍ إيمانٌ حتى يُحِبَّكم لله ولقرابتي».

هذا إسناد حسن، رواه الإمام أحمد، وَيَزِيْدُ في حفظه نَقْصٌ. لكن له شواهدُ عدَّة، منها عند ابن ماجه: عن محمد بن كعب القُرَظي عن العباس، وسنده جيِّد لولا الانقطاع بين القرظي والعباس. وعن أبي الضحى عن العباس عند ابن أبي شيبة هكذا. ووصله بذكر ابنِ عباسٍ الطبرانيُّ وابنُ شَبَّة والخطيبُ وابنُ عساكر وغيرهم. وصحَّح الخبر جماعة كالترمذي والحاكم وشيخ الإسلام ابن تيمية. ومن ضَعَّفه فكأنه لم يتنبَّه لشواهده.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه أن من الإيمان حبُّ آل البيت رضي الله عنهم.

الثانية: قوله: «يحبَّكم لله»، هذا قدر مشترك بين آل البيت وغيرهم من المؤمنين، لأن من الموالاة محبة كل مؤمن ومؤمنة، لكن قوله: «ولقرابتي»، قدر زائد على المحبة لله، ولا يختص هذا إلَّا بآل البيت.

الثالثة: قوله: «قريشاً»، أي جماعة من قريش، وهذا الجفاء قد كان من بعضهم لقرب عهدهم بالجاهلية، فقد كان بين بطون قريش من التنافس ما هو معروف في الأخبار والسِّيَر، وزاد ذلك ما حصل من قتل المسلمين لرؤوس الشرك منهم، ثم النبوة في بني هاشم زادت عداوة بعضهم، ولذا ذكروا: «أن أبا قحافة لمَّا ولي ابنه أبو بكر الخلافة قال: أَرَضِيَتْ بنو عبد مناف وبنو مخزوم؟! قالوا: نعم. قال: ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء. وجاء أبو سفيان إلى عليٍّ فقال: أرضيتم أن يكون هذا الأمر في بني تَيْم! فقال: يا أبا سفيان إنَّ أمر الإسلام ليس كأمر

....

الجاهلية». ولمَّا حَسُن إسلامهم وأذهب الله عنهم عُبِّيَّة الجاهلية، ذهب هذا الجفاء، وقد يكون بقي في أفرادٍ شيءٌ، فالله أعلم بما في أنفسهم، وفضائل قريش ومناقبها في الأخبار الصحيحة بخيريَّتها وسلامة نفوسها تشهد بذلك.

الرابعة: فيه منقبة عظيمة للعباس عم رسول الله ﷺ.

الخامسة: فيه استحباب الغضب عند إيذاء آل البيت، وإن قَلَّ أو صَغُر.

السادسة: فيه وجوب الانتصار لآل البيت على من يبغضهم، لأن بغضهم وتَنَقّصهم منكر قبيح يدل على ضعفٍ في الدين.

السابعة: فيه الرد على النواصب في بُغْضِهم آل البيت، وأنَّهم مستحقون لغضب رسول الله ﷺ في الدنيا، فَبِمَ يرجون شفاعته يوم القيامة!

الثامنة: فيه إشارة إلى فضل قرابة رسول الله ﷺ على كل قرابة، قال شيخ الإسلام ابن تيمية: «حتى يحبوكم لله ولقرابتي»، إذا كانوا أفضل الخلق فلا ريب أن أعمالهم أفضل الأعمال، وكان أفضلهم رسول الله ﷺ الذي لا عِدْل له من البشر، فَفَاضِلُهم أفضل من كل فاضل، من سائر قبائل قريش والعرب، بل ومن بني إسرائيل وغيرهم... اهـ.

التاسعة: فيه أن مرجع آل البيت كلهم عند التنازع وغيره هو رسول الله ﷺ، لا يَسْتَقِلّ أحد عنه مهما بلغت منزلته من أئمة آل البيت، ولو فُرِض أن العباس لم يرجع إلى رسول الله ﷺ لخفي الحق في هذه المسألة، فاعتبر بذلك؛ فإن الخير كل الخير في الرجوع إليه في حياته، وإلى سُنَّته وشريعته بعد وفاته.

العاشرة: فيه أن النبي ﷺ لا يحلف إلَّا في أمرٍ عظيم.

الحادية عشر: فيه أنه ﷺ لا يغضب إلَّا لأمرٍ عظيم.

❑❑❑

الحديث التاسع والعشرون

أخبرني الشيخ الصالح المعمر محمد بن عبد الرحمن بن إسحاق بن عبد الرحمن آل الشيخ النجدي الحنبلي قراءةً عليه بالرياض، أخبرنا الشيخ حمد بن فارس، أخبرنا الشيخ عبد الرحمن بن حسن بن الإمام المجدد محمد بن عبد الوهاب، أخبرنا جدي بإسناده[١] **إلى الإمام البخاري قال:**

حدثنا الحسن بن محمد، حدثنا محمد بن عبد الله الأنصاري، حدثني أبي عبدُ الله بن المثنى، عن ثمامة بن عبد الله بن أنس، عن أنس بن مالك:

أنَّ عمر بن الخطاب رضي الله عنه كانوا إذا قُحِطوا استسقى بالعباس بن عبد المطلب، فقال: «اللهمَّ إنَّا كُنَّا نتوسل إليك بِنَبِيِّنا فَتَسْقِينا، وإنَّا نتوسَّل إليك بِعَمِّ نبينا فاسْقِنا» قال: فَيُسْقَوْن.

رواه البخاري.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه أن صالحي آل البيت رضي الله عنهم مَظِنَّة إجابة الدعاء.

الثانية: فيه استحباب الاستسقاء بأئمة آل البيت وإحضارهم ليؤمِّن الناس

---

(١) في الحديث التاسع.

على دعائهم كما نصَّ عليه الفقهاء، وكما أشار إليه جماعات، منهم البغوي.

الثالثة: مشروعية طلب الدعاء في الحاجات الخاصة والعامة من أهل الولاية الأحياء سيَّما آل البيت.

الرابعة: ينبغي أن يُنْزَل كبار آل البيت منزلة الوالد.

الخامسة: إجماع الصحابة على تعظيم آل البيت، وإجماعهم على تعظيم عمر لآل البيت، وأن إجماعهم حُجَّة. ففي هذا الخبر إجماعات ثلاثة، فتأمَّل.

السادسة: فيه إثبات الكرامة لعم رسول الله ﷺ العباس بن عبد المطلب رضي الله عنه.

السابعة: فيه فضيلة أمير المؤمنين عمر رضي الله عنه لتواضعه للعباس، ومعرفته بِحَقِّه، كما قال الأمير في السُّبُل والحافظ في الفتح.

الثامنة: قوله: «كنا نتوسل إليك بنبيِّنا»، قال الآلوسي في تفسيره: لو كان التوسل به عليه الصلاة والسلام بعد انتقاله من هذه الدار لما عدلوا إلى غيره، بل كانوا يقولون: «اللَّهم إنا نتوسل إليك بنبيِّنا فاسقنا»، وحاشاهم أن يعدلوا عن التوسل بسيِّد الناس إلى التوسل بعمه العباس، وهم يجدون أدنى مساغ لذلك، فعدولهم هذا مع أنهم السابقون الأولون، وهم أعلم منَّا بالله تعالى ورسوله ﷺ، وبحقوق الله تعالى ورسوله عليه الصلاة والسلام، وما يُشْرع من الدعاء وما لا يشرع، وهم في وقت ضرورة ومخمصة، يطلبون تفريج الكربات، وتيسير العسير، وإنزال الغيث بكل طريقٍ، دَلِيْلٌ واضِحٌ على أن المشروع ما سلكوه دون غيره. اهـ.

التاسعة: فيه أن الأمور العامة مرجعها إلى ولي الأمر، فإن الناس سألوا عمر الاستسقاء كما سألوا النبي ﷺ، قال العيني: فيه أن الخروج إلى الاستسقاء والاجتماع لا يكون إلَّا بإذن الإمام، لما في الخروج والاجتماع من الآفات الداخلة على السلطان، وهذه سنن الأمم السالفة، قال تعالى: ﴿وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ إِذِ ٱسْتَسْقَىٰهُ قَوْمُهُۥٓ﴾ اهـ.

❑❑❑

الحديث الثلاثون

أخبرني العلَّامة الفقيه المعمر عبد الرحمن بن عبد الله بن أبي بكر المُلَّا الأحسائي الحنفي قراءةً عليه بالأحساء، عن بهاء الدين بن عبد الله الأفغاني الحنفي عن أبيه، عن المرتضى الزَّبيدي بإسناده[١] إلى الحافظ ابن حجر قال: أخبرتني فاطمة بنت المُنَجَّا التنوخية، عن التقي سليمان بن حمزة المقدسي، حدثنا الحافظ **ضياء الدين محمد بن عبد الواحد السَّعْدي المقدسي قال:**

أخبرنا عبد الباقي بن عبد الجبار الصوفي: أن أبا شجاع البِسْطامي أخبره قراءة عليه، أخبرنا أحمد بن محمد الخليلي، حدثنا علي بن أحمد الخزاعي، أخبرنا الهيثم بن كُليب، حدثنا أبو قلابة عبد الملك بن محمد الرَّقَاشي، حدثني عمر بن عامر وبشر بن مِهْران قالا: حدثنا شريك ـ قال أحدهما: حدثنا بمكة، ولم يذكر الآخر ـ، حدثنا شَبيب بن غَرْقَدة عن المُسْتَظِلّ بن حُصَين:

أنَّ عمر بن الخطاب خَطَب إلى عَلِيٍّ ابنته، فاعتلَّ عليه بِصِغَرها فقال: إني أعددتها لابن أخي جعفر.

---

(١) في الحديث الخامس عشر.

قال عمر: إني والله ما أردتُ بها الباه، إني سمعت رسول الله ﷺ يقول: «**كل سَبَب ونَسَب منقطعٌ يوم القيامة غيرَ سببي ونسبي**».

هذا إسنادٌ حسنٌ، وقع لنا هكذا في الأحاديث المختارة للضياء المقدسي. وشريك وإن كان في حفظه ضعف إلَّا أنه قد جاء من وجوه كثيرة مرسلاً وموصولاً عن جماعة من الصحابة، وفيها أنهم هَنَّأوه بهذا الزواج.

وقد احتجَّ به الإمام أحمد على أن معاوية رضي الله عنه داخل فيه، وأن له صِهْراً ونسباً.

وقوله: «ابنتَه»، هي أمّ كلثوم رضي الله عنها كما جاء مصرَّحاً في الروايات. والنسبُ بالولادة، والسبب بالزواج.

*** فيه مسائل:**

الأولى: أن الخبر تضمَّن خصوصية آل البيت بأن الأنساب والأسباب لا تنفع في القيامة إلَّا سببهم ونسبهم.

الثانية: قد وقع خلاف في الجمع بين حديث الباب وقوله تعالى: ﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي ٱلصُّورِ فَلَآ أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ﴾، فردَّ بعضُهم الحديثَ ولم يُصِب. **وقيل**: بل السبب والنسب هما القرآن والإيمان. **وقيل**: لا تنتفع الأمم يوم القيامة بأنسابها إلَّا هذه الأمة، فإنهم ينتفعون بانتسابهم إليه ﷺ.

قلت: وحديث الباب حجة عليهم، ولم يفهم الخليفتان الراشدان والصحابة معهم إلَّا كون ذلك خصيصة لآل البيت.

فإن قيل: يَرِد على ذلك ما رواه مسلم عن أبي هريرة مرفوعاً: «... **مَنْ بَطَّأَ به عمله لم يسرع به نَسَبه**»، وهذا عامٌ!!

....

فقل: وحديث الباب خاص.

وإن قيل: يَرِد على ذلك قوله ﷺ لبني هاشم: «لا يأتيني الناس بأعمالهم وتأتوني بأنسابكم»!!

فقل: هذا الحديث لا أصل له بهذا اللفظ يصح عن النبي ﷺ، ولو صحَّ فهو تحذير، لا نفيٌ لهذه الخصوصية، وإلَّا كان فَهْم أَمِيْرَي المؤمنين ومعهم سادات الصحابة فاسداً.

وإن قيل: في حديث الصحيحين المتقدم: «يا بني عبد مناف لا أغني عنكم من الله شيئاً...»!!

فقل: قد كان هذا خطاباً منه ﷺ في أول البعثة ودعوة قريشٍ إلى التوحيد، وأنَّ مَنْ لم يُجِبْه إليه فلن يغني عنه من الله شيئاً، كما يدل على ذلك سياق الخبر الذي تقدَّم، ولذا لم ينفع عَمَّه أبا لَهَبٍ مع دخوله في جملة النسب الشريف، فمن كان في دائرة التوحيد نفعه حديث الباب، ومَنْ لم يَكُنْ لم يُغْنِ عنه من الله شيئاً.

الثالثة: استحباب مصاهرة آل البيت، وقد أدرك سادة الصحابة ذلك، فصاهروا آل البيت، وممن صنع ذلك الأئمة الأربعة أبو بكر وعمر وعثمان وعليّ رضي الله عنهم.

الرابعة: قوله: «غير سببي ونسبي»، ليس فيه دليل على أن المُقَصّر من آل البيت لا يُعَذَّب، فإن الخبر لا يستلزمه، بل قد يعذَّب ثم تدركه الشفاعة، وقد تلفحه النار ثم تدركه رحمة أرحم الراحمين، كما يعلمه من تتبع أحوال البعث.

الخامسة: حديث الباب ليس حجة لمن يبتغي الفجور من آل البيت، لأنه إنْ فَعَل اتكاءً على هذا الحديث فقد صنع ما خشي منه أبو الأنبياء عليه السلام

....

إذ قال: ﴿وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ﴾، وأيُّ خِزْيٍ أَخْزَى من أن يأتي الناسُ النبيَّ ﷺ في الآخرة بالصالحات، ويأتيه آل بيته بالمنكرات.

السادسة: فيه أن إنكاح ذوي القربى من آل البيت أحق من غيرهم، إلَّا أن يكون مثل أمير المؤمنين عمر رضي الله عنه.

السابعة: فيه إشارة إلى أن أزواجه أمهات المؤمنين في الدنيا هُنَّ أزواجه في الآخرة، وقد جاء التصريح بذلك في عدَّة أخبار صحيحة، وأجمع على ذلك الصحابة ومن بعدهم.

الثامنة: فيه فضيلة أمير المؤمنين عمر رضي الله عنه في حرصه على اتِّباع السنَّة في النكاح ومصاهرة آل البيت على ضعف حاله، وقلة ذات يده، وكِبَر سنِّه.

التاسعة: قوله: «فاعتَلَّ بصغرها»، فيه إشارة إلى أن الأصل المستَقِرَّ عند أصحاب النبي ﷺ في الصغيرة أنها لا تُنْكَح.

العاشرة: فيه جواز الحلف على الأمور العظيمة.

❑❑❑

الحديث الواحد والثلاثون

أخبرني العلَّامة المحدِّث الصالح ثناء الله بن عيسى خان اللاهُوْري قراءة عليه ببيت الشيخ العجمي بالجهراء، أخبرنا عبد الله الرُّوْبْري، أخبرنا عبد الجبار الغَزْنوي، أخبرنا نذير حسين الدهلوي، عن محمد إسحاق الدهلوي، عن عبد العزيز بن ولي الله الدهلوي، عن أبيه، عن أبي طاهر الكوراني، أخبرنا العُجيمي، أخبرنا البابلي، عن السنهوري، عن الغَيْطي، **عن شيخ الإسلام زكريا الأنصاري قال**: أخبرنا إبراهيم بن صدقة الحنبلي، أخبرنا أبو علي الفاضلي بإسناده[1] **إلى الإمام أبي داود السجستاني قال**:

حدثنا أحمد بن صالح، حدثنا عنبسة، حدثنا يونس، عن ابن شهاب، أخبرني عبد الله بن الحارث بن نوفل الهاشمي، أن عبد المطلب بن ربيعة بن الحارث بن عبد المطلب أخبره: أن أباه ربيعة بن الحارث وعباس بن عبد المطلب قالا لعبد المطلب بن ربيعة وللفضل بن عباس: ائتيا رسول الله ﷺ فقولا له: يا رسول الله قد بَلَغْنا من السِّنِّ ما ترى، وأحببنا أن نتزوج، وأنت يا رسول الله أَبَرُّ الناس وأَوْصَلُهم، وليس عند أبوينا ما يُصْدِقانِ، فاستعملنا يا رسول الله

(١) في الحديث السادس.

على الصدقات، فلنؤدِّي إليك ما يؤدِّي العمال، ولنُصِبْ ما كان فيها مِنْ مِرْفَق، قال: فأتى عليٌّ بن أبي طالب ونحن على تلك الحال، فقال لنا: إن رسول الله ﷺ لا يستعمل منكم أحداً على الصدقة. فقال له ربيعة: هذا من أَمْرِك، قد نِلْتَ صِهْر رسول الله ﷺ فلم نَحْسُدْكَ عليه. فألقى عَلِيٌّ رداءه، ثم اضطجع عليه فقال: أنا أبو حَسَنٍ القَرْمُ، والله لا أرِيْمُ حتى يرجع إليكما ابناكما بجواب ما بعثتما به إلى النبي ﷺ.

قال عبد المطلب: فانطلقتُ أنا والفضل حتى نوافق صلاة الظهر قد قامت، فصلَّينا مع الناس، ثم أسرعتُ أنا والفضلُ إلى باب حجرة رسول الله ﷺ، وهو يومئذٍ عند زينب بنت جحش، فقمنا بالباب حتى أتى رسولُ الله ﷺ فأخذ بأُذُني وأُذُن الفضل ثم قال: أَخْرِجا ما تُصَرِّران. ثم دخل وأذن لي وللفضل، فدخلنا، فتواكلنا الكلام قليلاً، ثم كلَّمته أو كلَّمه الفضل ـ قد شَكَّ في ذلك عبد الله ـ قال كَلَّمَه بالذي أَمَرَنا به أبوانا، فسكت رسول الله ﷺ ساعةً وَرَفَع بصره قِبَل سقف البيت حتى طال علينا أنه لا يَرْجِعُ إلينا شيئاً، حتى رأينا زينب تُلَمِّعُ من وراء الحجاب بيدها، تُرِيْدُ: أن لا تَعْجَلا، وإنَّ رسول الله ﷺ في أمرنا، ثم خَفَّض رسول الله ﷺ رأسه فقال لنا:

«إنَّ هذه الصدقة إنما هي أوساخ الناس، وإنها لا تحلّ لمحمدٍ ﷺ ولا لآل محمد، ادعوا لي نوفل بن الحارث». فدعي له نوفل بن الحارث، فقال: **«يا نوفل أَنْكِحْ عبدَ المطلب»**. فأنكحني نوفلُ. ثم قال: **«ادعوا لي مَحْمِيَةَ بنَ جَزْء»**، وهو رجل من بني زُبيد، كان رسول الله ﷺ استعمله على الأخماس، فقال رسول الله ﷺ لِمَحْمِيَة:

«أَنْكِحِ الفضلَ»، فَأَنْكَحَه، ثم قال رسول الله ﷺ: «**قُمْ فَأَصْدِق عنهما من الخمس كذا وكذا شيئاً**» لم يُسَمِّه لي عبد الله بن الحارث.

هذا إسناد صحيح، رواه أبو داود، ورواه مسلم عن ابن شهاب نحوه.

وقوله: «مِرْفَق»: أي: منفعة. و«القَرْم»: أصله الفَحْل، ثم استعير للسيِّد المجرَّب للأمور. و«لا أَرِيْم»: لا أبرح من مكاني هذا. و«تُصَرِّرَان»: تكْتُمان. و«تُلَمِّع»: تُشِيْر.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه دخول بني عمومته ﷺ في آل بيته.

الثانية: فيه تحريم الصدقة على بني هاشم، وهم آل علي وآل العباس وآل جعفر وآل عقيل، كما تقدَّم.

الثالثة: ألحق الشافعي وأحمد رضي الله عنهما في تحريم الصدقة كذلك بني المطلب بِبَني هاشم لمشاركتهم لهم في إعطائهم من الخمس، فقد أعطاهم ﷺ معهم ـ كما في البخاري ـ دون إخوانهم من بني عبد شمس ونوفل، بكون بني هاشم وبني المطلب شيئاً واحداً في الجاهلية والإسلام.

الرابعة: في قوله: عن الصدقة: «**إنها لا تحل لمحمد ﷺ ولا لآل محمد**»، ثم أمره بإعطائهم من الخمس، دليل لما ذهب إليه أبو حنيفة رضي الله عنه من أنهم إذا مُنعوا من الخمس حَلَّتْ لهم الصدقة، وهو قول قوي، وقد قال به بعض محققي المالكية والشافعية والحنابلة والهادوية رحمهم الله تعالى.

الخامسة: فيه كَرَم نفوس آل البيت، إذ إنَّ الفضل وعبد المطلب لم يسألا النبي ﷺ، بل طلبا العمل بأجرة.

....

السادسة: قوله: «إنما هي أوساخ الناس»، قال أبو العباس القرطبي في «المُفْهِم»: إنما كانت الصدقة كذلك لأنها تطهرهم من البخل، وأموالهم من إثم الكنز، فصارت كأنها الغُسالة التي تُعاب اهـ.

السابعة: في جوابه ﷺ وقوله لهما: «إنها لا تحلّ لمحمد ﷺ ولا لآل محمد»، كما قال الإمام النووي في شرح مسلم: دليل على أنها محرمة سواء كانت بسبب العمل أو بسبب الفقر والمسكنة وغيرهما من الأسباب الثمانية، وهذا هو الصحيح عند أصحابنا، وجوَّز بعض أصحابنا لبني هاشم وبني المطلب العملَ عليها بِسَهْم العاملين، لأنها إجارة، وهذا ضعيف أو باطل، وهذا الحديث صريحٌ في ردِّه اهـ.

الثامنة: قول ربيعة: «هذا من أَمْرِكَ»، كأنه أراد أنَّ هذا من اجتهادك واستنباطك ورأيك، ولا يريد اتهامه على الكذب. لكن رُوِّينا الخبر عند الإمام أحمد وابن خزيمة بلفظ: «هذا من حَسَدك» ورجالهما ثقات. ورويناه عند أبي عبيد وابن زنجويه في الأموال والطبراني بلفظ: «هذا من حَسَدك وبَغْيك»، وفيه عبد الله بن صالح كاتب الليث وهو كثير الغَلَط، فكأن هاتين اللفظتين رويتا بالمعنى، ويؤيده قوله بعده: «فلم نحسدك»، وإلّا فهاتان كلمتان ما كان ينبغي أن تُقالا لأمير المؤمنين عليّ رضي الله عنه، ولسنا ندَّعي العصمة في أفراد الصحابة رضي الله عنهم، لا من آل البيت ولا من غيرهم، كما لا ندَّعي أن لا يخطىء بعضهم في حق بعض، فإنهم بشر كسائر الناس رضي الله عنهم أجمعين.

التاسعة: فيه أن تزويج الأب لابنه عند القدرة، هو من جنس النفقة لا الهبة والعطية التي يلزم فيها التسوية بين الأولاد، بخلاف حال العجز، فإن الأب لا يلزمه تزويج ابنه.

....

العاشرة: فيه أن الفضل وعبد المطلب سألا النبي ﷺ عملاً فجاءهما ما هو خير منه، قال العلامة ابن القيم في إعلام الموقعين: «وهذا اقتداء منه بربه تبارك وتعالى، فإنه يَسأله عَبْدُه الحاجةَ فيمنعه إياها ويعطيه ما هو أصلح له وأنفع منها، وهذا غاية الكرم والحكمة» اهـ.

الحادية عشر: فيه أن المفتي إذا منع السائل من شيء محرم فينبغي له أن يَدُلَّه على طريق مباح.

❑ ❑ ❑

الحديث الثاني والثلاثون

أخبرني الشيخ الصالح المقرىء محمد بن المكِّي بن بَرْبِيْش الرِّباطي المالكي قراءةً عليه وإجازة بالرِّباط، أخبرنا الشيخ أبو شعيب الدُّكَّالي، عن عبد الله بن عَوْدَة القَدُّومي، عن حسن بن عمر الشَّطِّي، عن مصطفى بن سعد الرُّحَيْباني، عن الشمس محمد بن أحمد السَّفَّاريني، عن عبد القادر بن عمر التغلبي، عن عبد الباقي الحنبلي، عن أحمد بن علي الوَفَائي المُفْلِحي، عن الشمس محمد بن علي بن طولون الصالحي قال: أخبرنا محمد بن محمد بن زُرَيق الحنبلي، عن حافظ دمشق محمد بن أبي بكر بن ناصر الدين، أخبرني الزين عمر بن محمد البالِسِي، أخبرتنا أم عبد الله زينب بنت الكمال المقدسية، عن سِبْط السِّلَفي عبد الرحمن بن مَكِّي، أخبرنا أبو طاهر أحمد بن محمد السِّلَفي، أخبرنا أبو الخَطَّاب نصر بن أحمد بن البَطِر، أخبرنا أبو محمد عبد الله بن عبيد الله بن يحيى بن البَيِّع، حدثنا **الحافظ القاضي أبو عبد الله الحسين بن إسماعيل الضَّبِّي المَحَامِلي إملاءً قال:**

حدثنا محمد بن الوليد، حدثنا محمد، يعني ابنَ جعفر، حدثنا شعبة، عن الحكم، عن ابن أبي رافع، عن أبي رافع:

أنَّ رسول الله ﷺ بعث رجلاً من بني مخزوم على الصدقة، فقال لأبي رافع: اصحبني كَيْما تُصيب منها، فقام فقال: حتى آتي النبي ﷺ فَأَسأله، فانطلق إلى النبي ﷺ فسأله، فقال: «**إن الصدقة لا تَحِلُّ لنا، وإن مولى القوم من أنفسهم**».

هذا إسناد صحيح، وقع لنا هكذا في أمالي المَحَامِلِي. ورواه الإمام أحمد وأبو داود والترمذي والنسائي عن شعبة به نحوه. وصحَّحه الترمذي وغيره.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه منقبةٌ لآل البيت في تحريم الصدقة على مواليهم.

الثانية: فيه فضيلة موالي آل البيت في تطهيرهم من أوساخ الناس.

الثالثة: فيه أن خدمة آل البيت شرف وفضيلة.

الرابعة: قال شيخ الإسلام ابن تيمية: أما تحريم الصدقة فَحَرَّمها عليه وعلى أهل بيته تكميلاً لتطهيرِهم، ودفعاً للتهمة عنه، كما لم يُوَرِّث، فلا يأخذ ورثته درهماً ولا ديناراً، بل لا يكون له ولمن يَمُوْنه من مال الله إلَّا نَفَقَتُهُم، وسائر مال الله يُصْرَف فيما يحبه الله ورسوله، وذوو قرباه يُعْطَون بمعروف من مال الخُمُس والفيء الذي يُعْطَى منه في سائر مصالح المسلمين لا يختص بأصنافٍ مُعَيَّنة كالصدقات... اهـ.

الخامسة: الظاهر ـ والله أعلم ـ أن مَنْع موالي آل البيت من الصدقة، كأنه ـ مع كمال التطهير الذي أشار إليه شيخ الإسلام ـ هو دفع التهمة أيضاً عنه وعنهم، فإن العادة جارية كثيراً بأن الملوك يأخذون أموال بيت المال بواسطة آلهم وقرابتهم وخَدَمهم، فقطع الشرع المطهر سائر هذه السُّبُل والعلائق التي قد يُتَوصل بها إلى ذلك، إمَّا على وجه الأصالة به ﷺ وبذريته وعصبته، أو على

....

وجه التبع بأزواجه أو مواليه.

السادسة: ما كان عليه موالي النبي ﷺ من الأدب، ورَدّ الأمر إليه ﷺ.

السابعة: فيه عطف أصحاب النبي ﷺ بعضهم على بعض، ولا سيما عند الحاجة والقِلَّة رضي الله عنهم.

الثامنة: فيه محبة الصحابة رضي الله عنهم لآل البيت حتى شَمِلَت محبتهم التابعين لآل البيت من الخدم والموالي.

التاسعة: فيه أن من أولى الناس بالبر في الوظائف الشرعية هم آل البيت ومن التحق بهم من الصالحين.

العاشرة: فيه دليل على تحريم الصدقة على موالي آل البيت ـ سوى موالي أمهات المؤمنين ـ والخبر صريح في ذلك، وهو حُجَّة على من جوَّز الصدقة عليهم، فإن اعترض بحديث بَرِيْرَة، فقد تقدم الجواب عنه في الحديث الخامس.

لكن هٰهنا فائدة لطيفة في حديث بريرة، وهي أن أزواجه ﷺ أمهات المؤمنين حُرِّمت الصدقة عليهن على وجه التَّبع كما تقدم، ومواليهن لم تحرم عليهم الصدقة، ففيه دلالة على أن موالي آل البيت بعد العتق لا تحرم على مواليهم الصدقة، لأنهم تَبَعٌ، بل هؤلاء أولى بالجواز من موالي أمهات المؤمنين رضي الله عنهم أجمعين.

❑❑❑

الحديث الثالث والثلاثون

أخبرني الفقيه الصالح محمد بن حسين فَقِيْرَهُ السِّنْدي الأصل الحُدَيْدي الحنفي قراءةً عليه بالحُدَيدة، أخبرنا حسن بن أحمد بن عبد الباري الأهدل، عن محمد بن عبد الرحمن بن الحسن بن عبد الباري الأهدل، عن جده، عن الوجيه الأهدل بإسناده[1] إلى ابن شِدَّاد، قال: أخبرنا محمد بن إسماعيل الحَضْرَمي، أخبرنا أبو عبد الله محمد بن إسماعيل بن أبي الصَّيْف الزَّبيدي، أخبرنا علي بن خَلَف التِّلِمْساني قراءةً عليه بالمسجد الحرام، أخبرنا الحسن بن علي الأنصاري البَطَلْيُوْسي، أخبرنا أبو بكر محمد بن الوليد الطُّرْطُوْشي، أخبرنا أبو علي التُّسْتَرِي، أخبرنا أبو عمر الهاشمي، أخبرنا أبو علي اللؤلؤي، قال: **أخبرنا الإمام أبو داود السجستاني قال:**

حدثنا عبد الله بن محمد النُّفَيْلي، حدثنا محمد بن سلمة، عن محمد بن إسحاق، عن يحيى بن عباد، عن أبيه عباد بن عبد الله بن الزبير، عن عائشة قالت: لما بَعَث أهل مكة في فداء أسراهم بعثت زينبُ في فداء أبي العاص بمالٍ، وبَعَثَتْ فيه بقلادة لها كانت عند

---

(١) السماعي في الحديث الرابع.

خديجة أَدْخَلَتْها بها على أبي العاص، قالت: فلما رآها رسول الله ﷺ رَقَّ لها رِقَّةً شديدة، وقال: «**إن رأيتم أن تطلقوا لها أسيرها وتَرُدُّوا عليها الذي لها**»، قالوا: نَعَم، وكان النبي ﷺ أَخَذَ عليه أو وعَدَه أن يُخَلِّيَ سبيل زينب إليه، وبَعَثَ رسول الله ﷺ زيد بن حارثة ورجلاً من الأنصار، فقال: «**كونا بِبَطْنِ يَأْجِج حتى تَمُرَّ بكما زينب فَتَصْحَباها حتى تأتيا بها**».

هذا إسناد جيد، رواه أبو داود، ومحمد بن إسحاق قد صرَّح بالسماع في «السيرة» له وفي عدَّة طرق. ورواه الإمام أحمد وابن الجارود والطبراني والحاكم وغيرهم عنه به نحوه.

و«يأجج» كمسجد، من أودية مكة.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه فضل البضعة النبوية زينب رضي الله عنها من عدَّة وجوه، منها: عظم محبة رسول الله ﷺ. ومنها: وفاؤها لزوجها. ومنها: حسن خُلقها. ومنها: إيثارها زوجها وحسن عهدها. ومنها: فداؤها زوجها بالقلادة التي وهبتها لها أمها خديجة. ومنها: تركها زوجها على محبتها له امتثالاً لرسول الله ﷺ.

الثانية: فيه أنه ينبغي لكل مؤمن يرى حالاً لا تَسُرُّ لبعض آل البيت أن يحمله ذلك على أمرين: **أحدهما**: الرِّقَّةُ لحالِه. **والآخر**: العمل على إصلاح هذا الحال ما استطاع إلى ذلك سبيلاً.

الثالثة: ما كانت عليه البضعة النبوية من حسن التربية والنُّبل وحسن الإسلام مع بُعْدها عن أهلها.

الرابعة: فضيلة صِهْر رسول الله ﷺ أبي العاص بن الرَّبيع، وما كان عليه من مكارم الأخلاق رضي الله عنه.

....

الخامسة: في هذا الخبر دلالة على نكارة ما روي أن زينب رضي الله عنها هاجرت مع أبيها ﷺ، كما أشار إليه الواقدي وغيره.

السادسة: **فإن قيل**: فكيف سافرت البضعة النبوية من غير محرم؟

فالجواب: قال الحافظ في الفتح: قال البغوي: لم يختلفوا في أنه ليس للمرأة السفر في غير الفرض إلَّا مع زوجٍ أو مَحْرم، إلَّا كافرة أسلمت في دار الحرب أو أسيرة تخلَّصت. وزاد غيره: أو امرأة انقطعت من الرفقة فوجدها رجل مأمون، فإنه يجوز له أن يصحبها حتى يبلغها الرفقة... اهـ.

وقال الإمام النووي في شرح مسلم: اتفق العلماء على أنه ليس لها أن تخرج في غير الحج والعمرة إلَّا مع ذي محرم، إلَّا الهجرة من دار الحرب، فاتفقوا على أنَّ عليها أن تهاجر منها إلى دار الإسلام وإن لم يكن معها محرم، والفرق بينهما أن إقامتها في دار الكفر حرام إذا لم تستطع إظهار الدين، وتخشى على دينها ونفسها، وليس كذلك التأخر عن الحج... اهـ.

كما أن إقامتها في دار الكفر أكثر مفسدة من سفرها بلا محرم، ولا سيما أنه ﷺ أرسل رجلين لا واحداً. فهذا كله يرفع الإشكال ولله الحمد والمنَّة.

السابعة: فيه محبة الصحابة لآل البيت، وإيثارهم لهم في الحقوق على ضعف حالهم رضي الله عنهم أجمعين.

الثامنة: فيه رِقَّة النبي ﷺ للضَّعَفة ولا سيما من آل البيت.

التاسعة: فيه دلالة على جواز المَنِّ على الأسرى بغير فداء إذا رأى الإمام ذلك، كما ذهب إليه الشافعي وأحمد والأوزاعي والثوري، وقد حصل بسبب ذلك خير كثير: مِنْ رَدّ البضعة النبوية إلى أبيها ﷺ، وإسلام أبي العاص بعد ذلك في قصة عظيمة مبسوطة في السيرة.

....

العاشرة: فيه أن الشفاعة في الأمور الدينية من أحسن الشفاعات لما لها من الآثار الصالحة.

الحادية عشر: فيه أنه ينبغي لآل البيت تزويج بناتهم من الأكفاء النبلاء، وإن لم يكونوا من الآل.

الثانية عشر: فيه ما كان عليه آل البيت والصحابة من التعاضد والتناصر والرحمة رضي الله عنهم أجمعين.

❑ ❑ ❑

الحديث الرابع والثلاثون

أخبرنا الشيخ المعمر المأمون بن العلَّامة عبد الحفيظ الفِهْري الفاسي المالكي بقراءتي عليه بالرباط، أخبرنا والدي إجازةً، أخبرنا أبو الطيب شمس الحق العظيم آبادي كتابةً من الهند، عن بشير الدين القِنَّوْجي، عن محمد رحيم الدين البخاري، عن الشاه عبد العزيز بن ولي الله الدهلوي، عن أبيه، عن أبي طاهر الكوراني، عن البصري، عن أبي الحسن الطبري، عن الخطيب الحَصَّاري، عن الشمس الغَمْري، عن الحافظ ابن حجر، عن أحمد بن عمر اللؤلؤي، عن الحافظ أبي الحجاج المزي، قال: أخبرنا يوسف بن يعقوب بن المُجَاور، أخبرنا أبو اليُمْن الكندي، أخبرنا أبو منصور القَزَّاز، أخبرنا **الحافظ أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي قال:**

أخبرنا محمد بن الحسين القَطَّان، أخبرنا عثمان بن أحمد الدَّقَّاق، حدثنا أبو العباس إسحاق بن يعقوب العطار، حدثنا عمار بن نصر، حدَّثني حكيم بن زيد الأشعري، عن إبراهيم الصائغ، عن عطاء، عن جابر بن عبد الله قال:

قال رسول الله ﷺ: **«أفضل الشهداء حمزة بن عبد المطلب، ثم رجلٌ قام إلى إمام جائر فأمره ونهاه فَقُتِل»**.

هذا إسناد حسن، وقع لنا هكذا في تاريخ بغداد للخطيب. وقول الأزدي عن حكيم بأنه متروك فيه نظر. ومع هذا فقد توبع، وله شواهد كذلك، وصحَّحه جماعة منهم الحافظ في الفتح، وفي بعض رواياته: «سيِّد الشهداء. . .».

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه المنقبة العظيمة لعم رسول الله ﷺ وأخيه من الرضاعة حمزة بن عبد المطلب باصطفائه أعلى مراتب الشهداء.

الثانية: فيه فضيلة آل البيت بأن اصطفى الله منهم سيد الشهداء فلا يشركهم في ذلك بيت من البيوتات.

الثالثة: فيه فضيلة الدعوة إلى الله عزَّ وجلّ.

الرابعة: فيه دلالة على أن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر فرض كفاية.

الخامسة: فيه تنبيه لطيف إلى أن الشهداء ليسوا في مرتبة واحدة، بل هم يتفاضلون بحسب نيَّاتهم وطاعة الإمام وإنفاق الكريمة ومياسَرَة الشريك واجتناب الفساد، كما يدل عليه قوله «أفضل».

السادسة: فيه أن نصيحة أئمة الجور أفضل من نصيحة غيرهم لما يترتب عليها من الخير في الناصح والمنصوح له وفي الأمة، ولذا رُتِّبَ عليها هذه المنزلة.

السابعة: فيه التنبيه على خطأ الخروج على أئمة الجور، فإنه لو كان ممدوحاً في الشرع لَقَاله النبي ﷺ في هذا المقام وغيره، فلما اقتصر على النصيحة من رَجُلٍ دلَّ على أن الزيادة بالخروج ليست من الشرع، وإلَّا لأَمَر به ولأَثْنى على فاعله، كما أثنى على الناصح هنا.

....

الثامنة: فيه إشارة إلى التثبُّت فيما يُنْسَب إلى الإمام من المنكرات، لأنه من لازم الأمر والنهي في قوله: «فَأَمَرَه ونهاه» فإذا لم يثبت فعل الإمام للمنكر صار فعل الناصح منكراً.

التاسعة: فيه فضيلة عظيمة لمن نصح لأئمة الجور فقتلوه.

العاشرة: فيه أنَّ مَنْ نَصَح لإمامٍ فقتله فهو من خير الشهداء.

الحادية عشر: فيه دليل لمن قال من المحققين: إنَّ مَنْ قُتِل ظُلْماً فهو شهيد، ويؤيده عِدَّة أخبار، منها: ما روِّيناه في الموطأ أنَّ عمر رضي الله عنه كان يقول: «اللهمَّ إني أسألك شهادةً في سبيلك ووفاةً بِبَلَدِ رسولك»، قال أبو الوليد الباجي رحمه الله في «المنتقى»: أجمع المسلمون على أن هذا الدعاء مستجاب، وأنه رضي الله عنه شهيد، وهذا يقتضي أنَّ من قُتل على هذ الوجه ـ وإنْ لم يُقْتَل في حربٍ ولا مدافعة ـ فإنه شهيد... اهـ.

❑❑❑

الحديث الخامس والثلاثون

أخبرني الفقيه المقرىء المعمر عبد الحميد بن أحمد بن الحسين الشهير بـ «أبو شحاته» العدوي المالكي قراءةً عليه وإجازةً خاصةً ببني عدي قُرْب أسيوط، أخبرني محمد حسنين مخلوف العدوي المالكي، أخبرنا أحمد بن محجوب الرفاعي المالكي، أخبرنا أحمد مِنَّة الله الأزهري المالكي، أخبرنا محمد بن محمد الشهير بالأمير الكبير المالكي، أخبرنا علي بن أحمد الصعيدي المالكي، عن الشمس ابن عَقيلة، أخبرنا العُجيمي بإسناده[1] **إلى الإمام البخاري قال:**

حدثنا عبيد الله بن موسى، عن إسرائيل، عن أبي إسحاق، عن البراء رضي الله عنه، قال:

«اعتمر النبي ﷺ في ذي القَعْدة، فأبى أهل مكة أن يَدَعُوه يدخلُ مكة حتى قاضاهم على أن يقيم بها ثلاثة أيام، فلما كتبوا الكتابِ كتبوا: «هذا ما قاضَى عليه محمد رسول الله ﷺ، فقالوا: لا نُقِرُّ بها، فلو نعلمُ أنَّك رسول الله ما منعناك، لكن أنت محمد بن عبد الله»، قال: **«أنا رسول الله، وأنا محمد بن عبد الله»**، ثم قال لِعَلِيٍّ: **«امْحُ رسول الله»**، قال: لا والله لا أمحوك أبداً. فأخذ رسول الله ﷺ

---

(١) في الحديث الثامن.

الكتابَ فكتب: «**هذا ما قاضَى عليه محمد بن عبد الله، لا يدخل مكة سِلاح إلَّا في القِراب، وأن لا يَخرج من أهلها بأحدٍ إن أراد أن يَتَّبِعَهُ، وأن لا يَمنع أحداً من أصحابه أراد أن يُقيم بها**»، فلمَّا دخلها ومضى الأجل أَتَوْا عَلِيًّا فقالوا: قل لصاحبكَ اخْرُج عنَّا فقد مَضَى الأجل. فخرج النبي ﷺ، فَتَبِعَتْهم ابنة حمزة: يا عَمّ يا عَمّ، فَتَنَاوَلَها عليٌّ فأخذ بيدها وقال لفاطمة عليها السلام: دُوْنَكِ ابنةَ عَمِّكِ احْمِلِيها.

فاختصم فيها عليٌّ وزيدٌ وجعفرٌ، فقال عليٌّ: أنا أحقُّ بها وهي ابنة عمي، وقال جعفر: ابنةُ عمِّي وخالتها تحتي، وقال زيد: ابنة أخي. فقضَى بها النبي ﷺ لخالتها وقال: «**الخالة بمنزلة الأم**»، وقال لِعَلِيٍّ: «**أنتَ منِّي وأنا مِنْكَ**»، وقال لجعفر: «**أشبهتَ خَلْقي وخُلُقي**»، وقال لزيد: «**أنتَ أخونا ومولانا**».

رواه البخاري هكذا. وروى مسلم أصل قصة الحديبية فقط، ومن عزاه له على هذا الوجه الذي ذكرنا فقد وهم.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه منقبة لجماعة من آل البيت: عليٌّ وحمزةَ وجعفرٍ والمَوْلَى الحِبّ زيد بن حارثة رضي الله عنهم.

الثانية: فيه فضيلة ذي الجناحين جعفر بن أبي طالب، حيث أثنى عليه النبي ﷺ هذا الثناء العظيم بقوله: «**أشبهت خلقي وخلقي**»، ولم يقل ذلك لأحدٍ غيره، وقد قال الله تعالى: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾.

الثالثة: فيه فضيلة أخرى لجعفر رضي الله عنه، حيث أصاب الحق قبل قضاء النبي ﷺ به.

....

الرابعة: فيه أن ولي الأمر إذا كان الخصوم جميعهم من آل البيت أنه ينبغي له أن يحكم بالحق، ثم يُرَضِّيَ الآخرين، إكراماً لآل رسول الله ﷺ، واتِّباعاً لِسُنَّته، بخلاف غيرهم؛ فلا يتأكد ذلك في حَقِّه.

الخامسة: فيه الرد على من ادَّعى العصمة في بعض آل البيت، فإنه ﷺ قال لجعفر: «أشبهتَ...»، ومع ذلك ما فَهِم أحدٌ من الصحابة والتابعين وآل البيت الطاهرين عصمةَ جعفرٍ مع عِظَم هذا التشبيه.

السادسة: فيه فضيلة ابنة حمزة رضي الله عنهما من وجوه، منها: محبة رسول الله ﷺ لها، وعنايته بقضيتها، ومنها: محبة عليّ وفاطمة لها، واهتمامهم بشأنها، فإنهما أبقياها معهما من مكة إلى المدينة، ومنها: محبتها هي لرسول الله ﷺ وآل البيت، ومنها: كونها سبباً لتشريع أحكام كثيرة في هذه الحادثة.

السابعة: فيه أنه ﷺ قضى بها لجعفر، لأن زوجته أسماءَ بنتَ عُمَيس خالتُها، وهي بمنزلة الأم في الحنوّ والشفقة، وهذه فضيلة لجعفر وزوجه رضي الله عنهما.

الثامنة: فيه أن الحاضنة إذا تزوَّجت بقريب المحضونة لا تسقط حضانتها كما قاله الإمام أحمد رحمه الله تعالى، وهو قول قويّ فيه جمع بين هذا الحديث وحديث: «**أنتِ أحقُّ به ما لم تنكحي**».

التاسعة: قوله لعليّ: «**أنتَ مني وأنا منك**»، قال الحافظ في الفتح: أي: في النسب والصهر والمسابقة والمحبة، وغير ذلك من المزايا، ولم يُرِد محض القرابة، وإلَّا فجعفر شَرِيْكُهُ فيها. اهـ.

العاشرة: قول زيد: «ابنة أخي»، يريد المؤاخاة على الحق والمواساة، فإن حمزة قد آخى النبيُّ ﷺ بينه وبين زيد قبل الهجرة، ولما قدموا المدينة، كما أشار إليه ابن القيم في الهدي.

....

قلتُ: وقد جاء التصريح بالمؤاخاة في هذه القصة كما في المسند وغيره عن ابن عباس.

الحادية عشر: قول ابنة حمزة للنبي ﷺ: «يا عم»، قيل: إنها خاطبته بذلك إجلالاً له، وإلَّا فهو ابن عمها، كذا قيل، وفيه نظر، والتحقيق أنها خاطَبَتْه بذلك لأنه ﷺ أخٌ لحمزة من الرضاعة، فهو عَمُّها، وقد صرَّح بذلك في إحدى روايات الصحيح هنا، لمَّا قال له عليّ: ألا تتزوجُ بنتَ حمزة؟ قال: إنها ابنة أخي من الرضاعة.

الثانية عشر: فيه أن حال الحرب ليس كحال السلم، وأن حال الضعف ليس كحال القوة، فللإمام أن يصالح الكفار على أشياء فيها لا تحل زمن قوة المسلمين، وهذا كما هو مقتضى الشرع المطهَّر فهو مقتضى الحكمة، والحفاظ على الدولة والأمة.

الثالثة عشر: قوله: «فتناولها عليّ فأخذ بيدها»؛ لأنها كانت صغيرة، وقد جاء التصريح بذلك من غير وجهٍ بأنها كانت جارية، وإلَّا فلا يخفى أن عليًّا هو ابنُ عمِّها وليس من محارمها، وأما قوله في الخبر كما تقدَّم: «ألا تتزوج ابنة حمزة» فهذا من اختصار الرواة، لأن عليًّا عَرَضها على النبي ﷺ بعدما بَلَغَتْ، كما جاءت به الرواية.

□□□

الحديث السادس والثلاثون

أخبرني العلَّامة الفقيه الصالح مُنِيْر بن عبد العزيز الكَسْم الحنفي قراءة عليه وإجازة بالمِزَّة بدمشق، أخبرنا عطا الله الكَسْم، أخبرنا عبد الغني بن طالب الغُنيمي، أخبرنا محمد أمين بن عمر بن عابدين، أخبرنا صالح بن محمد الفُلَّاني كتابة بإسناده[1] إلى الحافظ ابن حجر، عن السراج عمر بن علي القزويني، أخبرنا إسماعيل بن علي الطبَّال، أخبرنا إسماعيل بن محمد المؤدِّب، أخبرنا أحمد بن إسماعيل الطالْقاني، أخبرنا هبة الله بن سعيد الصُّعْلُوكي، أخبرنا الحسن بن محمد الصفَّار، أخبرنا أبو سعد عبد الرحمن بن حَمْدان، أخبرنا عبد الله بن محمد السِّمِّذِي، أخبرنا عبد الله بن محمد بن شِيْرَوَيْه، أخبرنا **إسحاق بن إبراهيم بن رَاهَوَيْه التميمي الحنظلي قال:**

أخبرنا سليمان بن حرب، حدثنا حماد بن سلمة، عن عبد الله بن عثمان بن خثيم، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس قال: كنتُ عند خالتي ميمونة زوج النبي ﷺ فدخل رسول الله ﷺ لقضاء الحاجة فأتيته بماءٍ، فقال رسول الله ﷺ لميمونة: «من فعل هذا؟» فقالت: عبد الله بن عباس.

(١) في الحديث السادس والثالث عشر.

فقال رسول الله ﷺ: «**اللَّهم فَقِّهه في الدين وعلِّمه التأويل**».

هذا إسناد صحيح، وقع لنا عالياً في المسند لإسحاق بن راهويه، ورواه الإمام أحمد وغيره عن حمادٍ به.

ووهم من عزاه بتمامه إلى الصحيحين، والذي فيهما: «اللَّهم فقِّهه»، زاد البخاري: «في الدين»، وفي لفظٍ له: «علِّمه الحكمة»، و«علِّمه الكتاب»، وقال البخاري: «الحكمة: الإصابة في غير النبوة»، وفي رواية الطبري في تهذيب الآثار والبزار: «تأويل القرآن».

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه المنقبة العظيمة لابن عباس حيث أصابته الدعوة النبوية فكان من أعلم الأمة بالكتاب والسنَّة.

الثانية: فيه أن إصابة الحق والتأويل لا يكون بكمال الاستعدادات فقط، بل هي مع ذلك توفيق من الله وعناية.

الثالثة: فيه استحباب المبالغة في إكرام آل البيت إذا صنعوا إلينا معروفاً.

الرابعة: فيه استحباب حث آل البيت على صحبة أئمة العلماء والتخلق بآدابهم، والاقتداء بهم في دلِّهم وسمتهم، ولا سيما إذا كانوا من أئمة آل البيت.

الخامسة: فيه استحباب تخصيص العالِم المتعلمَ بدعوات صالحات في العِلْم إذا رأى العالمُ نباهته.

السادسة: فيه أن تأويل ابن عباس رضي الله عنه للقرآن أقرب من غيره لوجوهٍ كما قال الإمام السيد محمد بن إبراهيم الوزير في «الإيثار»: منها: دعوة النبي ﷺ له. ومنها: أن التأويل قد جاء عنه تفسيراً كاملًا، ولم يتَّفق مثل ذلك لغيره من الصدر الأول، فمتى صحَّ الإسناد إليه كان تفسيره من أصح التفاسير، مقدَّماً على كثير من الأئمة والجماهير. ومنها: اتفاق الصحابة على تعظيمه في العلم عموماً، وفي التفسير خصوصاً، وسَمَّوه البحر والحبر، وقصة عمر معه

....

رضي الله عنهما مشهورة في إدخاله مع أكابر الصحابة. ومنها: كونه من أهل بيت النبوة ومعدن الرسالة. ومنها: أنه كان لا يستحل التأويل بالرأي حتى إنه قال: «من قال في القرآن برأيه فليتبوأ مقعده من النار». اهـ.

السابعة: قال الإمام ابن القيم: الفرق بين الفقه والتأويل: أن الفقه هو فهم المعنى المراد، والتأويل إدراك الحقيقة التي يؤول إليها المعنى التي هي آخِيَّتُه وأصله، وليس كل مَنْ فَقه في الدين عَرَف التأويل، فمعرفة التأويل يختص به الراسخون في العلم، وليس المراد به تأويل التحريف وتبديل المعنى، فإن الراسخين في العلم يعلمون بطلانه، والله يعلم بطلانه. اهـ.

الثامنة: فيه أن من مروءة الأكابر الانتباه إلى نوع ما يُحْسَنُ إليهم فيه، ليكون لكل نوع من المعروف ما يناسبه من الجزاء.

التاسعة: فيه أن ملازمة الأكابر من أهل العلم تورث الفقه في الدين، وتَعَلُّم التأويل.

العاشرة: ما في خدمة العلماء والقيام عليهم من الآثار الصالحة، وإصابة دعوتهم.

الحادية عشر: قوله: «الحكمة»؛ فيه أنه ليس كل فقيه يكون من أهل الحكمة، ولذا خصَّها النبي ﷺ في دعائه لابن عباس، وقال الله تعالى: ﴿يُؤْتِي ٱلْحِكْمَةَ مَن يَشَآءُ وَمَن يُؤْتَ ٱلْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾، وإنما تظهر الحكمة زمن الفتن والمصائب.

الثانية عشر: قوله: «علِّمه الحكمة»؛ فيه: أن من الحكمة ما يدرك بالتعلُّم، وأن النبيه من حملة العلم يتعلَّمها ويدركها أسرع من غيره، وهذا والله أعلم وجه مناسبة هذه الدعوة مع غيرها.

❑❑❑

الحديث السابع والثلاثون

أخبرنا العلَّامة المحدِّث الصالح عبد العزيز بن فَتْح الزُّبَيْدي المُلْتاني ثم اللاهوري بقراءتي عليه بها، أخبرنا أحمد الله القرشي، أخبرنا السيد نذير حسين الدهلوي، أخبرنا محمد إسحاق الدهلوي، أخبرنا عبد العزيز بن ولي الله الدهلوي، أخبرنا والدي، أخبرنا الشيخ وفد الله المالكي المكي، أخبرنا حسن بن علي العجيمي وعبد الله بن سالم البصري قالا: أخبرنا عيسى المغربي، أخبرنا سلطان بن أحمد المَزَّاحي، أخبرنا أحمد بن خليل السُّبْكي، أخبرنا النجم الغيطي، أخبرنا عبد الحق بن محمد السنباطي، أخبرنا البدر الحسن بن محمد الحسني النسَّابة، أخبرنا عَمِّي الحسن بن أيوب النسَّابة، أخبرنا الحافظ محمد بن جابر الوادي آشي، أخبرنا عبد الله بن هارون الطائي القرطبي، أخبرنا أبو القاسم أحمد بن يزيد بن عبد الرحمن بن بَقِيّ القرطبي بِغُرْفَة جَدِّه بقيّ بن مخلد، أخبرنا محمد بن عبد الحق الخزرجي، أخبرنا محمد بن فرج مولى ابن الطَّلَّاع، أخبرنا يونس بن عبد الله بن مُغيث المعروف بابن الصفَّار، أخبرنا أبو عيسى يحيى بن عبد الله بن يحيى ـ ثلاثاً ـ القرطبي، أخبرنا عَمُّ والدي عبيد الله بن يحيى بن يحيى الليثي، أخبرنا والدي يحيى بن يحيى الليثي، **أخبرنا الإمام أبو عبد الله مالك بن أنس الأصبحي**:

عن إسحاق بن عبد الله بن أبي طلحة: أنه سمع أنس بن مالك يقول: قال أبو طلحة لأمّ سُليم: لقد سمعتُ صوتَ رسول الله ﷺ ضعيفاً أَعْرِفُ فيه الجوع، فهل عندكِ من شيءٍ؟ فقالت: نعم. فأخرجتْ أقراصاً من شعير ثم أخذتْ خماراً لها فَلَفَّتِ الخُبْز ببعضه ثم دَسَّتْه تحت يَدِي وَرَدَّتْني ببعضه ثم أَرْسَلَتْني إلى رسول الله ﷺ، قال: فذهبتُ به، فوجدتُ رسول الله ﷺ جالساً في المسجد ومعه الناس، فقمتُ عليهم، فقال رسول الله ﷺ: «**آرْسَلَكَ أبو طلحة؟**» قال: فقلتُ نعم، قال: «**للطعام؟**» فقلتُ: نعم. فقال رسول الله ﷺ لمن معه: «**قوموا**».

قال: فانطَلَق وانطلقتُ بين أيديهم حتى جئتُ أبا طلحة فأخبرتُه، فقال أبو طلحة: يا أمَّ سُليم قد جاء رسول الله ﷺ بالناس وليس عندنا من الطعام ما نُطْعِمُهُمْ. فقالت: الله ورسوله أعلم. قال: فانطلق أبو طلحة حتى لقي رسول الله ﷺ، فأقبل رسول الله ﷺ وأبو طلحة معه حتى دخلا، فقال رسول الله ﷺ: «**هَلُمِّي يا أمَّ سُليم ما عندكِ**»، فَأَتَتْ بذلك الخبز، فأمر به رسول الله ﷺ فَفُتَّ، وعَصَرَتْ عليه أمُّ سُليم عُكَّةً لها فآدَمَتْه، ثم قال رسول الله ﷺ ما شاء الله أن يقول، ثم قال: «**ائْذَنْ لعشرةٍ بالدخول**»، فأذِن لهم فأكلوا حتى شبعوا ثم خرجوا. ثم قال: «**ائذن لعشرة**»، فأذن لهم فأكلوا حتى شبعوا ثم خرجوا. ثم قال: «**ائذن لعشرة**»، فأَذن لهم فأكلوا حتى شبعوا ثم خرجوا. ثم قال: «**ائذن لعشرة**»، فأَذن لهم فأكلوا حتى شبعوا ثم خرجوا. ثم قال: «**ائذن لعشرة**»، حتى أكل القوم كلُّهم وشبعوا. والقومُ سبعون رجلاً أو ثمانون رجلاً.

هذا إسناد صحيح، وقع لنا عالياً في الموطأ لإمام دار الهجرة.

وبهذا الإسناد وغيره نروي الموطأ عالياً مسلسلاً بالسماع من فاتحته إلى خاتمته. والخبر رواه الشيخان عن مالك به نحوه.

وقوله: «فَفُتَّ»: أي كُسِّرَ، وقوله: «عُكَّة»: أي إناءٌ من جلد يوضع فيه السَّمْن وغيره، وقوله: «فآدَمَتْه»: أي جعلت ما خرج من السمن إداماً له.

*** فيه مسائل:**

الأولى: ما كان عليه آل البيت من ضيق العيش، ولو كانوا في سَعَةٍ لم يظهر عليه ﷺ شدة الجوع، حتى عُرِفَتْ بين الناس.

الثانية: فيه فضيلة آل البيت في الصبر على ضيق الحال.

الثالثة: فيه التأكيد على أن من رأى بآل البيت حاجة أو ضعفاً أن يَجْبُر خَلَّتهم ويقضي حاجتهم.

الرابعة: فيه أن جزاء من جَبَر خَلَّة آل البيت هو البركة والسعة في الرزق.

الخامسة: ما كان عليه سيد الأولين والآخرين وآل بيته الطاهرين من الاحتساب وعدم الشكوى إلى الناس في ضيق العيش فإنهم ما أفضوا ذلك إلى الخلق، ولا أشعروا أحداً به، ولم يحبسهم ذلك عن القيام لدين الله تعالى.

السادسة: فيه ما كان عليه أصحاب النبي ﷺ من تَحَسُّس حاجة آل البيت، والتفطُّن لحالهم، وهذا لا يكون إلَّا من كمال محبتهم.

السابعة: فيه فضيلة لأم سليم رضي الله عنها، ومتانة دينها، وتسليمها لله ولرسوله.

الثامنة: فيه علم من أعلام النبوة.

التاسعة: فيه دلالة على صدق نبوته ﷺ، فإن هذه العيشة ليست عيشة

....

الملوك أو السلاطين، ولا هذه حالهم، فإن ضعف أحواله ﷺ مع سلامة أفعاله دليل على صحة أقواله.

العاشرة: فيه أن مع العسر يسراً، وأن الفرج لا بد أن يَعْقُب الشدَّة.

الحادية عشر: فيه أن الدعاة إلى الله تعالى لا بدَّ أن يجري عليهم من جنس ما جرى على الأنبياء عليهم الصلاة والسلام من الخوف والجوع ونقصٍ من الأموال والأنفس والثمرات، فلا بُدَّ من تهيئة النفوس على ذلك، فإن النصر مع الصبر، والفرج مع الكرب.

الثانية عشر: فيه أن من أهدى لآل البيت فينبغي له ثلاثة أمور هنا، وأمر رابع قد جاء في حديث آخر، وكلُّها قد فَعَلَتْها هذه الصحابية الجليلة أم سليم:

أحدها: إحسان الهدية؛ فإن الخبز مع السمن من أنفع الطعام.

والثاني: إحسان طريقة الإهداء؛ فإنها لَفَّت الهدية ودسَّتها حتى لا يشعر بها الناس فتتعلَّق بها نفوسهم وقت القلَّة.

والثالث: إحسان اختيار الرسول بالهدية؛ فإنها أرسلت أنَساً لأنه ابنها، وهو أمين سِرّ رسول الله ﷺ وخادمه المبارك.

أما الرابع: قد ورد في قصةٍ لأمّ سُليم عن أنس كذلك في قصة الحَيْس لما تزوج النبي ﷺ بزينب، قال: صنعتْ أمّي أم سليم حيساً فجعلته في تَوْرٍ فقالت: يا أنس اذهب بهذا إلى رسول الله ﷺ فقل: بَعَثَتْ بهذا إليك أمّي وهي تُقْرِئُك السلام وتقول: «إنَّ هذا لكَ مِنَّا قليل يا رسول الله...» فقولها: «إن هذا...» فيه رَفْعٌ لمقام المهدى إليه، مع الإحسان إليه، والمعنى أن هذه الهدية ليست تعادل مقامَك ومنزلتك ـ وهذا الأدب الرابع يستحب أن يقال للضيف تطييباً لخاطره ورفعاً لمقامه، فإن إرسال الحيس من الطعام من جنس الضيافة ـ.

....

فهذه أربعة آداب صنعتها هذه المرأة الصالحة، وهي دالة على صدق محبتها ووفور عقلها.

الثالثة عشر: فيه أن العبد إذا ضَعُفَ، وضعفتْ أسبابه وإمكاناته ووسائله في الأرض مع كمال تَعَلُّقه بالرب جلَّ وعلا فإنه سبحانه وتعالى يضعه على عينه، ويكلؤه برعايته، ويحرسه بعنايته، ويأتيه بالمدد، والقوة والعُدَد، مِنْ حيثُ لا يَحْتَسِب، وقد كانت هذه الحادثة في غزوة الأحزاب ـ كما جاء مصرَّحاً به في عدَّة روايات ـ، وقد أنزل الله تعالى فيها سورةً تُتْلَى، وذكر عجائب من تصريف الأحوال، وغرائب من تحويل الملائكة والأموال.

الرابعة عشر: وقع في رواية مسلم أن أنساً قال: فذهبتُ إلى أبي طلحة وهو زوج أمِّ سُليم بنتِ مِلْحان فقلتُ: يا أبتاه قد رأيتُ رسول الله ﷺ عَصَبَ بَطْنَه...»، ففيه دلالة على جواز تسمية زوجِ الأمِّ أباً. واستحباب اتخاذ آل البيت الخادم النبيه.

❏❏❏

الحديث الثامن والثلاثون

أخبرني الفقيه القاضي السيد إبراهيم بن حسن هِنْد الأهدل الشافعي قراءة عليه في طريق تَعِزّ، أخبرني الوالد، عن محمد بن عبد الرحمن بن الحسن بن عبد الباري الأهدل، عن جده، عن الوجيه الأهدل، عن المرتضى الزبيدي، عن عمر بن عقيل السقّاف، عن البصري بإسناده(١) **إلى ابن حِبَّان قال:**

أخبرنا الحسين بن عبد الله بن يزيد القطّان بالرَّقَّة، حدثنا هشام بن عَمَّار، حدثنا أسد بن موسى، حدثنا سَلِيم بن حَيَّان، عن أبي سعيد الخدري قال: قال رسول الله ﷺ: **«والذي نفسي بيده لا يُبْغِضُنا أهل البيت رجلٌ إلَّا أدخله الله النار».**

هذا إسناد جيد، وقع لنا هكذا في الصحيح لابن حبان، وصحَّحه هو والحاكم وغيرهما، وله متابعات وشواهد.

*** فيه مسائل:**

الأولى: غِلَظُ عقوبة من أبغض آل البيت.

الثانية: عِظم ثواب من أحبَّ آل البيت، فإن العقوبة إذا كانت في بُغضهم هي النار، فثَوَاب من أحبَّهم لا يكون إلَّا الجنَّة.

---

(١) في الحديث الثالث عشر.

....

الثالثة: فيه أن بُغْض آل البيت قد كان في زمنه ﷺ من بعض المنافقين، كما أشار إلى ذلك عدة حوادث منها حادثة الإفك كما تقدَّم، فَنَبَّه بهذا الوعيد على تحذير بعض المسلمين من الوقوع في هذه الشِّرَاك.

الرابعة: فيه أنه إذا استحق النار من أبغض الآل مع كون البغض من أعمال القلوب فَلأَن يستحقها بإيذائهم وقتلهم من باب أولى.

الخامسة: فيه الوعيد الشديد للنواصب المبغضين آل البيت.

السادسة: فيه أن بعض المسلمين قد يقع منه بَعْض البُغْض لآل البيت، وإلَّا لما كان في إخبار النبي ﷺ فائدة، لأن المشركين يقع منهم البُغْض أبداً.

السابعة: سأل أحدُ وزراء المغول شيخ الإسلام ابن تيمية: ما تقول فيمن يبغض أهل البيت؟

فأجاب: مَنْ أَبغضهم فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين، لا يقبل الله منه صرفاً ولا عَدْلاً... اهـ.

الثامنة: روِّينا في المُصَنَّف لابن أبي شيبة قال: حدثنا إسحاق بن منصور، عن سليمان بن قرم، عن عاصم عن زرّ قال: قال عليٌّ: «لا يحبنا منافق ولا يبغضنا مؤمن».

وروِّينا في الصحيح لمسلم عن زرّ قال: قال عليٌّ: «والذي فَلَقَ الحَبَّة وَبَرَأَ النَّسْمَة إنه لعهد النبي الأمِّي ﷺ إليَّ أن لا يُحِبَّني إلَّا مؤمن ولا يبغضني إلَّا منافق».

التاسعة: فيه أن من البغض لآل البيت التظاهر بحبهم واستبطان كرههم، وهذا من أقبح النفاق. ولذلك دلائل، منها: ترك الاقتداء بجميل أفعالهم من الإخلاص والصدق والإيثار، ومحبة الخلق، ودوام الذكر، وإدمان التعبُّد، والاستغفار للسابقين، والدعاء للمسلمين، والشجاعة في صَدِّ أعداء الدين، والسعي في جمع كلمة الموحدين، وكفّ الأذى عن المؤمنين، وسلامة الصدر

....

في معاملة المسلمين، وإكرام الناس لا سيما المستضعفين، وحفظ كتاب الله المبين، والاقتداء بسيِّد الأولين والآخرين.

فإذا لم تجد ذلك، ووجدتَ رفعَ الشعارات بدعوى محبة الآل فاعلم أنها دسيسة على الإسلام، ﴿قَدْ قَالَهَا ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَمَآ أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ﴾.

العاشرة: بَوَّبَ ابن حبَّان على هذا الحديث فقال: «ذِكْر إيجاب الخلود في النار لِمُبْغِض أهل بيت المصطفى ﷺ» اهـ.

قلت: ليس في الخبر ذكر الخلود، ودخول النار لا يستلزم الخلود فيها، ونصوص الكتاب والسنَّة وإجماع السلف على ذلك، وابن حبَّان قد صرَّح بذلك في غير موضع، وهذا الخبر من نصوص الوعيد الذي أجمع السلف الصالح على أنه مُعَلَّقٌ بمشيئة الله تعالى، إن شاء غفر وإن شاء عَذَّب، كما قال تعالى: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِۦ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ﴾، وأجمع المسلمون كذلك على تقييد ذلك بالتوبة، كما في قوله سبحانه وتعالى: ﴿إِن يَنتَهُوا۟ يُغْفَرْ لَهُم مَّا قَدْ سَلَفَ﴾.

وإنما أوجب ابن حبان خلود المُبْغِض لآل البيت ـ والله أعلم ـ لكونه لا يصدر إلَّا من منافق لا يؤمن بالله واليوم الآخر حقيقةً، فإنَّ آل البيت قد كان بهم من الخير والبركة ونصر الدين ما لم يكن في بيتٍ من بيوت العالمين، فَمُبْغِضُ ذلك ليس من جنس المؤمنين، بل من جنس أعداء الدين، وإن تظاهر بالدين، وقد جاءت الإشارة إلى ذلك في غير ما خبر، لكن لم يصح منها شيء، ونظير هذا الخبر ما قاله النبي ﷺ في الأنصار ـ كما في الصحيحين ـ: «**لا يحبهم إلَّا مؤمن، ولا يبغضهم إلَّا منافق**»، وللشيخ تقي الدين بن تيمية في «الصارم المسلول» كلام متين في هذا المعنى.

الحادية عشر: فيه أن النبي ﷺ لا يحلف إلَّا على أمر عظيم.

❑❑❑

الحديث التاسع والثلاثون

أخبرني الفقيه الصالح المعمر السيد أحمد بن قاسم بن أحمد البَحْر الشافعي قراءةً عليه ببيت الفقيه، أخبرني والدي، أخبرنا محمد بن الأمين بن عبد القادر البحر، أخبرنا والدي، أخبرنا محمد بن حسن بن فرج، أخبرنا رزق بن رزق العلوي، أخبرنا محمد بن المساوَى الأهدل، أخبرنا الوجيه الأهدل عن والده، عن أحمد بن محمد مقبول الأهدل، عن يحيى بن عمر مقبول الأهدل، أخبرني أبو بكر بن علي البطَّاح، أخبرني يوسف بن محمد البطَّاح، أخبرني الطاهر بن حسين الأهدل، أخبرني ابن الدَّيْبَع، أخبرنا الحافظ السخاوي، أخبرنا التقي محمد بن فهد، أخبرنا أبو الحسن علي بن أحمد السلمي، أخبرنا أبو الحسن محمد بن عمر الحلبي، أخبرنا سُنْقُر بن عبد الله الأَرْمَني الحلبي، أخبرنا الموفَّق عبد اللطيف بن يوسف البغدادي، أخبرنا أبو زرعة طاهر بن محمد المقدسي، أخبرنا السلَّار مكِّي بن علَّان الكَرَجي، أخبرنا أبو بكر أحمد بن الحسن الحِيْري، حدثنا أبو العباس الأصم، أخبرنا الربيع بن سليمان المرادي، أخبرنا **الإمام أبو عبد الله محمد بن إدريس الشافعي المُطَّلِبي قال**:

أخبرنا يحيى بن سُليم، عن عبد الله بن عثمان بن خُثَيم،

عن إسماعيل بن عُبيد بن رفاعة الأنصاري، عن أبيه، عن جده رفاعة: أن النبي ﷺ نادى: «**أيها الناس إن قريشاً أهلُ أمانة، من بغاها العواثر أكبَّه الله لِمَنْخِرَيْه**» يقولها ثلاث مرات.

هذا إسناد حسن، وقع لنا في مسند الإمام الشافعي، وبهذا الإسناد وغيره نروي المسند سماعاً من فاتحته إلى خاتمته.

ورواه الإمام أحمد والبخاري في الأدب وعبد الرزاق وابن أبي شيبة وابن أبي عاصم في السنَّة والطبراني والحاكم وصحَّحه والبزار وحسَّنه والبيهقي وغيرهم عن ابن خثيم به هكذا ومطوَّلاً، وله شواهد.

وفي لفظ: «أهل صدق وأمانة»، وفي لفظ: «كبَّه الله على وجهه»، وفي لفظ: «في النار».

وقوله: «بغاها العواثر»، أي طلب عثراتها.

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه أن من طلب عثرة قريش أكبَّه الله تعالى على وجهه في النار، فكيف من آذاها أو عَذَّبها.

الثانية: إذا كانت هذه عقوبة من طَلَب عثرة قريش فكيف من طلب عثرة خواصهم من آل البيت، ثم كيف مَنْ آذاهم أو ضيَّق عليهم أو عذَّبهم أو ظلمهم حقوقهم.

الثالثة: فيه دلالة على أن الأصل في القرشي أنه صاحب صدق وأمانة، حتى تَدُلَّ البيِّنة أنه بخلاف ذلك.

الرابعة: في هذا الخبر ونظائره حماية لجناب آل البيت رضي الله عنهم، فإن قريشاً كالبرزخ لآل البيت، وكالوقاية لهم، لئلا يُتعدى عليهم.

....

الخامسة: فيه إشارة إلى الحثِّ على حفظ أنساب قريش وأنساب آل البيت.

السادسة: فيه دلالة على استحباب استعمال الرجال والنساء من قريش لما فيهم من القوة والأمانة، وهذان شرطا الأعمال، كما قال الله تعالى: ﴿ٱسۡتَـٔۡجَرۡتَ ٱلۡقَوِيُّ ٱلۡأَمِينُ﴾.

السابعة: فيه تحريم طلب العثرات وتتبع الزلَّات وأنها من الكبائر، لأنها من أخلاق أهل النار.

الثامنة: فيه إشارة إلى أن طالب العثرات ومُتَتَبِّعَ الزلَّات ينقلب إليه بصره ونَفْسه خاسئاً وهو حسير، لقوله: «أكَبَّه الله لمنخريه».

التاسعة: فيه تفضيل قريش وكمال خيريَّتها على سائر القبائل.

العاشرة: فيه أن الخيانة والكذب في قريش أقلُّ منها في سائر الناس.

الحادية عشر: فيه إشارة إلى أن الصدق والأمانة من أجلِّ صفات الخلق، ولذا لم يَخْلُ منهما نَبِيٌّ من الأنبياء، فَتَطَلُّبهما في الناس أصل لا ينبغي التفريط فيه.

الثانية عشر: فيه أن النبي ﷺ لا يكرِّر الشيء إلَّا لِعِظَمِهِ وأهميته.

الثالثة عشر: فيه أن من أراد أن ينبِّه إلى أمر عظيم فالأولى له أن يذيعه في الناس وينادي به لِيُحْمل عنه ويؤدَّى على وجهه.

❑❑❑

الحديث الأربعون

أخبرنا الشيخ الصالح السيد عباس بن أحمد صَقْر الحسيني الحنفي بقراءتي عليه ومشافهته لي بالمسجد النبوي، أخبرنا أحمد بن مصطفى البساطي، عن فالح بن محمد الظاهري بإسناده[1] إلى الحافظ ابن حجر قال: أخبرنا الحافظ أبو الفضل عبد الرحيم بن الحسين العراقي، أخبرنا محمد بن إسماعيل الحَمَوي، أخبرنا الفخر بن البخاري، أخبرنا منصور بن عبد المنعم الفراوي كتابةً، أخبرنا محمد بن إسماعيل الفارسي، أخبرنا الإمام أبو بكر أحمد بن الحسين البيهقي قال:

أخبرنا محمد بن عبد الله الحافظ، أخبرنا عبد الله بن الحسين القاضي بِمَرْوَ، حدثنا الحارث بن أبي أسامة، حدثنا رَوْح بن عُبادة، حدثنا علي بن سويد بن مَنْجُوف، عن عبد الله بن بريدة، عن أبيه قال:

بعث رسول الله ﷺ عَلِيًّا رضي الله عنه إلى خالد بن الوليد رضي الله عنه لِيَقْبِضَ الخُمُسَ، فأخذ منه جاريةً، فأصبح ورأسُه يَقْطُرُ، قال خالد لبريدة: ألا ترى ما يصنع هذا! قال: وكنتُ أُبْغِضُ عليًّا رضي الله عنه، فذكرتُ ذلك لرسول الله ﷺ فقال: «يا بريدة أتبغض

(١) في الحديث الثالث عشر.

عليًّا؟» قال: قلتُ: نعم، قال: «فأَحِبَّه فإن له في الخُمُس أكثر من ذلك»[1].

هذا إسناد صحيح، رواه البيهقي في السنن، ورواه البخاري عن روح به نحوه.

وفي لفظ جيد في المسند: « **«فوالذي نفس محمد بيده لنصيب آل عليّ في الخمس أفضل من وَصِيْفَة»**، قال بريدة: فما كان من الناس أحدٌ بعد قول رسول الله ﷺ أَحَبَّ إليَّ من عليّ».

وقوله: «يقطر» أي ماءً من الاغتسال من وطء المَسْبِيَّة.

وهذا آخر الأربعين

والحمدُ لله رب العالمين

وصلَّى الله وسلَّم على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه والتابعين

*** فيه مسائل:**

الأولى: فيه منقبة لآل البيت، ولِعَلِيٍّ رضي الله عنه، ودفاع رسول الله ﷺ عنه.

الثانية: فيه أنه على كل مسلم أن يُحِبّ عليًّا رضي الله عنه، وأن يأمر الخلقَ بمحبته والدفاع عنه بإظهار ما صحَّ من مناقبه ونفي الكذب عنه وعليه.

الثالثة: فيه فضيلة أمير المؤمنين علي رضي الله عنه في إصابة الحق من

---

(١) ختمت هذه الأربعين المباركة بالإسناد المدني لأن الإيمان يأرز إلى المدينة، وختمت بهذا المتن لقوله ﷺ: **«له في الخمس أكثر من ذلك»**، وفضائل آل البيت أكثر من ذلك، واستفتحتُها بِعالِمٍ من علماء الآل وختمتها كذلك ليكون الافتتاح والاختتام بالمِسْك. وَبَقِيَتْ لطائفُ يستخرجها أهل الصنعة.

....

قولي العلماء في عدم استبراء المسبيَّة إذا صحَّ عند المالك براءة رحمها، ودقيق فقهه، وصحَّة نظره، وسداد اجتهاده، وتصويب النبي ﷺ له.

الرابعة: إحسان الظن بآل البيت، ولا سيما إن كان من أئمة الآل، أو كان أميراً له ولاية.

الخامسة: فيه أن الاختلاف مع الرجل من صالحي آل البيت أو بُغْضه في أفعالٍ يقع الخلاف فيها بين الناس لا يُخْرِج عن الإسلام، ولذا لم يُكَفِّر النبي ﷺ بريدةَ ولا خالداً، بل أمر بإبدال البُغْضِ محبةً.

السادسة: فيه استحقاق آل البيت الخُمُس شريعةً وديناً وفريضةً من الله تعالى، لا منحةً ومنَّةً من الخلق.

السابعة: فيه ما كان عليه أصحاب النبي ﷺ من الفضائل، كتعظيم الرب جلَّ وعلا فوق كل أحد، وعدم النفاق، والشجاعة، والصبر في العمل بالشرع المطهر، وسرعة الاستجابة لله تعالى ورسوله ﷺ، والرجوع إلى الحق.

الثامنة: فيه أن المنكَر يُنْكَر على فاعله، وإن كان من أئمة آل البيت.

التاسعة: فيه أن العالِم لا يُنْكِر على من هو أجَلُّ منه في العلم والديانة حتى يتثبت من المسألة، ويُحَرِّر معناها، وينقِّح مناطها، فقد أنكر خالد وبريدة على عليٍّ في وطء المسبيَّة وهو أجلّ منهما رضي الله عنهم جميعاً، فبان الحق معه بتصويب النبي ﷺ، فإنَّ المسبيَّة لا يجوز وطؤها حتى تُستبرأ بِحَيْضَة، ولما كان هذا هو الأصل أنكرا عليه، غير أنه فَهِم علَّةَ الحكم وهي براءةُ الرَّحِم نَفْسُها، وهذه تحصل معرفتها بِعِدَّة أمور، فلما تيقَّن من ذلك وطأها، وكأنه لذلك وأشباهِه نبَّه رضي الله عنه أبا جُحَيْفَة لما سأله ـ كما في البخاري ـ عن تخصيص النبي ﷺ له بشيءٍ، قال: لا، إلَّا كتاب الله أو فَهْمٌ أُعطِيَهُ رجلٌ مسلمٌ. . . ».

العاشرة: فيه أن الفاضل من أهل العلم إذا وقع منه شيء في جناب آل البيت فالسنَّة نُصْحه إسراراً، لا فضحه إعلاناً، وقد جاء في رواية المسند أن بريدة رضي الله عنه قال: «فأمسك يديْ وقال: أتبغض عليًّا؟».

الحادية عشر: فيه أن أكابر أهل العلم إذا تنازعوا وَجَب رَدّ تنازعهم إلى الكتاب والسنَّة، وإنْ بلغوا في القرابة والولاية أيَّ مَبْلَغ.

الثانية عشر: قال العلامة الشوكاني في «النَّيل»: فيه منقبة لِبُرَيْدَة لِمَصِيْر عليٍّ أحبَّ الناس إليه، وقد صحَّ أنه لا يحبه إلَّا مؤمن ولا يبغضه إلَّا منافق كما في صحيح مسلم وغيره. اهـ.

الثالثة عشر: فيه أنَّ مَنْ سبقتْ منهم الفضائل وتكاثرت، وكانت لهم قَدَمُ صِدْقٍ؛ فينبغي أن يُقْبَل من مُحْسِنهم ويُتجاوز عن مسيئهم، وهذا سِرّ قوله ﷺ لبريدة في عليٍّ رضي الله عنهما: **«أَحِبَّه فإن له في الخمس أكثر من ذلك»**، وكذلك آل بيته لهم من الفضائل أكثر مما ذكرنا، وأوفر مما أَلَّفْنا، جمعنا الله تعالى بهم في علِّيين، آمين آمين.

وكان الفراغ من هذه الأربعين والتعليق عليها
غُرَّة ربيع الآخر سنة ثلاثين وأربعمائة وألف
من هجرة من له العزّ والشرف في مجالس آخرها
في الجامع الكبير بمدينة الرياض، حرسها الله تعالى

إجـــازة

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأوَّلين والآخرين، وعلى آله وصحبه والتابعين.

أمَّا بعد:

فقد سمع عليَّ هذه الأربعين ....
حفظه الله تعالى،

وطلب الإجازة بذلك وبجميع ما لي وعني، فأقول:

قد أَجزت الفاضل المذكور إجازة عامة بشرطها المعتبر عند أئمة الأثر.

وأوصيه بتقوى الله تعالى في السر والعلن، وأن يعمل بالكتاب والسنَّة على منهج السَّلَف الصالح، وأن لا ينساني ووالدي ومشايخي من دعواته الصالحة.

وكتب

عبد الله بن صالح بن محمد العبيد

الفهـارس

١ ـ فهرس الأحاديث[1].
٢ ـ فهرس الشيوخ الأربعين.
٣ ـ الفهرس العام.

---

(١) هذا الفهرس والذي بعده مرتَّب على حروف المعجم.

فهرس الأحاديث

فهرس الشيوخ الأربعين

❑ ❑ ❑

الفهرس العام

❑❑❑

مآخذ ومراجع

حديث

١ـ **الآحاد والمثاني**: إمام أبوبكر أحمد بن عمرو بن أبي عاصم، متوفّى ٢٨٧ ﻫ، دار الراية، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١١ﻫ.

٣ـ **الأحاديث المختارة مماليس في الصحيحين**: ضياء الدين محمد بن عبد الواحد المقدسي، متوفّى ٦٤٣ﻫ، مكتبة النهضة الحديثية، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤١٠ﻫ.

٤ـ **الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان**: أبوحاتم محمد بن حبان البستي متوفّى ٣٥٤ﻫ، **بترتيب**: الأمير علاء الدين علي بن بلبان الفارسي، متوفّى ٧٣٩ ﻫ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٨ﻫ.

٥ـ **الأدب المفرد**: أبوعبد الله محمد بن إسماعيل البخاري، متوفّى ٢٥٦ﻫ، مكتبة المعارف الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٩ﻫ.

٦ـ **الأمالي للمحاملي**: قاضي أبوعبدالله الحسين الضبي المحاملي، متوفّى ٣٣٠ﻫ، دار ابن القيم، الدمام، السعودية، الطبعة الأولى ١٤١٢ﻫ.

٧ـ **إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة**: أحمد بن أبي بكر بن إسماعيل البوصيري، متوفّى ٨٤٠ﻫ، دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٠ﻫ . **وط**: مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٩ﻫ.

٨ـ **بغية الباحث في زوائد مسند الحارث**: نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفّى ٨٠٧ﻫ، مركز خدمة السنة والسيرة النبوية، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤١٣ﻫ.

٩ـ **البحر الزخار المعروف بمسند البزار**: إمام أحمد عمرو بن عبد الخالق البزار، متوفّى ٢٩٢ﻫ، مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤٠٩ﻫ.

١٠ـ **البيان والتعريف في أسباب وُرود الحديث الشريف**: إبراهيم بن محمد الشهير بابن

حمزة الحسيني، متوفّیٰ ١١٢٠ھ، دار المعرفة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٤ھ.

١١۔ **تحفة الأخيار بترتيب شرح مشكل الآثار**: إمام أبوجعفر أحمد بن محمد الطحاوي، متوفّیٰ ٣٢١ھ، دار بلنسية، مكة المكرمة، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٠ھ.

١٢۔ **الترغيب والترهيب**: إمام زكي الدين عبد العظيم بن عبد القوي المنذري، متوفّیٰ ٦٥٦ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٧ھ.

١٣۔ **تقريب البغية بترتيب أحاديث الحلية**: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفّیٰ ٨٠٧ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٠ھ.

١٤۔ **تهذيب الآثار وتفصيل الثابت عن رسول الله ﷺ من الأخبار**: الإمام أبو جعفر محمد بن جرير الطبري، متوفّیٰ ٣١٠ھ دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولی ١٤٢٩ھ .**وط:** مطبعة المدني، مصر، ١٩٨٢ء

١٥۔ **جامع الأحاديث الكبير**: حافظ جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفّیٰ ٩١١ھ، دار الفكر، بيروت ١٤١٤ھ.

١٦۔ **جامع الأصول في أحاديث الرسول**: إمام مجدالدين أبي السعادات المبارك بن محمد بن الأثير الجزري، متوفّیٰ ٦٠٦ھ، دار ابن كثير دمشق، الطبعة الأولیٰ ١٤٣٢ھ.

١٧۔ **الجامع الصحيح المسند من حديث رسول الله ﷺ وسننه وأيامه**: (بخاري) محمد بن إسمعيل البخاري، متوفّیٰ ٢٥٦ھ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الثانية ١٤٢٧ھ.

١٨۔ **الجامع الصغير في أحاديث البشير النذير ﷺ**: جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفّیٰ ٩١١ھ، مكتبة نزار المصطفیٰ الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولی ١٤١٨ھ .

١٩۔ **الجامع الكبير وهو سنن الترمذي**: إمام أبوعيسیٰ محمد بن عيسیٰ الترمذي، متوفّیٰ ٢٧٩ھ، دار الغرب الإسلامي بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٩٩٦ء، **وط**: بتحقيق الألباني، مكتبة المعارف، الرياض، الطبعة الأولیٰ.

٢٠۔ **جامع المسانيد**: أبوالفرج عبدالرحمن بن علي الجوزي الحنبلي، متوفّی ٥٩٧ھ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٦ھ.

٢١ـ **جامع المسانيد والسنن**: أبوالفداء إسماعيل بن كثير،متوفّیٰ٧٧٤هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعةالأولیٰ ١٤٢٠هـ.**وط**:مكتبة النهضة الحديثية،مكةالمكرمة،الطبعةالثانية١٤١٩هـ.

٢٢ـ **الجامع لشعب الإيمان**: إمام أبو بكر أحمد بن حسين البيهقي،متوفّیٰ٤٥٨هـ،مكتبة الرشد، الرياض،الطبعةالأولیٰ١٤٢٣هـ.

٢٣ـ **الجمع بين الصحيحين**: محمد بن فتوح الحُميدي، متوفّی٤٨٨هـ، دارابن حزم، بيروت،الطبعةالأولی١٤١٩هـ.

٢٤ـ **جمع الجوامع**: جلال الدين عبدالرحمان بن أبي‌بكرالسيوطي،متوفّی ٩١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولى١٤٢١هـ،**وط**:دارالسعادة،جامعةالأزهر،١٤٢٦هـ.

٢٥ـ **حلية الأولياء وطبقات الأصفياء**: إمام أبو نُعَيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني،متوفّیٰ ٤٣٠هـ، دارالكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤١٨هـ،**وط**: مكتبةالخانجي، القاهرة،١٤١٦هـ.

٢٦ـ **خصائص أميرالمؤمنين علي بن أبي طالب**ﷺ: إمام أبوعبدا لرحمان أحمد بن شعيب النسائي، متوفّیٰ٣٠٣هـ،بتحقيق البلوشي،مكتبةالمعلیٰ،الكويت،الطبعةالأولیٰ١٤٠٦هـ.

٢٧ـ **الروض البسّام بترتيب وتخريج فوائد تمّام**: أبوسليمان جاسم بن سليمان الفهيد الدّوسري،دارالبشائرالإسلامية،بيروت،الطبعةالأولیٰ١٤٠٨هـ.

٢٨ـ **زوائد مسند أحمد**: عبدالله بن أحمدبن حنبل،متوفّیٰ ٢٩٠هـ، دارالبشائر الاسلامية، بيروت،الطبعة الأولى ١٤١٠هـ.

٢٩ـ **السلسلة الصحيحة**: محمدناصرالدين الألباني،متوفیٰ١٤٢٠هـ، مكتبةالمعارف الرياض،الطبعةالأولیٰ١٤٢٠هـ.

٣٠ـ **السنة**: إمام أحمدبن عمرو بن أبي عاصم الشيباني،متوفّیٰ٢٨٧هـ، المكتب الإسلامي، بيروت،الطبعة الثالثة ١٤١٣هـ.

٣١ـ **سنن الأصفهاني**: الحافظ الإمام الجليل أبي نعيم صاحب الحلية، **جامع**: أبوعبدالله عبد السلام بن محمد، مكتبةالرشدالرياض،الطبعةالأولیٰ١٤٢٥هـ.

۳۲۔ **سنن ابن ماجة**: إمام أبوعبد اللّٰہ محمد بن یزید ،متوفّیٰ ۲۷۳ھ،دارالمعرفة، بیروت، الطبعة الثانیة ۱۴۱۸ھ .

۳۳۔ **سنن أبي داود**: إمام أبوداود سلیمان بن الأشعث السجستاني، متوفّیٰ ۲۷۵ھ، دار المعرفة،بیروت،الطبعةالأولیٰ ۱۴۲۳ھ.

۳۴۔ **سنن الدارمي**: إمام أبوعبداللّٰہ عبدالرحمان الدارمي،متوفّیٰ۲۵۵ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۱۷ھ.

۳۵۔ **السنن والأحکام عن المصطفیٰ علیه أفضل الصلاة والسلام**: ضیاء الدین محمد بن عبد الواحد المقدسي،متوفّیٰ ۶۴۳ھ،دارُماجد عسیري،جدة، الطبعةالأولی ۱۴۲۵ھ.

۳۶۔ **السنن الکبریٰ**: إمام أبوعبدالرحمن أحمدبن شعیب النسائي،متوفّیٰ۳۰۳ھ،مؤسسة الرسالة،بیروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۲۱ھ،**وط**:دارالکتب العلمیة،بیروت،الطبعةالأولیٰ۱۱ ۱۴ھ.

۳۷۔ **السنن الکبریٰ** :إمام أبو بکر أحمد بن حسین البیهقي، متوفّیٰ۴۵۸ھ،دارالکتب العلمیة،بیروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۱۴ھ ،**وط**:مرکزهجر،القاهرةالطبعةالأولیٰ۱۴۳۲ھ.

۳۸۔ **السنن المجتبی (سنن النسائي)**: إمام أبو عبد الرحمٰن أحمد بن شعیب النسائي، متوفّیٰ ۳۰۳ھ ، دارالمعرفة، بیروت ،الطبعة الثالثة ۱۴۱۴ھ.

۳۹۔ **شرح السنة**: إمام حسین بن مسعود البغوي،متوفّیٰ۵۱۶ھ،دارالفکر،بیروت،۱۴۱۴ھ.

۴۰۔ **شرح مشکل الآثار**: إمام أبوجعفرأحمدبن محمدالطحاوي،متوفّیٰ۳۲۱ھ،مؤسسة الرسالة،بیروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۱۵ھ.

۴۱۔ **شرح معانی الآثار**: إمام أبو جعفرأحمدبن محمدالطحاوي،متوفّیٰ۳۲۱ھ،عالم الکتب، بیروت، الطبعةالأولیٰ ۱۴۱۴ھ.

۴۲۔ **الشریعة**: أبوبکرمحمدبن حسین الآجري،متوفّیٰ۳۶۰ھ،دارالوطن،الریاض،الطبعة الأولیٰ۱۴۱۸ھ.

۴۳۔ **شعب الإیمان**: إمام أبو بکر أحمد بن حسین البیهقي،متوفّیٰ۴۵۸ھ،دارالکتب العلمیة، بیروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۱۰ھ.

٤٤ـ **صحيح ابن خزيمة:** إمام محمد بن إسحاق بن خزيمة،متوفّیٰ ٣١١ھ ،المكتب الإسلامي بيروت،الطبعة الثالثة ١٤٢٤ھ.

٤٥ـ **صحيح الجامع الصغيروزيادته:** محمدناصرالدين الألباني،متوفّیٰ ١٤٢٠ھ،المكتب الإسلامي،بيروت،الطبعة الثالثة ١٤٠٨ھ.

٤٦ـ **عمل اليوم والليلة:** إمام أبوعبدالرحمن أحمدبن شعيب النسائي،متوفّیٰ ٣٠٣ھ، مؤسسة الرسالة،بيروت.

٤٧ـ **عمل اليوم والليلة:** أبوبكرأحمدبن محمدالدينوري،المعروف بابن السني،متوفّیٰ ٣٦٤ھ،مؤسسة الكتب الثقافية،الصنائع،الطبعة الأولى ١٤٠٨ھ.

٤٨ـ **غاية المقصد في زوائد المسند:** حافظ نورالدين علي بن أبي بكرالهيتمي، متوفّیٰ ٨٠٧ھ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤٢١ھ.

٤٩ـ **غوث المكود بتخريج منتقیٰ ابن الجارود:** أبوإسحاق الحويني الأثري،دارالكتاب العربي،بيروت،الطبعة الأولیٰ،١٤٠٨ھ.

٥٠ـ **فتح المنان شرح وتحقيق لسنن الدارمي:** السيدأبوعاصم نبيل بن هاشم،الغمري، دار البشائرالإسلامية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤١٩ھ.

٥١ـ **الفتن:** حافظ نُعيم بن حمادالخزاعي المروزي،متوفّیٰ ٢٢٩ھ،دارالكتب العلمية،بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٨ھ. **وط:** مكتبة التوحيد،القاهرة،الطبعة الأولیٰ ١٤١٢ھ.

٥٢ـ **كتاب الضعفاء الكبير:** أبوجعفر محمدبن عمروالعقيلي،متوفّیٰ ٣٢٢ھ،دارالصميعي، الرياض،الطبعة الأولیٰ ١٤٢٠ھ .

٥٣ـ **كشف الأستار عن زوائد البزار:** حافظ نور الدين علي بن أبي بكرالهيثمي،متوفّیٰ ٨٠٧ھ،مؤسسة الرسالة،بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤٠٤ھ.

٥٤ـ **كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال :** علامة علي متقي بن حسام الدين برهانبوري، متوفّیٰ ٩٧٥ھ،مؤسسة الرسالة،بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤٠٥ھ.

٥٥ـ **اللآلی المصنوعة في الأحاديث الموضوعة:** حافظ جلال الدين عبدالرحمان بن أبي

بكر السيوطي، متوفّیٰ ٩١١ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧ھ.

٥٦۔ **مجمع البحرين في زوائد المعجمين:** حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفّیٰ ٨٠٧ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩ھ. **وط:** مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤١٣ھ.

٥٧۔ **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد:** حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفّیٰ ٨٠٧ھ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٤ھ. **وط:** دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ٢٠٠٩ء. **وط:** دار المنهاج، جدة، الطبعة الأولىٰ ١٤٣٦ھ.

٥٨۔ **المحصل لمسند الإمام أحمد بن حنبل:** عبد الله بن إبراهيم بن عثمان القرعاوي، دار العاصمة، الرياض، الطبعة الثانية ١٤٢٧ھ.

٥٩۔ **مختصر زوائد مسند البزار:** حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفّیٰ ٨٥٢ھ، مؤسسة الكتب الثقافية، الصنائع، الطبعة الثالثة ١٤١٤ھ.

٦٠۔ **المستدرک علی الصحیحین:** إمام أبو عبد الله محمد بن عبد الله الحاكم نيشاپوري متوفّیٰ ٤٠٥ھ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨ھ، **وط:** قديمة، دار المعرفة، بيروت. **وط:** دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٢ھ۔

٦١۔ **مسند أبی یعلی الموصلي:** إمام أحمد بن علي المثنى التميمي، متوفّیٰ ٣٠٧ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨ھ. **وط:** دار المأمون، دمشق، الطبعة الأولىٰ ١٤٣٠ھ.

٦٢۔ **المسند:** إمام أبو بكر عبد الله بن محمد بن أبي شيبة، متوفّیٰ ٢٣٥ھ، دار الوطن، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨ھ.

٦٣۔ **المسند:** إمام أحمد بن حنبل، متوفّیٰ ٢٤١ھ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩ھ. **وط:** دار الحديث القاهرة، الطبعة الأولىٰ ١٤١٦ھ، **وط:** مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢١ھ، **وط:** دار المنهاج، الرياض، ١٤٢٩ھ.

٦٤۔ **مسند الإمام أبو حنيفة:** متوفّیٰ ١٥٠ھ، رواية: أبو محمد عبد الله الحارثي، متوفّیٰ ٣٤٠ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٩ھ، **وط:** مترجم اردو، مكتبة رحمانية، لاهور.

٦٥۔ **المسند**: إمام عبد اللّٰہ بن الزبیر الحمیدي، متوفّیٰ ۲۱۹ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱٤۰۹ھ.

٦٦۔ **مسند سعد بن أبي وقاص** رضي الله عنه: إمام أبي عبد اللّٰہ أحمد بن إبراهیم بن کثیر الدورقي البغدادي، متوفّیٰ ۲٤٦ھ، دار البشائر الإسلامیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱٤۰۷ھ.

٦٧۔ **مسند فاطمة الزهراء**: جلال الدین عبد الرحمان بن أبي بکر السیوطي، متوفّیٰ ۹۱۱ھ، مؤسسة الکتب الثقافیة، الطبعة الأولیٰ ۱٤۱۳ھ۔

٦٨۔ **المسند**: إمام سلیمان بن داود بن جارود الطیالسي، متوفّیٰ ۲۰۳ھ، دار المعرفة، بیروت. **و ط**: دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱٤۲۵ھ.

٦٩۔ **مشکاة المصابیح**: إمام عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزي، متوفّیٰ ۷٤۱ھ، دار الأرقم، بیروت. **و ط**: المکتب الإسلامي، بیروت، الطبعة الثانیة ۱۳۹۹ھ.

۷۰۔ **مصابیح السنة**: محي الدین حسین بن مسعود الفراء البغوي، متوفّیٰ ۵۱٦ھ، دار المعرفة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱٤۰۷ھ.

۷۱۔ **المصنَّف**: إمام عبد الرزاق بن همام الصنعاني، متوفّیٰ ۲۱۱ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱٤۲۱ھ. **و ط**: المجلس العلمي، جنوب إفریقة، الطبعة الأولیٰ ۱۳۹۰ھ.

۷۲۔ **المصنَّف**: إمام أبو بکر عبد اللہ بن محمد بن أبي شیبة، متوفّیٰ ۲۳۵ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱٤۱٦ھ. **و ط**: مکتبة الرشد، الریاض، الطبعة الأولیٰ ۱٤۲۵ھ.

۷۳۔ **المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة**: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني متوفّیٰ ۸۵۲ھ، دار الباز، عباس أحمد الباز، مکة المکرمة، الطبعة الأولیٰ ۱٤۰۷ھ. **و ط**: دار العاصمة، الریاض، الطبعة الأولیٰ ۱٤۱۹ھ.

۷٤۔ **المعجم الأوسط**: إمام أبو القاسم سلیمان بن أحمد الطبراني، متوفّیٰ ۳٦۰ھ، مکتبة المعارف، الریاض، ۱٤۰۵ھ، **و ط**: دار الحرمین، القاهرة، ۱٤۱۵ھ.

۷۵۔ **المعجم الصغیر (الروض الداني)**: إمام ابو القاسم سلیمان بن أحمد الطبراني، متوفّیٰ ۳٦۰ھ، المکتب الإسلامي، بیروت، الطبعة الأولی ۱٤۰۵ھ.

۷۶۔ **المعجم الكبير**: إمام أبوالقاسم سليمان بن أحمدالطبراني ،متوفى ٣٦٠هـ ،دارالكتب العلمية ،بيروت،الطبعةالأولى١٤٢٨هـ.**وط**:مكتبة ابن تيمية،القاهرة.

۷۷۔ **منتخب من مسند عبد بن حُميد**: حافظ أبومحمدعبدبن حُمَيد،متوفى٢٤٩هـ، دار بلنسية،الرياض،الطبعةالثانية١٤٢٣هـ.

۷۸۔ **المقصد العلي في زوائد مسند أبي يعلى الموصلي**: حافظ نورالدين علي بن أبي بكر الهيثمي،متوفى٨٠٧هـ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولى١٤١٩هـ.

۷۹۔ **المنتقىٰ**: إمام عبد الله بن علي بن جارودنيشابوري،متوفى٣٠٧هـ،دارالكتب العلمية، بيروت،الطبعةالأولى١٤١٧هـ.

۸۰۔ **الموطأ**:إمام مالك بن أنس،متوفى ١٧١هـ،دارالمعرفة،بيروت،الطبعةالثانية١٤٢٠هـ.

۸۱۔ **موطأالإمام مالك ،رواية محمد بن الحسن الشيباني: [موطأ محمد]** متوفى١٨٩هـ، دارالقلم، دمشق،الطبعةالأولى١٤١٣هـ.

۸۲۔ **موسوعة الحافظ ابن حجرالعسقلاني الحديثية**: جمع وإعداد: وليد بن أحمدالزبيري وشركاءه،سلسلةإصدارات الحكمة،برطانية، ومدينةالمنورة، الطبعةالأولى١٤٢٢هـ.

۸۳۔ **نظم المتناثرمن الحديث المتواتر**:محمدبن جعفرالكتاني،متوفى١٣٤٥هـ،دارالكتب السلفية،مصر.

۸۴۔ **نوادر الأصول في أحاديث الرسول**:إمام أبو عبدالله محمد الحكيم الترمذي، متوفى٣٢٠هـ،مكتبةإمام البخاري،القاهرة،الطبعة الأولى١٤٢٩هـ.

۸۵۔ **هدايةالرواةإلى تخريج أحاديث المصابيح والمشكاة**:حافظ أحمدبن علي بن حجر العسقلاني،متوفى٨٥٢هـ،دارابن القيم،الدمام،الطبعةالأولى١٤٢٢هـ.

تفسیر

۸۶۔ **بدائع التفسير**: شمس الدين محمدبن أبي بكر،ابن قيم الجوزية،متوفى ٧٥١،دارابن الجوزي،الدمام ،السعودية،الطبعةالأولى١٤٢٧هـ،

۸۷۔ **تبیان القرآن**:شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی،(معاصر)فرید بک سٹال،لاہور.

٨٨ـ **تفسير القرآن العظيم**: عماد الدين إسماعيل بن عمر بن كثير الشافعي، متوفّیٰ ٧٧٤هـ، دار طيبة، الرياض، الطبعة الثانية ١٤٢٠هـ، **و ط**: مؤسسة قرطبة، جيزة، الطبعة الأولیٰ ١٤٢١هـ.

٨٩ـ **التفسير المظهري**: قاضي ثناء الله پاني پتي، متوفّیٰ ١٢٢٥هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

٩٠ـ **جامع البيان عن تأويل آي القرآن**: إمام أبو جعفر محمد بن جرير الطبري، متوفّیٰ ٣١٠هـ، دار الفكر، بيروت الطبعة ١٤١٥هـ، **و ط**: دار هجر، القاهرة، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٢هـ.

٩١ـ **الدر المنثور في التفسير بالمأثور**: الإمام الحافظ جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفّیٰ ٩١١هـ، دار هجر، القاهرة، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٤هـ.

٩٢ـ **روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني**: أبوالفضل سيد محمود آلوسي حنفي بغدادي، متوفّیٰ ١٢٧٠هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٣١هـ.

٩٣ـ **الكشف والبيان (تفسير الثعلبي)** أبوإسحاق أحمد الثعلبي، متوفیٰ ٤٢٧هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٢هـ.

شُرُوحِ حدیث

٩٤ـ **إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري**: أحمد بن أبي بكر الخطيب القسطلاني، متوفّیٰ ٩٤٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٦هـ.

٩٥ـ **إكمالُ إكمالِ المُعْلِم**: أبوعبد الله محمد بن خليفة الوشتاني أبي المالكي، متوفّیٰ ٨٢٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٩هـ.

٩٦ـ **إكمال المعلم بفوائد مسلم**: قاضي عياض بن موسیٰ مالكي الأندلسي، متوفّیٰ ٥٤٤هـ، دار الوفا، المنصورة، الطبعة الأولیٰ ١٤١٩هـ.

٩٧ـ **أنوار الباري اردو شرح صحيح البخاري**: سيد أحمد رضا بجنوري، متوفّیٰ، إداره تاليفات أشرفية، ملتان.

٩٨ـ **تحفة الأحوذي بشرح الجامع الترمذي**: شيخ عبد الرحمن مبار كپوري، متوفّیٰ ١٣٢٥هـ، دار إحياء التراث العربي بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٩هـ.

٩٩ـ **التمهيد لما في المؤطا من المعاني والمسانيد** :حافظ أبو عمرو بن عبد البر المالكي، متوفیٰ٤٦٣ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ١٤١٩ھ.

١٠٠ـ **التوشيح شرح الجامع الصحيح**: جلال الدين عبدالرحمٰن بن أبي بكر السيوطي، متوفیٰ٩١١،مكتبة الرشد،الرياض،الطبعة الأولیٰ١٤١٩ھ.

١٠١ـ **التوضيح لشرح الجامع الصحيح**: أبو حفص عمر بن علي المعروف بابن الملقن، ٨٠٤ھ،دار الفلاح،مصر،الطبعة الأولیٰ١٤٢٩ھ.

١٠٢ـ **تيسير الباري شرح صحيح البخاري**: وحيد الزمان،متوفیٰ ١٣٢٨ھ،تاج کمپنی پاکستان.

١٠٢ـ **جامع العلوم والحكم في شرح خمسين حديثاً من جوامع الكلم**:حافظ عبد الرحمان بن رجب الحنبلي،متوفیٰ٧٩٥ھ،مؤسسة الرسالة،بيروت،الطبعة الرابعة١٤١٣ھ.

١٠٣ـ **حاشية مسند الإمام أحمد بن حنبل**: أبو الحسن نورالدين محمد بن عبد الهادي، السندي،متوفیٰ١١٣٨ھ،دار النوادر،دمشق،الطبعة الأولیٰ١٤٢٨ھ.

١٠٤ـ **سبل السلام الموصلة إلیٰ بلوغ المرام**: محمد بن إسماعيل الأمير الصنعاني، متوفی ١١٨٢ھ،دار ابن الجوزي،الدمام،الطبعة الثانية١٤٢١ھ، **و ط**:دار ابن حزم،بيروت، الطبعة الأولیٰ١٤٢٣ھ.

١٠٥ـ **السراج الوهاج من كشف مطالب صحيح مسلم بن الحجاج**: أبوالطيب صديق بن حسن خان القنوجي،متوفیٰ١٣٠٧ھ،وزارة الأوقاف وشؤون الإسلامية،قطر١٤١٧ھ.

١٠٦ـ **شرح صحيح مسلم**:علامہ غلام رسول سعیدي،معاصر،فرید بک سٹال،لاہور.

١٠٧ـ **عون الباري لحلِّ أدلة البخاري**: أبو الطيب سيد صديق حسن القنوجي، متوفیٰ ١٣٠٧ھ،المطبعة العربية الحديثة،القاهرة،١٤٠٤ھ، **و ط**:دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ١٤٢٩ھ.

١٠٨ـ **عون المعبود شرح سنن أبي داود**: شمس الحق عظيم آبادي،متوفیٰ١٣٢٩ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ١٤١٠ھ.

۱۰۹۔ **فتح الباري شرح صحيح البخاري**: أحمدبن علي بن حجر العسقلاني،متوفّیٰ ۸۵۲ھ، دار الفکر،بیروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۶ھ.**وط**:دار طيبة،الرياض،الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۶ھ.

۱۱۰۔ **فتح الملهم بشرح إمام المسلم**: علامة شبير أحمد عثماني،دار إحياء التراث العربي، بیروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۶ھ.

۱۱۱۔ **الفجر الساطع على الصحيح الجامع**: محمد الفضيل بن الفاطمي المغربي الزرهوني، المالكي، متوفّیٰ ۱۳۱۸ھ،مکتبة الرشد،الرياض.

۱۱۲۔ **فيض القدير شرح الجامع الصغير**: زين الدين عبدالرؤف المناوي، متوفّیٰ ۱۰۲۱ھ، دار المعرفة،بيروت،الطبعة الثانية ۱۳۹۱ھ.

۱۱۳۔ **قوت المغتذي بشرح الجامع الترمذي**: جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي،متوفّیٰ ۹۱۱ھ،دار النوادر،دمشق،الطبعة الأولیٰ ۱۴۳۳ھ.

۱۱۴۔ **كشف الباري عمافي صحيح البخاري**:سليم الله خان،معاصر،مکتبة فاروقية، کراچي.

۱۱۵۔ **مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح**: علي بن سلطان محمد المعروف بملاعلي القاري،متوفّیٰ ۱۰۱۴ھ، المكتبة التجاريه،مكة المكرمة.

۱۱۶۔ **معالم السنن شرح سنن أبي داود**: أبوسليمان حمد بن محمد الخطابي،متوفّیٰ ۳۸۸ھ، دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى ۱۴۱۱ھ.

۱۱۷۔ **المفهم لماأشكل من تلخيص كتاب مسلم**: إمام أبوا لعباس أحمد بن عمر القرطبي المالكي،متوفّیٰ ۶۵۶ھ،دار ابن كثير،بيروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۷ھ.

۱۱۸۔ **مكمل إكمال الأكمال**: علامة محمد بن محمد السنوسي المالكي،متوفّیٰ ۸۹۵ھ، دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۵ھ.

۱۱۹۔ **منار القاري شرح مختصر صحيح البخاري**: حمزة محمد قاسم، مكتبة دار البيان، دمشق، ۱۴۱۰ھ.

۱۲۰۔ **المنتقیٰ شرح مؤطا**: قاضي أبوالوليد سليمان بن خلف الباجي،متوفّیٰ ۴۹۴ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۰ھ.

١٢١ـ **نعمة الباري في شرح صحيح البخاري**: علامة غلام رسول سعيدي(معاصر)،فريد بك سٹال،لاهور، الطبعة الأولىٰ١٤٢٨هـ.

١٢٢ـ **نيل الأوطار شرح منتقى الأخبار**: محمد بن علي بن محمدالقاضي الشوكاني، متوفّىٰ ١٢٥٥هـ،دارابن الجوزي، الدمام، الطبعة الأولى١٤٢٧هـ.

سِيَرت و فَضَائِل

١٢٣ـ **الأنوار المحمدية من المواهب اللدنية**: الشيخ يوسف بن إسماعيل النبهاني،متوفّىٰ ١٣٥٠هـ، الطبعةالأدبية،بيروت١٣٢١هـ.

١٢٤ـ **إشراق مصابيح السيرة المحمدية بمزج أسرار المواهب اللدنية** :محمد عبد الباقي الزرقاني، متوفّىٰ١١٢٢هـ، دارالكتب العلمية، بيروت،الطبعةالأولىٰ١٤١٧هـ .

١٢٥ـ **ألفية السيرة النبوية [نظم الدررالسنية فى السيرة الزكية]** إمام زين الدين عبد الرحيم بن الحسين العراقي،متوفّىٰ ٨٠٦هـ،دارالمنهاج، بيروت، الطبعةالأولىٰ١٤٢٦هـ.

١٢٦ـ **تهذيب الخصائص النبوية الكبرىٰ**: الشيخ عبداللّٰه التليدي،دارا لبشائرالإسلامية، بيروت،الطبعةالثانية١٤١٠هـ.

١٢٧ـ **جلاء الأفهام فى الصلاة والسلام على خيرالأنام**: محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية، متوفّىٰ ٧٥١هـ، دارعالم الفوائد،مكة المكرمة، الطبعةالأولى ١٤٢٥هـ

١٢٨ـ **جواهرالبحار في فضائل النبي المختار**: يوسف بن إسماعيل النبهاني،متوفّىٰ١٣٥٠هـ، مصطفى البابي الحلبي،مصر١٣٧٩هـ**وط**:دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولىٰ١٤١٧هـ.

١٢٩ـ **حجة اللّٰه على العالمين في معجزات سيدالمرسلين**: الشيخ يوسف بن إسماعيل النبهاني،متوفّىٰ١٣٥٠هـ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولىٰ١٤١٧هـ.

١٣٠ـ **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**: إمام أبوبكرأحمدبن حسين البيهقي، متوفّىٰ ٤٥٨هـ ، دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولىٰ ١٤٠٥هـ .

١٣١ـ **دلائل النبوة**: أبونُعَيم أحمدبن عبدالله الأصفهاني،متوفّىٰ٤٣٠هـ،دارالنفائس، بيروت الطبعةالثالثة١٤٠٦هـ.

١٣٢ـ **الروض الأنف**: أبو القاسم عبد الرحمن بن عبد الله السهيلي، متوفّىٰ ٥٧١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

١٣٣ـ **زاد المعاد في هدي خير العباد** : شمس الدين محمد بن أبي بكر ابن القيم الجوزية، متوفّىٰ ٧٥١هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٩هـ .

١٣٤ـ **الزهر الباسم في سير أبي القاسم**: علاؤ الدين أبوعبد الله مغلطائي، متوفّىٰ ٧٦٢هـ، دار السلام، القاهرة، الطبعة الأولىٰ ١٤٣٣هـ.

١٣٥ـ **سبل الهدىٰ والرشاد في سيرة خير العباد**: إمام محمد بن يوسف الصالحي الشامي، متوفّىٰ ٩٤٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٤هـ.

١٣٦ـ **سر الشهادتين**: شاه عبدالعزيز محدث دهلوي، متوفّىٰ ١٢٣٩هـ، أحباب پبلشرز، لكهنؤ.

١٣٧ـ **سعادة الدارين فی الصلاة علی سید الکونین ﷺ**: قاضي يوسف بن إسماعيل النبهاني، متوفّىٰ ١٣٥٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

١٣٨ـ **السيرة النبوية**: أبو محمد عبد الملك بن هشام الحميري المعافري، متوفّىٰ ٢١٣هـ، دار ابن حزم، الطبعة الثانية ١٤٣٠هـ.

١٣٩ـ **الشفاء بتعريف حقوق المصطفى ﷺ**: قاضي عياض بن موسىٰ اليحصبي المالكي، متوفّىٰ ٥٤٤هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، ومؤسسة الكتب الثقافية. الطبعة الثانية ١٤٢١هـ.

١٤٠ـ **الطبقات الكبرىٰ** : محمد بن سعد بن منيع الظهري، متوفّىٰ ٢٣٠هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ. **و ط**: مكتبة الخانجي القاهرة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢١هـ .

١٤١ـ **العجالة السنية على الفية السيرة النبوية**: زين الدين محمد عبد الرؤف المناوي، متوفّىٰ ١٠٢١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٤هـ.

١٤٢ـ **العطور المجموعة في ذكر النبي الحبيب ﷺ**: صوفي محمد إقبال مدني، متوفّىٰ ٢٠٠٩ء، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١١هـ.

١٤٣ـ **غاية السول في خصائص الرسول ﷺ**: إمام أبي حفص عمر بن علي الأنصاري ابن الملقن، متوفّىٰ ٨٠٤هـ ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٤هـ.

١٤٤ـ **الفصول في سيرة الرسول** : أبـوالفداء عمادالدين إسماعيل بن كثير،متوفّى٧٧٤ھ،دار التراث المدينة المنورة،الطبعة السادسة ١٤١٣ھ،**وط**:دار النوادر،الكويت١٤٣١ھ.

١٤٥ـ **فـضائل درودشريف** : مـولانـا مـحـمـدز كـريا كاندهلوي، متوفّى١٤٠٢ھ، دار البشائر الإسلامية،بيروت.

١٤٦ـ **الـقـول الـبـديـع فـي الـصلاة على الحبيب الشفيعﷺ**:إمـام مـحـمـد بن عبد الرحمٰن السخاوي،متوفّى٩٠٢ھ،مؤسسة الريان،بيروت،الطبعةالأولى ١٤٢٢ھ .

١٤٧ـ **كـفاية الطالب اللبيب في خصائص الحبيبﷺ(الخصائص الكبرىٰ)**: جلال الدين عبد الـرحـمـان بـن أبـي بـكر السيوطي،متوفّىٰ٩١١ھ،دارالكتب العلمية،بيروت، الطبعةالأولىٰ ١٤٠٥ھ.**وط**:دارالتوفيقية،القاهرة، سنةالطبع١٠١١ء.

١٤٨ـ **الـلـؤلـؤ الـمـكـنون في سيرة النبي المأمون**: مـوسـىٰ بـن راشـد العازمي،دار الصميعي، الرياض،الطبعةالأولىٰ١٤٣٤ھ.

١٤٩ـ **الـلـفـظ الـمـكـرم بخصائص النبي المعظمﷺ**: حـافـظ قـطـب الـدين محمدبن محمد الـخـيـضـري الشافعي،متوفّىٰ٨٩٤ھ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولىٰ١٤١٧ھ، **وط**: بالمدينة المنورة،الطبعةالأولىٰ١٤١٥ھ.

١٥٠ـ **الـمِـنـحُ الـمـكِّية في شرح الهمزيَّة**: شهـاب الـديـن أحـمـدبـن مـحـمدبن علي بن حجر الهيتمي المكي الشافعي،متوفىّٰ٩٧٤ھ،دارالمنهاج،بيروت،الطبعةالثانية١٤٢٦ھ.

١٥١ـ **الـمواهب اللدنية بالمنح المحمدية**: إمـام أحمدبن محمدالقسطلاني،متوفّىٰ ٩٢٣ھ، المكتب الإسلامي، بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤١٢ھ.

١٥٢ـ **نسيـم الرياض في شرح الشفاء القاضي عياض**: علامة أحمد شهاب الدين الخفاجي الـمـصـري،متـوفّـىٰ ١٠٦٩ھ،الـمـطـبـعةالأزهريةالمصرية،الطبعة الأولى ١٣٢٧ھ.**وط**: دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولىٰ١٤٢١ھ.

١٥٣ـ **نشر الطيب في ذكر النبي الحبيب** ﷺ:مولاناأشرف علي تهانوي،متوفّى ١٣٦٤ھ،تاج كمپنى، كراچى.

۱۵۴۔ **الوفا بأحوال المصطفیٰ ﷺ** :أبوالفرج عبد الرحمن علي بن الجوزي، متوفّیٰ۵۹۷ھ، دارالکتب العلمیة،بیروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۰۸ھ.

اُصُولِ حَدِیْث

۱۵۵۔ **معرفة علوم الحدیث**: إمام أبوعبداللّٰه الحاکم النیسابوري،متوفّیٰ۴۰۵ھ،المکتبة العلمیة،المدینة المنورة،الطبعة الثانیة۱۳۹۷ھ.

اسماء الرّجال

۱۵۶۔ **الاستیعاب في معرفة الأصحاب**: إمام أبوعمرویوسف بن عبد اللّٰه بن محمدبن عبد البر القرطبي،متوفّیٰ۴۶۳ھ،دارالفکر،بیروت،۱۴۲۶ھ.

۱۵۷۔ **الإصابة في تمییز الصحابة**: حافظ شهاب الدین أحمدبن علي بن حجرالعسقلاني، متوفّیٰ۸۵۲ھ،مرکزهجر،القاهرة، الطبعةالأولیٰ۱۴۲۸ھ.

۱۵۸۔ **تذهیب تهذیب الکمال فيأسماء الرجال**: شمس الدین محمدبن أحمدالذهبي،متوفّیٰ ۷۴۸ھ،الفاروق الحدیثیة،القاهرة،الطبعةالأولیٰ۱۴۲۵ھ.

۱۵۹۔ **تهذیب التهذیب**: حافظ أحمد بن علي بن حجرالعسقلاني،متوفّیٰ۸۵۲ھ،دار الفکر، بیروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۱۵ھ،**وط**:دارالکتب العلمیة،بیروت، الطبعة الأولیٰ۱۴۲۵ھ.

۱۶۰۔ **تهذیب الکمال في أسماء الرجال**: حافظ جمال الدین یوسف المزيمتوفّیٰ۷۴۲ھ، دار الفکر،بیروت ۱۴۱۴ھ.**وط**:مؤسسةالرسالة،بیروت،الطبعةالثانیة۱۴۰۳ھ.

۱۶۱۔ **کتاب الثقات**: أبوحاتم محمدبن حبان التمیمي،متوفّیٰ۳۵۴ھ،مجلس دائرةالمعارف العثمانیة،حیدرآباد دکن،الطبعةالأولیٰ۱۳۹۳ھ.

۱۶۲۔ **الکامل في ضعفاء الرجال**: إمام الحافظ أبيأحمدعبداللّٰه بن عديالجرجاني،المتوفّیٰ ۳۶۵ھ،دارالکتب العلمیة،بیروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۱۸ھ.

۱۶۳۔ **لسان المیزان**: حافظ أحمدبن علي بن حجرالعسقلاني،متوفّیٰ۸۵۲ھ،المکتب المطبوعات الإسلامیة،حلب،الطبعة۱۴۲۳ھ.

۱۶۴۔ **معجم الصحابة**:قاضيأبوالحسنین بن قانع البغدادي،متوفّیٰ۳۵۱ھ،دارالکتب العلمیة،

بیروت،الطبعۃالأولیٰ۱٤۲٦ھ.

۱٦۵۔ **میزان الاعتدال في نقدالرجال**: شمس الدین محمد بن أحمد الذہبي،متوفّیٰ ۷٤۸ھ،دارالکتب العلمیۃ،بیروت،الطبعۃالأولیٰ ۱٤۱۵ھ.

کُتُبِ عَقائِد وکَلام

۱٦٦۔ **آب حیات**:محمد قاسم نانوتوي،متوفّیٰ۱۲۹۷ھ،مطبوعۃ ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان.

۱٦۷۔ **الإعتقاد والهدایۃ إلی سبیل الرشاد**: إمام أبوبکرأحمدبن الحسین البیهقي،متوفّیٰ ٤۵۸ھ، الیمامۃ دمشق،الطبعۃالأولیٰ۱٤۲۰ھ، **وط**:دارالفضیلۃ، الریاض،الطبعۃالأولیٰ ۱٤۲۰ھ.

۱٦۸۔ **إنباء الأذکیاء فيحیاۃ الانبیاء،في:الحاويللفتاوي**: جلال الدین عبدالرحمان بن أبي بکرالسیوطي،دارالکتب العلمیۃ،بیروت،الطبعۃالأولیٰ۱٤۰۲ھ،**وط**:دارالکتاب العربي، بیروت،الطبعۃ۱٤۲۵ھ.

۱٦۹۔ **إیثارالحق علی الخلق في رد الخلافات إلیٰ مذهب الحق**: أبوعبدالله محمدبن مرتضیٰ ابن الوزیریماني،متوفّٰی ۸٤۰ھ،دارالکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۱٤۰۷ھ.

۱۷۰۔ **تسکین الصدور في تحیق أحوال الموتیٰ فی البرزخ والقبور**: أبوالزاهد محمد سرفراز خان صفدر،متوفّٰی۲۰۰۹ء،مکتبۃصفدریۃ، گوجرانوالہ،طبع پانزدهم۲۰۱۰ء.

۱۷۱۔ **دفع شبه من شبه وتمرد**: تقيالدین أبوبکرأحمد الحصنيالدمشقي،متوفّیٰ۸۲۹ھ، دار الرازي،عمان،الأردن،الطبعۃالأولیٰ۱٤۲٤ھ.

۱۷۲۔ **الدین الخالص**:السید محمدصدیق حسن القنوجي البخاري،متوفّیٰ۱۲۵۳ھ،دارالکتب العلمیۃ،بیروت،الطبعۃ الأولی ۱٤۱۵ھ۔

۱۷۳۔ **الرد علی المتعصب العنید،المانع من ذم یزید**: إمام أبوالفرج عبد الرحمان بن علي ابن الجوزي،متوفّٰی ۵۹۷ھ،دارالکتب العلمیۃ،بیروت، الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۲٦ھ.

۱۷٤۔ **رشد الإیمان**: أبومحمد،محمد عبد الرشید رضوي،متوفّٰی ۲۰۰۱ء،مکتبۃرشد الإیمان،سمندري، فیصل آباد،۲۰۰۹ء.

۱۷۵۔ **الرّوح**:شمس الدین محمد بن أبي بکربن قیم الجوزیۃ،متوفّیٰ۷۵۱ھ،دارالفکر،بیروت،

الطبعةالأولىٰ١٤١ھ،وط:دارإحياء العلوم، بيروت،الطبعةالثانية١٤١٤ھ.

١٧٦۔ **سماع الموتی:** أبوالزاهد محمد سرفرازخان صفدر،متوفّٰی٢٠٠٩ء،مكتبة صفدرية، گوجرانواله،طبع نهم٢٠٠٧ء.

١٧٧۔ **السيف المسلول:** قاضي ثناء الله پاني پتي،متوفّٰی١٢٢٥ھ،مطبع أحمدي دهلي، سنة الطبع١٢٦٨ھ.

١٧٨۔ **شرح العقائد النسفية:** إمام سعدالدين مسعودبن عبدالله الشهيربسعدالدين التفتازاني، متوفّٰی٧٩٣ھ،مكتبةالحسن ،لاهور،**وط:**مكتبةحقانيةملتان،**وط:**مكتبةرشيدية، كوئٹه.

١٧٩۔ **شرح العقيدة الواسطية:** شيخ محمدبن صالح العثيمين،دارالغدالجديد، القاهرة،الطبعة الأولىٰ١٤٢٨ھ.

١٨٠۔ **شرح مذاهب أهل السنة:** أبوحفص عمربن أحمدبن عثمان بن شاهين،متوفّٰی٣٨٥ھ، مكتبةالخراز،جدة،الطبعةالأولىٰ١٤١٥ھ.

١٨١۔ **شفاء السقام في زيارة خيرالأنام:** تقي الدين علي بن عبد الكافي السبكي، متوفّٰی ٧٥٦ھ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولى١٤٢٩ھ.

١٨٢۔ **شواهد الحق فی الاستغاثة بسيدالخلق:** يوسف بن إسماعيل النبهاني،متوفّٰی ١٣٥٠ھ، مصطفى البابي الحلبي،مصر،**وط:**دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولى١٤١٧ھ.

١٨٣۔ **الصارم المسلول على شاتم الرسول:** علامةأحمد بن عبد الحليم ابن تيمية،متوفّٰی ٧٢٨ھ،المكتب الإسلامي،بيروت،الطبعةالأولىٰ١٤١٤ھ.

١٨٤۔ **الصواعق المحرقة فی الرد علی أهل البدع والزندقة :** علامةأحمد بن حجرالهيتمي المكي،متوفّٰی٩٧٥ھ،مكتبةالقاهرة،مصر، الطبعةالثانية١٣٨٥ھ، **وط:** مكتبة فياض، منصورة،الطبعةالأولىٰ١٤٢٩ھ،وط:دارالوطن،الرياض،الطبعةالأولىٰ١٤١٧ھ.

١٨٥۔ **كفريه كلمات كے بارے میں سوال جواب:** أبوبلال محمدإلياس قادری،معاصر، مكتبة المدينة، كراچي.

١٨٦۔ **منصب إمامت:** شاه اسماعيل دهلوي،متوفّٰی ١٣٤٦ھ، طيب پبلشرز، لاهور، اشاعت

چهارم۲۰۰۸ء

۱۸۷۔ **منهاج السنة**: أبو العباس أحمد بن عبدالحلیم ابن تیمیة الحنبلي، متوفّیٰ ۷۲۸ھ، مؤسسةالریان،یروت،۱٤۲٤ھ.

کُتُب فقه حنفی

۱۸۸۔ **إمداد الفتاوي**: مولاناأشرف علي تھانوي،متوفّیٰ ۱۳٦٤ھ،مکتبةدارالعلوم، کراچي.

۱۸۹۔ **فتاویٰ حقانیة**: شیخ الحدیث مولاناعبدالحق،متوفّیٰ۱۹۸۸ء،ناشردارالعلوم حقانیة،اکوڑہ خٹك،پاکستان.

۱۹۰۔ **فتاوي دارالعلوم دیوبند**: مفتي عزیزالرحمان عثماني،متوفّیٰ۱۳٤۷ھ، ، دار الإشاعت، کراچي.

۱۹۱۔ **فتاویٰ رضویة**: إمام أحمد رضاحنفی،متوفّیٰ ۱۳٤۰ھ،مکتبةرضویة آرام باغ، کراچي، **و ط**:رضافاؤنڈیشن جامعیةنظامیةرضویة،لاھور.

۱۹۲۔ **فتاوی عزیزي**: شاہ عبدالعزیزمحدث دھلوي،متوفّیٰ۱۲۲۹ھ، کتاب فروشي حاجي محمدعلیم وپسران،بازار کتاب فروشي، کابل افغانستان. **و ط**:مترجم اردو،ایچ ایم سعید کمپني، کراچي،سنةالطبع۱۳۸۷ھ.

۱۹۳۔ **فتاوي محدث اعظم**:مؤلاناسردارأحمد،متوفّیٰ ،رضااکیڈمی،فیصل آباد.

۱۹٤۔ **فتاوي مھریه**: علامةسیدپیر مھرعلي شاہ گولڑوي،متوفّیٰ۱۳۵٦ھ،انٹرنیشنل پرنٹرز، لاھور.

۱۹۵۔ **کفایت المفتي**:مفتي محمد کفایت الله دھلوي،متوفّیٰ۱۹۵۲ء،دارالإشاعت، کراچي.

فقه شافعی

۱۹٦۔ **حاشیة العلامة ابن حجر علیٰ إیضاح المناسک للنووي**: إمام أحمدبن حجر الھیتمي المکي،متوفیٰ۹۷٦ھ،مکتبةنزارمصطفیٰ الباز،مکةالمکرمة،الطبعةالأولیٰ۱٤۱٦ھ.

۱۹۷۔ **الحاوي للفتاوي**: الإمام الحافظ جلال الدین السیوطي،متوفّیٰ۹۱۱ھ،دارالکتب العلمیة،بیروت،الطبعةالأولیٰ ۱٤۰۲ھ **و ط**:دارالکتاب العربي،بیروت الطبعة۱٤۲۵ھ.

١٩٨ـ **القواعد الكبرىٰ**: إمام عزالدين عبد العزيز بن عبدالسلام، متوفّىٰ ٦٦٠ھ، دار القلم، دمشق،الطبعةالأولىٰ ١٤٢١ھ.

فقه حنبلي

١٩٩ـ **إعلام الموقعين عن رب العالمين**: أبوعبدالله محمدبن أبي بكر ابن قيم الجوزية الحنبلي،متوفّىٰ ٧٥١ھ،دارابن الجوزي،الدمام،الطبعةالأولىٰ ١٤٢٣ھ.

٢٠٠ـ **كتاب الجدل**: أبوالوفاء علي بن عقيل الحنبلي البغدادي،متوفّىٰ ٥١٣ھ، مكتبة الثقافة الدينية،القاهرة.

٢٠١ـ **مجموعة الفتاوىٰ**: أبو العباس أحمدبن عبدالحليم ابن تيمية الحنبلي، متوفّىٰ ٧٢٨ھ، دارابن حزم، بيروت،الطبعةالثانية ١٤٢٢ھ.

مذاهب

٢٠٢ـ **الفتح الرباني من فتاوىٰ الإمام الشوكاني**: محمدبن علي الشوكاني، متوفّىٰ ١٢٥٠ھ، مكتبةالجيل الجديد،اليمن،صنعاء.

ترغیب وترہیب

٢٠٣ـ **تبليغى نصاب**: مولانامحمدزكرياسهارنپورى، متوفّىٰ ١٤٠٢ھ،اداره اشاعتِ دينيات انار كلى،لاهور.

٢٠٤ـ **تحفة الذاكرين شرح حصن حصين**: قاضي محمد بن علي الشوكاني،متوفّىٰ ١٢٥٠ھ، دارالجيل، بيروت،طبعة الأولىٰ ١٤١٩ھ.

٢٠٥ـ **التذكرة في أحوال الموتىٰ وأمور الآخرة** : إمام أبوعبدالله محمد بن أبي بكر القرطبي، متوفّىٰ ٦٦٨ھ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤١٩ھ، **وط**: مكتبة دار المنهاج،الرياض،الطبعةالأولىٰ ١٤٢٥ھ.

٢٠٦ـ **جامع بيان العلم وفضله**: إمام أبو عمرو يوسف بن عبد الله بن محمدبن عبد البر القرطبي،متوفّىٰ ٤٦٣ھ،دارإبن الجوزي،الدمام،الطبعةالرابعة ١٤١٩ھ.

٢٠٧ـ **جذب القلوب(فارسى)**: شيخ عبدالحق الدهلوي،متوفّىٰ ١٠٥٢ھ،مطبع نامي منشي

نولکشور کانپور.

۲۰۸۔ **حجة اللہ البالغة**: شاہ ولی اللہ بن عبد الرحیم الدهلوي، متوفّیٰ ۱۱۷۶ھ، دار إحیاء العلوم بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۰ھ.

۲۰۹۔ **شرح الصدور بشرح حال الموتی و القبور**: حافظ جلال الدین عبدالرحمن السیوطي، متوفّیٰ ۹۱۱ھ، دار المعرفة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۷ھ.

۲۱۰۔ **العلم الهیب من الکلم الطیب**: محمود بن أحمد بدر الدین العیني، متوفّیٰ ۸۵۵ھ، مکتبة الرشد، الریاض، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۹ھ.

۲۱۱۔ **مختصر الترغیب و الترهیب**: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفّیٰ ۸۵۲ھ، مکتبة الغزالي، دمشق، الطبعة الثانیة ۱۴۱۰ھ.

۲۱۲۔ **منتخب النصیحة فی الأدعیة الصحیحة**: حافظ عبدالغني المقدسي، متوفیٰ ۶۶۰ھ، المکتبة التجاریة الکبریٰ مکة المکرمة، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۴ھ.

۲۱۳۔ **الوابل الصیب من الکلم الطیب**: محمد بن ابی بکر بن قیم الجوزیة، متوفّیٰ ۷۵۱ھ، المکتب الإسلامي، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۸ھ.

علم الأصول

۲۱۴۔ **الإبهاج في شرح المنهاج**: شیخ الإسلام علي بن عبدالکافي السبکي، متوفّیٰ ۷۵۶ھ، وولده: تاج الدین عبدالوهاب بن علي السبکي، متوفّیٰ ۷۷۱ھ، دار البحوث للدراسات الإسلامیة وإحیاء التراث، دبي، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۴ھ.

۲۱۵۔ **شرح الکوکب الساطع**: إمام جلال الدین عبدالرحمان بن أبي بکر السیوطي، متوفّیٰ ۹۱۱ھ، مکتبة الإیمان، القاهرة، ۱۴۲۰ھ.

۲۱۶۔ **غیث الهامع شرح جمع الجوامع**: ولي الدین أبوزرعة أحمد بن عبدالرحیم العراقي، متوفّیٰ ۷۲۶ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۵ھ.

فَضَائِلُ ومَنَاقِب

۲۱۷۔ **إتحاف السائل بما لفاطمة من المناقب و الفضائل**: محمدعبدالرؤف بن علي بن زين العابدين المناوي،متوفیٰ۱۰۳۱ھ،مکتبۃالقرآن،القاھرۃ.

۲۱۸۔ **إحياء الميت بفضائل أهل البيت**: إمام جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفّیٰ۹۱۱ھ،دارالمدینۃالمنورۃ،الطبعۃالأولیٰ۱۴۲۰ھ.

۲۱۹۔ **الثغور الباسمة في مناقب فاطمة**: إمام جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكرالسيوطي، متوفّیٰ۹۱۱ھ،دارالصحابۃ،طنطا،الطبعۃالأولیٰ۱۴۱۱ھ.

۲۲۰۔ **جامع كرامات الأولياء**: إمام یوسف بن إسماعیل النبھاني،متوفّیٰ۱۳۵۰ھ،دارالکتب العلمیۃ،بیروت،الطبعۃالأولیٰ۱۴۱۷ھ.

۲۲۱۔ **جمال الأولياء**:مولاناأشرف علي تھانوي،متوفّیٰ۱۳۶۴ھ،مکتبۃ اسلامیۃ،لاھور.

۲۲۲۔ **جواهر العقدين في فضل الشرفين**: نورالدين علي بن عبدالله السمهودي، متوفّیٰ۹۱۱ھ، دارالکتب العلمیۃ،بیروت،الطبعۃالأولی۱۴۱۵ھ.

۲۲۳۔ **الجوهرة في نسب الإمام علي و آله**: محمدبن أبي بكرالأنصاري التلمساني،المعروف بالبرّي،دارالجیل،بیروت،الطبعۃالثانیۃ۱۴۱۴ھ.

۲۲۴۔ **حكاياتِ صحابة(مع تبليغي نصاب)** :مولانامحمدزکریاالکاندھلوي،سھارنپوري متوفّیٰ۱۴۰۲ھ،تاج کمپنی،پاکستان.

۲۲۵۔ **درالسحابة في مناقب القرابة و الصحابة**: قاضي محمدبن علي الشوکاني، متوفّیٰ ۱۲۵۰ھ،دارالفکردمشق،بیروت،الطبعۃالأولیٰ۱۴۰۴ھ.

۲۲۶۔ **الذرية الطاهرة النبوية**: حافظ أبوبشرمحمدبن أحمدالدولابي،متوفیٰ۳۱۰ھ،الدار السلفیۃ،الکویت،الطبعۃالأولیٰ۱۴۰۷ھ.

۲۲۷۔ **ذخائر العقبىٰ في مناقب ذوى القربىٰ**:محب الدين أحمدبن عبدالله الطبري، متوفّیٰ ۶۹۴ھ،دارالکتب العلمیۃ،بیروت،الطبعۃالأولیٰ۱۴۲۷ھ.

۲۲۸۔ **رأس الحسين،ملحق باستشهاد الحسين**:أبو العباس أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية

الحنبلي، متوفّىٰ ٧٢٨هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٦هـ.

٢٢٩ـ **صفة الصفوة:** أبو الفرج عبدالرحمان ابن الجوزي، متوفّىٰ ٥٩٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.

٢٣٠ـ **الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة:** علي بن محمد بن أحمد الشهير بابن الصباغ المالكي، متوفّى ٨٥٥هـ، مؤسسة الأعلمي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٨هـ.

٢٣١ـ **فضائل الصحابة:** إمام أبو عبدالله أحمد بن محمد بن حنبل، متوفّىٰ ٢٤١هـ، دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الثالثة ١٤٢٦هـ.

٢٣٢ـ **فضائل الصحابة:** إمام أبو عبد الرحمٰن أحمد بن شعيب النسائي، متوفّىٰ ٣٠٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٥هـ.

٢٣٣ـ **فضائل فاطمة الزهراء:** الإمام الحافظ أبي عبدالله الحاكم النيسابوري، متوفّىٰ ٤٠٥هـ، دار الفرقان، القاهرة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٩هـ.

٢٣٤ـ **محض الخلاص في مناقب سعد بن أبي وقاص** رضي الله عنه: جمال الدين يوسف بن حسن، متوفّىٰ ٩٠٩هـ، شركة دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٧هـ.

٢٣٥ـ **محض الصواب في فضائل أمير المؤمنين عمر بن الخطاب:** جمال الدين يوسف بن حسن، متوفّىٰ ٩٠٩هـ، مكتبة أضواء السلف، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٠هـ.

٢٣٦ـ **مناقب علي والحسنين وأمهما فاطمة الزهراء** رضي الله عنهم: الشيخ محمد فواد عبد الباقي متوفّىٰ ١٣٨٨هـ، دار الحديث، القاهرة، سنة الطبع ١٤٢٣هـ.

٢٣٧ـ **نزل الأبرار بما صح من مناقب أهل البيت الأطهار:** حافظ محمد بن معتمد خان البدخشاني، المتوفى بعد ١١٢٦هـ، شركة الكتبي، بيروت.

٢٣٨ـ **نساء أهل البيت في ضوء القرآن والحديث:** أحمد خليل جمعة، معاصر، دار اليمامة دمشق، الطبعة الخامسة ١٤٢٣هـ.

٢٣٩ـ **نور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار** صلى الله عليه وآله وسلم: الشيخ مومن بن حسن الشبلنجي، متوفّىٰ بعد ١٢٩٠هـ، شركة مطبعة مصطفىٰ البابي الحلبي، مصر، الطبعة الأخيرة ١٣٢٧هـ.

لغت

٢٤٠ـ **کتاب العین**: أبوعبدالرحمان خلیل بن أحمد فراهیدي،متوفیٰ١٧٥ھ،دار إحیاء التراث العربي،بیروت،الطبعة الأولیٰ١٤٢١ھ.

٢٤١ـ **الکامل في اللغة والأدب**: إمام أبوالعباس محمدالمبرِّد،متوفیٰ٢٨٥ھ، مؤسسة الرسالة ناشرون،دمشق،الطبعة الأولیٰ١٤٢٧ھ.**وط**: وزارة الشؤون الإسلامیة،السعودیة.

٢٤٢ـ **لسان العرب**: إمام محمدبن مکرم المعروف بابن منظورالأفریقي،متوفیٰ٧١١ھ،دار إحیاء التراث العربي،بیروت،الطبعة الأولیٰ١٤١٦ھ.

٢٤٣ـ **المفردات في غریب القرآن**: إمام حسین بن محمد راغب الأصفهاني، متوفیٰ ٥٠٢ھ، مکتبة نزار مصطفی الباز،مکة المکرمة،الطبعة الأولیٰ١٤١٨ھ.

سیر و تاریخ

٢٤٤ـ **البدایة والنهایة**: عماد الدین إسماعیل بن عمربن کثیرالشافعي،متوفیٰ ٧٧٤ھ،دار ابن کثیر،دمشق،الطبعة الأولیٰ١٤٢٨ھ،**وط**: دار هجر،القاهرة،الطبعة الأولیٰ١٤١٧ھ.

٢٤٥ـ **بهجة النفوس والأسرار في تاریخ دار هجرة النبي المختار**: عبد الله بن محمد بن عبدالملك المرجاني،متوفیٰ٧٦٩ھ،مکتبة نزار مصطفی الباز،مکة المکرمة، الطبعة الأولیٰ١٤١٨ھ.

٢٤٦ـ **تاریخ الإسلام ووفیات المشاهیر والأعلام**: شمس الدین محمدبن أحمدبن عثمان بن قایماز الذهبي،متوفیٰ٧٤٨ھ،دار الکتاب العربي،بیروت،الطبعة الثانیة ١٤١٠ھ.

٢٤٧ـ **تاریخ إسلام [اردو]**: شاہ معین الدین أحمد ندوي،متوفیٰ١٣٩٤ھ، المیزان، اردو بازار،لاهور،٢٠١٥ء.

٢٤٨ـ **تاریخ الخلفاء**: الإمام الحافظ جلال الدین عبدالرحمان بن أبي بکر السیوطي،متوفیٰ ٩١١ھ،دار المنهاج،جدة،الطبعة الثانیة١٤٣٤ھ.

٢٤٩ـ **تاریخ الأمم والملوك**: إمام أبوجعفر محمدبن جریر الطبري،متوفیٰ٣١٠ھ،دار الکتب العلمیة،بیروت،الطبعة الأولیٰ١٤٢٤ھ.

٢٥٠ـ **تاريخ مدينة السلام [تاريخ بغداد]**: أبوبكر أحمدبن علي بن ثابت الخطيب البغدادي، متوفىّ ٤٦٣هـ، دار الغرب الإسلامي، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٢هـ.

٢٥١ـ **جمهرة أنساب العرب**: أبومحمد علي بن أحمد بن سعيد بن حزم الأندلسي، متوفّىٰ ٤٥٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٤هـ.

٢٥٢ـ **سير أعلام النبلاء**: شمس الدين محمدبن أحمدبن عثمان الذهبي، متوفّىٰ ٧٤٨هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الحادية العشرة ١٤٢٢هـ.

٢٥٣ـ **العبر في خبر من غبر**: شمس الدين محمدبن أحمدبن عثمان بن قايماز الذهبي، متوفّىٰ ٧٤٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٥هـ.

٢٥٤ـ **العقد الفريد**: أحمدبن محمدبن عبد ربه الأندلسي، متوفّىٰ ٣٢٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٤هـ.

٢٥٥ـ **عيون الأخبار**: أبومحمد عبدالله بن مسلم بن قتيبة الدينوري، متوفّىٰ ٢٧٦هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، تصوير: دار الكتب المصرية، ١٣٤٣هـ.

٢٥٦ـ **كتاب السير**: إبراهيم بن محمد أبو إسحاق الفزاري، متوفّىٰ ١٨٦هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ.

٢٥٧ـ **كنز الدرر وجامع الغرر**: أبوبكربن عبد الله بن أيبك الد واداري، نيوتايب الكترونيك، بيروت، ١٤١٤هـ.

٢٥٨ـ **الكامل في التاريخ**: عزالدين أبوالحسن علي بن محمد الشهير بابن الأثير الجزري، متوفّىٰ ٦٣٠، بيت الأفكار الدولية، الأردن.

٢٥٩ـ **مختصر تاريخ دمشق**: إمام محمدبن مكرم المعروف بابن منظور، متوفّىٰ ٧١١هـ، دار الفكر، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٠٤هـ.

٢٦٠ـ **المختصر في أخبار البشر**: أبوالفدا عماد الدين إسماعيل، متوفّىٰ ٧٣٢هـ، المطبعة الحسينية المصرية، الطبعة الأولىٰ ١٣٢٣هـ.

٢٦١ـ **المنتظم في تاريخ الملوك والأمم**: أبوالفرج عبد الرحمان بن الجوزي، متوفّىٰ ٥٩٧هـ،

دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٢ھ.

٢٦٢۔ **المعرفة والتاريخ**: أبويوسف يعقوب بن سفيان الفسوي، متوفّٰى ٢٧٧ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩ھ.

٢٦٣۔ **وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفىٰ ﷺ** : علي بن أحمد السمهودي، متوفّٰى ٩١١ھ، دار إحياء التراث العربي، بيروت. **و ط**: مكتبة دار الزمان، المدينة المنورة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٩ھ.

كُتُب مُتَفَرِقَة

٢٦٤۔ **أنوار النجوم ترجمه مكتوبات قاسم العلوم**: پروفيسر انوار الحسن شير كوٹي، متوفّٰى، مطبع خيابان پريس، اداره ناشران قرآن، اردو بازار، لاهور.

٢٦٥۔ **بدائع الفوائد**: محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية، متوفّٰى ٧٥١ھ، مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولىٰ ١٤١٦ھ.

٢٦٦۔ **حيات الحيوان الكبرىٰ**: كمال الدين محمد بن موسى الدميري، متوفّٰى ٨٠٨ھ، مطبعة مصطفى البابى الحلبي، مصر، **و ط**: دار البشائر، دمشق، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٦ھ.

٢٦٧۔ **ضرب كليم**: علامة ڈاكٹر محمد إقبال، متوفّٰى ١٩٣٨ء، شيخ غلام علي اينڈ سنز، لاهور.

٢٦٨۔ **الفوائد**: محمد بن أبي بكر بن قيم الجوزية، متوفّٰى ٧٥١ھ، مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤١٧ھ.

٢٦٩۔ **كلياتِ اقبال (اُردو)**: علامة ڈاكٹر محمد إقبال، متوفّٰى ١٩٣٨ء، شيخ غلام علي اينڈ سنز، لاهور.

فہرست مضامین

چند خصوصیات :

- مکمل عربی متن مع سند
- سابقہ عربی طبعات کی غلطیوں کی اصلاح
- ہر حدیث کی مکمل تخریج وتشریح
- سند کے لحاظ سے علماء اصولِ حدیث سے ہر حدیث پر حکم
- ہر حدیث پر وارد ہونے والے تمام اعتراضات کا متین جواب
- مصنف (امام نسائی رضی اللہ عنہ) کے قائم فرمودہ عنوانات کی روشنی میں خصوصیاتِ مرتضوی
- متن میں مذکور پنجتن پاک رضی اللہ عنہم کا تعارف اور ان کے اہم فضائل وخصائص
- جدید وقدیم تمام ناصبی اعتراضات کا انتہائی علمی اور مہذب رد
- علماء ومشائخِ اہلِ سنت دامت برکاتہم کی گرانقدر تقریظات
- پانچ سو سے زائد مآخذ ومراجع (کتابیات) کی فہرست مع سنہ طباعت اور مطبع وغیرہ
- صفحات (1150) گیارہ سو پچاس
- مکمل بیروتی طرزِ طباعت وبائنڈنگ اور امپورٹڈ کاغذ۔

اذانِ مغرب واقامت کے مابین وقفہ (مطبوع)

مغرب کی اذان اور اقامت (تکبیر) کے درمیان مناسب وقفہ کے ثبوت میں پہلی کاوش۔

نبی کریم ﷺ کے جسمِ اقدس کی نفاست و لطافت
اور فضلات شریفہ کی طہارت و برکت کے موضوع پر
اپنی مثال آپ کتاب۔

تصنیف:
قاری ظہور احمد فیضی

مکتبۃ باب العلم
جامعۃ علی المرتضیٰ، لاہور

شرح

إتحاف السائل بما لفاطمة من المناقب والفضائل

المعروف

مناقب الزہرا

تصنیف

امام زین الدین محمد بن عبد الرؤف المناوی

متوفی ۱۰۳۱ھ

ترجمہ، تخریج، تحقیق، تشریح

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلم

جامعہ علی المرتضیٰ، لاہور

شرح

أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب علیہ السلام

تصنیف

أبو الخیر شمس الدین محمد بن محمد بن محمد الجزري المقري الشافعي

متوفی ۸۳۳ھ

ترجمہ، تخریج، تحقیق، تشریح

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبۃ باب العلم

جامعۃ علی المرتضیٰ، لاہور

إنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ أَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ (صحیح مسلم)

اسماءِ قرآن کی روشنی میں فضائل و علومِ قرآن اور مقامِ صاحبِ قرآن ﷺ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

تصنیف

قاری ظہور احمد فیضی

ریسرچ سکالر: جامعہ اسلامیہ، لاہور

مکتبۃ باب العلم

جامعۃ علی المرتضیٰ، لاہور

الشمائل المحمدية ﷺ

للإمام أبي عيسى محمد بن عيسى الترمذي

(۲۰۹ - ۲۷۹ھ)

ترجمہ، تخریج، تحقیق، تشریح

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلم

جامعہ علی المرتضیٰ، لاہور